

سالِ نو مبارک


ماہنامہ

# پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۱ شمارہ ۱



اڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی



جنوری ۱۹۷۴

قیمت ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔


## فہرست مضامین

# بچوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ارکانِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | 1/50 |
| آں حضرت | الیاس احمد مجیبی (اردو) | -/65 |
| پاک کہانیاں (دو حصوں میں) | مقبول احمد سیوہاروی | 2/35 |
| چار یار | الیاس احمد مجیبی | 1/30 |
| خلفائے اربعہؓ | خواجہ عبدالحی فاروقی | 2/25 |
| رسولِ پاکؐ | عبدالواحد سندھی | 1/80 |
| عقائدِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/50 |
| مسلمان بیبیاں | مولانا اعجاز الحق قدوسی | -/45 |
| نبیوں کے قصے | خواجہ عبدالحی فاروقی | 1/25 |
| ہمارے رسول | " " " | 1/65 |
| سرکارِ دو عالم | محمد حسین حسان | 2/75 |

## معلومات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آدمی کی کہانی | مشتاق احمد | 1/75 |
| انوکھا عجائب خانہ (چار حصے) | محمد حسین حسان | 1/80 |
| بجلی کی کہانی | علی احمد خاں | -/50 |
| بڑے دادا کی کہانی | محمد عبدالغفور | -/56 |
| تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل | نجمہ سلطان | -/80 |
| " " " دوم | ضیاء الرحمٰن | 1/- |
| " " " سوم | مشتاق احمد اعظمی | 1/80 |
| " " " چہارم | " " | -/95 |
| چٹانوں کی کہانی | محمد امین | 1/75 |
| خبر رسانی کے طریقے | رشیدہ منظور الامین | -/85 |
| ڈینمارک کے بچے | محمد حسین حسان | 1/- |
| دہلی | ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی | 1/80 |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| رابندر ناتھ ٹیگور | صفدر حسین | 1/25 |
| سماجی زندگی اوّل | احمد جمیل و غلام ابرار | -/56 |
| " " دوم | " " | -/81 |
| " " سوم | " " | -/81 |
| سمندر کے کنارے | سلطانہ آصف فیضی | 1/30 |
| " " بچے | " " | 2/- |
| قدرت کے کرشمے | ادارہ | -/43 |
| میرا انیس | محمد حسین حسان | 1/25 |
| ہماری پارلیمنٹ | کیلاش چندر | 1/25 |

## کہانیاں، ڈرامے ۔ ناول

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے | | 4/- |
| اس نے کیا کرتا جاتا (کہانیاں) | آصفہ مجیب | -/37 |
| پریم کی جیت (ڈراما) | اسد اللہ کاظمی | -/37 |
| تانبیل خاں (کہانی) | محمد حسین حسان | -/30 |
| ترکوں کی کہانیاں (") | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/55 |
| تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) | م۔ ندیم | 1/50 |
| تین اناڑی (") | عصمت چغتائی | 1/40 |
| چھپاوت کا آدم، خورشیر } سچی کہانی | محمد معین | -/35 |
| چنیلی | محمد حسین حسان | -/50 |
| ستاروں کی سیر (ناول) | کرشن چندر | 4/75 |
| کوے دادا (سچا ناول) | مجیب احمد خاں | 1/75 |
| لال مرغی (کہانی) | عبدالواحد سندھی | -/50 |
| مزہ چکھائیں گے (") | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | 1/25 |
| مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں) | محمود علی خاں | -/65 |
| ننھا ٹٹو (کہانی) | خورشید سلطان | -/30 |

# بچّوں سے باتیں

## پیامی بہن بھائیوں کو بہت بہت عید مبارک

## نیا سال مبارک

جنوری کے مہینے میں حسنِ اتفاق سے تین تین خوشیاں جمع ہو گئی ہیں۔ نئے سال کی آمد۔ عید مبارک اور چھبیس ۲۶ جنوری یوں تو ۱۵۔ اگست اور ۲۶ جنوری ہماری قومی تاریخیں ہیں۔ مگر ۲۶ جنوری کو دھوم دھام چہل پہل زیادہ ہوتی ہے خصوصاً دہلی میں تو اس تاریخ کو ایسا شاندار جلوس نکلتا ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ اس جلوس میں فوج ہوتی ہے۔ فوجی ساز و سامان ہوتا ہے۔ دیس کی ریاستوں کی عجیب و غریب جھانکیاں ہوتی ہیں۔ دِلّی کے اسکولوں کے لڑکے لڑکیاں بھی اس میں حصہ لیتے ہیں۔ غرض عجیب و غریب سماں ہوتا ہے۔ دِلّی سے باہر کے ہزاروں لاکھوں بچے بڑے اسے دیکھنے آتے ہیں۔

---

دِلّی تو خیر دیس کی راج دھانی ہے جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے دیس کے ہر شہر ہر قصبے اور قریب قریب ہر گاؤں میں یہی جوش و خروش ہوتا ہے، ایسی ہی چہل پہل ہوتی ہے۔

اب سے بہت دنوں پہلے ہمارے بزرگوں نے مکمّل آزادی کی تجویز پاس کی تھی۔ اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے دیس کی جنتا نے کیسی کیسی قربانیاں کیں اور آخر کامیاب ہوئے یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔

---

آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ پچھلے سال نومبر ۷۳ء بچوں کی کتابوں کی بہترین لکھائی چھپائی پر ہمارے پریس (لبرٹی آرٹ پریس) کو دیس کی سرکار سے نیشنل اوارڈ ملا ہے۔ یہ کتاب مخدوم و محترم مرحوم ذاکر صاحب کی "ابو خاں کی بکری" کتاب اور اس کی رنگین تصویریں اتنی اچھی چھپی ہیں کہ دیکھ کر سچ مچ آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ ہم اس شاندار کامیابی پر جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں اور پریس کے دوسرے کارکنوں کی خدمت میں دِلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اوارڈ ایک خاص تقریب میں نائب صدرِ جمہوریہ ہند۔ جناب پاٹھک صاحب نے شاہد صاحب کو مرحمت فرمایا۔ اس موقع کی تصویر مشہور ہفتہ وار اخبار سب ساتھ (۲۲ نومبر ۷۳ء) میں شایع ہوئی ہے۔ یہ باتصویر اخبار نئی دِلّی سے نکلتا ہے۔

---

کسی پچھلے پرچے میں ہم نے کاغذ کی کم یابی بلکہ نایابی کا ذکر کیا تھا یہ بھی لکھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو گا کہ ہم رسالے کی قیمت نہیں بڑھائیں گے۔ لیکن بھائی اب تو پانی سر

آدھا ہو گیا ہے۔ تمام اخباروں نے اپنی ضخامت پہلے ہی کم کر دی تھی اور اب پچھلے دسمبر سے مشہور انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا نے اور غالباً دوسرے اخباروں نے بھی ہفتے میں ایک بار کی اشاعت ملتوی کر دی ہے۔ ایک تو کاغذ کی کمی دوسرے پچھلے مہینے سے دام بھی ایک دم کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اسی لیے ہمیں بھی مجبوراً بادل ناخواستہ۔ رسالے کی قیمت تھوڑی بہت بڑھانی پڑی اب تک اس کی قیمت کل چھ روپے سالانہ تھی۔ اب چھ کی جگہ سات روپے کرنی پڑی اور عام پرچے کی قیمت بجائے ساڑھے پیسے کے کل ۷۰ پیسے۔

---

مگر پیامیوں کی سہولت کے لیے یہ دام جنوری ۷۴ء سے نہیں فروری ۷۴ء سے بڑھائے گئے ہیں۔ جنوری میں جو پیامی خریدار بنیں گے ان سے پرانا چندہ صرف چھ روپے لیا جائے گا۔ بلکہ جنوری میں جن خریداروں کا چندہ ختم ہو گیا ہے ان سے بھی یہی قیمت لی جائے گی۔

---

کچھ مہینوں سے پیام تعلیم کے پرچے پیامیوں کو خاص طور سے پسند آ رہے ہیں اور تو اور خلیق انجم اشرفی صاحب بھی جو ہمیشہ پیام تعلیم پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ رسالے کے مضمونوں، کہانیوں، نظموں اور رسالے کی ترتیب کو بھی بہت پسند فرماتے ہیں۔

---

جنوری کا پرچہ سال کا نیا پرچہ ہے ہم نے محنت سے تیار کیا ہے ان شاء اللہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہماری درخواست پر محترم نیر صاحب نے نئے سال کے سلسلے میں ایک خاص نظم مرحمت فرمائی نظم بھی ایسی لاجواب کہ واہ واہ! جناب شوکت پردیسی۔ جناب مرتضیٰ حسین ساحل تسلیمی روشن علی روشن۔ حضرت مفتون کوٹوی۔ جناب منہاج احمد وغیرہم کی نظمیں بھی اس سلسلے کی ہیں۔ ان سب کا دلی شکریہ۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت اچھی اچھی نظمیں اور مضمون بھی آپ کو پسند آئیں گے۔

---

جناب خلیق انجم اشرفی اپنی غیر معمولی مصروفیت کے سبب اپنی کہانی "سونگے کا جزیرہ" کی قسط وقت پر نہ بھیج سکے۔ خلیق انجم صاحب کو اور خود ہمیں افسوس ہے۔ کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ آپ لوگ ہر مہینے اس کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ اب یہ ان شاء اللہ فروری میں پڑھیے گا۔

---

مجتبیٰ جمیل قریشی صاحب کا مضمون آپ نے اور دوسرے پڑھنے والوں نے بہت پسند کیا۔ قریشی صاحب نے ہالینڈ کی خاص خاص چیزوں پر مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ایسی چیزوں پر جو آپ کی دلچسپی کی ہیں۔ قریشی صاحب بھی وقت پر مضمون تیار نہ کر سکے یہ بھی اگلے نمبر میں پڑھیے گا۔

---

۷۳ء کا سال یوں تو ہم سب کے لیے بڑی پریشانیوں کا سال رہا سب سے افسوس ناک بات یہ کہ اس سال دیس کے بہت سے دانشور، ادیب، اچھے اچھے شاعر موت کی نذر ہو گئے ابھی نومبر کے شروع میں جناب سلام مچھلی شہری اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرض وہی کینسر، جگر کا کینسر۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق ہو۔

---

اور آیئے اب ہم آپ سب ہاتھ اٹھا کر اللہ میاں سے دعا مانگیں کہ یہ سال خیر و برکت کا سال ہو ہم سب خیریت سے اور امن و امان سے رہیں و دیس کے ہم سب باسی بھائی بھائی کی طرح مل جل کر رہیں دیس کو آگے بڑھانے میں سے ترقی دینے میں دل و جان سے لگ جائیں۔

جناب محمد شفیع الدین نیرؔ

# پھر تیس جنوری کی تاریخ آرہی ہے

پھر تیس جنوری کی تاریخ آرہی ہے
اس دن کی یاد سب کے دل کو دکھا رہی ہے

اس دن کی روشنی میں اندھیرا تھا یہ چھایا
باپو نے اپنے دل پہ پستول کا تیر کھایا

کٹیا سے آرہے تھے ایشور سے لو لگائے
بھگتی کے پاک جذبے تھے قلب میں سمائے

قاتل کے واسطے بھی "پرنام" منہ سے نکلا
گرتے ہوئے بھی اُن کے "ہے رام" منہ سے نکلا

یہ آرزو تھی اُن کی بھارت میں امن پھیلے
کوئی نہ اِس زمیں پہ ہولی لہو کی کھیلے

بھارت میں بسنے والے بن جائیں بھائی بھائی
مٹ جائیں سارے جھگڑے، ان میں نہ ہو لڑائی

آزاد سب ہوئے ہیں، پھر کیوں نہ سب ہوں شاداں
عیسائی ہوں کہ سکھ ہوں، ہندو ہوں یا مسلماں

سیوا سے سب کی، اپنا گلزار ہو یہ بھارت
الفت کی روشنی کا مینار ہو یہ بھارت

مسلم ہوں یا کہ ہندو پھولیں پھلیں خوشی میں
چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں سکھ پائیں زندگی میں

چھوت اور اچھوت کا ہو باقی نہ بھید بھاؤ
مدت کے بعد اب تو بھر جائیں دل کے گھاؤ

یہ اُن کی زندگی سے ملتا ہمیں سبق ہے
باپو کا بھی ہمارا اس زندگی میں حق ہے

اس تیس جنوری کو باپو کا دن منائیں
جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ کر کے اب دکھائیں

مہر و وفا کی دولت بھارت میں پھر سے آئے
نیرؔ وطن ہمارا دنیا میں نام پائے



جناب سہیل عظیم آبادی

# سخی عبداللہ

یہ بہت دنوں پہلے کی بات ہے بغداد میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ بہت امیر تھا۔ بہت سے ملکوں میں اس کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ اس کے آدمی دیس بدیس جاکر کاروبار کرتے تھے اور عبداللہ کی تجوری بھرتے تھے۔

عبداللہ جتنا امیر تھا اتنا ہی سخی بھی تھا۔ جو بھی اس کے پاس مدد مانگنے جاتا خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔ عالموں اور شاعروں پر تو وہ سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتا۔ کوئی عالم یا شاعر اس کے گھر پہنچتا تو جیسے عید کا دن آجاتا خوب خاطر کرتا، اچھے اچھے کھانے پکوا کر کھلاتا چلتے وقت اشرفیوں کی تھیلیاں دے کر رخصت کرتا۔

عبداللہ کا نام دور دور تک مشہور ہوگیا تھا۔ دور دور سے لوگ اس سے مدد مانگنے آتے۔ اور تھیلیاں بھر کرلے جاتے۔

جن لوگوں کی وہ برابر مدد کرتا رہتا تھا۔ ان میں اصمعی بھی تھا اصمعی اس زمانے کا بہت بڑا عالم اور شاعر تھا۔ وہ خلیفہ کے دربار میں بھی جاتا تھا اور جب جاتا تو عبداللہ کی سخاوت کی کہانیاں ضرور سناتا۔ خلیفہ سمجھ دار آدمی تھا۔ سن لیتا اور اس کی تعریف بھی کرتا۔ پر دل ہی دل میں عبداللہ سے جلنے لگا تھا یہ خلیفہ بھی اپنی رعایا میں بہت ہر دلعزیز تھا لیکن عبداللہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔

ایک بار خلیفہ نے عبداللہ کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ "لوگ تمھاری اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں" عبداللہ نے کہا "اے امیرالمومنین یہ تو صرف خدا کی مہربانی ہے۔ میں تو معمولی آدمی ہوں۔ مجھ میں بہت سی برائیاں ہیں۔ تعریف کے لائق تو بہر حال نہیں ہوں۔ مگر جو لوگ تعریف کرتے ہیں ان کو میں کیسے روکوں؟ یہ سوال اُن لوگوں سے ہی پوچھیے کہ وہ کیوں تعریف کرتے ہیں؟"

خلیفہ کو عبداللہ کی بات چیت کا یہ انداز کچھ اچھا نہ لگا۔ اس نے سوچا عبداللہ اپنی زبان سے اپنی تعریف کر رہا ہے۔ مگر اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس کی گرفت ہوسکتی تھی۔

پھر خلیفہ نے اس سے پوچھا "تو اتنی سخاوت کیوں کرتا ہے؟ کیا تجھے دولت سے محبت نہیں جو اُسے آتے ہی بانٹ دیتا ہے۔

عبداللہ نے جواب دیا "اے امیرالمومنین! دولت تو خدا کی دی ہوئی ہے۔ وہ مجھے بنا مانگے دیتا ہے تو جب میرے دروازے پر کوئی امید لے کر آئے۔ اُسے میں کیسے نا اُمید لوٹادوں؟ ایسا کرنا تو خدا کی ناشکری ہے۔"

خلیفہ نے کہا "اے عبداللہ تو عالموں اور شاعروں کی صحبت میں رہ کر بہت باتیں کرنا سیکھ گیا ہے۔ مگر یاد رکھ تیری دولت اس طرح بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ تب تیرے دروازے

پر کوئی نہ آئے گا۔"

عبداللہ نے کہا۔" اے امیر المومنین جس کنویں سے برابر پانی نکلتا رہے اس کا پانی خراب نہیں ہوتا۔ اور اگر میری دولت ختم کبھی ہو گئی تو پھر میرے دروازے پر کوئی مانگنے والا کیوں آئے گا اور کوئی نا امید نہ لوٹے گا۔ لیکن جب تک میرے پاس دولت ہے۔ میں کسی کو نا امید کیسے لوٹا دوں ؟ "

خلیفہ کو اس کی بات سن کر اور بھی غصّہ آیا۔ مگر وہ چپ ہو رہا۔ اور عبداللہ کو عزّت کے ساتھ دربار سے رخصت کیا۔ مگر اس کے دل میں یہ بات کھٹکتی رہی۔ اور وہ موقع کے انتظار میں رہنے لگا کہ کبھی کوئی ایسا وقت آئے جب وہ عبداللہ کو نیچا دکھائے۔

بہت دن ہو گئے۔ عبداللہ کی سخاوت کا وہی عالم تھا۔ وہ لوگوں کی مدد کرتا رہا۔ اور اس کے نام کا ڈنکا بجتا رہا۔ مگر دھیرے دھیرے اس کا کاروبار خراب ہونے لگا اس کی دولت گھٹنے لگی۔ یہ خبر کسی طرح خلیفہ تک پہنچی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ عبداللہ کی سخاوت پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ اور اس کے دینے دلانے یا داد و دہش میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اور جیسے پہلے وہ لوگوں میں دولت بانٹتا تھا۔ اسی طرح اب بھی بانٹتا ہے۔ خلیفہ نے سوچا عبداللہ یہ سب کچھ دکھانے اور نام کمانے کے لیے کرتا ہے۔ لیکن جب وقت پڑے گا تو پھر اس کی ساری قلعی کھل جائے گی۔

ایک دن خلیفہ کو خبر ملی کہ عبداللہ بالکل دیوالیہ (تباہ) ہو گیا ہے اور اس کے پاس کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہیں رہا تو خلیفہ کو رحم آ گیا۔ اس نے اپنے ایک غلام کے ہاتھ عبداللہ کے پاس اشرفیوں سے بھری ہوئی دو تھیلیاں بھیجیں اور غلام سے کہا۔" عبداللہ کے دروازے پر بیٹھے رہنا تاکہ کوئی اس سے ملاقات نہ کر سکے" غلام نے تھیلیاں عبداللہ کو پہنچا دیں۔ اور ننگی تلوار لے کر اس کے دروازے پر بیٹھ گیا۔

اور جب اصمعی کو یہ پتا چلا کہ عبداللہ کا کاروبار خراب ہو گیا ہے۔ اور اب وہ دانے دانے کو ترس رہا ہے۔ اسے بڑا دکھ ہوا اور وہ ایک تھیلی میں اشرفیاں بھر کر اس کے مکان پر پہنچا تاکہ اس کی مدد کرے۔

مگر دروازے پر حبشی غلام نے روک دیا اور بتایا کہ حکم نہیں کہ کوئی عبداللہ سے ملے۔ اصمعی سمجھا کہ غلام شاید عبداللہ کا آدمی ہے اور عبداللہ نے اسے دروازے پر اس لیے بٹھا دیا ہے کہ لوگ اسے تنگ نہ کریں۔ اس نے غلام کو ہزار سمجھایا۔ مگر غلام نے ہر بار یہی کہا۔" حکم نہیں ہے۔"

اصمعی کو یہ بات بری لگی اور اس نے کاغذ کے ایک پرزہ پر لکھ کر بھیجا " جس کو تم نے ہر بار بہت کچھ دیا اسے آج تم صورت تک نہیں دکھانا چاہتے، اس طرح چھپ کر تو کنجوس آدمی بیٹھتے ہیں" غلام نے پرزہ لے جا کر عبداللہ کو دے دیا۔

عبداللہ نے پرزہ دیکھا۔ پھر دونوں تھیلیاں غلام کے حوالے کر دیں اور کہا " جا کر اصمعی کو دے آئے" غلام نے تھیلیاں لا کر اصمعی کو دے دیں۔ اصمعی کو بہت تعجب ہوا اور وہ دونوں تھیلیاں لے کر خلیفہ کے دربار میں پہنچا اور بولا " یہ خبر غلط ہے کہ عبداللہ دیوالیہ ہو گیا ہے۔" ابھی میں اس کے یہاں سے آ رہا ہوں اس نے مجھے اشرفیوں سے بھری دو تھیلیاں دی ہیں۔"

خلیفہ نے تھیلیاں اصمعی کے ہاتھ سے لے لیں دونوں ہتھیلیوں پر خزانے کی مہر لگی تھی ۔ یہ وہی تھیلیاں تھیں جو خلیفہ نے عبداللہ پر ترس کھاکر اُسے بھیجی تھیں کہ اپنے کھانے پینے کا سامان کرلے ۔

اب تو خلیفہ نے بھرے دربار میں کہا ۔" خدا کی قسم میں نے عبداللہ سے بڑا سخی نہیں دیکھا"۔ پھر اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا " عبداللہ کو بلاؤ "۔ وزیر نے عرض کیا اگر عبداللہ کو بھرے دربار میں بلایا جائے گا ۔ تو اُسے شرم محسوس ہوگی ۔ اس لیے آپ اس سے تنہائی میں ملیں اور اسے بلانے کو اصمعی کو بھیجیں کوئی دوسرا آدمی اسے بلانے جائے گا تو وہ اپنی بے عزّتی سمجھے گا "۔

وزیر کی یہ رائے خلیفہ کو پسند آئی ۔ اس نے اصمعی کو بھیجا اور عبداللہ کو عزّت کے ساتھ بلوایا ۔ جب دونوں دسترخوان پر کھانے بیٹھے تو خلیفہ نے کہا ۔" تم نے وہ اشرفیاں اصمعی کو دے دیں جو میں نے تمہارے لیے بھیجی تھیں ۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا اپنے اور اپنے بال بچوّں پر ظلم کیا "۔ عبداللہ نے کہا ۔" اے امیرالمومنین جو دروازے پر امید لے کر آئے اسے نا امید نہیں لوٹانا چاہیئے ۔ خدا ایسا کبھی نہیں کرتا یہی اس کا حکم بھی ہے "۔

خلیفہ نے اپنے خزانے سے بہت سا روپیہ عبداللہ کو دیا کہ پھر کاروبار کرے اور اپنی خواہش کے مطابق زندگی گذارے ۔ خدا کے فضل و کرم سے عبداللہ کا کاروبار پھر چمک اُٹھا ۔ اور پہلے ہی کی طرح اس نے اپنی ساری زندگی گذاری ۔

خلیفہ کہا کرتا تھا " عبداللہ جیسا سخی انسان میرا دوست ہے ۔ یہ میرے لیے بہت فخر کی بات ہے "۔



بقیہ ہنڈ کلھیا صہ ۳۴ سے

سامان :-

| | |
|---|---|
| ترئی کے چھلکے | ½ کلو |
| چنے کی دال | ۵۰ گرام |
| لہسن | ۸-۱۰ جوے |
| پیاز | درمیانی گانٹھ |
| مرچ سرخ | ۵ عدد |
| نمک | حسب منشا |
| دھنیا بھُنا ہوا | ۲ چمچہ چائے کے |
| زیرہ سفید بھُنا ہوا | ۱ " " کا |
| الائچی بڑی | ۲ عدد |
| لونگ | ۴ " |
| کالی مرچ | ۱۰-۱۲ " |
| پیاز | ایک بڑی گانٹھ |
| ہری مرچ | حسب منشا |
| ہرا دھنیا | " " |
| تیل یا گھی | " " |

ترکیب : ترئی کے چھلکے اچھی طرح دھو لیجیے اور چنے کی دال ، لہسن ، پیاز ، سرخ مرچ اور نمک ملاکر چھلکوں کو اُبال لیجیے چھلکے گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو اتار لیجیے ۔ دھنیا ، زیرہ بڑی الائچی ، لونگ کالی مرچیں ایک ساتھ پیس لیجیے اور پسے ہوئے چھلکوں میں اچھی طرح ملا لیجیے ساتھ ہی ہری مرچیں ، پیاز اور ہرا دھنیا باریک کتر کر ملا دیجیے اور حسب منشا ٹکیاں بناکر سرخ سرخ تل لیجیے ۔ اگر کسی کو گرم گرم کھلائیں گی تو اسے یہ تمیز کرنا مشکل ہوگا کہ کباب سچ مچ گوشت کے ہیں یا چھلکوں کے ۔

## آپ کا کام

یہ ہے کہ اپنے پیام تعلیم کو شروع سے آخر تک پڑھیے ۔ جو چیز آپ چاہتے ہیں اور اس میں موجود نہیں ہے تو ہمیں لکھیے ۔ ہم آپ کے مشوروں کی روشنی میں پیام تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے گی ۔

اپنے دوست احباب میں پیام تعلیم کا چرچا کیجیے ۔ ایسے دوستوں کے پتے بھیجیے جنھیں پیام تعلیم سے دلچسپی ہو پیام تعلیم کے خریدار بناکر ہماری مدد کیجیے اور اس طرح پرچے کو زیادہ خوبصورت اور زیادہ کار آمد بنانے میں ہماری مدد کیجیے ۔

جناب مفتوں کوٹوی

# اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

کاش اپنے ساتھیوں کے دلوں میں ہو یہ خیال
پڑھ لکھ کے ہم کو کرنا ہے پیدا کوئی کمال

ایسا کمال جس کی نہ دنیا میں ہو مثال
ناکامیوں کا ہو گا اسی جوش سے زوال

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

مہنگائی کے سبب ہے ہر اک سمت ہائے وائے
بچّوں کو دودھ۔ ہم کو میسّر نہیں ہے چائے

کپڑے، کتابیں، کاپیاں کوئی کہاں سے لائے
سستا اناج ہو تو مٹے سب کی ہائے ہائے

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

ہڑتالیں، اور فساد، یہ ہنگامے، شور شر
گھیراؤ، توڑ پھوڑ، یہ "بند" آتش و شرر

یہ نفع خوری، دھوکہ دہی، تو یہ، الحذر
پیدا ہو ایسے لوگوں کے دل میں خدا کا ڈر

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

گزرے یہ سال اپنا خدا کی پناہ میں — دل اہلِ ملک کا رہے بڑھنے کی چاہ میں
جو بھی قدم اٹھے وہ ترقی کی راہ میں — پورا ہو اپنا کام ہر اک واہ واہ میں

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

اپنی زبان پر نہ کبھی جھوٹ لائیں ہم — چھوٹے بڑے کے فرق کو یکسر مٹائیں ہم
آپس میں ربط و ضبط و محبت بڑھائیں ہم — نفرت سے بغض و کینہ سے دامن بچائیں ہم

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

بھولیں جو پچھلے سال ہوئیں، چھوڑ دیں انھیں — پاؤں جو پڑ رہے ہوں غلط موڑ دیں انھیں
جو رشتے ناطے ٹوٹ گئے جوڑ دیں انھیں — بڑھنے میں جو رکاوٹیں ہوں توڑ دیں انھیں

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

ہم کاش کامیاب ہوں ہر امتحان میں — راہیں ترقیوں کی رہیں اپنے دھیان میں
ہر سمت شہرت اپنی ہو دنیا جہان میں — ہم سے اضافہ اور ہو بھارت کی شان میں

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

چاہے مدد جو بڑھنے میں، اس کی مدد کریں — کرنے نہ دیں کسی کو نہ خود کار بد کریں
رکھیں نہ دشمنی نہ کسی سے حسد کریں — شائستگی سے رد کریں جو بات رد کریں

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

کرنا شرارتیں نہیں اچھا، خطا بھی ہے — حسن عمل بغیر کوئی کچھ پڑھا بھی ہے
اپنا بھلا بھی اس میں ہے سب کا بھلا بھی ہے — مفتوں کی آرزو بھی یہی ہے دعا بھی ہے

اللہ ہم سبھی کو مبارک کرے یہ سال

محترمہ آصفہ مجیب

# چند دن کشمیر میں

(۴)

سامان ہر قسم کا بھرا پڑا ہے۔ خریداروں کی کثرت ہے کشمیر کی بنی ہوئی چیزیں بھی ہیں۔ کشمیری صنعت کے کیا کہنے! دیکھ کر جی لوٹ ہو جائے۔ اخروٹ کی لکڑی پر ریشم اور پشمینے پر ہاتھ سے کتنا باریک کام کرتے ہیں۔ وہاں (کشمیر) کی پھول پتیوں کے نقش کاڑھتے بناتے ہیں۔ بہت دیدہ ریزی کرتے ہیں۔

سنا ہے پچھلے زمانے میں ایک شال دادا شروع کرتا تھا تو پوتا اسے ختم کرتا تھا۔ غرض بڑی محنت اور جان فشانی کرتے ہیں وہ ہوتی بھی ہیں ایسی نایاب کہ اب کم ہی نظر آتی ہیں۔ ایسی چیزیں آج کل کسی کو مل جائیں تو انھیں آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

۱۰۔ جون۔ جامعہ سے شمس صاحب بیوی بچوں سمیت آئے ہیں وہ بھی ملنے آئے۔ صاحب اور انس صاحب ان کے ساتھ اور میں گسٹ ہاؤس کے سامنے والی سڑک پر ٹہلنے آ گئی۔ سڑک کے دوسری طرف سامنے ہی بڑا سالان ہے اور چنار کے درخت جا بجا لگے ہیں میں موٹروں سے بچتی کنارے کنارے جانے لگی۔ گسٹ ہاؤس سے آگے ایک مکان کے پھاٹک سے ایک بچی دوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ یہ مقصودہ ہے۔ جو پہلے ملی تھی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ادھر ادھر سے کئی بچیاں اور ایک لڑکا جو سب میں بڑا تھا۔ آیا اور سلام کیا ظہور احمد نام بتایا میں نے پوچھا "پڑھتے ہو؟" اس نے بتایا چھٹے کلاس میں ہے۔ لڑکیوں کی طرف میں نے اشارہ کیا "اور یہ؟" اس نے جواب دیا: "ایک تیسری میں ہے ایک دوسری میں ہے" بڑی کا نام حسینہ اور چھوٹی کا غنیفہ بتایا۔ اور کچھ نام مجھے یاد نہیں رہے۔

کچھ بچیوں نے پیسے مانگے میں نے کہا "یہ بری بات ہے پیسہ نہ مانگو کرو" ظہور احمد نے ان سے کہا "ہاتھ ملاؤ" سب نے خوش ہو کر ہاتھ ملایا۔ میں خوش ہو کر بولی "ہاں یہ بہت اچھی بات ہے"

مقصودہ کی ماں اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لیے مسکراتی ہوئی گھر سے نکل آئی اور کہا "اس نے آپ کو بند ھ پر دیکھا تو یہاں دیکھتے ہی دوڑی اچھا چلو ہمارے یہاں چائے بنائے پیو" میں نے جواب دیا "مجھے جلد واپس جانا ہے" مجھے ان سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غریبوں میں بھی اب اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کا رواج ہو گیا ہے اور بچے اور بچیاں اردو اچھی بولتے ہیں۔ وہاں سے واپس آئی تو صاحب نے بتایا کہ کل شمس صاحب بوس (S oo Y) مرگ جا رہے ہیں۔ ہم لوگ بھی چلیں گے۔

۱۱۔ جون صبح صبح یوس مرگ جانے کی تیاری شروع

ہوئی۔ غنی صاحب نے کھانا ساتھ لے جانے کا انتظام کیا۔
سوا دس بجے روانہ ہوئے۔ چالیس میل کے قریب ہے۔
چڑھائی اور اتار ہے۔ راستہ کچھ اچھا نہیں۔ یوس مرگ
کے پاس ایک چشمہ جاری ہے۔ لمبا راستہ، گرمی کا وقت
طبیعت گھبرا گئی۔ لیکن وہاں پہنچ کر بڑا خوبصورت منظر
دیکھا۔ میلوں تک بڑا شاداب سبز میدان۔ کنارے کنارے
شمشاد کے درختوں کی قطار اور سبز سبز پہاڑ۔ شمس صاحب
ان کی بیوی اور دونوں بچے پہلے ٹورسٹ بس پر پہنچ گئے
وہ لوگ آگے بڑھ کر ہم سے ملے۔ ایک ہٹ (سیاحوں
کے ستانے اور آرام کرنے کے لیے مختصر سا مکان) بنا
ہے مسافروں کے آرام کے لیے دو پرائیویٹ ہٹ ہیں
جن میں پہلے سے لوگ ٹھہرے ہیں۔ لان میں جگہ جگہ چھتریاں
لگی ہیں جن کے نیچے لوگ کرسیوں پر یا کچھ فرش بچھائے
بیٹھے ہیں اور پکنک منا رہے ہیں۔

ہمارے مہربان غنی صاحب نے فوراً ہم لوگوں کے لیے
ایک کمرہ کھلوادیا۔ اور سب سامان وہاں لگادیا سری نگر
سے اونچا ہے اس لیے کافی ٹھنڈک ہے۔

یہاں گھوڑے بھی سواری کے لیے ملتے ہیں۔
ان پر تھوڑی دیر اور آگے لوگ سیر و تفریح کے لیے
لوگ جاتے ہیں۔ انس صاحب اور شمس صاحب اور ایک
خاتون جو ہندوستان سے آئی ہیں تینوں تھوڑی دیر کے
لیے گھوڑوں پر گھومنے گئے۔ صاحب کافی دور پیدل
گئے۔ مجھے سبزہ پر ٹہلنا بہت اچھا لگا۔ بہت اچھی سیر
اور تفریح رہی کھانا کھا کر ذرا دیر آرام کر لیا اور چائے
کے بعد واپس ہوئے۔ راستہ میں کچھ بزرگوں کے مزارات
کی زیارت کی۔ ہندو مسلمان سب مانتے ہیں اور رشی
اور منی کے نام بھی ہیں مزار سے وغیرہ کی جالیوں پر
اور کہیں جگہ منتوں کے اونی تاگے بندھے ہیں۔

۱۴۔ جون۔ آج آغا اشرف صاحب کے یہاں
گئے۔ صاحب وہاں ٹھہر گئے۔ میں صوفیہ اشرف کے ساتھ
کالج کی لائبریری سے کچھ کتابیں اور رسالے لینے گئی۔
دہلی سے ایک دو جو لائی تھی وہ پڑھ لی اور اب کچھ
پڑھنے کو نہیں تھا۔

پرنسپل صاحب کے کمرے میں گئی وہ موجود تھے
صوفیہ بیگم نے میرا تعارف کرایا اور کتابوں کے لیے کہا،
انھوں نے لائبریرین کو بلوا کر کتابیں منگوائیں۔ میں نے
چند منتخب کیں۔ ایک کرشن چندر کی تھی اور دو رسالے
ایک "آجکل"، جس میں قرۃ العین حیدر کا مسلسل ناول
چھپ رہا ہے۔ "کار جہاں دراز ہے"

لائبریرین صاحب نے فرمایا۔ "مجھے تو اب بھی سب
سے زیادہ پریم چند کی کتابیں پسند ہیں۔ آپ کہیں
تو لے آؤں؟"

میں نے کہا "جی ہاں مجھے بھی بہت پسند ہیں"
انھوں نے کہا۔ "آپ چاہیں تو لائبریری دیکھیں"
لیکن اب دیر ہو رہی تھی۔ صوفیہ بیگم کے ٹیچرس ٹریننگ
کالج جانے کا وقت تھا میں نے کتابیں لے کر لائبریرین صاحب
کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا "یہ تو میرا فرض ہے"
صوفیہ بیگم کو اتار کر میں اور انس صاحب آغا صاحب کے
یہاں آئے وہاں سے صاحب کے ساتھ گسٹ ہاؤس
آ گئے۔ شام کو بھیا کے ساتھ ڈل گیٹ کی سیر کی
اور "ا مدو" رسٹورنٹ میں چائے پی۔

دوسرے دن بھیا اور لالہ دونوں بھائی آئے
بھیا، صاحب کے پاس ٹھہرے ہیں اور انس صاحب
لالہ کے ساتھ خریداری کرنے آئے۔ لالہ کو یہاں کی خاص

عنبر دکانیں معلوم ہیں وہیں لے گئے۔ ایک شال کی
ی دکان پر آئے۔ شالیں دیکھنے لگے۔ دکاندار نے
وچھا "آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے"۔ انھیں بتایا گیا
لمہ دہلی سے۔ اور صاحب جامعہ کے وائس چانسلر ہیں تو
نھوں نے کہا "تب تو ہمیں داموں میں ضرور رعایت کرنی
ہوگی" اور جو ہم نے پسند کیا مقررہ داموں سے انھوں
نے اس میں اچھی خاصی کمی کی۔

## کُکر ناگ :-

۱۶۔ جون صبح کو آغا اشرف صاحب آئے دیر تک
ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں کرتے رہے دوسرے دن
انھوں نے کُکر ناگ جانے کا پروگرام بنایا اور کہا "میں تو
بہت مصروف ہوں بھیا اور چھوٹی لڑکی آپ لوگوں کے
ساتھ جائے گی" ہم لوگوں کو اس تجویز سے بہت خوشی
ہوئی۔ صبح صبح جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بھیّا
چھوٹی بہن کو لے کر آ گئے۔ صاحب بھیّا کے آنے سے
بہت خوش ہوئے اس سے انھیں بہت انس ہے۔ پچھلے
سال بھی انھوں نے اس کے ساتھ خوب سیر کی تھی۔ غنی
نے کھانا ساتھ لیا اور سب موٹر میں روانہ ہوئے۔
کُکر ناگ سری نگر سے پچاس میل ہے اور اونچائی
پر سے راستہ خوبصورت ہے۔ قریب پہنچ کر چشمہ ساتھ ساتھ
میلوں تک راگ گاتا چلا جاتا ہے۔ بھیا نے فیض اور
غالب کی غزلیں سنائیں اور

"چھا گئی اودی گھٹا میرا مورا لہرائے ہے"
سن ری کوئل باؤلی تو کیوں ملارین گائے ہے

گایا جو اس نے بیگم اختر سے سنا تھا۔
کچھ بھول گیا مجھے جو یاد تھا میں نے بتایا۔

"آپ پپیہا تو ادھر آم پر کیوں جھوم رہا۔ میں بھی سراپا نغمہ ہوں
فرق اتنا ہے کہ اس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے"

چھوٹی بہن اس کے ساتھ تانے لگانے لگی۔ اور کچھ
فلمی گانے اور گیت گاتی رہی اس کا کہیں کہیں سریلی آواز
سے بھائی کے ساتھ تانیں لگانا آواز ملا کر گیت گانا بہت
اچھا لگا اور خوب ہنسی بھی آئی۔ راستہ بہت دلچسپی سے
گزرا۔ راستے میں گاؤں اور قصبے پڑے۔ یونیفارم پہنے
بچے" اور بچیاں اسکول جاتی اور آتی ہوئیں۔ لہلہاتے
ہوئے دھانوں کے کھیت۔ سیب، ناسپاتی، اخروٹ
اور بادام کے باغات بادام اور اخروٹ ابھی بالکل کچے"
ہیں ہرے ہرے۔

کُکر ناگ میں ایک ڈاک بنگلے میں اُترے بہت پر فضا
جگہ ہے۔ یہاں چشمہ بالکل قریب ہے۔ بہت چوڑا اور
اس کی کئی شاخیں ہیں جو دور تک چلی گئی ہیں۔ پانی زور شور
سے پتھروں سے ٹکراتا بل کھاتا موجیں مارتا ہے۔ بہت
لوگ یہاں کا منظر دیکھنے آتے ہیں۔ کچھ چشمے کے پاس ہیں
کچھ ٹولیاں ادھر اُدھر باغ میں کہیں کرسیوں پر کہیں سبزے
پر بیٹھی ہیں اور چل پھر رہی ہیں۔ کہیں کھانا ہو رہا ہے۔
کچھ لوگ ہٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کئی
دن سے ٹھہرے ہیں۔ کپڑے دھو کر سکھا رہے ہیں۔
میں چشمہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی پانی میں ہاتھ ڈال
دیا۔ لہروں کو چھونا کتنا اچھا لگتا ہے۔ دل میں آنند کی
لہریں اور شانتی سی پیدا ہوتی ہے جی چاہتا ہے گھنٹوں
بیٹھی رہوں۔ صاحب اور انس، صاحب اور بھیا تو دور
تک چشمے کے ساتھ ساتھ چلے گئے اور چھوٹی بٹیا جب
واپس آئی تو دیکھا کہ شلوار سب بھیگی ہے وہ کہیں پر
چشمہ کے اندر گئی اور اسے پار کیا۔

ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر سبحی صاحب بھی آئے ہیں
کھانے کے بعد صاحب ان کے پاس جاکر بیٹھے اور کئی لوگ
اور خواتین صاحب کے ساتھ ہیں۔ میں کمرے میں آرام کرنے
لیٹی اتنے میں لگ بھگ ایک یا دو سال کی پھول سی بچی میرے
پلنگ کے پاس آئی۔ میں نے پاس بلا کر پیار کیا۔ ایک دو چکر
لگا کر بھاگ گئی، اور پھر میرے پاس آکر لیٹ گئی میں پیار سے
اسے تھپکنے لگی۔ پھر خیال آیا کہ نہ معلوم کس کی بچی ہے وہ اسے
تلاش نہ کرتا ہو۔ ذرا دیر میں وہ خود اٹھی تو میں باہر برآمدے
میں نکل کر دیکھنے لگی دو تین خواتین اس بچی کو لیے میرے
کمرے میں آئیں۔ ہم نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف
کرایا۔ ایک ان میں سے سبحی صاحب کی بیٹی اس بچی کی ماں
تھیں میں نے ان سے کہا یہ میرے پاس لیٹی رہی تو میں
سوچ رہی تھی کہ اسے کوئی تلاش نہ کر رہا ہو۔ وہ مسکرائیں
اور بولیں "جی ہاں میں اسے دیکھ رہی تھی کہ یہ آپ کے
کمرے میں آئی ہے۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔

سبحی صاحب مجھے دیکھ کر آگے بڑھے۔ میں نے
کہا "یہ بڑی اچھی جگہ ہے" انھوں نے فرمایا "جی
ہاں میں نے مجیب صاحب سے کہا ہے کہ یہاں انتظام
کروا کے دو چار روز قیام کریں" جی تو ایسا ہی چاہتے
تھے۔ کہ یہاں ابھی رہیں۔ لیکن شام کو واپس آئے۔
ایک ملک میں اتنی دور دراز جگہ جانے آنے میں بہت
تکان محسوس ہوئی ہم سب کا یہ احساس تھا لیکن مجیب
صاحب یہ ماننے پر تیار نہیں ہوئے کہ وہ تھک گئے
ہیں۔ تھکنے کا تو وہ کبھی نام ہی نہیں لیتے نہ اس کا
احساس ہوتا ہے۔ اتنی بیماری کمزوری کے باوجود
اس عمر میں اتنی ہمت، شوق اور کام کرنے کی تڑپ
ایسی نادر مثال ہے جو کٹھنائیوں اور دشواریوں میں
مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے دوسروں میں حوصلہ پیدا کرتی ہے

غم لا انتہا سعی مسلسل شوق بے پایاں
مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں (ڈاکٹر گوہر)

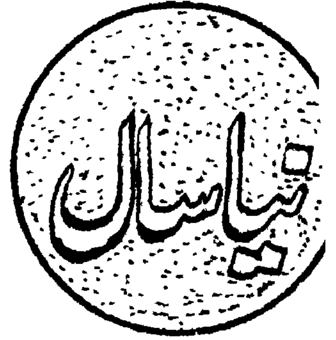
---

جناب مومن خاں شوق

# غزل

دو خبر اس کی آمد کی تارو
صبح سے پہلے ہم کو پکارو
انتہا تک کیے جاؤ کوشش
ابتدا ہی میں ہمت نہ ہارو
نام اونچا وطن کا ہے کرنا
رہنا آپس میں مل جل کے پیارو
زندگی کا یہ گلشن ہے اس کو
خوبصورت گلوں سے سنوارو
زندگانی ہے یہ چار دن کی
شوق ہنس ہنس کے اس کو گزارو

جناب شوکت پردیسی



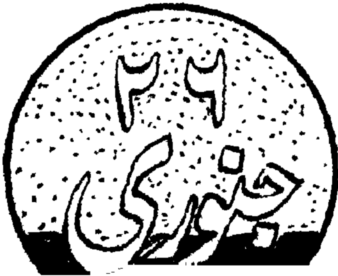

نئے حوصلے ہیں، ارادے نئے ہیں
نئی ہے تمنا، تقاضے نئے ہیں
نئی ساری باتیں، نئی ساری کایا
نئی صبح لے کر، نیا سال آیا

ہوا ہم سے رخصت تہتّر کا ہر پل
دکھا کر گیا سال بھر اپنا کس بل
کہیں بھی نہیں اب رہا اس کا سایا
نئی صبح لے کر نیا سال آیا

نئے عزم کے ساتھ اب تم بھی جاگو
کرو دل سے محنت، کتابیں سنبھالو
وہ پیچھے رہا جو ذرا ہچکچایا
نئی صبح لے کر، نیا سال آیا

---

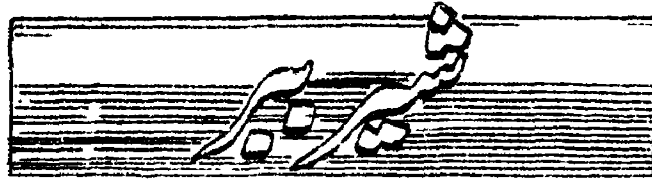
جناب روشن علی روشن




الم مٹاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی خوشی مناؤ کہ ۲۶ جنوری آئی
ترقیوں کی چمکتی ہوئی سحر بنکر جہاں پہ چھاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی
مہکتا ہی رہے خوشبو سے جس کی ہر گوشہ وہ گل کھلاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی
گراں ہے جن کے لیے زندگی کا بار گراں انھیں اٹھاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی
وطن پرستی کا جذبہ ہر ایک دل میں اٹھے بگل بجاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی
جوانو پرچم جمہور کو اٹھاتے ہوئے قدم بڑھاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی
جو اپنی راہ ترقی میں کانٹے بوتے ہیں انھیں ہٹاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی

خدا کا شکر کہ روشن ہے نیّر جمہور
اب اٹھ بھی جاؤ کہ ۲۶ جنوری آئی

ناوک حمزہ پوری




# ہمارا قومی جانور

شیر ببر ہندوستان کا قومی جانور ہے۔ لوگ اُسے "جنگل کا راجہ" یا "بن راج" کہتے آئے ہیں۔ اس کی بے پناہ طاقت، بے مثال بہادری اور بے خوفی۔ لاثانی چستی اور پھرتی۔ شاہانہ چال ڈھال اور رعب دار رنگ روپ کی وجہ سے "بن راج" کا خطاب اس پر پھبتا ہے زیب دیتا ہے۔

اسے سنسکرت میں سِنہا (सिंह) اور کیسری، فارسی ہندی اور اُردو میں شیر عربی میں اسد۔ گجراتی میں "اونٹیایا گھر" اور کاٹھیاواڑی میں "ساوج" کہتے ہیں۔

ہندوستان میں ویدوں کے زمانے سے شیر کا ذکر ملتا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ اُس زمانے سے پہلے ہی سے یہاں موجود تھا۔ والمیکی کی رامائن میں بھی چترکوٹ کے جنگل میں شیر کی موجودگی کا ذکر ہے۔ سنسکرت کے مشہور شاعر کالیداس نے بھی اپنی تخلیقات میں شیروں کا ذکر کیا ہے۔

ہندو بھائیوں کے عقیدے کے مطابق یہ "دیوی درگا" کی سواری ہے۔ زمانۂ قدیم میں مندروں کے پھاٹک پر شیروں کی مورتی بنانے کا رواج تھا۔ اس طرح یہ مندر (دھرم) کے دربان یا نگہبان بھی ہوئے۔ دیوی درگا بھی اس پر سوار ہو کر ظلم کے خلاف جنگ کرتی تھیں۔

کہتے ہیں شیر کا اصلی وطن یورپ ہے۔ یورپ کے زیادہ ملکوں میں یہ تاریخی زمانہ سے پہلے ہی پائے جاتے تھے۔ یورپ سے ہی یہ شمالی مغربی ایشیا اور ایشیا سے دھیرے دھیرے افریقہ تک پھیل گئے۔

ہندوستان میں مغربی شمالی دروں سے داخل ہوئے اور ملک کے شمالی اور وسطی حصے میں پھیل گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہ مالوہ۔ سہارنپور روہیل کھنڈ اور پوربندر کے علاقے میں پائے جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے اب ان کی نسل ختم ہوتی جا رہی ہے اور ہندوستان میں اب یہ صرف گجرات کے "گیر" نامی محفوظ جنگل میں رہ گئے ہیں۔

اس وقت دنیا میں دو نسلوں کے شیر پائے جاتے ہیں۔ ایک کو "پینتھیرا لیو لیو پرسیکا" کہلاتی ہے۔ اسی نسل کے شیر "افریقہ" میں ہیں۔

دوسری نسل "پینتھیرا لیو پرسیکا" کہلاتی ہے اسی نسل کے شیر "گیر" میں ہیں۔ ان کے ایال چھوٹے، دم کے سرے پر بالوں کا لمبا گچھا، کھال بھری ہوتی ہے، پیٹ پر جھالر ہوتی ہے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ساڑھے نو فٹ ہوتی ہے۔

افریقی شیر کے ایال لمبے اور گھنے ہوتے ہیں

دُم کا گچھا چھوٹا، پیٹ پر بال کم اور کھال نسبتاً کم بھری ہوتی ہے۔ لیکن یہ ساڑھے دس فٹ تک لمبے ہوتے ہیں۔ شیروں کی لمبائی کی پیمائش دُم کے سرے سے لے کر ناک تک کی جاتی ہے۔ آج تک سب سے لمبا شیر لگ بھگ سوا تین میٹر (۳٫۲۲۸) کا پایا گیا ہے۔

مادہ قد و قامت میں نر سے چھوٹی ہوتی ہے نر کے سر اور کندھے پر ایال ہوتے ہیں۔ مادہ اور بچّوں کے ایال نہیں ہوتے۔ شیر کا رنگ سرخی مائل زرد ہوتا ہے اس کی کھال کا رنگ اونٹ کی کھال کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔

گوشت خور جانور ہونے کی وجہ سے قدرت نے اس کی جسمانی بناوٹ ایسی رکھی ہے کہ اسے شکار پر حملہ کرنے، جھپٹنے، پکڑنے۔ جکڑنے، گوشت نوچنے اور کاٹنے میں آسانی ہو، ان کاموں میں وہ اپنے طاقتور پنجوں، نکیلے اور تیز دانتوں اور مضبوط جبڑوں سے مدد لیتا ہے۔ کل ملا کر اس کے ۲۶ دانت ہوتے ہیں۔ دانتوں کی بناوٹ بلّی کے دانتوں جیسی ہوتی ہے۔

آواز کے بغیر دبک کر شکار کا پیچھا کرنے کے لیے اس کے پاؤں اور پنجوں کی بناوٹ بھی خاص طرح کی ہوتی ہے۔ پاؤں کے تلوے گدّی دار ہوتے ہیں۔ پنجوں کے ناخن ایک طرح کی جھلی دار خول میں بند رہتے ہیں۔ حملہ کرتے وقت یا جب ضرورت محسوس ہو وہ انھیں نکال لیتا ہے۔ ناخن نکیلے اور خم دار ہوتے ہیں۔ کل اٹھارہ ناخن ہوتے ہیں۔ اگلے پنجوں میں پانچ پانچ اور پچھلے میں چار چار۔

عموماً یہ رات کو شکار کرتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں دیکھنے کے لیے اس کی آنکھوں کی بناوٹ بھی خاص طرح کی ہے۔ اس کی بینائی کی قوت بھی بہت تیز ہوتی ہے یہ سننے اور سونگھنے کی بھی زبردست قوت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ صرف آواز یا بو پاکر ہی شکار پر جا ٹوٹتا ہے۔ یہ بہت عقل مند اور سمجھ دار بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر شیر درختوں پر نہیں چڑھتے۔

شیر جماعتی زندگی گزارنے کا عادی ہوتا ہے۔ یہ جہاں رہتا ہے اپنے پورے خاندان کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک خاندان میں نر مادہ اور بچّوں کو ملا کر بارہ[۱۲] پندرہ[۱۵] شیر ہوتے ہیں۔ شکار کے لیے نکلنے سے پہلے یہ گرجتا ہے تاکہ خاندان کے سبھی شیر اکٹھا ہو جائیں اسی طرح شکار سے واپسی کے وقت بھی گرجتا ہے تاکہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے شیر بکھرا اپنی جگہ واپس آ جائیں۔

شیر آپس میں بڑی محبت کرتے ہیں۔ ماں باپ اور بچّوں میں بڑا پیار ہوتا ہے۔ یہ اپنے بچّوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے خوراک مہیّا کرتے ہیں۔

ان کی شادی (جوڑا بنانے) کا کوئی خاص موسم نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی موسم میں یہ جوڑا بنا لیتے ہیں کبھی کبھی ایک دلھن (شیرنی) کے لیے دو یا دو سے زیادہ دولھوں (نروں) میں جم کر لڑائی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد یہ کسی تنہا جگہ پر ہنی مون منانے چلے جاتے ہیں اور اس موقع پر لگ بھگ ایک ہفتہ تک پیار اور محبت میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ کھانے پینے کی بھی سدھ نہیں رہتی۔

حاملہ ہونے کے ایک سو سولہ (۱۱۶) دن بعد مادہ
جنتی ہے۔ بچے جننے کے لیے یہ کسی تنہا اور الگ تھلگ
م کی تلاش کرتی ہے۔ عام طور سے درختوں کے جھرمٹ
یسی صاف ستھری جگہ کا انتخاب کرتی ہے۔ جہاں دوسرے
نوروں کی آمد و رفت نہ ہو یا کم ہو۔ عموماً ایک بار میں دو بچوں
جنم دیتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ تعداد پانچ تک پہنچ
پاتی ہے۔

نوزائیدہ بچوں کی کھال پر گلدار کی طرح پہلے گول
ول نشان ہوتے ہیں جو بعد میں دھاریوں کی شکل
یں بدل جاتے ہیں۔ یہ دھاریاں بھی چھ سات مہینوں
عمر ہوتے ہوتے مٹ جاتی ہیں۔

لی کے بچوں کی طرح شیرنی کے بچوں کی آنکھیں پیدائش
ے وقت بند ہوتی ہیں۔ عموماً پانچ سے سات دنوں میں
نکھیں کھلتی ہیں۔ بچوں کی پرورش اور پرداخت ماں
رتی ہے۔ انھیں چاٹنا صاف کرنا، کھسکتے کھسکتے دور
چلے جائیں تو انھیں واپس اپنی جگہ پر لانا اسی کا کام ہے۔

بچے اکیلے چھوٹ جانے پر یا بھوک لگنے پر یا اور
سی وجہ سے چلّا چلّا کر ماں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔
چھوٹے بچے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ بچہ جننے کے بعد دس
پندرہ دنوں تک مادہ ہر وقت ان کے پاس رہتی ہے۔

ابتدائی دنوں میں بچے صرف ماں کے دودھ پر
رہتے ہیں۔ پانچ سات دنوں کے بعد ماں اپنا کھایا
ہوا گوشت ان کے سامنے اُگل دیتی ہے اور اسی کو
وہ کھاتے ہیں۔ پندرہ بیس دنوں کی عمر ہو جانے
پر وہ خود بھی کچے گوشت پر منہ مارنے لگتے ہیں۔

ایک ماہ کی عمر ہو جانے پر ماں کے ساتھ ایک
آدھ میل کے سیر سپاٹے کو بھی نکلتے ہیں۔ تین ماہ
کے ہو جانے پر ماں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ آنے جانے
لگتے ہیں۔ اسی عمر سے ماں انھیں شکار کرنے کی تربیت
دیتی ہے۔ کچھ اور بڑا ہو جانے پر ماں کی نگرانی
میں یہ خود شکار کرتے ہیں۔ پانچ سال کی عمر ہونے پر
نر جوان ہوتا ہے اور ڈھائی برس سے تین سال میں مادہ۔

چیتل، سانبھر، اور جنگلی سوّر کا گوشت شیر کا
من بھاتا کھاجا ہے۔ اس کی خوراک بہت زیادہ ہوتی
ہے۔ شکار مل جانے پر ڈٹ کر کھاتا ہے نہ ملنے پر کئی
کئی دن تک بھوکا بھی رہ جاتا ہے۔

شکار کی تلاش میں کبھی کبھی یہ راتوں رات چالیس
پچاس میل کا چکر کاٹ کر صبح ہوتے ہوتے اپنی جگہ
واپس چلا آتا ہے۔ جنگل میں ہر گروہ یا خاندان کا
اپنا اپنا الگ الگ علاقہ ہوتا ہے۔ ایک گروہ کے
علاقے میں دوسرا گروہ عام طور سے دخل اندازی
نہیں کرتا۔

شکار کے لیے یہ اکثر "ہانکے" کا طریقہ
اپناتے ہیں۔ شیرنی ایک طرف گھات لگا کے بیٹھ
جاتی ہے اور خاندان کے بقیہ شیر چاروں
طرف سے گھیرا بنا کے بڑھتے ہیں۔ ان کے ڈر سے
جانور اسی طرف بھاگ نکلتے ہیں جدھر شیرنی
گھات میں بیٹھی ہوتی ہے۔ بس وہ اس ابھاگے
جانور کو دبوچ لیتی ہے۔

شیر عام طور سے پالتو جانوروں کے چرتے
ہوئے جھنڈ پر نہیں ٹوٹتے۔ ہاں کوئی جانور
بھٹک کر تنہا رہ جائے یا وہ بہت بھوکے ہوں
تو بات دوسری ہے۔ بوڑھے شیر پالتو جانوروں
اور آدمیوں کو بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔

ایک بار آدمی کے گوشت کی چاٹ لگ جانے پر یہ بہت خطرناک ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپے میں ان کے دانت گر جاتے ہیں۔

بوڑھے شیر دوسرے شیروں کے بچے کھچے شکار پر ہی گذر بسر کرتے ہیں اور اکثر بھوک کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ بھوک کے علاوہ بیماریوں اور حادثوں کا شکار ہو کر بھی مرتے ہیں۔ شیر کی عمر تیس سال ہوتی ہے۔

شیر کی کھال، ناخن، وڈ ہڈی اور چربی بہت قیمتی ہوتی ہے۔ ایک تندرست شیر کے جسم سے دس کلو تک چربی نکلتی ہے۔ اور اس کے دام دس روپے فی تولہ تک ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کا ناخن بھی آٹھ نو روپے فی تنگ کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔

---

بقیہ بچوں کی انجمن ۲۵ سے

ممبر کورس کی پرانی (سکنڈ ہینڈ) کتابیں پرانے یا استعمال شدہ کپڑے جمع کر کے غریب طالب علموں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہی نہیں محنت مزدوری کر کے اور دوسرے ذریعوں سے وہ ان غریب خاندانوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمس)

ابھی تیس چالیس سال پہلے کی بات ہے پیام تعلیم نے بھی "پیام برادری" کے نام سے ایک انجمن یا برادری قائم کی تھی۔ اس نے خوب ترقی کی حیدرآباد، کشمیر، پنجاب، یوپی وغیرہ میں جگہ جگہ اس کی شاخیں کھل گئیں۔ اس زمانے کے پیامیوں کو جو خیر سے اب گھر بار کے ہو گئے ہوں گے۔ شاید یہ پرانی باتیں یاد بھی ہوں۔ لیکن ۴۷ء کے انقلاب کے بعد یہ سب باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔

★



جناب منہاج احمد رہبر جونپوری

# سالِ نو

(کے موقع پر پیامِ تعلیم کے نونہالوں سے خطاب)

یہ سالِ نو، یہ طرب یہ خوشی مبارک ہو
رواں دواں قدمِ زندگی مبارک ہو

تمہارا نام اُجاگر ہو چاند تاروں میں
سدا قیام کرو تم حسین بہاروں میں

تمہارا ذہن تمہارا دماغ ہو روشن
متاعِ علم و ہُنر سے بھرا رہے دامن

جواں ہو کے کرو ملک و قوم کی خدمت
خلوص و ربط و محبت تمھاری ہو عادت

خدا کرے تمھیں راس اس طرح شباب آئے
تمھارے فیض سے دُنیا میں انقلاب آئے

قدم اُٹھے جو تمھارا وہ فاتحانہ ہو
تمھارا حُسنِ عمل مشعلِ زمانہ ہو

وفا شعار بنو مردِ پاکباز بنو
نقیبِ امن زمانے کے چارہ ساز بنو

کرو گریز ہر اک شر، ہر اک بُرائی سے
بچو ہمیشہ زمانے میں خُود نمائی سے

خدا کی ذات پہ کامل یقیں تمھارا ہو
جو سربلند ہے جگ میں وہ دیں تمھارا ہو

دعا ہے میری زمانے میں شادکام رہو
ترقیات کی راہوں میں تیز گام رہو

جہانِ زیست میں اک عزمِ باثبات ملے
خدا کرے کہ تمھیں خضر کی حیات ملے

# جوڑی سلامت رہے

جناب محمد حسین اعظمی

دیپک اور شکیل پانچویں جماعت میں پڑھتے
دونوں ایک ہی بنچ پر ایک ساتھ بیٹھتے تھے
ںوں میں گہری دوستی تھی۔ ایک کو دوسرے
بغیر چین نہ آتا تھا۔ دیپک اسکول نہ آتا تو شکیل
س بیٹھا رہتا اور جب کبھی شکیل نہ آتا تو یہی حالت
یپک کی ہوتی۔

دونوں کے گھر بھی ایک دوسرے سے زیادہ
ور نہیں تھے۔ ان دونوں کے درمیان فرق یہ تھا
دیپک کے گھر کی مالی حالت بہت اچھی تھی
س کے پتا کنہیا لال گاؤں کے کسانوں سے سستے
بھاؤ اناج خریدتے اور شہر میں نفع سے بیچ ڈالتے۔
مگر شکیل یتیم تھا۔ اس کے والد کو دنیا سے گذرے
دو سال بیت چکے تھے۔ اس کی سرپرستی اس کی
والدہ کے سر آپڑی تھی۔ تھوڑی سی کھیتی باڑی تھی۔
اسی تھوڑی آمدنی میں اس کی والدہ کسی نہ کسی طرح
گھر کا خرچ پورا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ پڑوسیوں
کے گھر جا کر ان کے کام میں ہاتھ بٹا دیتی تھیں اس
لیے ہر مہینے کوئی نہ کوئی پڑوسی شکیل کی فیس
ادا کر دیا کرتا تھا۔

ایک دن شکیل کی والدہ کو بخار آگیا۔ ڈاکٹر
سے علاج کے لیے پیسے کہاں سے آتے گھر میں
صرف ایک روپے کا نوٹ تھا۔ اس ایک روپے
میں شکیل کیا کرتا۔ وہ کچھ دیسی دوائیں خرید لایا جو بستی
ہی میں مل گئیں۔ یہ دیسی دوائیں کئی دن استعمال کرائی گئیں
مگر بخار کی شدت کم نہ ہوئی۔ انھی الجھنوں کی بنا پر شکیل
کئی روز اسکول نہیں گیا۔ ماں کی تیمارداری میں لگا رہا۔

شکیل کی غیر حاضری سے دیپک کا دل اسکول میں
نہیں لگ رہا تھا۔ وہ شکیل سے ملنے اس کے گھر آیا۔
دیپک شکیل کی ماں کی حالت دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوا اور
شکیل سے پوچھا۔ "کسی ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے؟"
شکیل نے نفی میں جواب دیا۔ پھر دیپک نے بڑے تعجب
سے پوچھا۔ "آخر کسی ڈاکٹر کو دکھلانا تو چاہیے؟"

"علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں دیپک!" شکیل نے
بہت رک رک کر یہ بات کہی۔ جیسے زبردستی، کوئی اس
کے منہ سے کہلوا رہا ہو۔

یہ سنتے ہی دیپک گہرے رنج میں ڈوب گیا پھر کچھ ہی
دیر میں اس نے اپنا ایک ہاتھ شکیل کے شانے میں رکھتے
ہوئے کہا۔ "جاؤ شکیل ڈاکٹر کو بلا لاؤ، علاج کی ذمہ داری
مجھ پر چھوڑ دو۔"

"نہیں دیپک، تم بھلا کہاں سے روپے لاؤ گے؟
کہیں تمھارے پتا جی .......!" شکیل نے بڑے دھیمے
لہجے میں کہا۔

دیپک نے شکیل کی بات کاٹتے ہوئے پھر زور دیا
"تم کچھ فکر مت کرو شکیل، جاؤ ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔"

اِدھر دیپک اپنے گھر پہنچا۔ چُپ کے سے اپنے
بے کے تمام پیسے نکالے یہ اس نے روزانہ بیس بیس
پیسے کرکے جمع کیے تھے۔ گنا تو پندرہ روپے تھے گھر
یں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور پھر وہ سیدھا
شکیل کے گھر پہنچا۔

یہاں ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔ انھوں نے شکیل
کی والدہ کو دوائیں دیں اور جب جانے لگے تو دیپک نے
ان کا بیگ اپنے ہاتھ میں لیا اور اُن کے پیچھے ہولیا۔
ڈسپنسری پہنچ کر اس نے ڈاکٹر سے فیس اور دوا
کے دام پوچھے۔ اپنی جیب سے ریزگاری نکالی اور گن کر
سات روپے ڈاکٹر کو ادا کیے اور پھر وہاں سے شکیل
کے گھر کا رُخ کیا۔

دیپک بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ شکیل کی ماں دیپک
کو دل سے دعائیں دے رہی تھی۔ وہ اپنے گھر جانے
لگا تو بچے ہوئے پیسے شکیل کو دینے لگا۔ ساتھ ہی
ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر اور پیسوں کی ضرورت ہوگی تو
انتظام ہو جائے گا۔ شکیل ان پیسوں کو نہیں لے
رہا تھا مگر دیپک نہ مانا اور زبردستی یہ رقم شکیل کی
جیب میں ڈال دی۔

دیپک کے جانے کے بعد شکیل اپنی ماں سے کہنے
لگا۔

"ماں، دیپک کتنا اچھا ہے۔ میرا بہت گہرا
دوست ہے۔ دیکھا ماں، میری ہر پریشانی میں وہ
میرا ساتھ دیتا ہے۔ اُس پر بھی اگر کوئی مصیبت
آئے گی تو میں بھی اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔"

بیٹے کے جذبات سے متاثر ہوتے ہوئے
ماں نے کہا۔

"بیٹا، میری یہی دعا ہے کہ تم اور دیپک میں
سدا اسی طرح دوستی قائم رہے۔ تم دونوں پھلو پھولو اللہ
عمر دراز کرے۔"

پورے دن دیپک کی وفاداری کی باتیں ہوتی
رہیں۔ شام تک بخار کی شدّت بہت کم ہوگئی تھی
شکیل نے چائے اور بسکٹ ماں کو کھلائے۔ رات
کافی گذر چکی تھی۔ باتیں کرتے کرتے ماں سوگئی۔ شکیل
بھی اپنے بستر پر آلیٹا۔ کچھ دیر تک تو اپنے اور
دیپک کے بارے میں سوچتا رہا پھر اُس کی آنکھیں
بوجھل ہونا شروع ہوگئیں اور وہ سوگیا۔

جب صبح ہوئی تو شکیل اپنی ماں کے پاس گیا اور
نبض دیکھی۔ اب بخار بالکل نہیں تھا۔ اس نے چائے
وغیرہ تیار کرکے ماں کو دی، خود بھی ناشتہ کیا۔ اُس کے
بعد اُس نے اسکول کی کتابیں سنبھالیں اور دیپک کے
گھر کا رُخ کیا۔

اس کے پہنچتے ہی دیپک نے اُس کی ماں کی کیفیت
دریافت کی۔ دیپک کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی
کہ شکیل کی ماں کا بخار اتر گیا۔ پھر دیپک نے شکیل کو
ایک کمرے میں بٹھا دیا اور خود اپنے پتاجی کے پاس
دوسرے کمرے میں گیا۔ اور پتاجی سے کہنے لگا۔

"پتاجی میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں،
کیا آپ پورا کریں گے؟"

"کہو بیٹا، کیا بات ہے" کنہیا لال نے بڑے
پیار سے پوچھا۔

دیپک نے سمجھا کہ اب بات بن جائے گی۔ اُس
نے بڑے ادب سے عرض کیا۔

"پتاجی بات یہ ہے کہ میرا سب سے گہرا دوست شکیل
اس کے پتا اس سنسار میں نہیں ہیں اس کے گھر کی
ت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ اس کی فیس کا ذمّہ
لیجیے!"

کنہیا لال کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ جھنجلا کر بولے:
"بٹیا، ان سب چکروں میں مت پڑو، جی لگا کر
و۔ ایسے نہ جانے کتنے ہوں گے کیا ہم سب کی
ں بھرتے بیٹھیں؟ تمھیں تو مسلمان لڑکوں سے زیادہ
تی ہی نہیں کرنی چاہیے۔ چلو جاؤ اسکول کا وقت
یا ہے۔"

اپنے پتا کی باتیں سن کر دیپک بالکل اداس ہو گیا
پھر اس کمرے میں گیا جہاں شکیل بیٹھا ہوا تھا۔
ونوں اسکول کے لیے روانہ ہوئے۔ شکیل نے بھی
یپک کے پتا کی باتیں سن لی تھیں۔ راستے میں اس
دیپک سے کہا۔ "بھلا تمھیں کیا ضرورت تھی اِن
ں کو اپنے پتاجی سے کہنے کی؟"

"دوست، اگر میرے پتاجی میری بات کو نہیں مانتے
نہ مانیں میں ہر مہینے اپنا ڈبّا خالی کر کے تمھاری فیس ادا
دیا کروں گا!" دیپک نے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے
سکول کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ دیپک کے دل
ں یہ خیال آیا کہ اس کے پتا نے کہا تھا "تم مسلمان
ڑکے سے ........!" اس نے فوراً ہی اس خیال
و دل سے نکال پھینکا اور بڑے جذبے کے ساتھ
ہا "تم مسلمان ہو تو کیا ہوا، تم میرے دوست
ہو۔ میں تم پر اپنی جان تک نچھاور کر سکتا ہوں۔"
دیپک شکیل کے ساتھ اپنا حقِ دوستی ادا کرتا
رہا۔ ہر مہینے وہ شکیل کی فیس ادا کر دیا کرتا۔ ہوتے ہوتے
دونوں نے میٹرک پاس کیا۔ شکیل نے نمایاں کامیابی حاصل
کی۔ پورے صوبے میں ممتاز رہا۔ دیپک شکیل کی کامیابی
پر بہت خوش ہوا۔ دوست کی کامیابی کو وہ اپنی ہی کامیابی
سمجھا۔

اب شکیل کو گورنمنٹ سے وظیفہ ملنے لگا۔ اور اعلیٰ
تعلیم حاصل کرنا اس کے لیے آسان ہو گیا۔ دیپک اور
شکیل ساتھ ہی ساتھ کالج میں بھی رہے۔ دونوں نے
بڑی کامیابی سے بی۔ اے کیا۔ شکیل اعلیٰ تعلیم کی غرض
سے ولایت چلا گیا۔ دیپک نے آگے کی تعلیم کا خیال
ترک کر دیا۔

کئی سال گزر گئے۔ اب گورنمنٹ نے اناج پر کنٹرول
کر دیا۔ کسان اپنا اناج اچھے داموں فروخت کرنے لگے۔
کنہیا لال کا کاروبار ٹھپ پڑ گیا۔ دھیرے دھیرے جمع
کی ہوئی رقم ختم ہونے لگی۔ اب دیپک کو بھی فکر ہوئی
اس نے نوکری کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

بہت دوڑ دھوپ کے بعد دیپک بینک کی ایک
ٹریننگ میں لے لیا گیا۔ اس نے اپنے کام کو بڑی باقاعدگی
سے انجام دیا۔ اس لیے اسی بینک میں بہت اونچے عہدے
پر پہنچ گیا۔

مگر دو ہی مہینے بعد دیپک پر ڈیڑھ لاکھ کے غبن کا الزام
عائد ہو گیا۔ دراصل اس نے غبن تو کیا نہیں تھا۔ مگر قانوناً
وہ مجرم تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پہلے ایک بوڑھا
مینجر ریٹائرڈ ہوا تھا۔ جاتے جاتے وہی ہاتھ صاف کر گیا۔
دیپک کی غلطی یہ تھی کہ اس نے چارج لیتے وقت
باریکی سے حساب کی چھان بین نہ کی کیونکہ اسے اپنے
سابق مینجر پر پورا بھروسا تھا۔ اسی لیے آج وہ اپنے

بڑے جال میں پھنس گیا۔

اب دیپک قید میں تھا۔ کوئی اس کی ضمانت بھی لینے کو تیار نہ تھا۔ کنہیا لال نے سب کے آگے ہاتھ پیر جوڑے مگر کہیں سے کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔

دیپک عدالت میں جج کے سامنے حاضر کیا گیا تو کنہیا لال بھی موجود تھے۔ انھوں نے جج سے بہت التجائیں کیں مگر بے سود۔ سپاہی اسے جیل میں لے جانے والے تھے کہ اتنے میں شکیل اپنے وکالت کے ڈریس میں آ پہنچا اور بڑے دلیرانہ طور سے جج سے مخاطب ہوا۔

"یور آنر! دیپک کی ضمانت میں لیتا ہوں!"

دیپک ضمانت پر رہا ہوا۔ شکیل نے بڑھ کر دیپک کو گلے سے لگا لیا اور کہا۔

"دوست! تم بے فکر رہو، تم بے گناہ ہو، اس کیس کو میں چٹکی بجاتے جیت لوں گا۔"

آج کنہیا لال کی گردن ندامت سے جھکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی شرمندگی کے ساتھ شکیل سے مخاطب ہوئے۔ "شکیل بیٹا مجھے معاف کرنا۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں!"

"چاچا! دیپک ہمارا بھائی ہے، اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے" شکیل نے ہنس کر کہا۔

کنہیا لال نے بڑھ کر شکیل کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بڑے فخریہ انداز میں بولے۔

"بیٹا! تم دونوں بھائیوں کی جوڑی ہمیشہ سلامت رہے!"

★ ★

---

# دُعا

جناب محمد عبداللہ شرقی

تو ہے یارب قدرت والا
داتا بیتا، حکمت والا
تیری قدرت کے ہیں نظارے
یہ سورج، یہ چاند، یہ تارے
پھولوں میں تو رنگ و بو ہے
سب میں ظاہر تو ہی تو ہے
گلشن گلشن صحرا صحرا
سب میں تیرا جلوہ دیکھا
حمد میں ملتے پایا سب کو
گن ترے گاتے دیکھا سب کو
تو ہے پالن ہار جگت کا
میرے داتا۔ میرے آقا
اپنا ہمیں عرفان عطا کر
اپنی ہمیں پہچان عطا کر
ہم کو عطا کر علم کی دولت
ہم کو دے تو دردِ ملت
ہم کو لائق فاضل کر دے
خدمتِ خلق کے قابل کر دے

---

# جشنِ جمہوریت منائیں گے

جناب مرتضیٰ ساحل تسلیمی

گلستاں میں بہار آئی ہے
پُر مسرت پیام لائی ہے
ہر کلی آج مسکرائی ہے
آؤ خوشیوں کے گیت گائیں گے
جشنِ جمہوریت منائیں گے

سالہا سال ہم رہے ناشاد
خوب لوٹے گئے، ہوے برباد
شاد ہیں آج ہم کہ ہیں آزاد
آج دیوار و در سجائیں گے
جشنِ جمہوریت منائیں گے

بھائی بھائی ہیں سارے اہلِ وطن
بغض و نفرت کا مٹ چکا ہے چلن
ساری قومیں ہیں شاد اور مگن
اہلِ دنیا کو یہ دکھائیں گے
جشنِ جمہوریت منائیں گے

جناب فخر الدین عارفی

# حضرت نوح علیہ السلام

خدا نے دنیا بنائی، آدم و حوّا کو زمین پر بھیجا اور ان کی نسل میں ایسی برکت دی ایسی برکت دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ساری زمین پر پھیل گئے۔ لیکن دنیا کے عیش و آرام میں پڑ کر اپنے حقیقی معبود کو بھول گئے اور اپنے پیدا کرنے والے اللہ سے پھر گئے۔ بت پرستی اور طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تب اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو مقرر کیا ان کا آبائی نام شکر تھا بعد میں نوح ہوا۔ اس لیے کہ اپنی قوم کی بداعمالیوں پر بہت نوحہ کرتے تھے۔ اللہ میاں نے انھیں ہدایت کی۔

"اس سے پہلے کہ تمھاری قوم کے لوگوں پر دردناک عذاب نازل ہو، ان کو ہدایت کرو" چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:-

"بھائیو! میں تمھیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ اللہ کی نافرمانی کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ دیکھو! اطاعت اور بندگی صرف اللہ کی کرو۔ اس کی نافرمانی سے بچو اور اس کے خلاف سرکشی کرنے کی سزا سے ڈرو، جو کچھ میں کہوں اسے مانو، اللہ کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ وہی تمھارا آقا اور مالک ہے، جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا اب بھی راہِ راست پر آؤ اور اسی سے اپنی خطاؤں کو معاف کراؤ، وہ بڑا بخشنے والا ہے اور بے حد مہربان ہے ـــــ دیکھتے نہیں، یہ وہی تو ہے جو تمھارے لیے باغ اُگاتا ہے اور دریا بہاتا ہے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اس کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے"

" ذرا خود اپنے ہی کو دیکھ لو۔ ایسی اچھی ساخت کے ساتھ تمھیں کس نے بنایا ہے؟ پھر تمھیں ہی کیا ـــ اپنے سر کے اوپر اس پوری کائنات کو دیکھو! اس میں چاند کو دیکھو، کیسا منوّر ہے۔ سورج کو دیکھو کس طرح روشن اور تاباں ہے، زمین کو دیکھو، تمھارے لیے چاروں طرف راستے کھلے ہیں۔ جہاں چاہو جاؤ اور اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز ہو"

بھائیو! اللہ نے مجھے اپنی پیام سے نوازا ہے، میں اس کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کا امین ہوں۔ میرا کام یہی ہے کہ میں اسے تم تک پہنچا دوں۔

بھائیو! میرا کہا مانو، مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمھارے انکار کی سزا میں اللہ تعالیٰ تم پر کوئی عذاب نہ نازل کر دے"

اور یہ پیام حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو ساڑھے نو سو برس (۹½) تک سناتے رہے، لیکن ان کی قوم نے جواب دیا:-

"نوح! اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو اسے ذرا ہم پر نازل کر کے دکھاؤ"

اور پھر حضرت نوح علیہ السلام نے خدا سے دعا کی

"اے خدا! بے شک تو ہماری قوم پر عذاب

نازل کر، اب یہ قوم راہ راست پر آنے والی نہیں ہے۔"
اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت نوح علیہ السلام نے ایک کشتی بنائی جو تین سو ہاتھ لمبی اور پچاس ہاتھ چوڑی اور تیس ہاتھ اونچی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کے حکم کے مطابق ہر قسم کے جانداروں کا ایک جوڑا کشتی میں چڑھا لیا اور جو لوگ ان کے ماننے والے تھے اُن کو بھی بٹھا لیا۔ انھی لوگوں میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام اور یافث بھی تھے۔ نوح علیہ السلام کا ایک اور لڑکا بھی تھا جس کا نام کنعان تھا۔ یہ کشتی پر سوار نہ ہوا اور کہا:۔
"جب طوفان آئے گا میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔"
کشتی میں جن لوگوں کو سوار کرنا تھا جب وہ سب کے سب سوار ہو چکے تو موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اسقدر پانی برسا کہ درخت، پہاڑ، انسان، حیوان، چرند و پرند سب کے سب تہ آب ہو گئے نہ کوئی مددگار رہا نہ اس کا نام و نشان ـــــ کنعان جس پہاڑ پر جا بیٹھا تھا وہ بھی نہ بچ سکا اور موت کے چنگل سے اُس کو کوئی نہ بچا سکا۔
چالیس دنوں کے بعد اللہ کے حکم سے پانی تھم گیا، طوفان ختم ہوا اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کوہ جودی سے جا لگی۔ تمام لوگوں نے وہاں ایک بستی بسائی اور رہنے سہنے لگے۔
حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں اللہ نے ایسی برکت دی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے ملک اور ہزاروں شہر ان کی اولاد نے آباد کر دیے۔



# پودا

محمد محمود حسین روشن

اک ننھا سا پودا ہوں میں
باغ کا رہنے والا ہوں میں
دھرتی کا ہوں گود کا پالا
اور گگن کی آنکھ کا تارا
ابر نے مجھ کو دودھ پلایا
اور ہوا نے مجھ کو جھلایا

ہری ہری ہے میری ڈالی
اس پر ہے پھولوں کی لالی
تتلی ہر سو گھوم رہی ہے
ننھی کلیاں چوم رہی ہے
بھونرا مجھ پر ہے منڈلاتا
آکر اچھے گیت سناتا
روشن سورج کے ڈھلتے ہی
چڑیلوں کے گھر کو جاتے ہی
تھک کر فوراً سو جاتا ہوں
نندیا پور میں کھو جاتا ہوں

# بچّوں کی انجمن

## ایشیا میں سب سے بڑی

آپ نے کیرالا یا کیرل کا نام تو سنا ہوگا دیس کے
جنوب میں ایک چھوٹی سی ریاست (STATE) یا
صوبہ ہے۔ اسی ننھی منی ریاست میں بچوں کی ایک انجمن
بچوں کا کلب ہے۔ کوئی چھوٹا موٹا کلب نہیں ایشیا میں
سب سے بڑا امریکہ میں اسی طرح کی ایک تنظیم ہے۔
فور ایچ موومنٹ یا تنظیم (MOVEMENT (4-H)
ہمارا کیرالا والا کلب اس سے بس دوسرے نمبر پر ہے۔

اس کلب کا نام "آل کرالا بالا جانا شاکھیام"
ہے۔ اس کے ممبروں کی تعداد کچھ نہیں کچھ نہیں تو چھ لاکھ
ہے اور پوری ریاست میں پانچ ہزار سے زیادہ شاخیں
پورے صوبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ملایالم زبان کے مشہور
روزانہ اخبار ملایالا منورما نے اسے قائم کیا ہے۔ اور اس
کی ساری سرگرمیوں کا رخ یا یوں کہہ کر ان سرگرمیوں کا
مقصد قومی تعمیر ہے۔ یعنی یہ کہ بچوں میں قومیت کا احساس
پیدا ہو ان میں قوم کی خدمت، ایک دوسرے کی مدد،
آپس میں مل جل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

آپ کو شاید یاد ہو آج سے دس برس پہلے چین
اور ہندوستان میں لڑائی کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی اس
موقع پر کلب کے ۲۵ ہزار بچوں اور بچیوں نے کوٹایم
(KOTTA YAM) کی ڈیفنس ریلی یا احتجاجی جلوس میں

سال میں ایک دن بچوں کی مصوری یا پینٹنگ کی شاندار
نمائش ہوتی ہے۔ اور کبھی سال میں دو دن ایک میلا لگتا ہے۔
اس میلے میں ڈرامے کے گانے کے اور ناچنے کے انعامی مقابلے
ہوتے ہیں۔

"آل کرالا بالا جانا شاکھیام" نام ہی غیر فرقہ دارانہ ملک گیر
تنظیم یا ادارہ ہے۔ اس کلب میں شامل ہونے والے بچوں کی صلاحیتوں
کو ابھارنے میں تندرستی کو بہتر بنانے میں، سماجی کاموں میں
یا سوشل سروس کا شوق پیدا کرنے میں ان کی مدد کی جاتی ہے۔

ابھی تھوڑے دنوں سے سبزی ترکاری بونے
(KITCHEN GARDENING) مرغی پالنے اور
دوسرے گھریلو کاموں کی طرف کلب کی توجہ زیادہ ہے
بجائے خالی کتابیں پڑھنے کے کچھ سیکھنے اور سیکھے ہوئے
پر عمل کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

کلب کی پانچ ہزار (یا اس سے بھی زیادہ شاخیں) اپنے
ہفتہ وار جلسے بھی کرتے ہیں۔ ان میں تقریریں ہوتی ہیں۔
بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ نقلی پارلیمنٹ کے اجلاس ہوتے،
ناچ گانے ہوتے ہیں۔ کہانیاں سنائی جاتی ہیں، نظمیں سنائی
جاتی ہیں۔ ڈراموں کی مشق ہوتی ہے۔ ہونہار صحافی قلمی اخبار
اور رسالے نکالتے ہیں

لیگ آف پٹی (ہمدردی اور رحم کی انجمن) اس کلب

شکیلہ بانو

# انمول گہنا

ایک دیہات میں ایک زمیندار رہتے تھے۔ سینکڑوں ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ قصبے کے سارے لوگ بھی خوشحال تھے۔ یوں تو سب لوگ ے خاصے کھاتے پیتے تھے۔ زیادہ تر کھیتی باڑی پر ر تھی۔ مگر وہاں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا اور نہ کسی ۔اس کی ضرورت محسوس کی تھی اس لیے زیادہ تر لوگ ، پڑھ ہی تھے۔

زمیندار کی تین بڑی لڑکیاں تھیں ایک رسب سے ھوٹا) لڑکا تھا۔ دیہات میں اسکول کے نہ ہونے کی وجہ ے تینوں لڑکیاں اَن پڑھ رہ گئی تھیں۔ لیکن زمیندار کا ا کا حمید جب اسکول جانے کی عمر کو پہنچا تو اس وقت ام پنچایت کی طرف سے پرائمری اسکول کا انتظام وگیا تھا اس طرح لڑکے کو پڑھنے کا موقع ملا۔

زمیندار نے اپنے بیٹے کا داخلہ اسکول میں کروادیا۔ ڑکا بہت ذہین تھا۔ ہر سال کامیاب ہوتا گیا۔ اس کے بعد ضلع پریشد نے آٹھویں جماعت تک انتظام کر دیا۔ لیکن آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ اداس رہنے لگا۔ اکثر اپنے والد سے کہا کرتا "میں شہر جاکر آگے پڑھوں گا" زمیندار صاحب نے بچّے کا شوق دیکھ کر حوصلہ بڑھایا اور شہر جانے کا انتظام کر دیا۔ لیکن زمیندار صاحب کی بیگم اپنے اکلوتے بچّے کو جدا کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ ان کی نظر میں علم کی کوئی اہمیت نہ تھی اسی لیے تو وہ کہا کرتیں "اونہہ! زیادہ پڑھ لکھ کر بھی کیا کرے گا؟ ہمارے یہاں کھانے پینے کی کوئی کمی تو ہے نہیں!"

زمیندار خود تو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن انھیں علم کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ انھوں نے حمید کی حمایت میں کہا "اگر بچّے کی خواہش ہے کہ اور آگے پڑھے تو کیوں آڑے آتی ہو؟ ہمارا ایک ہی تو لڑکا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میرا ایک ہی بچّہ ہے میں اُسے اپنی نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتی۔"

"بچّے کی محبّت کیا نظر کے سامنے رکھنے سے ہوتی ہے؟ دور رہ کر کیا محبّت میں فرق آجائے گا؟" وہ جھنجھلا کر کہہ ہی دیتے۔

مگر وہ جو کہتے ہیں "الٹی کھوپڑی اندھا گیان" زمین دارن کہاں آسانی سے ماننے والی تھیں، کہتیں "دیکھو جی! تم ماں کی ممتا کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ شہر میں کہاں کھائے گا، کہاں سوئے گا، کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟؟؟"

"تمھاری محبّت اندھی ہے۔ شہر میں تمھارے لاڈلے کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ وہاں تمام باتوں کا انتظام رہتا ہے۔" جب زمیندار نے تفصیل سے سمجھایا تب کہیں جاکر وہ راضی ہوئیں۔

حمید محنت اور لگن سے پڑھتا تھا۔ گاہے گاہے گھر پر اپنی خیریت کے خط لکھتا رہا۔ دن گزرتے رہے۔ اس سال حمید نویں کلاس میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوا تھا۔

اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے والدین کو تار کے ذریعہ خوش خبری دی۔

جس وقت تار آیا، حمید کی والدہ اوپر چھت پر تھیں۔ بڑی بہن نے ہرکارے سے تار لے لیا اور پوچھا "کہاں سے آیا ہے؟" اس نے شہر کا نام بتلایا اور چلا گیا۔ زبیدہ (حمید کی بڑی بہن) دوڑتی ہوئی ماں کے پاس پہنچی اور کہنے لگی۔

"اماں شہر سے تار آیا ہے؟"

ماں کے ہاتھ میں گھی کی ہانڈی تھی، تار کا نام سنتے ہی فرش پر گری اور چکنا چور ہوگئی۔ گھبرا کر کہنے لگیں "کیا کہا تار آیا ہے؟"

"ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ میرے بچے کو شہر مت بھیجو، مگر میری مانتا کون ہے۔ ہائے میرا بچہ" کہہ کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ماں کو روتا دیکھ کر بیٹی بھی رونے لگی۔ دوسری دونوں لڑکیوں نے رونے کی آواز سنی تو وہ بھی اوپر پہنچ گئیں اور چاروں ماں بیٹیاں مل کر بین کر کرکے رونے لگیں۔ شور سن کر پاس پڑوس کی عورتیں بھی جمع ہوگئیں اور ان کے ساتھ رونے میں شامل ہوگئیں۔ اچھا خاصا ہنگامہ مچ گیا۔

ماں نے دوہتڑ زبیدہ کے بیٹھ پر جما کر کہا "ہائے کمبخت تو نے تار لیا ہی کیوں؟ اب میرا بچہ مجھے کہاں ملے گا؟ ہائے" وہ ایسی ہی دیوانوں کی طرح بڑبڑا رہی تھیں اتنے میں زمیندار آگئے اور کہنے لگے "کیا بات ہے؟ کیوں تم سب رو رہے ہو؟" بیوی نے منہ بنا کر کہا "اجی تار آیا ہے تار! روئیں نہیں تو کیا کریں"۔ زمیندار نے پوچھا "کیا لکھا ہے تار میں؟ لاؤ تو مگر انگریزی انھیں بھی نہیں آتی تھی۔ پوسٹ آفس جا کر پڑھوایا تو معلوم ہوا کہ حمید اپنے درجے میں اوّل آیا ہے۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے گھر آئے تو وہی کہرام مچا ہوا تھا۔ انھوں نے خوش خبری سنائی۔ کہ حمید اوّل نمبر سے پاس ہوگیا اور اس کا یہ تار ہے" یہ سننا تھا کہ بیگم صاحبہ جلدی جلدی آنسو پونچھ کر کہنے لگی "یا اللہ شکر تیرا"

"زبیدہ کی ماں! اسی لیے کہتا ہوں کہ لڑکی کو پڑھ لینے دو۔ اگر تم یا لڑکیاں اَن پڑھ نہ ہوتیں تو اس خوش خبری پر بجائے خوشی کے آنکھو سے یہ آنسو نہ بہتے نہ یہ کہرام مچتا۔

"حمید کی ماں! اب تو مٹھائی بانٹ دو" زمیندار مات کھائے ہوئے انداز سے سر ہلاتے ہوئے اندر کے کمرے میں چلی گئیں۔

---

بقیہ صلا کیا مستقبل کا انسان سمندر کی تہہ میں رہیگا

ایک بڑا مکان بنایا اس میں تین کمرے تھے ان میں تمام سائنس آلات رکھے ہوئے تھے۔ یہ مکان سطح سمندر سے تمیس فٹ نیچے تھا۔ ڈاکٹر بیب اور اُن کے ساتھی ایک مہینہ تک اس میں رہے۔ مگر ان کی صحت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔

اس تجربے کے بعد دنیا کے کئی بڑے بڑے ملک نے اپنی سائنسی تجربہ گاہیں سمندر کے اندر بنائیں وہ دن دور نہیں جب خشکی کی طرح سمندر میں انسانی بستی ہو جائے گی۔

نثار گورکھپوری

# علم

علم سے ہر چیز میں ہے دلکشی[1] علم ہے کیف[2] و جمال زندگی

علم سے روشن ہے انساں کا ضمیر[3] علم ہے عقل و خرد کا دستگیر

علم سے سارا جہاں معمور[4] ہے علم فیضِ حق[5] سراپا نور ہے

علم سے عزت ملی انسان کو تازگی حاصل ہوئی ایمان کو

علم سے جب عقل ہوگی ہم کنار اور بھی ہو جائے گی وہ پائدار

علم جس کے دل میں بھی مہمان ہے وہ حقیقت میں بڑا انسان ہے

علم والے ہیں جہاں میں سربلند لائق تعظیم ہیں وہ ہوشمند

علم ہی اک مظہرِ معبود[6] ہے علم کہتا ہے خدا موجود ہے

علم ہے رمز آشنائے خیر و شر[7] علم ہے اک امن کا پیغام بر

علم دیتا ہے اخوت[8] کا سبق علم بابِ عشق کا ہے اک ورق

علم سکھلاتا ہے بندہ پروری سادگی، زندہ دلی اور دلبری

علم گویا مشعلِ انوار ہے مستقل اک مخزنِ اسرار[9] ہے

علم حاصل اتنا ہوتا ہے ضرور حق و باطل[10] کا تو ہو جائے شعور[11]

علم سے بنتی ہیں تقدیریں نثار
علم سے بڑھتا ہے انساں کا وقار

---

[1] دل کو اچھی لگنے والی [2] لطف [3] ایسی قوت جو انسان کو نیکی پر آمادہ کرتی ہے برائی سے بچاتی ہے [4] آباد۔
[5] خدا کا کرم بخشش [6] خدا کا مظہر [7] یعنی علم سے اچھی بڑی باتوں کو سمجھنے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔
[8] بھائی چارہ [9] بھیدوں کا خزانہ [10] صحیح اور غلط سچ اور جھوٹ [11] تمیز۔ احساس

جناب جمال الدین عمر

# کیا مستقبل کا انسان سمندر کی تہہ میں رہے گا؟

دنیا کے تین حصوں پر پانی اور ایک حصے پر زمین ہے۔ آج کی بڑھتی ہوئی آبادی دیکھ کر عالموں اور سائنس دانوں کو احساس ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب لوگوں کو زمین پر رہنے کی جگہ نہیں ملے گی۔

اسی مقصد کو مدِ نظر رکھ کر چند جیالے اور جانباز سائنس دانوں نے سمندر کے اندر آبادی بسانے کے منصوبے بنائے ایسے نیک خیالات کے سائنس دانوں میں ڈاکٹر بیب کا نام مشہور ہے۔ یہ علم حیوانات کے ماہر تھے۔ مگر انھیں سمندری دنیا سے زیادہ دلچسپی تھی اس لیے انھوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سمندر کی سیر کی۔

ڈاکٹر بیب نے سب سے پہلا تجربہ ایک لوہے کے کمرے میں کیا۔ اس کمرے کے ایک طرف آدھی دیوار میں کانچ لگی ہوئی تھی اور اندر آکسیجن کا انتظام تھا۔ اس فولادی کمرے کو ایک جہاز پر سے فولادی تار کے ذریعہ سمندر میں اتارا گیا اور ڈاکٹر بیب اندر بیٹھے مشاہدات کرتے رہے۔ مگر اس طرح انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تو انھوں نے ایک مخصوص لباس تیار کیا جس کی وجہ سے انسان آسانی سے سمندر کے اندر گھوم سکتا تھا۔ اس لباس کو غوطہ خوری کا لباس کہتے ہیں۔ اس لباس میں آکسیجن کا ایک سلنڈر بھی لگا رہتا ہے۔ ہاتھ میں ٹارچ۔ اگر کبھی ٹارچ ہاتھ سے گر جائے یا خراب ہو جائے تو ایک خاص بٹن دبا کر لباس میں لگے ہوئے سر کے

جس طرح زمین پر جنگلات اور پہاڑیوں کے سلسلے ہیں اسی طرح سمندر کے اندر بھی جنگلات اور پہاڑیوں کے طویل سلسلے ہیں۔ سمندری جنگلات میں اکثر بڑے بڑے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر بیب کا کہنا ہے کہ بحرالکاہل ایک جگہ اتنا گہرا ہے اگر کسی طرح دنیا کے عظیم الشان پہاڑ ہمالیہ کو اُلٹا کر کے اس میں ڈال دیا جائے تو بھی پتہ نہ چلے گا۔

اس کے علاوہ سمندر کے اندر وہ تمام چیزیں ہیں جو خشکی پر پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر شارک مچھلی کو سمندر کا شیر کہا جاتا ہے۔ یہ خشکی کے شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ خلاء میں تیرتے ہوئے اِن جراثیم کی طرف بھی توجہ دیجئے جو ہمیں آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے۔ ٹھیک اسی سے مشابہ سمندر کے اندر انتہائی گہرے پانی میں ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جنھیں بغیر خوردبین کے ہم نہیں دیکھ سکتے۔

سمندری دنیا میں طوفان بھی آتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ سمندر کے جس حصے میں طوفان آتا ہے تو وہاں کا پانی کھولنے لگتا ہے اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ مختلف حصوں میں پھیل جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی سمندری جانور یا مچھلی اس طوفان کی زد میں آتی ہے تو فوراً اسی لمحے مر جاتی ہے۔

غوطہ خوری کے لباس کے بعد ڈاکٹر بیب

فاخرہ یاسمین سلمہا

# ہنڈ کلھیا

## بڑے

سامان :-

| | |
|---|---|
| اُرد کی دال | ایک پیالی |
| مونگ کی دال | ,, ,, |
| دہی | ۲۵ گرام |
| زیرہ سفید بھنا ہوا | دو چمچے |
| مرچ سرخ | ۷ عدد |
| لہسن | ۶ جوے |
| ہینگ | ایک چٹکی |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل | ۱۰۰ گرام |

ترکیب :- دونوں دالیں ایک ساتھ بھگو دیجیے۔ اچھی طرح بھیگ جائیں تو دھو کر چھلکے الگ کر لیجئے اور باریک پیس لیجیے۔ دہی اچھی طرح متھ لیجیے اس میں دو پیالی پانی ملا دیجیے۔ زیرہ لہسن اور مرچیں پیس کر دہی میں ملا دیجیے۔ اب پسی ہوئی دال کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں دال میں تل لیجیے۔ تلی ہوئی ٹکیاں دہی میں ملاتی جائیے۔ سب پڑ جائیں تو کسی بڑے چمچے سے دبا دیجیے کہ سب بھیگ جائیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کرچھے یا بڑے چمچے میں تیل گرم کر کے تھوڑا سا سفید زیرہ اور ہینگ ڈال کر بگھار دیجیے بڑے یا دہی بڑے تیار ہیں۔

## آلو کی ٹکیاں

سامان :-

| | | | |
|---|---|---|---|
| آلو | ۲۵۰ گرام | ہری مرچ | ضرورت کے مطابق |
| بیسن | ۱۰۰ ,, | ہرا دھنیا | ,, ,, |
| لال مرچ پسی | ½ چمچہ | پیاز | ایک بڑی گانٹھ |
| | | نمک پسا ہوا | ضرورت کے مطابق |
| گرم مسالہ پسا ہوا | ½ چمچے سے ایک چمچے تک | تیل یا ڈالڈا | ضرورت کے مطابق |
| ادرک | اوسط درجے کی گانٹھ | | |

ترکیب :- ایک پتیلی میں آلو اُبلنے کے لیے رکھ دیجیے۔ اُبل جائیں تو پانی پھینک کر چھیل لیجیے اور پیس لیجیے۔ ادرک، ہری مرچ، ہرا دھنیا اور پیاز باریک کتر کر ملا دیجیے۔ نمک لال مرچ۔ گرم مسالہ اور نمک بھی ملا دیجیے۔ اب بیسن گاڑھا گاڑھا گھول لیجیے اور اپنی منشا کے مطابق بڑی یا چھوٹی ٹکیاں بنا کر بیسن میں لت پت کر لیجیے اور انھیں تل لیجیے اور چٹنی (جس کے بنانے کی ترکیب پچھلے پرچے میں دی گئی ہے) یا ٹماٹر کی چٹنی سے کھائیے۔

## ترئی کے کباب

کہتے ہیں زمانہ ایسا آگیا ہے کہ بے کار سی بے کار چیز کو بے کار نہ چھوڑنا چاہیے اس سے کوئی نہ کوئی کام لینا چاہیے۔ تو صاحب مجھے بھی بیٹھے بیٹھے ایک بات سوجھی اور چوری چوری یہ کام کر ڈالا۔ میں جانتی تھی کہ امی اگر جانتی ہوں گی تو ابا میری طرف داری کریں گے۔ ابا تو ہر بگڑے کھانے کو "ورائٹی" کہہ کر کھا لیتے ہیں دیکھیے ترکاریاں تو آپ کے گھر بھی پکتی ہوں گی۔ ان کے چھلکے آپ پھینک دیتی ہوں گی۔ تو لیجیے ہم آپ کو اپنا تجربہ بتائیں۔ ہم تو بھی پٹنے سے بھی بچے۔ تعریف بھی ہوئی انعام بھی ملا۔ آپ بھی ہماری طرح تجربہ کیجیے۔ ہنڈ کلھیا پکائیے اور امی اور ابو سے انعام لیجیے۔

باقی ص پر

# آدھی ملاقات

اُردو کی ترقی کے لیے بڑی بڑی کوششیں ہو رہی ہیں جو یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔ لیکن آپ حضرات کا کام بنیادی ہے جو خلوص لگن اور خاموشی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بچوں کے لیے معلوماتی، دلچسپ اور معیاری رسائل کی اگر تلاش کی جائے تو ” آپ ہی کو لانا پڑے گا آپ ہی کے جواب ہیں “

دو خریداروں کو میں نے تیار کیا ہے۔ یہاں مقامی شاخ جامعہ کو وہ چندہ جمع کر دیں گے اور جلد ہی آپ کو پتوں سے میں بھی مطلع کروں گا۔ عید کی مبارکباد کے جواب پر آپ کے گرامی نامہ کا شکر گزار ہوں اور آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔ والسلام۔

م ندیم۔ علی گڑھ

حقیقت تو یہ ہے کہ گذشتہ کچھ مہینوں سے پیامِ تعلیم میں ہر اعتبار سے غضب کا نکھار آیا ہے۔ ٹائیٹل کی دیدہ زیبی ترتیب و تدوین کی رنگا رنگی اور مضامین نظم و نثر کی چکا چوند سے دل و دماغ کو روشنی اور فرحت حاصل ہوتی ہے زیرِ نظر یعنی نومبر ۷۳ء کا پیامِ تعلیم تو اتنا پیارا ہے۔ کہ اس کی تعریف کے لیے کن الفاظ کا انتخاب کروں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اپنے آپ کو بے بس پا رہا ہوں۔ ٹائیٹل اسقدر حسین اور دلفریب ہے کہ بے شک دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین رسائل کی اوّلین صفوں میں رسالہ کو جگہ دلوا سکتا ہے۔ حسین اور خوشنما پھولوں کا ایک گلدستہ سجا کر رکھ دیا ہے۔ آپ نے کہ بس دیکھتے ہی رہیے سیری نہیں ہوتی۔ قابلِ مبارک باد ہیں آپ۔ مشاہیر فنکاروں کے ایسے قابلِ قدر فن پارے آپ نے اس شمارے میں یکجا کر دیے ہیں کہ ہر ایک خوب سے خوب تر ہے۔ شفیع الدین نیّر۔ راغب نعیم۔ شوکت پردیسی۔ آصفہ مجیب۔ خلیق انجم۔ سیدہ عنوان چشتی۔ وقار خلیل ناوک حمزہ پوری۔ سید حامد حسن مسعودہ حیات اور مہر ورولوی یہ تمام دنیائے ادب کے جانے پہچانے اور درخشندہ ستارہ ہیں۔ ان تمام نے پیام کے زیرِ نظر شمارے کے ذریعے پیامیوں کے لیے اپنی جو تخلیقات پیش کی ہیں بیشک یہ ان کی بہترین نگارشات میں سے ہیں۔ نیّر صاحب کی نظم کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھلانے کے مصداق ہے اور تعریف نہ کرنا حقیقت سے گریز کرنے کے مترادف ویسے راغب نعیم اور شوکت پردیسی کی نظموں نے بھی بیحد متاثر کیا۔ دونوں نظمیں بے حد رواں دواں۔ مترنم اور سلیس اور شستہ ہیں۔ مسعودہ حیات کی نظم جشنِ بہاراں بھی بہت خوب ہے۔ آخر میں پیامِ تعلیم کے لیے یہ دعا کر کے اجازت چاہتا ہوں کہ

” اللہ کرے حسن تیرا اور دوبالا “

محبوب راہی

اکتوبر کا پیامِ تعلیم ملا۔ جس میں میری نظر جب سرِ ورق پر پڑی تو بڑی مسرت ہوئی۔ اس تصویر کو دیکھ کر ہمارے سارے طلبہ بھی جھوم اٹھے۔

عبد اللہ کلام

★

پیام تعلیم (نومبر) پورا پڑھ لیا ہے۔ اور مجموعی طور پر بہت پسند آیا ہے۔ صرف چالیس صفحات میں آپ نے اتنا عمدہ مواد اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ سرورق میں بھی اس بار جدّت ہے اور کتابت و طباعت بھی اس بار پہلے سے بہتر ہے۔ بس ڈاکٹر عابد حسن صاحب کے مضمون کا البتہ ستیا ناس ہوگیا ہے ص ۳ پر لکھا ہوا تو پڑھا ہی نہیں جاتا۔ پتہ نہیں یہ کتابت کی گڑبڑ ہے یا طباعت کی۔ بہر حال کسی کی بھی اس کی وجہ سے محترم ڈاکٹر صاحب کے اتنے مفید و کارآمد مضمون کے ایک حصّے سے پیامی محروم رہ گئے۔ ہاں اس مضمون میں ص ۲۹ 'دقت طلب'، کے معنی 'مشکل پسند'، ہیں جو میری ناچیز رائے میں درست نہیں۔ 'دقّت طلب'، کے دوسرے معنی "جس کام کے کرنے میں دشواری ہو" زیادہ درست لگتے ہیں۔

"ہندسوں کی ہڑتال" بڑی دلچسپ اور بڑی مفید کہانی ہے۔ اتنی عمدہ کہانی لکھنے کے لیے شریمتی سوتیا جاجودیا، اسے بڑی خوبی سے اُردو کا لباس پہنانے کے لیے محترم روشن علی اور اس کی اشاعت کے لیے آپ میری دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

محترم راغب نعیم صاحب کی نظم پڑھ کر دل بھر آیا۔ حالاں کہ یوں تو اس نظم میں صبر و تسلّی اور راضی برضا رہنے ہی کی ترغیب ہے لیکن پھر بھی نظم پڑھ کر دل پر عجیب سا اثر ہوتا ہے۔ اور بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ شاعر کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ جس خلوص دل سے اس نے یہ نظم کہی ہے اس کا اثر قاری کے دل پر بھی اتنا ہی ہوتا ہے نعیم صاحب میری مبارک باد قبول فرمائیں۔

محترم آصف مجیب نے اس بار کشمیر کی سیر اپنے دلکش انداز میں کرائی ہے۔ گھڑی کی کہانی بڑا مفید مضمون ہے لیکن پہلے ہی صفحہ پر ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ سورج کو مغرب کے بجائے جنوب میں چھپتا بتایا گیا ہے۔ بظاہر تو یہ کتابت [illegible] ہوگیا ہو۔

ناوک حمزہ پوری کے مضامین کا سلسلہ بہت معلوماتی ہے۔ محترم مسعود حیات کی نظم آپ نے بڑے موقع سے شایع کی ہے لیکن نظم پر ان کے نام میں حیات کی جگہ 'صباحت' کتابت ہوگیا ہے۔

ستمبر کے پیام تعلیم میں شایع ہونے والی نظم "گڈو بڑا شیطان ہے" (مرتضیٰ ساحل تسلیمی) کھلونا کے نومبر ۷۶ء کے شمارے میں بھی شایع ہوئی ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں اڈیٹر کھلونا کو بھی خط لکھ دیا ہے۔

طباعت اور کم صفحات کے سلسلہ میں لوگوں کے خطوط اور آپ کی وضاحت نظر سے گزری۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ قیمت پچھتر پیسے کر کے آٹھ صفحات بڑھا ہی دیں کیونکہ اتنا اچھا مواد اتنا کم پڑھ کر تسلی نہیں ہوتی دوسری بات یہ کہ قلم کاروں کے پتہ ان کی تخلیقات کے آخر میں دینا شروع کر دیجیے تاکہ قلمکار آپس میں بھی اور قارئین ان سے رابطہ قائم کر سکیں اور اپنی پسند ناپسند سے انھیں آگاہ کر سکیں۔

خلیق انجم اشرف

عجیب اتفاق ہے کہ یہی نظم کھلونا نومبر ۷۶ء میں بھی شایع ہوگئی۔ ہوا یہ تھا کہ بہت دن پہلے میں نے کھلونا میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔ چند ماہ تک کسی قسم کا جواب نہ ملنے کی وجہ سے میں اسے محکمہ ڈاک کی لاپروائی سمجھا اور مطمئن ہوگیا کہ وہ نظم ان تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کے بعد میں نے آپ کو وہی نظم ار[illegible] کر دی جسے آپ نے فوراً ہی شایع کر دیا اور اب کھلونا میں بھی وہی شایع ہوگئی۔ جبکہ میں خود یہ [illegible] نہیں سمجھتا کہ ایک ہی نظم یا غزل کو دو جگہ بھیجو[illegible] یہ سب غلط فہمی کی وجہ سے ہوگیا۔ اس سلسلہ میں اب محتاط رہوں گا۔

[illegible]

# کتابوں کی باتیں

بڑا پانی: مصنف: لیلا مجمدار مترجم: محترمہ صالحہ عابد حسین، بڑی دلچسپ اور رومانٹک کہانی ہے۔ نانا، کانو، کانوں کی ماں خاص کردار ہیں۔ یہ پورا کنبہ پہاڑی علاقے میں رہتا ہے۔ کانوں کی ماں بنگال کی رہنے والی ہیں۔ انھیں اپنے وطن کی یاد اکثر ستاتی ہے۔ کانو کے نانا اسی برس کے بہت تجربے کار بزرگ ہیں۔ اور ظاہر ہے دنیا کی بہت سی باتیں جانتے ہیں۔ جنگل کی۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کی دنیا کی اور بہت باتوں کی معلومات حاصل ہیں اور وہ موقع موقع سے وقتاً فوقتاً یہ سب باتیں کانو کو بتاتے رہتے ہیں۔ کہانی کچھ اس ڈھنگ سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا بچہ کہانی کہانی میں بہت سی مفید اور کارآمد باتیں غیر محسوس طریقے پر جان جاتا ہے کہانی ایسی مزے دار ہے کہ پڑھنے والا شروع کرنے کے بعد ناممکن ہے بنا ختم کیے دم لے۔ ترجمہ محترمہ صالحہ عابد حسین کے منجھے ہوئے قلم کا کارنامہ ہے۔ بہت ہی سادہ زبان۔ بہت دلچسپ اندازِ بیان۔ جگہ جگہ گھریلو بول چال کی مٹھاس۔ بالکل ایسا لگتا ہے کہ کتاب محترمہ صالحہ عابد حسین کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب ۶۴ صفحے کی قریب قریب ہر صفحہ پر کئی کئی رنگوں کی تصویریں ہیں۔ سرورق بہت ہی خوبصورت۔ چھپائی آفسیٹ کی ان سب باتوں کو دیکھیے۔ ڈیڑھ روپیہ قیمت بہت ہی کم۔

مکتبہ جامعہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے
منگائیے

"بچوں کا ہلال" رام پور۔ پچھلے سال جون سے مکتبہ الحسنات، رام پور نے مولانا عبدالحی کی نگرانی میں نکالا ہے عبدالملک سلیم ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ بہت ہی چھوٹے، یوں کہیے کہ نرسری کے بچوں کے لیے ہے۔ اسی لیے شروع سے آخر تک بہت ہی خوبصورت ہے ٹائیٹل خاص طور پر چار رنگوں کا ہے۔ اندر کے صفحے بھی رنگین ہیں۔ بعض بعض کئی رنگوں کے ہیں۔ پرچے میں چھوٹی نظمیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے نثر کے مضمون ہیں۔ تصویروں کی مدد سے گنتی سکھائی گئی ہے۔ جغرافیہ ڈرائینگ کی تعلیم دی گئی ہے۔ پرندوں اور جانوروں پر ہلکے پھلکے مضمون ہیں۔ رسالہ ماہوار ہے کل سولہ صفحے ہیں۔ مگر بہت اہتمام سے نکالا گیا ہے۔ بہت چھوٹے بچوں کے لیے رسالے شائد اس سے پہلے نکالے گئے ہوں مگر یہ رسالہ ہمارے خیال میں پہلا رسالہ ہے جو شروع سے آخر تک اتنا خوبصورت اتنا دل کش ہے۔ ایک پرچے کی قیمت ۶۰ پیسے ہے۔ سالانہ چندہ ساڑھے چھ روپے ہے۔

مکتبہ الحسنات پرانی کھنڈسار رام پور سے
منگائیے



# اِدھر اُدھر سے

## آخر زرافے صاحب پہنچ گئے دِلّی کے چڑیا گھر میں

آپ کو یاد ہوگا کسی پرچے میں ہم نے کہا تھا کہ دِلّی چڑیا گھر میں نیروبی سے زرافہ آنے والا ہے ان مشکلوں کا بھی ذکر کیا تھا جن کی وجہ سے زرافوں کا یہ خاندان اب تک دہلی نہیں پہنچ سکا ہے۔ اپنی لمبائی اور اونچائی کی وجہ سے یہ ہوائی جہاز میں نہیں سما سکتے تھے۔

اس موقع پر شپنگ کارپوریشن آف انڈیا نے مدد کا ہاتھ بڑھایا اور ان کا ایک سمندری جہاز انھیں نیروبی سے بمبئی لے آیا۔ لیکن اب یہ بمبئی سے دہلی کیسے آئیں۔ اس مشکل کو ریلوے نے حل کیا۔ اس کے پاس ایسے ویگن تھے جن میں عام ویگنوں سے زیادہ گہرائی تھی۔ اس طرح یہ حضرت نظام الدین تک آئے۔ یہاں انھیں کرین کے ذریعے ٹرک پر سوار کیا گیا۔ اس کام میں بھی کئی گھنٹے لگ گئے۔ آخر دوپہر کے بعد یہ پورا خاندان خیر و عافیت چڑیا گھر پہنچ گیا۔ اور آپ لوگ اب ان کی زیارت کر سکتے ہیں۔ ان کی قیمت لگ بھگ ایک لاکھ روپے ہے۔ لیکن یہ تو دِلّی چڑیا گھر کے مادہ گینڈے کے تبادلے میں آئے ہیں۔ یعنی ان کے بدلے میں دِلّی چڑیا گھر سے گینڈے کی مادہ بھیجی گئی ہے۔ دنیا کے چڑیا گھروں میں یہ تبادلے یا تبادلے عام ہیں۔

(ٹائمس آف انڈیا)

## ہاتھی کی پنشن

جی ہاں ہاتھی کی پنشن! اور وہ بھی معمولی نہیں ۵۰۰ روپے ماہوار پہ جناب یہ ہاتھی بھی تو ایسا ویسا نہیں تھا۔ اس نے ۴۹ سال تک سرکاری نوکری کی ہے۔ مدراس کے صوبے میں ایک ضلع ہے کوئمبٹور وہیں کے محکمۂ جنگلات میں ملازم تھا عمارتی لکڑی ڈھونے کا کام انجام دیتا تھا۔ دوسرے ہاتھیوں کی تربیت کا کام بھی اس کے ذمّے تھا۔ بارہ سال کی عمر میں ملازم ہوا تھا۔ ایک ہزار روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ یہ ایک ہزار روپے اس کے کھانے اور دواؤں پر صرف ہوتے تھے۔ اسے عام طور پر جنگلات کا انسپکٹر جنرل کہتے تھے۔ اور اب یہ انسپکٹر جنرل صاحب ٹھاٹھ کے ساتھ آرام کی زندگی گذاریں گے اور یہ پانچ سو روپے ان کے کھانے پینے پر خرچ ہوں گے

(دعوت)

## پلاسٹک کی گھاس اور پودے

جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں قدرتی پیڑ پودوں کی جگہ پلاسٹک کے پودے اور گھاس لگانے کا رواج بڑھ رہا ہے یہ آنکھوں کو بہت بھلے لگتے ہیں۔ پھر بھی وہ قدرتی خوبصورتی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ٹوکیو شہر کے لوگ پلاسٹک کی اس بہتات سے پریشان ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں ٹوکیو میں رہائشی پلاٹوں کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے یوں سمجھیے کہ ایک مربع گز کی قیمت پچاس ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے۔ دو کمروں کے مکان کا ماہوار کرایہ دس ہزار سے پندرہ ہزار ماہوار تک ہے۔

(الجمعیۃ)

## مصنوعی گھوڑا۔

جاپان کی ایک کمپنی "مزو شیا لگا کوکے کے" نے آخرکار ایک مصنوعی گھوڑا تیار کرلیا۔ یہ گھوڑا پورے سائز کا ہے یعنی عام سواری کے گھوڑوں کی برابر ہے۔ اس کی زین یا کوَر بھی پلاسٹک کا ہے۔ یہ شہ سواری یا گھوڑا سواری سکھانے کے کام آسکتا ہے۔ بجلی کی طاقت سے چلتا ہے اور ایک منٹ میں ۸۰ سو گز دوڑ سکتا ہے۔ اس کے بنانے والوں کا دعویٰ ہے کہ سخت سردی کے علاقوں میں یہ معیاری گھوڑے کا کام دے سکتا ہے اور جناب اسے نہ تو دانہ پانی چاہیئے نہ اس کے اصطبل کو روزانہ صاف کرنے کی ضرورت ہے۔

(الجمعیتہ)

## ایورسٹ پہاڑ پر کوہ پیماؤں کی یورش۔
## ۱۹۷۸ تک چوٹی بک ہو چکی۔

نیپالی وزارت خارجہ کے ایک افسر نے بتایا ہے کہ اگلے سال (۱۹۷۴ء) کے شروع میں نیپال کے بہار کے موسم میں گیارہ ملکوں کی اکیس ٹیمیں یا مہمیں ماؤنٹ ایورسٹ کی چڑھائی میں حصہ لیں گی۔ اس میں دس ٹیمیں صرف جاپان کی ہیں۔ اسی موسم بہار میں اسپین کی ایک کوہ پیما ٹیم بھی ایورسٹ چڑھنے کی کوشش کرے گی۔

دنیا بھر کے کوہ پیماؤں نے ۱۹۷۸ء تک ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کے لیے بکنگ کرالی ہے۔

اب سے لگ بھگ ۵۱ برس پہلے سے دنیا کی اس سب سے اونچی چوٹی کو سر کرنے کی کوششیں شروع ہوئی ہیں۔ پہلی کامیابی آزادی کے بعد ایڈمنڈ ہلاری اور تین سنگھ کو ہوئی۔ لیکن ۱۹۷۳ء کا سال یادگار رہے گا اٹلی کے کوہ پیماؤں نے دونوں موسموں میں بار بار چوٹی تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی ہے

(الجمعیتہ)

## میونسپلٹی کو ہاتھی صاحب کی قبر بنوانی پڑی۔

پچھلے نومبر میں جبل پور میں ایک ہاتھی صاحب نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ مرحوم کے مالک یا وارث نے راہ فرار اختیار یعنی لاپتہ ہوگئے یا بھاگ کھڑے ہوئے شہر کے لوگوں نے میونسپل کارپوریشن کو مجبور کیا کہ مرحوم کو دفن کرنے کا انتظام کرے۔ اور کارپوریشن کو ان کی قبر بنانے یا گڑھا کھودنے کے لیے ۲۵ مزدوروں کو لگانا پڑا۔ گڑھا بھی تو سات مربع میٹر اور ساڑھے تین میٹر گہرا تھا اور ہاں گڑھے میں ڈالنے کے لیے چھ بوریاں نمک کی خریدنا پڑیں۔ کارپوریشن کو مجموعی طور پر چھ سو روپے خرچ کرنے پڑے۔ لیکن ہاتھی میاں کی ہڈیاں بھی بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ کارپوریشن ان ہڈیوں سے دس گنا کمالے گا۔

(الجمعیتہ)

# پیام تعلیم کلینڈر ۱۹۷۴ء

| عبد المجید آنیکل ضلع بنگلور | | | | | ستمبر دسمبر | اپریل جولائی | جنوری اکتوبر | مئی | اگست | فروری مارچ نومبر | جون |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۲۹ | ۲۲ | ۱۵ | ۸ | ۱ | اتوار | پیر | منگل | بدھ | جمعرات | جمعہ | ہفتہ |
| ۳۰ | ۲۳ | ۱۶ | ۹ | ۲ | پیر | منگل | بدھ | جمعرات | جمعہ | ہفتہ | اتوار |
| ۳۱ | ۲۴ | ۱۷ | ۱۰ | ۳ | منگل | بدھ | جمعرات | جمعہ | ہفتہ | اتوار | پیر |
| ★ | ۲۵ | ۱۸ | ۱۱ | ۴ | بدھ | جمعرات | جمعہ | ہفتہ | اتوار | پیر | منگل |
| ★ | ۲۶ | ۱۹ | ۱۲ | ۵ | جمعرات | جمعہ | ہفتہ | اتوار | پیر | منگل | بدھ |
| ★ | ۲۷ | ۲۰ | ۱۳ | ۶ | جمعہ | ہفتہ | اتوار | پیر | منگل | بدھ | جمعرات |
| ★ | ۲۸ | ۲۱ | ۱۴ | ۷ | ہفتہ | اتوار | پیر | منگل | بدھ | جمعرات | جمعہ |

Regd. No. D. 1457

JANUARY 1974

# PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025



لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) ۲۸ پٹودی ہاؤس، دریا گنج۔ دہلی


پیام تعلیم

ماہنامہ

# پیام تعلیم

نئی دلّی

جلد ۱۱ شمارہ ۲

اِڈیٹر

محمد حسین حسان ندوی

فروری ۱۹۷۴ء

قیمت ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

## فہرست مضامین



پرنٹر پبلشر سید احمد دلّی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دلّی میں چھپوا کر۔
جامعہ نگر نئی دلّی نمبر ۲۵ سے شائع کیا

# بچّوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ارکانِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | 1/50 |
| [illegible]ن حضرت | الیاس احمد مجیبی (اُردو) | -/65 |
| پاک کہانیاں (دو حصوں میں) | مقبول احمد سیوہاروی | 2/35 |
| چار یار | الیاس احمد مجیبی | 1/30 |
| خلفائے اربعہؓ | خواجہ عبدالحیؒ فاروقی | 2/25 |
| رسول پاکؐ | عبدالواحد سندھی | 1/80 |
| عقائدِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/50 |
| مسلمان بیبیاں | مولانا اعجاز الحق قدوسی | -/75 |
| نبیوں کے قصے | خواجہ عبدالحی فاروقی | 2/25 |
| ہمارے رسول | " | 1/65 |
| ہمارے نبی | سید نواب علی رضوی (اُردو) ہندی | 1/75 -/140 |
| سرکارِ دوعالم | محمد حسین حسّان ندوی | 2/75 |

## معلومات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آدمی کی کہانی | مشتاق احمد | 1/75 |
| انوکھا عجائب خانہ | محمد حسین حسّان (چار حصے) | 1/80 |
| بجلی کی کہانی | علی احمد خاں | -/50 |
| بڑے دادا کی کہانی | محمد عبدالغفور | -/56 |
| تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل) | خجستہ سلطان | -/80 |
| " " " (دوم) | ضیاء الرحمن | 1/- |
| " " " (سوم) | مشتاق احمد اعظمی | 1/80 |
| " " " (چہارم) | " | -/95 |
| چٹانوں کی کہانی | محمد امین | 1/75 |
| عجائب رسانی کے طریقے | رفیعہ منظور الامین | -/85 |
| دُنیا کے بچے | محمد حسین حسّان | 1/- |
| دہلی | ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی | 1/80 |
| رابندر ناتھ ٹیگور | صفدر حسین | 1/25 |
| سماجی زندگی (اوّل) | احمد شبیل و غلام ابرار | -/56 |
| " (دوم) | " " | -/81 |
| " (سوم) | " " | -/81 |
| سمندر کے کنارے | سلطانہ آصف فیضی | 1/30 |
| سمندر کے نیچے | " " | 2/- |
| قدرت کے کرشمے | ادارہ | -/65 |
| میر انیس | محمد حسین حسّان | 1/25 |
| ہماری پارلیمنٹ | کیلاش چندر | 1/25 |

## کہانیاں، ڈرامے، ناول

| کتاب | | مصنف | قیمت |
|---|---|---|---|
| جن جھن عبدالرحمن | (ناول) | (دو حصے) | 4/- |
| اس نے کیا کرنہ جانا | (کہانیاں) | آصفہ مجیب | -/37 |
| پریم کی جیت | (ڈراما) | آسداللہ کاظمی | -/37 |
| تانبیل خاں | (کہانی) | محمد حسین حسان | -/50 |
| ترکوں کی کہانیاں | ( " ) | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/55 |
| تیس مارخاں کے کارنامے | (ناول) | م۔ ندیم | -/50 |
| تین اناڑی | ( " ) | عصمت چغتائی | -/40 |
| چقماق کی ڈبیا | (کہانی) | برکت علی فراق | -/40 |
| چمپاوت کا آدم خور شیر | (سچی کہانی) | محمد معین | [illegible]5 |
| چنبیلی | | محمد حسین حسان | [illegible] |
| ستاروں کی سیر | (ناول) | کرشن چندر | [illegible]5 |
| کوے دادا | (سچا ناول) | مجیب احمد خاں | [illegible]5 |
| لال مرغی | (کہانی) | عبدالواحد سندھی | [illegible] |
| مزہ چکھائیں گے | ( " ) | مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | |
| مزہ دار پہیلیاں | (پہیلیاں) | محمود علی خاں | |
| ننھا شتو | (کہانی) | خورشید سلطان | [illegible] |

# بچوں سے باتیں

پچھلے کئی مہینوں سے کاغذ کی کم یابی یا نایابی کا ذکر آ چکا ہے۔ یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اچانک آپ کا پیام تعلیم بھی اس کا شکار ہو جائے گا۔ جنوری کا پرچہ وقت سے پہلے تیار ہو گیا۔ وقت سے پہلے چھپ گیا۔ اب جو ٹائٹل کی باری آئی تو بازار میں کاغذ غائب! بہت دنوں دوڑ دھوپ کی گئی۔ آخر خدا خدا کر کے مل تو گیا مگر بہت مشکلوں سے۔ اور قیمت؟ بس یہ بات پردے ہی میں رہنے دیجیے۔ یہی غنیمت سمجھیے کہ نادر شے سونے کے بھاؤ مل گئی اور کم سے کم چار مہینوں کے لیے اطمینان ہو گیا۔

---

پچھلے پرچے میں خلیق انجم صاحب اشرفی کی کہانی کی قسط شایع نہیں ہو سکی تھی۔ خلیق انجم صاحب اپنی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے کہانی کی یہ قسط ہمیں نہیں بھیج سکے تھے۔ کہانی کا یہ حصّہ بہت دلچسپ ہے اور مہم جوئی یا ایڈونیچر کا مثالی نمونہ ہے اسے پڑھ کر کیا عجب جو آپ میں بھی بڑے کام کرنے، خطرے میں پڑ کر ہمت اور مستقل مزاجی کا حوصلہ پیدا ہو۔ خلیق انجم صاحب نے فرمایا ہے کہ اگلی قسط اور بھی دلچسپ ہو گی۔ اور اخباری لب و لہجے میں بہت سنسنی خیز ہو گی۔

---

ہمارے محترم مضمون نگار جمیل قریشی صاحب بھی اپنا قیمتی اور معلوماتی مضمون وقت پر نہ بھیج سکے تھے۔ اب یہ آپ اس پرچے میں پڑھیے۔ "دنیا کا سب سے چھوٹا شہر" مضمون پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ سچ مچ یہ کیسا عجیب و غریب شہر ہے۔ کاش ہم اس شہر کی تصویریں بھی شایع کر سکتے۔ تصویروں سے اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی۔ آپ کو بھی مزہ آجاتا۔

جمیل قریشی صاحب نے ایک اور مضمون ہالینڈ کے بین الاقوامی شہر "ہیگ" پر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ خدا کرے یہ مضمون (مارچ کے لیے) قریشی صاحب وقت پر مرحمت فرما سکیں۔

---

ہمارے اور پیام تعلیم کے بہت ہی مخلص کرم فرما مجی خالد عرفان صاحب ایم ایس سی بہت دنوں سے خاموش تھے مصروفیت اتنی تھی کہ باوجود خواہش کے پیام تعلیم کے لیے کچھ لکھ نہیں پاتے تھے۔ خالد صاحب کو اس کا بہت احساس تھا آخر وہ آپ کے پیام تعلیم کے لیے تھوڑا وقت نکال سکے اور ایک بہت اچھا سائنسی مضمون آپ کے لیے لکھ سکے یہ مضمون واقعی بہت دلچسپ ہے۔ خالد صاحب نے آیندہ بھی اس سلسلے کو جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مگر اس کے لیے انھوں نے ایک شرط رکھی ہے — یہ کہ آپ کو بھی پسند آئے اور اس کے بارے میں آپ اپنی رائے بھی لکھیں۔ یہ مضمون ان شاء اللہ اگلے پرچے میں شایع ہو گا۔

---

اس پرچے میں ایک مضمون شاہد عظیم صاحب (حیدرآباد) کا پڑھیے، بہت معلوماتی مضمون ہے۔ بہت اچھے بہت دلچسپ انداز میں لکھا گیا اس طرح کے مضمونوں کی ہمیں آپ کو سب کو ضرورت ہے موسموں کی پیشین گوئی کے سلسلے میں یورپ اور امریکہ بہت آگے ہیں کہتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں ۹۰ فی صدی پیشین گوئیاں صحیح ثابت

ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں موسم کا صحیح حال معلوم کرنے کے لیے نئے نئے آلات ایجاد ہوگئے ہیں اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔ ہمارا دیس بھی اس معاملے میں تیزی سے ترقی کررہا ہے۔

---

پچھلے چند مہینوں سے محب محترم جناب شفیع الدین صاحب نیّر کی نوازشوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ایک اچھی سی نظم، اس پرچے میں پڑھیے گا۔ دعا کیجیے کہ یہ سلسلہ آیندہ بھی جاری رہے۔

---

فروری میں مرزا غالب کی برسی کی تقریب منائی جاتی ہے آپ کو یاد ہوگا۔ پچھلے دنوں ہم نے بہت شان دار غالب نمبر نکالا تھا۔ اس مرتبہ ہمارے پرانے مضمون نگار اور شاعر محترم مفتون کوٹوی نے ایک دلچسپ نظم بھیجی ہے ایک نظم محسن نیاز صاحب اور ایک شفیع کلکتوی صاحب کی پڑھیے گا۔

---

محترمہ آصفہ مجیب کے سفرنامے (چند دن کشمیر میں) کی آخری قسط اس پرچے میں پڑھیے گا۔ محترمہ آصفہ مجیب کے لکھنے کا انداز ایسا سادہ اور دلچسپ ہے۔ زبان عام بول چال کی اور اتنی گھریلو ہے کہ ہر بچّہ یا بڑا، بڑے شوق اور چاہت سے ان کا مضمون پڑھتا ہے۔ امید ہے کہ محترمہ آیندہ بھی اور عنوان پر لکھنے کی طرح ڈالیں گی۔

---

عزیزی بدر وقاص ایڈی کی کہانی پچھلے مہینے شایع ہونی چاہیے تھی۔ کاتب صاحب سے کسی غلط فہمی کے سبب وقت پر اسے لکھ نہیں پائے۔ یہ اس پرچے میں چھپ رہی ہے۔

---

جنوری کے دوسرے ہفتے میں اُردو کے مشہور اخبار نویس جناب سید انیس الرحمٰن کا انتقال ہوگیا اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ مرحوم بہت پرانے نیشلسٹ مسلمان تھے۔ شروع سے اپنے قلم کے ذریعے دیس کی خدمت کرتے رہے۔ بہار وطن تھا وہاں سے اخبار نکالا الہ آباد سے نئی زندگی نکالا۔ حیدرآباد سے ایک روزانہ اخبار شعیب نکالا۔ کئی سال ہوئے۔ دلی تشریف لے آئے تھے اور یہاں سے ایک روزنامہ ملک و ملّت اور ایک ہفتہ وار اخبار پرچم ہند نکالتے تھے۔ اُن کی موت سے دیس خصوصاً ہماری اُردو ایک ماہر اخبار نویس سے محروم ہوگئی۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا ہو آمین۔

---

بڑوں کے لیے

## مکتبہ جامعہ کی چند نئی کتابیں

نئے انتظام کے بعد مکتبے نے بہترین ادیبوں اور مصنفوں کی کتابیں شایع کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ بہت سی کتابیں شایع ہوچکی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے اس نے چند اور نہایت بہتر کتابیں شایع کی ہیں ہمیں امید ہے کہ ہمارے پیامیوں کے سرپرست اور بزرگ خصوصی توجہ فرمائیں گے۔ کتابوں کے نام یہ ہیں۔

| کتاب | مصنف |
| --- | --- |
| ۱۔ مضحکات و طنزیات | رشید احمد صدیقی |
| ۲۔ ہمارے ذاکر صاحب | ״ ״ ״ |
| ۳۔ مسلمان اور سیکولر ہندوستان | ڈاکٹر مشیر الحق |
| ۴۔ نظر اور نظریے | آل احمد سرور |
| ۵۔ ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں | ڈاکٹر سالم قدوائی |

جناب محمد شفیع الدین نیّر

# خدا کے حضور میں دعا

دُنیا ساری تیری ہے مولا ، ساری دنیا تیری ہے
ہوتا ہے دن رات تماشا ساری لیلا تیری ہے

سورج تیرا ، چاند بھی تیرا ، تیرے سارے تارے ہیں
بجلی چمکے ، بادل گرجے ، سب تیرے ہی اشارے ہیں

سورج نکلا دن کہلایا ، سورج ڈوبا رات ہوئی
جاڑا آیا ، گرمی آئی ، گرمی سے برسات ہوئی

دُنیا کے سارے منظر روپ ہیں تیری قدرت کے
مٹّی ، پانی ، آگ ، ہوا ، بہروپ ہیں تیری قوّت کے

مسجد تیری ، گرجا تیرا ، مندر ، و ، گُردوارے بھی
تو ہے مالک ، ہم سب بندے ، گورے بھی اور کالے بھی

تو نے ہمیں انسان بنایا ، اُنس ہمارا کام ہوا
دنیا کی اِس نگری میں ، اِس اُنس سے ہر اک رام ہوا

گھُل مِل کر رہنے کی ہم انسانوں کو عادت دی
دُنیا کے صدمے مِل جُل کر سہ لینے کی طاقت دی

ہاتھ اور پاؤں ، کان اور ناک اور آنکھیں ہیں اکرام ترے
کیسے کیسے اچھے اچھے عضو ہیں یہ انعام ترے

عقل کی ایسی دولت بخشی ، جس سے ہم اپنے کام بنائیں
علم کی ایسی نعمت بھی دی ، جس سے دنیا میں سُکھ پائیں

یا اللہ ! ہمارے دل میں پاپ نہ رہنے پائے ذرا
پریم کی پیاری پیاری اگنی ، سینوں کو گرمائے سدا

نیّر کو توفیق عطا کر وہ بھی کچھ خدمت کر جائے
وہ بھی فرض اپنا پہچانے ، پورا اس کو کر کے دکھائے

( بشکریہ نور رام پور

جمیل احمد قریشی

# دنیا کا سب سے چھوٹا شہر




آئیے آج آپ کو ہالینڈ کے بچوں کے شہر کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے چھوٹا شہر ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ کیونکہ ہالینڈ تو خود دنیا کا بہت چھوٹا ملک ہے۔ چھوٹے میں چھوٹا شہر!

بات کچھ عجیب سی ہے پر یہی ہے حقیقت سچ مچ یہ ایک عجیب شہر ہے۔ بہت خوبصورت دیکھنے والے بڑے بچے سب حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ ہم نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو جی چاہا کہ بار بار دیکھیں۔ یہ ننھا منا شہر لگ بھگ قریب دس ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے اور دیکھنے والوں کو تقریباً دو میل چلنا پڑتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ خود بھی اس شہر ہی میں گھوم رہے ہیں۔ تھکاوٹ بالکل نہیں ہوتی ہے۔ پورے ملک ہالینڈ کو ایک چھوٹی سی جگہ دیکھنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ خوب تفریح ہوتی ہے۔

اس شہر کا نام مدورودام ہے۔ مشہور شہر ہیگ میں واقع ہے۔ ہالینڈ کی لائنڈن یونیورسٹی کا ایک طالب علم تھا اس کا نام جارج مدورو تھا۔ یہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سپاہی بننا پسند کیا اور ملک کی خاطر جان دے دی۔ اس لڑکے کے وارثین نے یہ شہر بنوایا اور سارا خرچ خود برداشت کیا۔

اب اس کی آمدنی بہت ہے۔ یہ سب اس ملک کے بچوں کی فلاح پر خرچ ہوتی ہے۔

یہ پورا شہر دو سال میں بن کر تیار ہوا۔ ۲۔ جولائی ۱۹۵۲/۶ کو ہالینڈ کی ملکہ شہزادی بیٹرکس نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اب اس کی نگرانی بھی شہزادی ہی ہیں۔

شروع میں جب یہ شہر بنا تو صرف ایک گرجا گھر تھا کچھ پرانے زمانے کے مکان بنے تھے۔ تم جانتے ہو شہر بس جاتے ہیں، شہر بڑھتے رہتے ہیں۔ مادورودام بھی برابر بڑھتا رہا ہے۔ پھر بھی یہ چھوٹا شہر ہے۔ لیکن یہ بہت مصروف ہے۔ اگر تم کو صرف یہ شہر دکھایا جائے تو پورے ہالینڈ کو دیکھنے کا مزا آجائے۔ اس کے مکان، دکانیں اور بازار سب اسی طرح بنے ہوتے ہیں جس طرح بڑے مکان بنتے ہیں بڑی بڑی دکانیں بنتی ہیں۔ اس کے بنانے میں چھوٹی چھوٹی اینٹیں، پتھر اور سیمنٹ استعمال کیا گیا ہے دروازے اور کھڑکیاں لکڑی کی۔ کھڑکیوں پر صاف شیشے، شیشوں میں سے اندر کا سب کچھ دکھائی دیتا ہے اسی طرح کی ریلیں، موٹریں، بسیں اور گاڑیاں سمندر میں چلنے والے اور ہوا میں اڑنے والے جہاز بالکل جیسے سچ مچ کے، اور پھر تعریف یہ کہ سب چلتے بھی

ہوتے۔ مکانوں کے آگے پھولوں کی کیاریاں سڑکوں پر
درخت اور چلتے پھرتے آدمی، دکانوں پر ساری چیزیں
سجی ہوئی۔ اسکول میں بچے آتے جاتے ہوئے۔ گرجا
گھر، فیکٹریاں اور سینما سب معروف۔
اور یہ سب کچھ ۱-۱ انچ برابر ۲۵-۱ انچ کے
پیمانہ پر بنا ہوا۔

اس ملک کی مشہور تاریخی عمارتیں۔ مثلاً دنیا کے
ملکوں کے درمیان جھگڑے طے کرانے والی سب سے
بڑی عدالت "پیس پیلیس"، (امن کا محل) اسٹرڈم
اوٹرڈم، ہیگ، لائڈن مشہور شہر اور بہت سے مشہور
گرجا گھر اور میوزیم وغیرہ۔

اس ملک میں اب بھی شہزادی حکمراں ہے شہزادی
کا محل۔ اس کا بہت خوبصورت بینڈ باجا، قریب ہوا
دو میل لمبی چلتی پھرتی ریل گاڑی، ہوائی اڈا جہاں
جہاز گھومتے ہوئے۔ ہوائی اڈے پر جہازوں کی آمدورفت
معروف سمندر، دریا اور نہریں یہ سب کچھ چھوٹے چھوٹے
لیکن بالکل بڑے جیسے۔

رات کو یہ شہر اور بھی زیادہ خوبصورت معلوم
ہوتا ہے۔ تقریباً . . . ۴۶ ہزار بجلی کے بلب روشن ہوتے
ہیں۔ سارا شہر جگمگا جاتا ہے مکانوں اور سب عمارتوں
کے اندر روشنی ہی روشنی بازاروں میں بھی بالکل ایسی
ہی روشنی۔ دریا اور نہروں کے پانی پر بجلی کی روشنی
کا خوبصورت عکس، رنگ برنگے پھول، ہری
ہری گھاس پر سوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اسے
روشنی کا شہر بھی کہا جاتا ہے

اس شہر میں داخل ہونے کا ایک دروازہ
ہے۔ جہاں لوگوں کی انہیں ٹکٹ خریدنے اور اندر
جانے کے لگے رہتی ہیں۔ اندر خوبصورت بازار اور ریسٹورنٹ
بھی ہیں۔ جہاں چیزیں خریدی اور کھائی جاسکتی ہیں۔ بچوں
کے کھلونے بھی بہت بکتے ہیں۔ یہاں دنیا کی مشہور نمائشیں
بھی لگی رہتی ہیں۔ لاکھوں آدمی ان نمائشوں کو دیکھ چکے ہیں۔
کہتے ہیں خود اس عجیب وغریب ننھے منے شہر کو دیکھنے والوں کی
تعداد ایک کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ ہے۔ ***

---

# لطیفہ

ایک لڑکا — (دوسرے لڑکے سے) تم فٹ پاتھ پر چلنا
زیادہ پسند کرتے ہو یا سڑک پر؟
دوسرا لڑکا — میں اصل میں کار پر چلنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

★

ڈاکٹر — (حادثہ کے شکار لڑکے سے) تم بیچ سڑک پہ
کیوں چل رہے تھے؟
زخمی لڑکا — فٹ پاتھ پہ سائیکل والے لوگ اس
کثرت سے چل رہے تھے کہ میں نے سمجھا
آج سے فٹ پاتھ سواریوں کے لیے اور
سڑک پیدل والوں کے لیے کھول دی گئی ہے۔

★

ایک آدمی — (لڑکے سے) کیوں لڑکے! تم کیلے کھا کر
اس کے چھلکے فٹ پاتھ پر کیوں پھینک
رہے ہو؟
لڑکا — (بھولے پن سے) کیلے کے چھلکے سڑک پر پھینکنے
سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے کوئی گرتا ہی نہیں
ہے۔ ہاں فٹ پاتھ پر پھینکنے سے یہ فائدہ ہے
کہ لوگ گرتے ہیں اور ان کا تماشا دیکھنے میں مزہ آتا

جناب مفتوں کوٹوی

# غالب اور آم

نہ تھے شاعر ہی کچھ بڑے غالب  دِل لگی میں بھی خوب تھے غالب
خوب ہنستے ہنساتے رہتے تھے  بڑی پُر لطف بات کہتے تھے
آم اُن کو پسند تھے بے حد  یعنی رسیا تھے آم کے بے حد
خود بھی بازار سے منگاتے تھے  دوست بھی آم ان کو بھجواتے
پھر بھی آموں سے جی نہ بھرتا تھا  آم کا شوق ان کو اتنا تھا

ان کے قصے تمھیں سنائیں ہم
اُن کی باتوں سے کچھ ہنسائیں ہم

ایک محفل میں وہ بھی بیٹھے تھے  لوگ آموں کا ذکر کرتے تھے

آم ایسا ہو آم ویسا ہو  پوچھا غالبؔ سے آم کیسا ہو ؟
بولے غالبؔ کہ پوچھتے ہو اگر  صرف دو خوبیوں پہ رکھیے نظر

بات پہلی یہ ہے کہ میٹھا ہو
دوسری بات یہ کہ بہت سا ہو

ایک دن دوست اُن کے گھر آئے
آم غالب نے تھے بہت کھائے

سامنے گھر کے تھے پڑے چھلکے
اس گلی میں سے کچھ گدھے گزرے

ان گدھوں نے نہ چھلکے وہ کھائے
سونگھ کر ان کو بڑھ گئے آگے

دوست نے جب یہ ماجرا دیکھا
سوچا غالب کو اب ہے سمجھانا

کیوں کہ آموں سے ان کو نفرت تھی
ناپسند ان کو ان کی لذت تھی

دوست بولے۔ ہے شے بُری سی آم
دیکھو کھاتے نہیں گدھے بھی آم

ہنس کے غالب یہ دوست سے بولے
جی ہاں، بے شک، گدھے نہیں کھاتے

---

بادشاہ کر رہے تھے سیر باغ
خوش تھا آموں سے ان کا قلب و دماغ

بادشاہ کے تھے ساتھ غالب بھی
ڈالتے تھے نظر وہ للچائی

جی میں یہ تھا کہ خوب کھائیں آم
بادشاہ سے جو آج پائیں آم

گھورتے تھے جو غالب آموں کو
بادشاہ بولے گھورتے کیا ہو؟

بادشاہ سے یہ بولے وہ ہنس کر
مہر ہوتی ہے دانے دانے پر

دیکھتا ہوں میں گھور کر یوں آم
شاید اِن پر لکھا ہو میرا نام

مقصد ان کا جو بادشاہ پائے
پھر بہت آم ان کو بھجوائے

محترمہ آصفہ مجیب




(۵)

میری مشکل یہ تھی کہ ہر وقت ان کی صحت کی فکر رہتی کہ کسی چیز سے نقصان نہ پہنچے اور بحث میں وہ مجھے اور انس صاحب کو دونوں کو قائل کر دیتے۔

انس صاحب کو انھوں نے بڑے اصرار سے گلمرگ بھیجا۔ انھوں نے ابھی دیکھا نہیں تھا۔ ان سے کہا "اگر آپ برف پر نہ گئے تو میں سمجھوں گا آپ کا گلمرگ جانا بیکار رہا۔"

گلمرگ بہت اونچائی پر ہے۔ وہاں خوب سردی پڑتی ہے۔ کھلن مرگ سے اوپر آتش لائن ہے۔ لوگ برف پر چلتے ہیں اور پھسلنے والی گاڑیاں ہوتی ہیں ان پر بیٹھتے ہیں۔ انس صاحب نے بتایا کہ ایک خاتون بےچاری گاڑی سے لڑھک گئیں۔

پہلے، تنگ مرگ سے اوپر تک گھوڑوں پر جاتے تھے بیچ میں بسیں اور موٹریں چلنے لگیں۔ انس صاحب نے کہا بس کنڈکٹر نے ان سے یہ واقعہ بیان کیا کہ اسی زمانہ میں اندرا جی آئیں تو گھوڑے والے ان کے پاس پہنچے اور اپنا دکھڑا رونے لگے۔ ان سے درخواست کی کہ بسیں بند کروا دیجیے ان کی روزی کا معاملہ ہے۔ اندرا جی نے حکم دیا کہ بسیں اور موٹریں عام طور سے بند کرادی جائیں۔ تب سے پھر گھوڑے چلنے لگے اور گھوڑے والوں کی کمائی ہونے لگی۔ وہاں کے گھوڑے بھی ایسے سدھے ہوتے ہیں کہ خطرناک راستوں پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

پھر ایک دن صاحب نے انس صاحب کو شنکراچاریہ پہاڑ پر بھیجا۔ ان کو یہ خیال رہتا کہ یہ پہلی دفعہ کشمیر آئے ہیں جو کچھ دیکھ سکیں دیکھ لیں۔ شنکراچاریہ ایک ہزار فٹ۔ پہلے موٹر سے گئے پھر ایک میل پیدل چڑھے۔

رات کو کھانے پر چٹرجی صاحب سے ملاقات ہوئی یہ کلکتہ سے سرکاری کام سے آئے ہیں۔ ان کی بیوی دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ دونوں صاحب کو جانتے ہیں۔ گسٹ ہاؤس میں زیادہ تر لوگ جو آئے ہیں صاحب کو جانتے ہیں۔ کھانے کی لمبی سی میز کبھی بھری ہوتی ہے۔ کبھی دو تین چار رہ ہوتے ہیں۔ بعض صرف ترکاری کھاتے ہیں۔ اس کا خاص طور سے الگ ہوتا ہے۔

کرم کا ساگ یہاں کی خاص ترکاری ہے۔ کہتے ہیں غریبوں کی غذا ہے۔ اس میں طاقت بھی ہے۔ چاول کے ساتھ کھاتے ہیں۔ پالک کی طرح ہوتی ہے۔ پتے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ مجھے پسند ہے۔ جب پکتی ہے میں ضرور کھاتی ہوں۔ راز ما ایک طرح کی دال ہے سیم کے بیج کی طرح بہت خستہ ہوتی ہے۔ وہ بھی یہاں شوق سے لوگ کھاتے ہیں۔ غنی صاحب لاکر دیتے اور کہتے "راز ما۔ جناب راز ما یہ ضرور کھائیے"

ایک دن جنبش مسعود صاحب سے ملاقات انھوں نے صاحب سے کہا۔ کہ وہ مرحوم ہمایوں کبیر صاحب

رہتے تھے اور ان سے آپ کا بہت تذکرہ رہتا تھا۔ میں نے
نذیر مسلم " ( صاحب کی تصنیف) پڑھی ہے بڑی اچھی
ب ہے۔ اور مختلف عنوانوں پر باتیں ہوتی رہیں۔

شام کو ہم دونوں سامنے بڑے لان پر جو سڑک کے پار
ا ٹہلنے گئے۔ خوشگوار ہوا اور اتنے بڑے سبزے کے میدان
ں ٹہلتے بڑا اچھا لگا۔ کہیں پر بچے گیند وغیرہ کھیل رہے ہیں —
ب طرف دو کشمیری عورتیں بچوں کو لیے گھاس پر بیٹھی ہیں۔ ایک
ے نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ ایک چھوٹا لڑکا پاس آیا
ر سلام کر کے ہاتھ ملایا۔ ایک لڑکی کا نام راجہ ہے اور لڑکے
نام اقبال ہے۔ لڑکی سے میں نے پوچھا "پڑھتی ہو؟"
لی "میں نہیں پڑھتی یہ لڑکا پڑھتا ہے" ہم لوگ تھوڑی
ور سڑک پر ٹہل کر واپس آ گئے۔

۲۰ جون کو بھگوان سہائے صاحب سے ملاقات
کے لیے صاحب داچی گام گئے۔ آجکل وہ داچی گام میں ٹھہرے
ہیں۔ ان کے لیے موٹر بھیجی آغا اشرف صاحب بھی ساتھ گئے۔

ایک دن دس گیارہ بجے ہوں گے جسٹس غلام حسن صاحب
بٹ مرحوم کی بیگم عائشہ بہن اور ان کی بیٹی نشاط ملنے آئیں۔
لکھنؤ سے آئی ہیں۔ یہاں ان کا ذاتی مکان ہے۔ گرمی میں یہاں
آتی ہیں۔ بڑی محبت سے ملیں۔ پرانے خاندانی تعلقات ہیں۔
لکھنؤ کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہ دور جو گذر گیا۔ وہ لوگ جو نہیں
رہے ان کا خیال اور افسوس۔

ایک روز بہت اصرار سے کھانے پر بلایا۔ کول صاحب
اور ان کی بیگم صاحبہ بھی کھانے پر آئیں۔ عائشہ بہن نے یہ پرانا
گھر بہت سلیقہ سے درست کرایا ہے۔ سیب وغیرہ کا باغ
بھی ہے۔ جگہ سنسان ہے کوئی آبادی نہیں دور تک۔
میں نے عائشہ بہن کے کمرے میں عشاء کی نماز پڑھی۔
قاعدے سے جانماز بچھی ہے۔ کھانے کے بعد
انھوں نے کہا "آصفہ پاندان رکھا ہے پان کھاؤ۔ ڈرائنگ
روم میں کونے کی طرف میز پر پاندان سجا ہوا تھا۔ میں نے پان
بنایا۔ انھوں نے پان کھایا۔ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔
اور تھوڑی دیر بیٹھے۔ یہاں کچھ لکھنؤ کی سی فضا اس پر
عائشہ بہن کی شیریں بیانی شستہ منجھی ہوئی بولی دل لبھانے
والی ہے۔ اب دیر ہوگئی ان سے اجازت لی۔ موٹر تک دونوں
پہنچانے آئیں۔

## شیپیان:-

آغا اشرف صاحب نے شیپیان جانے کا اور ایک
دو دن وہاں قیام کا انتظام کیا۔ شیپیان کافی دور ہے۔
اور نو ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ راستہ بہت دلکش ہے —
چشمے کی روانی اور جوش و خروش دیکھ کر مجھے غالب کا
یہ مصرع یاد آیا:

"موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں"

شیپیان بڑا قصبہ ہے یہاں ٹریننگ اسکول ہے۔ آغا
صاحب ٹریننگ کے ڈائرکٹر ہیں انھوں نے ڈاک بنگلہ میں
ٹھہرنے کا انتظام کرایا وہ ہم سے پہلے پہنچ گئے۔ ہم لوگوں
نے وہاں آ کر دوپہر کا کھانا کھایا کچھ استاد اور شاگرد بھی
موجود ہیں۔ اچھی خاصی دعوت ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر کے
اہربل گئے۔

## اہربل:-

یہ وہ خاص مقام ہے بہت بلندی پر جہاں سے چشمہ
پہاڑ سے نکلتا ہے اور جھاگ مارتا تیزی سے نیچے گرتا ہے۔
یہاں ایک ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ یہاں سے وہ مقام صاف
نظر آتا ہے جہاں اس چشمہ سے پانی پیتے ہوئے ایک لڑکی

اور دو لڑکوں کا جو اسے بچانے گئے تھے ڈوبنے کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اب وہاں دور تک تار کھینچ دیئے گئے ہیں کہ کوئی چشمہ تک نہ جائے۔

صاحب پچھلے سال آغا صاحب اور صوفیہ اشرف کے ساتھ چشمہ تک گئے تھے اور اب بھی ان کا جی چاہا کہ جائیں راستہ تلاش کرنے لگے کئی لوگ ان کے ساتھ گئے اور وہ کافی نیچے تک اتر گئے۔ پتھر ہی پتھر ہیں بار بار پیر پھسل جاتا۔ میں بہت گھبرائی ایک صاحبزادے میرے ساتھ چلے تھوڑی دور چلی اور تھک کر واپس آئی اور جب صاحب اور انس صاحب لوٹ آئے تو جی میں جی آیا۔ ڈاک بنگلہ سے چشمہ کا نظارہ اور پانی کا شور بہت بھلا لگتا ہے وہاں چائے پی۔

شام ہونے لگی۔ آغا صاحب کو اور آگے جانا تھا وہ گھوڑے پر روانہ ہوئے ہم لوگ شپیان واپس آئے۔ نظیر اور عبدالرشید دو طالب علموں کو انھوں نے ہماری دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا۔ نظیر احمد اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ دونوں خوش اخلاق اور فرض شناس ہیں۔ ہر وقت ہر کام کے لیے حاضر۔ ذرا ذرا سی بات کی فکر۔

شام کو ہیڈ ماسٹر سندر صاحب تشریف لائے۔ ہم لوگ ایک پیڑ کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے۔ سردی بڑھ گئی۔ ہوا ٹھنڈی چلنے لگی۔ میں وہاں سے مغرب کی نماز پڑھنے کمرے میں آئی۔ اس کے بعد بستر پر پڑ گئی۔

نہ معلوم سردی کھائی یا بلڈ پریشر بڑھ گیا طبیعت خراب ہو گئی۔ کچھ دوا ساتھ تھی وہ کھائی ایک دوا انس صاحب اور نظیر ہسپتال سے لینے دوڑے گئے۔ یہاں اچھا ہسپتال ہے۔ دوا مل گئی اس سے سکون ہوا۔ دوسرے دن سندر صاحب صبح ہی صبح تشریف لائے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا مگر میں نے منع کیا کہ اب ٹھیک ہے طبیعت۔ نظیر احمد اور عبدالرشید نے جو خدمت اتنی اچھی طرح انجام دی۔ اس سے ان کی بڑی قدر دل میں بیٹھ گئی۔ یہاں ایک بڑی مسجد دیکھی جس کے بارے میں نظیر نے بیان کیا کہ چالیس برس ہوئے یہ چندہ سے بنی ہے۔ عورتوں نے اپنے زیور چندے میں دے دیئے۔

چلتے وقت ہم نے انعام کے طور پر لڑکوں کو کچھ دینا چاہا۔ نظیر نے صاحب سے درخواست کی کہ آپ ہمیں یہ لکھ کر دے دیں کہ "آپ یہاں تشریف لائے اور دو دن ہم آپ کے ساتھ رہے — یہ تحریر ہمارے لیے ایک یادگار ہوگی" انس صاحب نے لکھ کر صاحب سے دستخط کرکے دے دیا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ اور ہم بھی یہاں کی خوشگوار یاد اور اثر لیے ہوئے سری نگر واپس آئے۔

## پہلگام

سری نگر سے ساٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ تین ہزار فٹ سری نگر سے اونچا ہے۔ سری نگر پانچ ہزار فٹ بلندی پر ہے۔ صاحب اور انس صاحب دن بھر کے لیے وہاں گئے۔ میری طبیعت سست ہے بلڈ پریشر بڑھنے کے خیال سے میں نہیں گئی۔ کئی برس ہوئے جب گئی تھی۔ راستہ بہت حسین ہے۔ سیاح بہت آتے ہیں۔ اچھے اچھے ہٹ وغیرہ بنے ہیں۔ کچھ لوگ خیموں میں رہتے ہیں۔ آبادی بڑی ہے اور بازار اچھا ہے۔ بہت بڑے سرسبز میدان ہیں۔ دونوں طرف آبادی ہے اور بیچ میں بہت بڑا اور چوڑا چشمہ میٹھا سریلا نغمہ سناتا رہتا ہے۔ سلسلہ وار چھوٹی بڑی پہاڑیاں سبزے سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ انس صاحب نے بیان کیا کہ صاحب وہاں کی پہاڑیوں

پر چڑھے ایک سے دوسری پر۔ اور ایک جگہ ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ اپنے بیٹے معین مرحوم کو یاد کرکے ان پر رقت طاری ہوگئی۔ وہ یہاں پر ان کو لایا تھا۔ اسے کشمیر سے عشق تھا۔ انس صاحب اور صدیق صاحب بھی متاثر ہوگئے۔ صاحب آئے تو بہت نڈھال سے۔ انھوں نے عجیب حسرت سے کہا۔ اب مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔ اطمینان سے دہلی چلا جاؤں گا۔" میرے دل کا زخم تازہ ہوگیا۔ کیا ہم کبھی اسے بھول سکتے ہیں۔ کتنی بہت سی خوبیاں اس میں یکجا تھیں۔ سب کا پیارا تھا۔ خدا کو بھی پیارا ہوا۔ قضا و قدر سے انسان مجبور ہے۔

۲۔ جولائی کو دہلی جانے کے لیے سیٹیں رزرو ہوگئیں۔ پہلی کو ناشتے پر غنی نے مجھے چپکے سے مشورہ دیا "صاحب آپ شیخ عبداللہ کی بیگم سے مل لو۔ ہاں" مجھے بہت خوشی ہوئی انھوں نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے انس صاحب سے کہا کہ فون کیجیے کہ صاحب شیخ صاحب سے ملنا چاہتے تھے انھوں نے دس بجے کا وقت ہم لوگوں کو دیا۔ چلتے وقت دیکھا کہ غنی صاحب بھی بہت سے گلاب کے پھول لیے جانے کو تیار ہیں۔ انھوں نے مسکرا کر کہا۔ "اُن کو گلاب کے پھول بہت پسند ہیں۔" کچھ دور پر ان کی کوٹھی ہے۔ ہمیں دیکھ کر کمرے سے نکل آئے۔ موٹر کے پاس آکر مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ ایک طرف میرا ہاتھ پکڑا ایک طرف صاحب کا اور چند زینے طے کرکے کمرے میں آگئے۔ دو اور صاحب بیٹھے ہیں۔ بیگم صاحب کو اطلاع کرائی۔ غنی صاحب چائے بنا کر لائے اور مجھے لیمو کا پانی دیا۔ انھیں یہاں بھی اس کا خیال رہا کہ میں اس وقت لیموں کا پانی پیتی ہوں۔ وہ بہت خوش نظر آرہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنے گھر میں ہیں۔ یہیں کام کرتے ہیں۔ انھیں شیخ صاحب سے محبت اور عقیدت ہے۔ اور ایک دفعہ مجھے بتایا کہ برسوں ان کے ساتھ رہے ہیں کہا" شیخ صاحب کی شادی ہمارے سامنے ہوا جناب"

شیخ صاحب نے صاحب سے کہا۔ "ابھی نہ جائیے گا پہلگام میں کچھ دن رہیے" انھوں نے کہا۔ "بس ایک ہی دن کے لیے جا سکا۔ جب انھیں بتایا کہ نائب صدر صاحب تشریف لائے ہیں۔ آجکل ان کی وجہ سے سب جگہیں رزرو ہوگئیں تو انھوں نے فرمایا مجھے پہلے معلوم ہوتا تو وہاں ایک ہٹ میں انتظام کرا دیتا۔ مجھ سے پوچھا آپ واچی گام میں کیوں نہیں ٹھہریں میں نے کہا" مجھے بڑا افسوس رہا لیکن جلدی میں دوائیاں وغیرہ ساتھ نہیں لے سکی اور چلی آئی۔ ذرا دیر میں بیگم صاحبہ سے ملنے ان کے کمرے میں گئی۔ ایک بڑے ہال میں پورے میں فرش لگا ہے اور کنارے کنارے گاؤ تکیے۔ وہ خندہ پیشانی سے ملیں اور گاؤ تکیے کے سہارے انھوں نے اپنے پاس بٹھایا۔ وہ شلوار اور لانبا کرتا پہنے ہیں سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا ہے۔ میں ایک مدت کے بعد ان سے ملی جب شیخ صاحب کشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اس کے بعد دہلی میں ایک مرتبہ مردولا سارابائی کے گھر۔ میں نے کہا "میرا بہت دل چاہتا تھا ملنے کا کتنی مدت کے بعد موقع ملا۔

بچوں کے بارے میں ان سے پوچھا۔ انھوں نے حال بتایا اور اس زمانے کا ذکر کیا جب شیخ صاحب نظر بند تھے۔ کہا بچوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد میں جانے کے لیے اٹھی تو انھوں نے کہا آپ جیسی بزرگوں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے اور اب یہاں یوپی والے نظر ہی نہیں آتے۔

وہ میرے ساتھ ہی اٹھیں اور صاحب سے ملیں ان کا مزاج پوچھا۔ وہ اور شیخ صاحب بھی کھڑے

ہو گئے اور ہمیں موٹر تک پہنچانے آئے۔

رات کو آغا صاحب کے یہاں پر لطف دعوت ہوئی۔

۱۰۔ جولائی ساڑھے نو بجے کشمیر کے وزیر اعلیٰ قاسم صاحب سے صاحب کی ملاقات کا وقت طے ہوا تھا۔ وہ آغا صاحب کے ساتھ ملنے گئے۔ انھوں نے آ کر بتایا کہ جب صاحب نے ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا تو انھوں نے فرمایا "میں آپ کا عزیز ہوں"۔ کشمیر میں "عزیز" کے معنی "چھوٹا" ہیں جو خصوصیت سے تعظیم کے طور پر بولتے ہیں۔ جس سے انکساری کا اظہار ہوتا ہے۔

دوپہر کو بارہ بجے ہم گسٹ ہاؤس سے روانہ ہوئے۔ آغا صاحب اور سبھا اور لالہ پہنچانے آئے۔ چونکہ ہوائی جہاز آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔ مسافروں کو ایرڈ روم پر لنچ دے دیا۔ ہم اس میں شریک ہوئے۔ اور دو بجے کشمیر کو خیر باد کہا۔

# نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچّوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوسکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱.۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

۱۔ باپو (حصّہ اوّل) مصنف: سی ذی ناس مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ ״ (״ دوم) ״ : ״ ״ ״ : ״ ״
۳۔ کشمیر ״ : مالا سنگھ ״ : خدیجہ بیگم بتصویر: پرمانند
۴۔ پرندوں کی دنیا ״ : جمال آرا ״ : محمد شفیع الدین نیّر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر ״ : بریگیڈیر گیان سنگھ ״ : محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی ״ : لیلا مجمدار ״ : رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنّت کی سیر اور دوسری کہانیاں ״ : لیلا بھاگوت ״ : ״ ״ ״
۸۔ رسیلی کہانیاں ״ : منوج داس ״ : صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل) ״ : وشنو پربھاکر ״ : انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں ״ : جگ جیت سنگھ ״ : عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیّاح ״ : کے. سی. کھنہ تصاویر: کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں ״ : اوما آنند مترجم: رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خالہ بلّی کا خاندان ״ : بمنوہر داس چترویدی ״ : محمد شفیع الدین نیّر
۱۴۔ بہت دن ہوئے (حصّہ اوّل) ״ : چوکسی بی ام جوشی ״ : رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں ״ : راجندر اوستھی ״ : انور کمال حسینی
۱۶۔ رتو ہنت و ستدیہ مصنف: بکرشن جینیہ مترجم: انور کمال حسینی
۱۷۔ سدا بہار کہانیاں ״ : شانتا رنگا چاری ״ : ״ ״ ״
۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دُنیا بدل ڈالی ״ : میر نجابت علی ״ : سیّد احسان
۱۹۔ ״ ״ (دوم) ״ : ״ ״ ״ ״ : ״ ״
۲۰۔ بڑا پانی ״ : لیلا مجمدار ״ : صالحہ عابد حسین
۲۱۔ سورا ״ : ملک راج آنند ״ : انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل ״ : سرویندر سانیال : پریتم لال

## ذاکر حسین سیریز

۲۳۔ ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت: ۲/
۲۴۔ انوکھی دکان ״ : قدسیہ زیدی ״ : ۲/۵۰
۲۵۔ گلا لو چوہیا اور پریشانی ״ : ״ ״ ״ : ۲/۰۰
۲۶۔ دنیا کے جانور ״ ״ ״ ״ ۲/۵۰
۲۷۔ راجہ رام موہن رائے ״ : عرش ملسیانی ״
(زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ (۲) اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ (۳) پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

جناب حافظ باقوی

# پھول

خوبصورت ہوں خوب سیرت ہوں
میں سراپا جمال و نکہت ہوں
میں ہوں نورِ نظر حسینوں کا
میں ہوں سرتاج نازنینوں کا
میں ہوں محبوب بادشاہوں کا
میں ہوں مرغوب کج کلاہوں کا
مجھ میں رعنائی ہے کچھ ایسی عجیب
چاہتے ہیں امیر ہوں کہ غریب
میرے طالب نہیں ہیں اک دو چند
مجھ کو کرتے ہیں سارے لوگ پسند

میری ہر انجمن میں چاہت ہے
مجھ سے ہر ایک کو محبّت ہے
سب ہیں مسرور میری صورت سے
سب ہیں مخمور میری نکہت سے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھلاتی ہے
گُد گُدا کر مجھے ہنساتی ہے
مجھ میں خورشید روپ بھرتا ہے
ہر پرندہ بھی پیار کرتا ہے
صبحدم میرا مُنہ دُھلاتی ہے
آکے شبنم وضو کراتی ہے
آئینہ ہوں میں نور و نکہت کا
ہوں کرشمہ خدا کی قدرت کا
رُوح میری ہے عطر کہلاتی
محفلوں کو ہے خوب مہکاتی
دوسروں کی خُوشی پہ مرتا ہوں
سب کا دل باغ باغ کرتا ہوں
سب کے سب بے غرض ہیں کام مرے
سامنے ہے رفاہِ عام مرے

سترھویں قسط

آر۔ ایم۔ بیلن۔ ٹائن
تلخیص و ترجمہ جناب خلیق انجم اشرفی

# مونگے کا جزیرہ

## دوسرا طوفان

ہم پنگوئنوں کے جزیرے سے رخصت ہوئے تو شام پھول رہی تھی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رات کسی ننھے سے جزیرے پر گزاریں اس لیے ہم بڑی تیزی سے چپو چلا رہے تھے لیکن ایک غیر متوقع خطرہ ہمارا منتظر تھا۔

اور وہ پیش آیا وہ ہوا جس نے ہمیں بڑی تیز رفتاری سے جزیرہ پنگوئن پہنچا دیا شام کے ساتھ ساتھ تیز ہونے لگی اور اس سے پہلے کہ ہم اس ننھے جزیرے کی طرف (جو ہماری منزلِ مقصود تھا) آدھے راستے بھی جا سکتے، یہ ہوا ایک زبردست طوفان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس کا رخ ایسا تو نہ تھا کہ وہ ہمیں اپنے راستے پر بڑھنے سے بالکل ہی روک دیتی پھر بھی خاصی رکاوٹ بن رہی تھی۔

سمندر کا زور اس جزیرے کی وجہ سے وہاں کچھ کم تھا لیکن جلد ہی موجیں تیزی سے اٹھ اٹھ کر ہماری ننھی کشتی سے ٹکرانے لگیں کشتی میں پانی بھرنے لگا اور ہمیں اپنی ننھی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے خاصی جد و جہد کرنی پڑی۔ جلد ہی ہوا اور سمندر اتنے خطرناک بن گئے کہ ہمیں جزیرے تک پہنچنا ناممکن سا نظر آنے لگا۔ جیک نے اچانک کشتی کا رخ دوسری طرف پھیر کر مجھے اور پیٹرکن کو بادبان کا ایک کونا کھولنے کو کہا۔ اس کا ارادہ جزیرہ پنگوئن کی طرف واپس جانے کا تھا۔

"وہاں ہمیں کم از کم جھاڑیوں کی پناہ تو مل ہی جائے گی" کشتی نے ہوا کے زور پر بہنا شروع کیا تو وہ بولا "اور پنگوئنیں ہماری ساتھی ہوں گی"

جیک نے بمشکل اپنی بات ختم کی ہو گی کہ ہوا کا رخ ایک دم بدل گیا اور وہ اتنی تیزی سے فراٹے بھرنے لگی کہ ہمیں بادبان کچھ اور کھولنا پڑا تاکہ ہم جزیرے تک جلدی پہنچ سکیں لیکن بات بن نہ سکی اور طوفان نے (جو ایسا لگتا تھا کہ قسطوں میں آ رہا ہے) ہمیں پریشان کر دیا۔

"کھڑے ہو جاؤ تم دونوں" جیک نے ایک تیز اور مضبوط آواز میں للکارا۔

"اور بادبان گرانے کے لیے تیار رہو۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم اس جزیرے تک نہیں پہنچ سکیں گے"

میں اور پیٹرکن ہر معاملے میں جیک پر بھروسا کرنے کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ کسی ایسے معاملے پر جو جیک کے سپرد ہو۔ غور تک کرنے کی زحمت نہ کرتے۔ اس لیے اب تک ہمیں ایک لمحے کو بھی کسی خطرہ کا شبہ نہ ہوا تھا اور ہم سمجھ رہے تھے کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے لیکن [illegible]

سے بھر دیئے۔ بہرحال ہمیں سوال وجواب کا موقع نہ ملا۔ کیونکہ جس لمحے اس نے یہ حکم دیا طوفانی ہوا کا ایک تیز جھونکا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت ہماری کشتی کا ایک سرا بار بار ڈوبتی ابھرتی موجوں میں چھپ رہا تھا اور اس جھونکے نے ہمیں آلیا۔ لیکن اسی لمحہ میں اور پیٹرکن بادبان گرا چکے تھے اور اس طرح ہماری کشتی الٹنے سے بچ گئی۔ لیکن یہ جھونکا گزر گیا تو ہم نے دیکھا کشتی آدھی سے زیادہ پانی سے بھر گئی تھی۔ میں نے تیزی سے سارا پانی باہر نکال پھینکا اور اسی دوران میں پیٹرکن نے بادبان کا ایک سرا پھر کھول دیا۔ اس کے باوجود جیک کو جس خطرہ کا ڈر تھا وہ پیش آہی گیا۔ ہم نے دیکھا طوفان نے ہمیں جزیرۂ پنگوئن سے دور کھلے سمندر میں لا پھینکا تھا اور اب وہاں لوٹنا قطعی ناممکن تھا۔ اس خطرناک صورت حال نے ہم پر یہ تلخ حقیقت بھی واضح کر دی کہ طوفان جلد ہی ہمیں اس بیکراں سمندر کے بیچ پھینک دے گا۔ اور اس ننھی سی کشتی میں موت آہستہ آہستہ ہمیں دبوچ لے گی۔

یہ خوفناک خیال ہمارے ذہنوں پر بری طرح چھا گیا۔ جس طرف ہوا پھینک رہی تھی، سمندر کی مہیب موجوں کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ چاروں طرف نظر ڈالی تو اس خیال کو اور تقویت ملی اور ہمارا خوف اور بڑھ گیا۔ ہم جزیروں کی پناہ گاہ سے بہت دور نکل آئے تھے اور اب تو ایسا لگ رہا تھا کہ آنے والی کوئی زبردست موج کسی لمحے بھی ہماری اس ننھی سی کشتی کو نگل لے گی اور یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔ پانی اب کشتی کے دونوں کناروں سے ٹکرا کر اندر بھر رہا تھا اور مجھے بڑی پھرتی سے مسلسل اسے باہر پھینکنا پڑ رہا تھا۔ جیک کشتی کی رہبری کر رہا تھا اور پیٹرکن نے بادبان سنبھال رکھا تھا۔

اچانک جیک نے ایک امید بھری چیخ ماری اور ایک جزیرے یا چٹان کی طرف اشارہ کیا جو بالکل ہمارے سامنے تھی۔ تاریک بادلوں اور اندھا کر دینے والے پانی کے مسلسل قطروں کے باعث (جو پوری ہوا میں بھر گئے تھے) ہم اسے پہلے نہیں دیکھ سکے تھے۔

اس چٹان کے نزدیک پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ اس پر درخت اور جھاڑیاں نہ تھیں اور وہ اتنی نیچی تھی کہ سمندر کا پانی اس کے اوپر سے بہہ رہا تھا۔ یہ کسی مونگے کی چٹان کی اوپری سطح تھی جو پانی سے چند فیٹ اوپر اٹھ آئی تھی اور اس طوفانی موسم میں تو بس کبھی کبھار نظر آجاتی تھی۔ موجیں پوری قوت سے اس چٹان پر سر پٹخ رہی تھیں اور یہ دیکھ کر ایک بار پھر ہمارے دل خوف سے بھر گئے کہ وہاں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں ہم کشتی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ مول لیے بغیر اسے ٹھہرا سکتے۔

"ذرا سا بادبان اور کھولو"، جب ہماری کشتی چٹان کے ایک سرے سے خوفناک تیزی سے گزرنے لگی تو جیک چلایا۔

پیٹرکن نے فوراً ایک فٹ بادبان اور کھول دیا۔ یوں تو بادبان کے اتنے ذرا سے حصے کا کھلنا کچھ نہ تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشتی تیز تیز جھکولے لینے لگی اور میں ہر لمحہ اس کے الٹنے کا منتظر رہا اور دل ہی دل میں جیک کو اس کی اس بے جگری کے لیے ملزم بھی گردانتا رہا۔ لیکن یہ حقیقتاً اس کے ساتھ ناانصافی تھی کیونکہ اگلے دو سیکنڈوں میں حالانکہ پانی ہماری کشتی میں دریا کے تیز بہاؤ کی طرح گھسا لیکن جیک نے بڑی کامیابی سے چٹان کی محفوظ سمت کی طرف ہماری رہنمائی کی جہاں پانی نسبتاً پرسکون تھا اور ہوا کی تیزی بھی کچھ کم تھی۔

"بہت خوب! اب چپو سنبھال لو لڑکو اور کھینا شروع کرو۔ ہم نے فوراً جیک کے حکم کی تعمیل کی۔ دونوں چپو ساتھ ساتھ پانی میں داخل ہوئے۔ ایک سخت دھکا اور بس۔ ہم ایک گزرگاہ میں داخل ہو گئے جو بالکل پرسکون تھی لیکن تھی اس قدر تنگ کہ ہماری ننھی سی کشتی بھی بمشکل اس میں داخل ہو سکی تھی۔ یہاں ہم بالکل محفوظ تھے اور جیسے ہی ہم چٹان کے کنارے پر کود کر کشتی کو چٹان سے باندھنے لگے میں نے دل کی گہرائیوں سے خدائے کریم کا شکر ادا کیا۔ جس نے ہمیں اتنے بڑے خطرے سے نکالا تھا۔"

ہم اب محفوظ تو تھے لیکن پھر بھی اس داستان کے پڑھنے والوں میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو یہ واقعہ پڑھ کر بھی اس وقت ہمارے ساتھ ہونے کی تمنا کریں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے پاس کھانے کی چیزوں کی کوئی کمی نہ تھی لیکن ہم پانی میں شرابور تھے ہمارے چاروں طرف سمندر خوفناک آواز میں گرج رہا تھا اور موجوں کے تھپیڑے ہمارے سروں پر لگ رہے تھے۔ یوں کہیے کہ ہم سوت کے کپڑوں کے بجائے پانی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جس جگہ ہم اترے تھے وہ بارہ گز مربع سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس جگہ سے آگے بڑھنے میں یہ خطرہ تھا کہ کہیں طوفان بہا نہ لے جائے۔ ایک کھاڑی کے دوسرے سرے پر ایک کھوکھلا حصہ یا غار تھا جس نے ہمیں ہوا اور موجوں کی تیزی سے محفوظ رکھا تھا اور چٹان کے اس سرے نے جو ہمارے سروں پر جھکا ہوا تھا ہمیں پانی کے قطروں سے بچا لیا تھا۔

"کیوں!" پیٹرکن نے جس کی خوش مزاجی عود کر آئی تھی بولا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم کسی مچھلی کے غار میں آ گئے ہیں کیونکہ ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے اور جہاں تک زمین و آسمان کا تعلق ہے وہ اب ماضی کی چیزیں بن چکی ہیں۔"

پیٹرکن کا یہ خیال حقیقت سے خاصا قریب تھا سمندر کا سفید جھاگ بھرا پانی ہمارے قدموں کو چوم رہا تھا۔ موجیں ہمارے سروں کی بلائیں لے رہی تھیں اور چٹان کے سائبان نما حصے سے مسلسل گرتا پانی ہماری نظروں کے سامنے کسی چادر کی طرح تنا ہوا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگ پانی کے اوپر نہیں اس کے اندر ہیں۔

"اچھا لڑکو!" جیک چلایا "آؤ اب ذرا آرام سے بیٹھیں۔ پیٹرکن تم ذرا کھانا نکالو اور رالف تم ذرا کشتی کو اوپر کھینچنے میں میری مدد کرو۔ ذرا جلدی۔"

ہم اپنے ساتھی کے خوشگوار اندازِ گفتگو سے بہت محظوظ ہوئے۔ خوش قسمتی سے غار زیادہ گہرا نہیں تھا۔ لیکن تھا بالکل خشک اور یوں ہم اپنی امید سے زیادہ آرام سے وہاں بیٹھ سکے۔ ہم کشتی سے کھانا نکال لائے۔ اپنے کپڑے نچوڑ کر خشک کیے۔ غار کے فرش پر بادبان بچھا دیا اور خوب ڈٹ کر کھانے کے بعد خاصا اطمینان محسوس کرنے لگے۔ لیکن جیسے جیسے رات قریب آتی گئی ہمارے دل پھر ڈوبنے لگے اور حوصلے پست ہوتے گئے کیونکہ دن کے ساتھ ساتھ ہماری حفاظت کے سارے سامان غائب ہو گئے۔ اب ہمیں وہ چٹان ہی نظر آتی بند ہو گئی جس پر ہم اترے تھے اور سمندر اسی تیزی اور تندی سے ہمارے چاروں طرف گرج رہا تھا۔

رات گہری اور تاریک تر ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ تاریکی اتنی گہری ہو گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینا تو الگ رہا ہاتھ آنکھوں کے سامنے لاتے پر بھی نظر آنے

بند ہوگئے تھے ہمیں بار بار ایک دوسرے کو چھو کر محسوس کرنا
(کیونکہ دیکھنا ممکن ہی نہ تھا) پڑتا تھا تاکہ یہ پتہ چلتا رہے
ایک دوسرے کی آواز بھی سننا بھی مشکل تھا۔

ہوا کے رُخ میں ذرا سی تبدیلی سے پانی کے قطرے
ہمارے منہ پر پڑنے لگے اور سمندر کا مجنونانہ ابال اتنا بڑھا
کہ وہ اس ننھی سی کھاڑی میں بھی گھس آیا اور یہ خطرہ پیدا ہو گیا
کہ کہیں ہماری کشتی بھی اس کے اس وحشیانہ غصے کی نذر نہ ہو جائے۔
اس خطرے سے بچنے کے لیے ہم نے کشتی کو اندر کی طرف کھینچ کر
اس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا

رہ رہ کر بجلی چمکتی تو ہمیں چاروں طرف کا بھیانک اور
ہولناک نظارے کی ایک جھلک نظر آجاتی لیکن اس کے باوجود
ہم بجلی کی اس چمک کی تمنا کرتے چونکہ وہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے
سے بہر صورت بہتر تھی جو اس عارضی روشنی کے بعد چھا جاتا تھا۔
بادلوں کی گرج الامان۔ بس یوں لگتا تھا کہ شاید آسمان دو ٹکڑوں
میں پھٹ رہا ہے۔ لیکن یہ آواز سمندر کے زبردست شور
سے گزر کر ہم تک پہنچتی تو اس کی تیزی ختم ہو جاتی۔ رفتہ
رفتہ موجوں کا زور اتنا بڑھا کہ ہم نے سوچا کہ شاید چٹان
رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑ رہی ہے اور خوفزدگی کے عالم
میں ہم نے غار کے فرش ہی کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا ---
ہمارے دل ہر لمحہ اس اندیشے سے لرز رہے تھے کہ کہیں
موجیں ہمیں بہا کر سیاہ سمندر کے حوالے نہ کر دیں۔

اوہ! کیسی بھیانک رات تھی وہ! اور کوئی ہمارے
ان حسرت بھرے جذبات کا اندازہ نہیں لگا سکتا جو ہمارے
دلوں میں دوسرے دن صبح کا ملگجا اُجالا پھیلتے دیکھ کر
پیدا ہوئے۔

تین دن اور تین راتیں ہم نے اس چٹان پر گزاریں
اور طوفان جاری رہا! چوتھے دن صبح وہ اچانک ہی تھم گیا
اور ہوا بالکل بند ہو گئی لیکن موجیں اب بھی اتنی اونچی تھیں
کہ کشتی سمندر میں ڈالنے کی ہمت نہیں پڑی اس تمام مدت
کے بیشتر حصے میں ہم نے چند منٹ سے زیادہ کبھی پلکیں نہ جھپکائیں
اور مستقل جاگتے رہے۔ ہاں تیسری رات جب تھکن نے اتنا
غلبہ کیا کہ پلکوں کو جدا رکھنا دشوار ہو گیا تو ہم غافل ہو گئے
اور تب تھی صبح جب اٹھے تو سمندر کا جوش بہت کچھ کم ہو چکا
تھا اور شفاف نیلے آسمان میں سنہرا سورج پوری تیزی
سے چمک رہا تھا۔

بڑے مطمئن اور مسرور دلوں کے ساتھ ہم نے ایک
بار پھر اپنی کشتی سمندر میں ڈالی اور اپنے گھر کی طرف روانہ
ہوئے۔ ہم خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے
اور سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے
اندیشوں کے برخلاف ہمارا جزیرہ دور سے دکھائی دے
رہا تھا ورنہ ہم تو یہ سوچ بیٹھے تھے کہ اس طوفان نے
ہمیں پتہ نہیں کہاں پہنچا دیا ہے۔

سمندر چونکہ بالکل ساکت اور پرسکون تھا اس
لیے دن کے بیشتر حصے میں ہمیں پوری قوت سے چپو
چلانے پڑے۔ لیکن دوپہر میں ہوا چلنے لگی اور ہم نے
بادبان کھول دیا۔ جلد ہی ہم جزیرہ پنگوئن اور اس
دوسرے جزیرے کے قریب سے جہاں ہم طوفان شروع
ہونے والے دن پہنچنے میں ہم ناکام رہے تھے۔ گزرے
لیکن چونکہ ہمارے پاس اب بھی کھانے کا کافی سامان
موجود تھا اور ہم گھر پہنچنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس
لیے ہم ان میں سے کسی جزیرے پر نہیں اترے۔ پیٹرکن
کو بڑا افسوس ہوا کیونکہ اسے پنگوئنوں سے بڑی دلچسپی
تھی۔

ہوا چل رہی تھی۔ لیکن پھر بھی ہم اپنے جزیرے کی بابری

چٹان تک رات سے پہلے نہیں پہنچ پائے اور ہم ابھی لیگون میں سوگز اندر تک نہیں پہنچے تھے کہ ہوا دفعتاً بالکل رک گئی۔ اور مجبوراً ہمیں چپو سنبھالنے پڑے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ اور سیاہ آسمان میں چاند اور تارے چمک رہے تھے۔ جب ہم اپنے گھر کے سامنے پہنچے اور کشتی سے ساحل پر کود پڑے۔

اپنے جزیرے پر بخیریت تمام پہنچ کر ہم اتنے خوش تھے کہ ہم نے کشتی کو ساحل پر کھینچنے میں بمشکل تمام ایک منٹ لگایا اور بھاگتے ہوئے اپنے گھر میں گھس گئے تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے۔

میں یہ ضرور کہوں گا کہ میری گھر پہنچنے کی خوشی میں ایک طرح کا خوف بھی شامل تھا کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں کسی نے ہمارے گھر پہنچ کر اسے تباہ نہ کر دیا ہو۔ لیکن گھر پہنچ کر ہم نے ہر چیز اسی حالت میں پائی جیسی ہم چھوڑ گئے تھے۔

(اگلی قسط کا عنوان ہے "لڑائی"، لڑائی مگر کس سے؟ کیا تینوں دوست آپس میں لڑ پڑے یا پھر جزیرے کے خونی وحشی باشندوں سے لڑائی ہوئی؟ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے مارچ ۷۷ء کا پیام تعلیم پڑھیے۔ یہ اگلی قسط انتہائی سنسنی خیز اور دلچسپ ہے۔

★ منہ میں آگ ڈالنا اس سے بہتر ہے کہ کوئی حرام مال منہ میں ڈالے۔

★ جھوٹی قسم سے مال تو بک جاتا ہے مگر برکت ختم ہو جاتی ہے (مسلم)

عبدالمنان عبدالسبحان منصوری

# عیّار لومڑی کی کہانی

ایک لومڑی گھومتے گھومتے اچانک شیر کے غار کے سامنے جا نکلی۔ شیر بھوکا تھا اس پر حملہ کرنے کی سوچنے لگا۔ لومڑی عیّار تھی شیر کی نیت تاڑ گئی اور عاجزی سے بولی "آپ جنگل کے بادشاہ ہیں۔ جب چاہیں مجھے مار کر اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں مگر کھانے سے پہلے میری ایک بات سن لیجیے"

شیر نے کہا "کہو بات کیا ہے؟" لومڑی نے کہا اسی جنگل میں ایک دوسرا شیر آن گھسا ہے اور وہ آپ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس جنگل میں میرا ہی راج رہے۔

یہ بات سن کر شیر بہت غصہ ہوا۔ دوسرے شیر کا پتہ نشان پوچھا۔ لومڑی نے عرض کیا! حضور! وہ اس گہرے کنویں میں چھپا بیٹھا ہے اگر آپ کو منظور ہو تو میں چل کر دکھا سکتی ہوں۔ شیر نے کہا۔ چلو! اور لومڑی آگے آگے اور شیر اس کے پیچھے پیچھے دونوں کنویں کے نزدیک پہنچے۔ کنویں میں پانی صاف تھا لومڑی کنویں کے کنارے کھڑے ہو کر کہنے لگی "حضور! وہ دیکھیے پانی کے اندر شیر نظر آ رہا ہے۔ شیر نے کنویں میں جھانکا اس کا عکس پانی میں نظر آیا۔ شیر اسے گھور گھور کر دیکھنے لگا عکس بھی ویسا ہی دکھائی دیا۔ شیر نے غصّے میں آکر چھلانگ لگا دی۔ لومڑی اپنی عیاری پر مسکرائی اور جنگل میں خوشی خوشی چلی گئی۔



جناب شفیع تمنّا کلکتہ

# ایک تھا شاعر

بچّو! ایک تھا شاعر جن کا نام تھا مرزا غالب
آج زمانہ ہوا ہے جن کی سالگرہ کا طالب

●

علم و ادب کی خاطر ٹپکا جن کا خون پسینہ
طوفان میں بھی اُردو کا جو کھیتا گیا سفینہ

●

آج بھی ان کے شعر و سخن کا چرچا چاروں اُور
شعروں کے "انمول جواہر" سے پھُوٹے گی بھور

●

دیا "چچا غالب" نے بچو! وہ انمول خزانہ
اسی لیے تو آج انھیں کرتا ہے یاد زمانہ

●

آؤ اردو زباں کی خاطر ہم بھی کریں کچھ کام
تاکہ چچا غالب کی طرح روشن ہو ہمارا نام

●

آخر کیوں مشہور ہے اتنا جہاں میں ان کا نام
بتلاؤ تو سمجھیں بچّو بن جائے کچھ کام

●

جناب عبد المتین نیاز

# چچا غالب کی نذر

میں جو پڑھنے میں مبتلا نہ ہوا — فرض اسکول کا ادا نہ ہوا
ہو گیا فیل امتحاں دے کر — جی چُرا کر مرا بھلا نہ ہوا
ممّی تم سے ہوا ور کیا اُمید — ٹا فیوں کا جب آسرا نہ ہوا
ضد کروں کیسے آپ سے ڈیڈی — ایک دن بھی مرا کہا نہ ہوا
چاند پر بھی پہنچ گیا انساں — امن اب تک مرے خدا نہ ہوا
آدمیّت کی اس نے لاج رکھی — جو کسی سے کبھی خفا نہ ہوا
سب زبانوں کا ہو گیا غالب — حرف اُردو زبان کا نہ ہوا
آؤ سن لو یہی ہے وقتِ عمل — پھر نہ کہنا ہمیں پتا نہ ہوا

ہم بھی کہتے "چچا" نیاز اُس کو
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

---

بقیہ بچوّں کے اقبال صـ۳۶ سے

رنگین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ "پہاڑ اور گلہری" دونوں اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظم پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے۔ جیسے اقبال نے جامد و ساکت پہاڑ میں جان ڈال دی ہو۔ ننھی گلہری بھی پہاڑ کا خوب مقابلہ کرتی ہے۔ آخر میں اقبال یہ حقیقت ظاہر کرتے ہیں۔

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

---

بقیہ موسمی پیشنگوئیاں صـ۲۹ سے

اسکی آلات یہ معلومات فوراً ایک ریڈیائی تشری آلے کے ذریعہ زمین تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہوا کی رفتار یا سمت معلوم کرنے کے لیے غبارہ کی اڑان کو دور بین کی بجائے راڈار سے دیکھا جاتا ہے۔

جناب محمد شاہد عظیم

# موسمی پیشگوئیاں

ہم روزانہ اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ آیندہ چوبیس گھنٹوں میں موسم خوشگوار رہے گا یا آندھی آئے گی یا بارش ہونے کا امکان ہے وغیرہ وغیرہ

قدرتی طور پر ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ موسم کے متعلق یہ معلومات آخر کہاں سے اور کس طرح حاصل کی جاتی ہیں۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ موسم کے متعلق پیش گوئیاں ہماری عملی زندگی میں بہت فایدہ مند اور کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ ہوا یا زجہاز چلانے سے پہلے یہ ضرور معلوم کرتے ہیں کہ راستے میں انھیں کس قسم کے موسم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ملاح اور مچھیرے یہ دریافت کرتے ہیں کہ کہیں آس پاس خطرناک طوفان کا اندیشہ تو نہیں ہے! اور پھر کسانوں کے لیے تو یہ موسمی معلومات بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ اگر بارش یا طوفان کے جلدی آنے کا خطرہ ہو تو کسان پکی ہوئی فصلوں کو جلدی جلدی سمیٹ لے گا اور نقصان سے بچ جائے گا۔

اکثر لوگوں کے روزگار یا زندگی کے لیے بھی آئندہ موسم کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ سائنس کی وہ شاخ جو آنے والے موسم کے حالات کا مطالعہ کرتی ہے اور پیش گوئیاں کرنے کا کام کرتی ہے اسے میٹرالوجی۔ (METEOROLOGY) علم حوادث سماوی، یا "موسمیات" کہتے ہیں۔ اور اس علم کے ماہرین کو میٹرالوجسٹ یا ماہر موسمیات کہا جاتا ہے۔ موسم کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لیے میٹرالوجسٹ موسمی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے لیے جو اعداد و شمار یا مواد انھیں چاہیے وہ میٹرالوجیکل اسٹیشنوں کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ یہ اسٹیشن تمام دنیا میں سمندر اور خشکی دونوں پر قائم کیے گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسا ہی ایک اسٹیشن پونا میں قائم کیا گیا ہے

بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں تو ان اسٹیشنوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے جہاں ہر وقت موسم کا مطالعہ جاری رہتا ہے۔ ان اسٹیشنوں میں سے کچھ تو شہروں کے وسطی حصّوں میں اور کچھ باہر دیہات میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اسٹیشن ایسے بھی ہوتے ہیں جو پہاڑی مقامات میں بلند جگہوں پر بنائے جاتے ہیں یا ایسے جہازوں پر ہوتے ہیں جو سمندر میں لنگرانداز ہوتے ہیں۔

ان اسٹیشنوں میں بعض پر تو سائنسداں خود مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن بعض خودکار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر قطبین کے ایسے میٹرالوجیکل اسٹیشن ہیں جو بلند پہاڑیوں پر یا سطح سمندر پر بنائے گئے ہیں۔ ان پر کوئی آدمی کام نہیں کرتا۔

بہر حال خواہ یہ اسٹیشن خودکار ہوں یا انسا

کنٹرول کرتا ہو' ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ موسم کے متعلق معلومات سائنسدانوں کو پہنچائیں۔ انھی معلومات کے ذریعے سائنسداں یہ بتا سکتا ہے کہ آئندہ چند گھنٹوں یا دنوں میں موسم میں کیا کیا اور کس طرح تبدیلی آنے کا امکان ہے۔

میٹرالوجسٹ کے لیے جو معلومات سب سے زیادہ اہم ہیں وہ ہوا کے دباؤ، ہوا کی سمت اور رفتار، درجہ حرارت، نمی مطلع کا ابر آلود ہونا، بارش کی مقدار اور سورج کے چمکنے کی مدت کے متعلق ہیں۔ چند آلات جو موسمیات کے مطالعہ اور مشاہدے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ان کو ہم نیچے بیان کرتے ہیں۔

## ۱۔ مقیاس المطر (بارش ناپنے کا آلہ)

اس آلے سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ کسی علاقے میں ایک مقررہ وقت میں بارش کا کتنا پانی برسا۔ بارش کا پانی ایک خاص برتن میں اکٹھا کیا جاتا ہے اسے کھلی فضا میں ٹکا دیا جاتا ہے۔ اس برتن کا رقبہ پہلے ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ جب مقررہ وقت کے بعد اسے خالی کیا جاتا ہے تو جمع شدہ پانی کی مقدار معلوم کر لی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ جمع شدہ پانی برتن کے رقبے کے برابر جگہ میں برس سکتا ہے۔ اس سے آسانی کے ساتھ پانی کی وہ مقدار معلوم کر لی جاتی ہے۔ جو ایک مربع انچ رقبہ میں ہو۔

## ۲۔ میکسمم مینمم تھرمامیٹر

MAXIMUM MINIMUM THERMOMETER

موسم کے متعلق جو رپورٹ پیش کی جاتی ہے اس میں یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں میں زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم کیا درجہ حرارت دیکھا گیا ہے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت کو ناپنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تھرمامیٹر کا ہر وقت مشاہدہ کیا جائے یا اسے بار بار مختلف وقفوں کے بعد دیکھا جائے اس مقصد کے لیے خاص قسم کا تھرمامیٹر استعمال کرتے ہیں جسے میکسمم مینمم تھرمامیٹر کہتے ہیں اس تھرمامیٹر میں یہ ہوتا ہے کہ پارے کا کالم جب تھرمامیٹر کی نالی (ٹیوب) میں اوپر چڑھتا یا اترتا ہے تو اپنے آگے ایک پوائنٹر کو دھکیل لے جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت پر پارے کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا ہے جب درجہ حرارت ذرا کم ہونا شروع ہوتا ہے تو پارہ نلی میں نیچے گرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن پوائنٹر اپنے مقام پر ہی رکا رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ درجۂ حرارت کی نشاندھی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح جب کم سے کم درجۂ حرارت سے پارہ زیادہ درجہ حرارت کی طرف لوٹتا ہے تو اس طرف کا پوائنٹر کم سے کم درجہ حرارت والی پوزیشن پر رکا رہتا ہے۔ اس طرح ہم درجہ حرارت کی دونوں انتہائی حدود کا تعین کر لیتے ہیں۔

## ۳۔ بادپیما، مقیاس الہوا

(BAROMETER)

ہوا کے متعلق کچھ جاننے کے لیے ہم دو چیزوں کا تعین کرتے ہیں۔

(۱) رفتار (۲) سمت، چنانچہ سمت معلوم کرنے کے لیے ہم خاص قسم کے بادنما استعمال کرتے ہیں۔ تم نے اکثر گرجوں اور پرانے ڈھنگ کی بعض عمارتوں پر مرغ بادنما لگے دیکھے ہوں گے۔ یہ اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ ایک دھات کی سلاخ کا ایک سرا چپٹا سا بنا دیا جاتا ہے اور اس کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ ہمیشہ ہوا کے رُخ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ بس اسی اصول پر بادنما بھی کام کرتے ہیں۔ ہوا کی رفتار معلوم کرنے کے لیے مقیاس الہوا استعمال کرتے ہیں

## ۴ - دباؤ پیما

سطح سمندر پر ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر پندرہ پاؤنڈ ہے۔ میٹر الوجسٹ جو وزن ہوا کے دباؤ کو معلوم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اسے بَلی بار --- کہا جاتا ہے۔ جیسے جیسے ہم سطح سمندر سے بلند ہوتے جائیں ہوا کا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ اگر ہوا میں نمی یا رطوبت ہو یا درجہ حرارت زیادہ ہونا شروع ہو جائے تو بھی ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ دباؤ پیما کے خود کار کھینچے ہوئے خطوط کے نقشے سے ہوا کا دباؤ فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ اس نقشہ کو بیروگراف کہتے ہیں۔

موسمی پیش گوئی کے لیے اندازاً یہ اصول کام کرتے ہیں کہ ،، اگر ہوا کا دباؤ زیادہ ہو تو موسم پر سکون اور خوشگوار ہوگا اور اگر کم ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہوا میں نمی اور رطوبت زیادہ ہے اور موسم خراب رہے گا۔

## ۵ - مطلع کا ابر آلود ہونا

اس کے لیے ایک خاص قسم کا آلہ استعمال کرتے ہیں اور مشاہدہ کرنے والا اپنی آنکھوں سے اور اس آلے کی مدد سے یہ معلوم کرتا ہے کہ آسمان کا کون کون سا حصہ اور کتنا حصہ بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ آسمان کو اندازاً چار حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک حصے کو دیکھ کر معلوم کیا جاتا ہے کہ اس میں آسمان بالکل صاف ہے یا نصف یا سارے کا سارا بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس طرح اعداد و شمار کو جمع کر کے مشاہدہ کرنے والا یہ معلوم کر لیتا ہے کہ مجموعی طور پر آسمان کس قدر بادلوں میں گھرا ہوا ہے۔

## ۶ - فضا میں حبس

یہ نمی ہوا کی خشکی یا رطوبت کے لیے ایک میزان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے ناپنے کے لیے سائنسداں ایک خاص قسم کا آلہ نمی پیما --- استعمال کرتے ہیں۔

موسمی حالات کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ فضا کی اوپر والی تہوں میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ فضا کے بالائی حصوں میں ہوا کا درجہ حرارت، دباؤ، نمی، اور اس کی سمت اور رفتار معلوم کر کے سائنسداں ان اسباب کا کھوج لگا سکتے ہیں جو فضا کے نچلے حصے میں موسم کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں کئی سالوں سے اس طرح ہوتا رہا ہے کہ غبارے بلندیوں کی طرف چھوڑے جاتے ہیں جو فضا کے بالائی حصوں کے موسمی حالات جاننے میں مدد دیتے ہیں۔ ان غباروں کے فضا میں بلند ہونے کے رُخ اور رفتار سے ہوا کی سمت اور رفتار معلوم کر لی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے جو آلہ استعمال کرتے ہیں اسے تھیوڈولائٹ کہتے ہیں۔

موسمی حالات معلوم کرنے والے آلات بعض اوقات ان غباروں میں رکھ بھی دیے جاتے ہیں۔ اور پھر غباروں کو بلندی کی طرف چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بلندی پر جا کر ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے غبارہ پھٹ جاتا ہے اور یہ آلات اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ آہستہ آہستہ ہوائی چھتری (پیراشوٹ) کے ذریعے زمین کی طرف آنا شروع کر دیتے ہیں اور موسمی حالات بھی ریکارڈ کرتے جاتے ہیں۔ لیکن اس طریقہ میں بڑا نقص یہ ہے کہ آلات کو تلاش کرنے اور پڑھنے میں بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

آج کل لاسلکی آلات سے آراستہ غبارے بھی ہوا میں چھوڑے جاتے ہیں۔ ان غباروں میں موسمی حالات معلوم کرنے والے آلے بھی لگے ہوتے ہیں جو فضا میں ہوا کا درجہ حرارت، نمی دباؤ وغیرہ نوٹ کرتے ہیں اور پھر

(باقی ۲۲)

جناب سعید احمد رفائی

گیت

# میٹھی ہماری بولی

ہم بچّوں کی ایک زباں ہے، ایک ہماری ٹولی ہے
ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، ایک ہماری ٹولی ہے
دُنیا کی باتوں سے ہم کو، آج کوئی سروکار نہیں
خوف کسی سے کیوں ہم کھائیں ہم پر کچھ ادھیکار نہیں
روز ہماری عید، دیوالی، روز ہماری ہولی ہے!
ہم بچّوں کی ......... !

بھید بھاؤ نہ ہم نے پالا، پنڈت ہو کہ کوئی لالہ
کسی کے ہاتھ گیتا۔ قرآن تو کسی کے ہاتھ موتیوں کی مالا
ایک زباں ہماری ہے، ایک ہماری بولی ہے!
ہم بچّوں کی ......... !

دیش کی ہم تقدیر بنیں گے، ہم سے روشن دیس کی ریکھا
کل کے جواں ہم ہی تو بنیں گے، ہوگا پورا خواب جو دیکھا
ہم بچّوں نے کھائیں قسمیں، ایک ہماری ٹولی ہے!
ہم بچّوں کی ......... !

ہم کریں گے دیش کی رکشا، امن کے رکھوالے بن کے
وقت پڑا تو جان بھی دیں گے، ہم بھیا ہے بن کے
پاس ہمارے بم نہیں ہے۔ بس اک میٹھی بولی ہے!
ہم بچّوں کی ایک زباں ہے، ایک ہماری بولی ہے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ایک ہماری ٹولی ہے!



جناب ام۔ ندیم۔ علی گڑھ

# اُستاد اور شاگرد

## کردار

اُستاد فیض اللہ = ۶۰ سال کی عمر کے بوڑھے اُستاد
اُستاد فیض اللہ کی بیوی۔ ۵۰ سال کی عمر کی خاتون
کلام میاں ـــــ سوٹ بوٹ میں ملبوس ۳۰ سال کے لندن پلٹ جوان

## پہلا منظر

(استاد فیض اللہ کا گھر، آنگن میں بکریاں اور مرغیاں چر چگ رہی ہیں۔ چند بچے ٹاٹ پر بیٹھے پڑھ رہے ہیں استاد فیض اللہ کی بیوی جھاڑو دے رہی ہیں۔ استاد داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں خط ہے۔ بہت خوش نظر آرہے ہیں۔)

اُستاد فیض اللہ: ارے سنتی ہو، میاں کلام کا خط آیا ہے لکھا ہے میں ۱۸ تاریخ کو قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہوں۔

بیوی: بڑا ہی لائق شاگرد ہے، خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ اس نے آپ کو اب تک یاد رکھا۔

استاد: ہاں میاں کلام میرا بڑا ہی ذہین شاگرد رہا ہے۔ اس کے والدین نے میرے سپرد کر دیا تھا تم کو تو یاد ہوگا۔ میں اس کی خوب پٹائی کرتا تھا۔ اسی کا تو فیض ہے کہ میاں کلام لندن تک پہنچ گئے اور اب بڑے ہی اونچے عہدے پر فائز ہیں۔ مگر اب تو دنیا ہی بدل گئی۔ نہ وہ شاگرد رہے نہ استاد۔

بیوی: ہاں آپ سچ کہتے ہیں۔ سنا ہے اب مدرسوں میں استاد بچوں کو نہ تو مار پیٹ سکتے ہیں نہ ڈرا دھمکا سکتے ہیں۔

اُستاد: جی ہاں، اسی کا تو نتیجہ ہے کہ برسوں کے پڑھ لکھ کر بھی کورے کے کورے رہتے ہیں۔ باادب بانصیب بے ادب بے نصیب

بیوی: (فکر مندی سے) مگر میاں کلام تو اب بڑا آدمی ہو گیا ہے، بھلا اس کی خاطر تواضع ہم غریب آدمی کیا کر سکیں گے۔ کہاں ٹھہرائیں گے؟ ہمارا مکان بھی کچا ہے اور چھوٹا سا ہے۔

استاد: ارے بھئی پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہم ٹھہرے غریب آدمی، جو دال دلیا ہوگا سو حاضر کر دیں گے (ہنس کر) اور پھر میاں کلام ہمارا

شاگرد ہی تو ہے کوئی اسکول کا انسپکٹر تو نہیں
ہے۔ اور سبھی انسپکٹر بھی آئے اب تو ہمیں ڈر
کا ہے کا..... ہم تو پنشن پا چکے ۱۵ روپے ماہوار
اب نوکر تو نہیں ہیں جو کسی کا ڈر ہو۔

**بیوی:** بھلا ہمارے میاں کلام کو کتنی تنخواہ ملتی ہوگی ؟

**استاد:** "پندرہ سو روپے ماہوار"

**بیوی:** (آنکھیں پھاڑ کر) پندرہ سو۔ یعنی دس سو اور
پانچ سو۔ اللہ۔ اللہ کہاں پندرہ اور کہاں پندرہ سو۔

**استاد:** ارے نیک بخت تم بھی علم کو روپیوں میں تولتی
ہو۔ استاد تو بے چارے ہمیشہ روکھی سوکھی کھا کر
علم کی دولت دوسروں کو بانٹتے رہے ہیں۔ استاد
کی محنت کا صلہ صرف یہی ہے کہ اس کے شاگرد ترقی
کی بلندیوں پر پہنچیں۔

**بیوی:** آپ سچ کہتے ہیں مگر اس جذبے کی کون قدر کرتا
ہے ؟

**استاد:** ایسا نہ کہو۔ سبھی شاگرد ایسے نہیں ہوتے۔ اب
دیکھو میاں کلام ہی کو لے لو خط میں لکھا ہے ۔۔
"استاد محترم آپ کی تربیت محنت اور رہنمائی نے جو
روشنی مجھے عطا کی ہے اس کا بدل دنیا کی ساری
دولت بھی نہیں ہو سکتی"
میرے لیے تو یہی میری محنت کا صلہ ہے۔

**بیوی:** تو میاں کلام کے آنے میں ۱۵ دن باقی ہیں!

## دوسرا منظر

(استاد کا مکان وہی منظر جو پہلے بیان ہو چکا ہے)

**استاد:** اب میں اسٹیشن چلتا ہوں۔ پہنچتے پہنچتے بھی گھنٹہ
بھر لگے گا۔ کم بخت سڑک بھی خراب ہے۔ یہاں
کے یکّے بھی تو باوا آدم کے زمانے کے معلوم ہوتے
ہیں۔ گھوڑے مریل۔ دوڑتے ہیں تو لگتا ہے جیسے
رینگ رہے ہیں"۔

**بیوی:** ہاں ہاں، جلدی کیجیے۔ کہیں ریل گاڑی نہ
آجائے اور بے چارے میاں کلام کو پریشانی
ہو۔ اسٹیشن یہاں سے کوئی چار میل تو ہوگا ہی۔

**استاد:** (صافہ باندھتے ہوئے) ابھی گاڑی آنے میں
دو گھنٹے ہیں۔ میں انشاء اللہ وقت پر پہنچ جاؤں گا۔

**بیوی:** آپ دو گھنٹے کی بات کر رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں
موئی ریل آپ کے پہنچنے کا انتظار تو کرے گی
نہیں۔ اگر گھنٹہ بھر میں ہی آگئی تو آپ کیا کریں گے؟

**استاد:** واہ، واہ، جو بات کرتی ہو لاجواب کرتی ہو۔
یعنی ریل گاڑی میں اور بیل گاڑی کوئی فرق نہیں
ہے، ریل گاڑی وقت سے پہلے کبھی نہیں آتی۔

**بیوی:** اچھا، اچھا، میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ شاید
بھولے بھٹکے وقت سے پہلے ہی آجائے تو
اب آپ جائیے بھی۔

**استاد:** لو میں تیار ہو گیا۔ ہاں۔ میاں کلام کے لیے بکری
کے دودھ کی کھیر ضرور پکا رکھنا بھولنا مت۔

**بیوی:** ہاں، ہاں مجھے مکا کی روٹی، اچار اور تازہ
گڑ بھی یاد ہے۔

## تیسرا منظر

(بیک گراؤنڈ میں ریل کی سیٹی کی آواز،
خوانچے والوں کا ہلکا ہلکا سا شور،
سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک جوان

بھیڑ میں سے نکلتا ہے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔)

میاں کلام: "قلی قلی! ارے عجیب جگہ ہے۔ قلی ہی نہیں ہے"

(اُستاد قریب آتے ہیں، سر پر صافہ بندھا ہے، جسم پر چادر پڑی ہوئی ہے)

میاں کلام (ان کو مزدور سمجھ کر) ارے میاں ادھر آنا، یہ سامان اٹھالو اور ذرا تانگے تک پہنچادو۔

استاد: (مسکراکر سامان اُٹھالیتے ہیں جو ایک اٹیچی اور بیگ پر مشتمل ہے۔ سامان یکّہ پر رکھ دیتے ہیں۔)

میاں کلام (جیب سے پیسے نکال کر) لو میاں یہ تمہاری مزدوری ہے۔ چونّی۔

اُستاد: رکھ لو بیٹا مٹھائی کھالینا میری طرف سے۔ میں مزدور نہیں ہوں۔ میرا نام فیض اللہ ہے میرا ایک شاگرد میاں کلام آنے والا ہے۔ میں اس کو لینے آیا ہوں۔

میاں کلام: ہائیں کیا کہا آپ نے ..... میں ہی بدبخت کلام ہوں (پیروں پر گر پڑتا ہے) اُستادِ محترم مجھے معاف کردیجیے۔ بڑی گستاخی ہوئی۔

اُستاد: کلام کو اٹھا کر سینے سے لگالیتے ہیں۔ میاں میں نے تو تم کو مدتوں بعد بھی پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ تمہاری خدمت کرنا مجھ پر فرض ہے۔ تم میرے مہمان ہو۔

میاں کلام: نہیں، استادِ محترم مجھے انتہائی شرمندگی ہے۔

استاد: تم میرے شاگرد ہو، ابھی تم کو ایک اور سبق یاد کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ کوئی کام چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔

میاں کلام: آپ نے درست فرمایا استادِ محترم۔ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

استاد: اچھا میاں، بسم اللہ یکّے پر سوار ہوجاؤ۔ تمہاری اُستانی ماں نے تمہارے لیے کھیر، مکّا کی روٹی اور گڑ اور نہ جانے کیا کیا تیار کر رکھا ہوگا، بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی ہوں گی۔

میاں کلام: میرے منہ میں تو پانی آگیا اور مجھے اپنا بچپن یاد آگیا۔ ولایت میں یہ نعمتیں کہاں رکھی ہیں؟

(پردہ گرتا ہے)

---

# آپ کا کام

یہ ہے کہ اپنے پیامِ تعلیم کو شروع سے آخر تک پڑھیے۔ جو چیز آپ چاہتے ہیں اور اس میں موجود نہیں ہے تو ہمیں لکھیے ہم آپ کے مشورہ پر غور کریں گے اِن مشوروں کی روشنی میں پیامِ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

اپنے دوست احباب میں پیامِ تعلیم کا چرچا کیجیے۔ ایسے دوستوں کے پتے بھیجیے جنھیں پیامِ تعلیم سے دلچسپی ہو۔

پیامِ تعلیم کے خریدار بنا کر ہماری مدد کیجیے اور اس طرح پرچے کو زیادہ شان دار زیادہ خوبصورت اور زیادہ کارآمد بنانے میں ہماری مدد کیجیے۔

(منیجر)



جناب اکبر رحمانی جلگانوی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

# ظلم کی سزا

## بنگلہ دیش کی لوک کہانی

ایک تھا کنجوس راجا۔ جو دھن دولت دکھائی دیتا اُسے سمیٹ کر اپنے خزانے میں جمع کر لیتا تھا۔ جس طرح بنگلہ دیش کے لوگ برسات کا موسم بیت جانے کے بعد جب بھی تھوڑی دیر کے لیے مطلع صاف دکھائی دے، اپنے کپڑے، اناج وغیرہ سُکھانے کے لیے دھوپ میں ڈال دیتے ہیں بالکل اُسی طرح یہ راجا بھی اپنے خزانے کی جمع شدہ اشرفیوں کو کبھی کبھار باہر نکال کر دھوپ میں ڈال دیا کرتا تھا۔

ایک دن ایک ننھے سے پرندے ٹن ٹنی نے اشرفیوں کے ڈھیر سے ایک اشرفی اٹھا کر اپنے گھونسلے میں رکھ لی۔ جب سہ پہر کو ساری اشرفیاں راجا کے خزانے میں پھر سے جمع کر دی گئیں تو ٹن ٹنی محل کی کھڑکی کے پاس ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھ گانے لگا۔

اتنی اشرفیوں کے ڈھیر
راجا کے تہہ خانے میں
اس بھرپور خزانے میں
پھر بھی اس کی کیا پرواہ
اپنا دھن بھی کم ہے کیا
اشرفی خوب چمکتی ہوئی
گھونسلے میں پڑی ہوئی

راجا نے جب یہ سُنا تو اُسے بہت غصّہ آیا۔ اُس نے کہا۔ "اتنا چھوٹا سا پرندہ اور میرا مقابلہ کرے! ایک اشرفی کے لیے میری برابری کا دعویٰ! میرے خزانے میں تو لاکھوں اشرفیاں پڑی ہیں۔" اس نے فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس معاملہ کی پوری چھان بین کرنے کے لیے ٹن ٹنی کے گھونسلے کی تلاشی لی جائے۔ گھونسلے کی تلاشی لی گئی اشرفی کو راجا کے پاس جمع کر دیا گیا۔ اور گھونسلے کو تہس نہس کر دیا گیا۔ یہ دیکھ کر ٹن ٹنی بہت اداس ہو کر راجا کی کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس طرح درد بھری آواز میں گانے لگا۔

ہائے ہائے! وائے وائے!!
کیسے کہوں، کہا نہ جائے
راجا کے ظالم سپاہی
چھین کر لے گئے میری شاہی

جب راجا نے سُنا تو اُسے بہت غصّہ آیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ٹن ٹنی کا گھر چھین کر اُسے گرفتار

کر لیا جائے۔ بے چارہ ٹن ٹمنی گرفتار ہو گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ زندہ بچ نہیں سکتا۔ اُس نے راجا کی کنجوسی اور اپنے گھر کے چھینے جانے کا پرچار شروع کر دیا اس نے رات دن یہ رٹ لگانی شروع کر دی۔

میرے گھو نسلے میں ایک شاہی
وہ کبھی لے گئے راجا کے سپاہی
وہ کبھی لے گئے راجا کے سپاہی
وہ کبھی لے گئے راجا کے سپاہی

راجا اپنی بدنامی کی تشہیر برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے ٹن ٹمنی کو ختم کر دینے کا ارادہ کیا۔ اُس نے پانی کا گلاس طلب کیا اور پانی کے ساتھ ہی ٹن ٹمنی کو بھی نگل گیا جس طرح کوئی دوائی کی گولی نگلتا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو کچھ نہ ہوا۔ راجا خوش تھا کہ ٹن ٹمنی کا خاتمہ ہو گیا لیکن جونہی راجا نے ڈکار لی۔ اس ڈکار کے ساتھ ہی ٹن ٹمنی باہر نکل کر اُڑ گیا۔ ابھی راجا کی ڈکار اور ٹن ٹمنی کے اڑجانے کی حیرت دُور نہ ہوئی تھی کہ ٹن ٹمنی نے ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھ کر زور و شور سے چہچہانے کی آواز آنے لگی۔ اب تو راجا کے لیے ٹن ٹمنی کی یہ حرکت ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ اس نے پھر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اس گستاخ پرندے کو فوراً گرفتار کر کے لائیں۔ تمام سپاہی دوڑ پڑے اور اس ننھے پرندے کو گرفتار کر کے راجا کے سپرد کر دیا۔ اب کی بار نگلنے سے پہلے راجا نے اپنے اردگرد ننگی تلواریں لیے ہوئے سپاہیوں کو کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ اور انھیں تاکید کی کہ اگر ڈکار یا چھینک کی وجہ سے پھر ٹن ٹمنی نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ بدقسمتی سے اب کی راجا کو زور کی چھینک آئی اور ٹن ٹمنی چھینک آتے ہی راجا کے نتھنوں سے باہر نکل پڑا۔ جونہی وہ باہر نکلا۔ ایک سپاہی نے تلوار کا زور سے وار کیا۔ وار خالی نہیں گیا۔ لیکن ٹن ٹمنی کی بجائے راجا کی ناک ہی کٹ گئی۔ راجا درد کے مارے تڑپ رہا تھا اور ٹن ٹمنی کھڑکی پاس چہچہا رہا تھا۔

اے لو راجا خوب ہوئی
ہا ہا ہا ہا کیا خوب ہوئی
ناک کٹی اور خون بہا
ظلم کی ملی سزا

---

جناب بدر وفا شیدائی (جامعی)

# انوکھا تحفہ

لندن کی صاف و شفّاف چمکتی ہوئی سڑکوں پر یوں تو ہر وقت بجلی کے لال، پیلے قمقمے اپنی پوری روشنی سے پورے شہر کو دلکش، پرکشش اور رومان انگیز بنائے رہتے ہیں لیکن، اس وقت لندن کی بہار دیکھنے کے لائق ہوتی ہے جب نیا سال آنے میں چند ہفتے رہ جاتے ہیں۔ لندن کے تمام باشندے، اپنے دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کے لیے سال کی خوشی میں طرح طرح کے قیمتی، اور اچھے سے اچھا تحفہ خریدتے ہیں۔

دکان دار بھی اس سنہرے موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنی اپنی دکانوں کو نئی نویلی دُلہن کی طرح سجاتے ہیں غرض کہ وہاں کا دلکش منظر بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

---

اسکول اور کالج کے تمام طالب علم نئے سال کی آمد پر بے حد خوش تھے۔ سب سے زیادہ خوشی اُنھیں اپنے دوستوں اور سہیلیوں کو تحفہ دیتے وقت ہوتی تھی۔

پیٹر اور بیلی دونوں لندن کے ایک قصبہ کے ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ دونوں کی دوستی بے مثال تھی —— دونوں ہر سال کلاس میں اوّل آتے تھے اور ایک دوسرے کو مبارک باد کے ساتھ ساتھ کوئی تحفہ بھی ضرور دیا کرتے تھے۔

یہ دونوں زیادہ امیر نہ تھے اُن کے بزرگوں کے پاس قصبے میں تھوڑی سی زمین تھی۔ اور اس میں پھلوں کے بہت سے پیڑ تھے اور انھی پھلوں کی تجارت سے دونوں کے والدین اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔

ایک دن بیلی نے مُسکراتے ہوئے پیٹر سے کہا۔ "بیلی ——! نیا سال آنے میں چند دن رہ گئے ہیں لیکن میں تمھارے لیے ابھی تک کوئی اچھا سا تحفہ نہ خرید سکی۔ شاید کل بازار جاؤں اور ایک پیارا سا تحفہ خرید لاؤں۔"

"پیٹر ——! میں بھی اس سال تمھیں ایک اچھا سا تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ سال ہمارے لیے بہت مبارک ثابت ہوا ہے۔ اس سال ہم نے اپنے کلاس میں امتیازی نمبر حاصل کیے ہیں، اسپورٹس میں بھی ہمیں کئی انعام ملے ہیں۔"

پیٹر نے بیلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کسی سوچ میں گم تھی۔ "کیا سوچ رہی ہو بیلی؟"

"کچھ نہیں —— اچھا اب میں گھر چلی، پھر ملاقات ہوگی ——!" بیلی نے کہا اور وہاں سے رخصت ہوگئی۔

---

لندن جیسے بڑے شہر تو شہر چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی نئے سال کی آمد پر چراغاں ہو رہا تھا۔ وہاں

بچے بچے خوشی اور بے خودی کے عالم میں اُچھل کود رہا تھا ۔
لیکن پیٹر کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ بلّی کو تحفہ دینے کے لیے
جو رقم جیب خرچ سے بچا کر اس نے رکھی تھی ۔ والدہ کی اچانک
بیماری کے دوا علاج میں خرچ ہوگئی تھی ۔ اس کی جیب
خالی تھی اور کل شام کو بلّی کے گھر جا کر اسے تحفہ دینا تھا ۔
—— بلّی بھی اُسے وہیں اپنا تحفہ دیتی ۔ اس
کے بعد دونوں پر تکلف ناشتہ کرتے ۔ قہقہے لگاتے ہوئے
پارکوں میں کودتے ، آنکھ مچولی کھیلتے اور پھر پیٹر اپنے
گھر واپس آجاتا ۔ ہر سال یہی ہوتا تھا ۔

دوا ، علاج پر خود پیٹر کی والدہ نے اپنا بچا
ہوا کافی روپیہ خرچ کر دیا تھا اس لیے پیٹر کو اپنی ماں
سے روپیہ مانگتے شرم آرہی تھی ۔

پر وہ کل بلّی کو کون سا تحفہ دے جسے دیکھ کر وہ
واقعی خوشی سے اچھل پڑے اُس کے دماغ نے اب
سوچنے سے انکار کر دیا مسلسل سوچتے رہنے کی وجہ سے
سر میں اچھا خاصا درد ہونے لگا تھا ۔

یک بیک پیٹر کو ایک تدبیر سوجھی ۔

اُس کے ماموں ایک مرتبہ کسی دوسرے ملک کی سیر کے لیے
گئے تھے وہاں سے پیٹر کے لیے ایک خوب صورت تحفہ
لائے تھے اور وہ خوب صورت تحفہ تھا ایک غیر ملکی ہاتھی
دانت کا بنا ہوا کنگھا جس کے اُوپر بہترین نقش و نگار
اور بیل بوٹے بنے ہوئے تھے ۔ یہ کنگھا پیٹر کے پاس
ویسا ہی رکھا ہوا تھا ۔

"کیوں نا وہی کنگھا تحفہ میں وہ بلّی کو پیش کر دے "

اور پھر اُس نے وہی کنگھا بلّی کو تحفہ میں دینے کا
پورا ارادہ کر لیا بلّی کے بال بڑے بڑے اور کافی گھنے تھے
کوئی خوبصورت کنگھا بال بنانے کے لیے نہ تھا ۔ بلّی اتنے
خوبصورت کنگھے کو تحفے میں پاکر خوشی سے اچھل پڑے گی ۔

پیٹر کی ساری اُلجھن دُور ہوگئی اور وہ اطمینان سے
سو گیا ۔

مقررہ وقت پر پیٹر کنگھے کو ایک خوب صورت کاغذ
میں لپیٹ کر احتیاط سے جیب میں رکھ کر بلّی کے گھر کی طرف
چلا جہاں بلّی ناشتے کا بہت سا سامان تیار کیے بیٹھی
پیٹر کا انتظار کر رہی تھی ۔ جیسے ہی پیٹر دروازے میں
داخل ہوا بلّی کے خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ
نمودار ہوئی

ہیلو پیٹر —— ! تم نے کافی دیر کر دی —— !"

معاف کرنا بلّی واقعی مجھے آنے میں دیر ہوگئی ہے
بھئی تم نے آج اپنے سر پر جو خوب صورت ڈیزائن والا
ریشمین کپڑا باندھ رکھا ہے واقعی بڑا دلکش لگ رہا ہے ۔
پیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا ۔

ناشتے کا سامان اور کھانے کی چیزیں ٹھنڈی ہو رہی
تھیں اس لیے وہ لوگ کھانے میں مصروف ہوگئے ۔
ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد پیٹر نے مسکراتے ہوئے
بلّی سے کہا ۔

بلّی —— ! تمھیں قدرت نے کتنے خوبصورت ،
چمکیلے اور گھنے بال عطا کیے ہیں لیکن افسوس اُس کو
بنانے ، سنوارنے کے لیے تمھارے پاس کوئی اچھا
سا کنگھا نہیں ہے اس لیے اس مرتبہ میں ایک بے حد
خوبصورت کنگھا تمھیں تحفے میں دے رہا ہوں میرے
ماموں باہر کے ملک سے میرے لیے لائے تھے اور

تو کسی مصرف کا نہیں لیکن تمھارے بالوں کو یہ اور زیادہ خوبصورت
بنادے گا اس لیے اس سال کے تحفے میں یہ میری طرف
سے قبول کرو۔!"

اتنا کہہ کر پیٹر نے خوبصورت کاغذ میں لپٹا ہوا کنگھا
بیلی کو دے دیا۔

بیلی پہلے تو مسکرائی اس کے بعد قہقہہ لگانے لگی پیٹر
کی سمجھ میں یہ قہقہہ نہ آیا اور وہ بے بسی سے بیلی کی طرف
دیکھنے لگا۔

کافی دیر قہقہہ لگانے کے بعد بیلی نے پیٹر کی طرف
دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

پیٹر ـــــ! میرے خوبصورت بالوں کی وجہ
سے تم نے اس سال تحفے میں کنگھا پیش کیا ہے۔ اس
کے لیے بہت بہت شکریہ ـــــ! لیکن جانتے ہو اس
سال تمھیں تحفہ دینے کے لیے میرے پاس پیسہ نہ تھا
مجبوراً مجھے لیڈیز ہیئر سیلون (عورتوں کے بال وغیرہ بنانے
کی نائی کی دکان جہاں عورتیں ہی کام کرتی ہیں) میں تمھارے
تحفے کے لیے اپنے خوب صورت، چمکیلے اور گھنے بال
فروخت کرنے پڑے اور اس کے بدلے دیکھو میں
تمھارے لیے کتنا اچھا تحفہ خرید کر لائی ہوں !

اتنا کہہ کر بیلی نے دو خوب صورت قلم پیش
کر دیے۔ پیٹر نے قلم لے لیے لیکن بال بیچ کر تحفہ
خریدنے پر وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

بیلی ـــــ! تمھیں میرے تحفہ کے لیے اپنے
خوب صورت بال فروخت نہیں کرنا چاہیے تھے۔"

ارے پیٹر ـــــ! تم رنجیدہ کیوں ہو، تمھارا
دیا ہوا کنگھا واقعی بہت خوب صورت ہے میں اسے
سنبھال کر رکھوں گی، میرے خوب صورت بالوں کا
کیا ہے چھ مہینے بعد تو وہ پھر ویسے ہی ہو جائیں گے"!
بیلی نے اتنی معصومیت سے یہ جملہ ادا کیا کہ پیٹر
کا سارا رنج یک دم دور ہو گیا اور وہ دونوں پہلے کی
طرح قہقہے لگانے لگے۔

پیٹر یہ سوچ رہا تھا کہ بیلی میرا کتنا خیال رکھتی ہے
بھلا اس نے دوستی، خلوص و محبت کی دیواروں کو
اور مضبوط اور پختہ کرنے کے لیے اپنے قیمتی بال فروخت
کر دیے یہ ہے دوستی کی زندہ جاوید مثال

پھر پیٹر اور بیلی نے نئے سال کی آمد پر ایک دوسرے
کو مبارک باد دی اور خدا سے دعا مانگی کہ وہ اس سال
بھی اپنے درجوں میں امتیازی نمبر حاصل کریں اور اپنے
ملک کا نام روشن کر سکیں اور آگے چل کر ایک اچھے
شہری کی طرح زندگی گزاریں۔

اس واقعہ کو زیادہ دن نہیں گزرے لیکن اب پیٹر اپنے
ملک کا بہت بڑا انجینئر بن گیا اور بیلی ایک مشہور کالج کی
پروفیسر ہو گئی اور پھر دونوں نے شادی کر لی۔

آج بھی پیٹر کا تحفے میں دیا ہوا کنگھا بیلی کی سنگھار
میز پر نظر آتا ہے۔ جس سے وہ روزانہ بال بناتی
ہے اور پیٹر کی میز پر بیلی کے تحفہ میں دیے ہوئے
خوب صورت قلم دکھائی دیتے ہیں جنھیں پیٹر روزانہ
استعمال کرتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں تحفے طالب
علمی کے سنہرے دور کو روزانہ یاد کرنے کے لیے بے حد
مددگار ثابت ہوئے ہیں۔



جناب رحمٰن آذر

# بچّوں کے اقباؔل

ڈاکٹر شیخ محمد اقباؔلؒ ہمارے دیس کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے وہ خالی شاعر ہی نہیں تھے۔ بہت بڑے عالم۔ بہت بڑے فلسفی تھے۔ انھوں نے ہمارے بڑوں کے لیے۔ بڑی اچھی اچھی نظمیں کہی ہیں۔ ان نظموں میں بڑی گہرائی ہے۔ بڑا درد ہے۔ بہت قیمتی نصیحتیں ہیں ہر پڑھنے والے پر ان کا اثر بڑا اچھا ہوتا ہے۔

عجیب بات یہ کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم بچوں کے لیے بھی اتنا ہی اچھا لکھتے ہیں جتنا بڑوں کے لیے۔ بلکہ بچوں کے لیے لکھتے وقت زبان میں سادگی اور مٹھاس بڑھ جاتی ہے۔

کچھ عنوانات ملاحظہ فرمایئے۔ "ایک مکڑا اور مکھی" "ایک پہاڑ اور گلہری" "ایک گائے اور بکری" "بچے کی دعا" "پرندے کی فریاد" وغیرہ وہ انگریزی خیال کو اردو لباس بڑی خوبصورتی سے پہناتے ہیں۔

انھوں نے اپنی نظم "ایک مکڑا اور مکھی" میں خوشامدی مکڑے کی چال کو دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ نظم پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے مکڑا مکھی کو پھانسنے کے لیے مختلف چالیں چل رہا ہو یا ترکیبیں آزما رہا ہو۔ پہلے تو مکھی مکڑے کی باتوں میں نہیں آتی پر جب وہ اس کی خوشامد کرتا ہے اور اس کا قصیدہ پڑھتا ہے، تو اس کا "دماغ" کام نہیں کرتا اور وہ اس کے جال میں پھنس جاتی ہے۔ اس طرح سے خوشامدی مکڑا مکھی کو پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے خوشامد سے کام نکل آتا ہے۔ اس کہانی میں اقباؔل نے ایک حقیقت بیان کی ہے۔

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دُنیا میں خوشامد کا ہے بندہ

ان کی ایک دوسری نظم "گائے اور بکری" میں گائے انسان کی شکایت کرتی ہے۔ اس کے برعکس بکری انسان کی مدح سرائی کرتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ انسان اتنا ظالم اور کیا گزرا نہیں ہے اور گائے کی زندگی جنگل کے مقابلہ میں انسان کے ساتھ آرام سے گزر سکتی ہے۔

اقباؔل کی "بچے کی دعا" (لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری) سبھی اُردو جاننے والے بچوں کی محبوب دعا ہے۔

ایک اور نظم "ہمدردی" میں اندھیری رات میں بلبل اور جگنو کی بات چیت کو انھوں نے بڑی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ جگنو کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں،

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچّھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ان کی نظم "پرندے کی فریاد" ماضی کی حسین یادوں کا رنگین عکس ہے۔ وہ اس نظم میں آزادی کے لیے تڑپتے ہوئے ایک بے زبان "قیدی" کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

اقباؔل اپنی نظم "ایک پہاڑ اور گلہری" میں ایک خود سر اور شیخی باز پہاڑ کی گلہری سے بات چیت

باقی صفحہ ۲۳ پر

عزیزہ فاخرہ یاسمین

# ہنڈ کلھیا

## چپلی کباب

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میری نانی پاکستان سے تشریف لائی تھیں۔ اور انھوں نے چپلی کباب تیار کرنے کی ترکیب بتائی تھی۔ ہم نے بھی اس کو آزمایا ہے۔ آپ بھی تجربہ کیجیے بڑے مزے کی چیز ہوگی۔

### سامان

| | |
|---|---|
| قیمہ باریک | ½ کلو |
| سرکہ | ۲ چمچے (چائے کے) |
| انڈے | ۳ (خوب پھینٹ لیے جائیں) |
| پیاز بڑی | ۲ (آملیٹ کے لیے کاٹیے) |

ان سب کو باریک خشک پیس لیجیے

| | |
|---|---|
| دارچینی | لگ بھگ دو انچ کا ٹکڑا |
| بڑی الائچی | ۳ عدد |
| لونگ | ۶ عدد |
| کالی مرچ | حسب منشا |
| کالا زیرہ | چائے کا ایک چمچہ |
| نمک | حسب منشاء |
| گھی ڈالڈا | ۱۰۰ گرام |

ترکیب :- انڈوں کو اچھی طرح پھینٹیے۔ ان میں نمک اور کالی مرچ ڈال کر سادہ آملیٹ بنا لیجیے۔ اس کے بعد اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیجیے۔ اب قیمہ میں سرکہ ملا دیجیے۔ سرکہ اچھی طرح مل جائے تو آملیٹ، پیاز، اور مسالہ ملا کر پندرہ منٹ تک رکھ چھوڑیے۔ اور حسب منشا سائز کے کباب بنا کر فرائی پان یا کڑھائی میں تل لیجیے اور خوب مزے سے کھائیے۔

## تریوں کے چھلکوں کے کباب

### سامان

| | |
|---|---|
| چنے کی دال | ۵۰ گرام |
| لہسن | ۸-۱۰ جوے |
| پیاز | ایک عدد درمیانی گٹھی |
| سرخ مرچ | ۵ عدد |
| نمک | حسب منشاء |
| دھنیا کھڑا لیجیے | ۲ چمچے چائے کے |
| زیرہ سفید | " ۱ " " |
| بڑی الائچی | ۲ عدد |
| لونگ | ۴ " |
| کالی مرچ | ۱۰-۱۲ |
| ہری مرچ | حسب منشاء |
| ہرا دھنیا | " " |
| پیاز | ایک بڑی گانٹھ |

ان سب کو باریک کتر لیجیے

چکنائی تیل، یا ڈالڈا حسب منشاء

ترکیب :- چھلکے اچھی طرح دھو کر اور لہسن، پیاز، سرخ مرچ اور نمک ملا کر ابال لیجیے۔ چھلکے گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو اتار لیجیے۔ بھنا ہوا دھنیا، بھنا ہوا زیرہ، کالی مرچ، بڑی الائچی، لونگ کو ایک ساتھ باریک پیس لیجیے۔ تو اب چھلکوں کو پیس لیجیے۔ پسے مسالوں کو اس میں ملا لیجیے۔ کتری ہوئی پیاز، ہرا دھنیا ہری مرچ بھی ملا لیجیے اور چھوٹی ٹکیاں بنا کر تل لیجیے۔ اگر کسی کو گرم گرم چکھائیں گی تو اسے تمیز نہ ہوگا کہ کباب قیمے کے ہیں یا چھلکوں کے۔



# اِدھر اُدھر سے

## قرآن مجید کا ۱۳۔سو سال کا پُرانا نسخہ

ایران کے ایک پندرہ سو ۱۵۰۰ پرانے شہر کے کھنڈروں میں قرآنی کریم کا ایک نسخہ برآمد ہوا ہے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ نسخہ رسولِ اکرمؐ کے نواسے حضرت امام حسینؑ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے —— اس شہر کے کھنڈر بہہ بائین سے تقریباً پچاس میل دور "دیہہ دشت" کے نواح میں دریافت ہوئے ہیں۔

خیال ہے کہ اس شہر کو جو کہا جاتا تھا۔ مقامی اخباروں کی اطلاع کے مطابق اس شہر کی کھدائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر ساسانی بادشاہ عباد کے عہد میں تھا۔ یہ بادشاہ اسلامی عہد سے پہلے گزرا ہے۔ اب تک شہر کی کھدائی میں جو چیزیں نکلی ہیں۔ ان میں کئی آتش کدے، ماہ پور کا مقبرہ، دو منزلہ بازار، پانی کے گہرے کنویں۔ ایک بڑی مسجد اور کئی اسلامی درس گاہیں شامل ہیں۔ آبادی اور رقبے کے اعتبار سے یہ ایک بڑا شہر معلوم ہوتا ہے۔

## کوہوٹیک (دُم دار ستارہ)

آج کل اخباروں میں کوہوٹیک دُم دار ستارے کا بہت چرچا ہے۔ پچھلے سال مارچ میں چکوسلواکیا کے ایک ماہر فلکیات نے اس کا پتہ نشان لگایا تھا اس ماہر فلکیات (آسمانوں کے علم کا ماہر) کا نام کوہوٹیک ہے۔ اس دم دار ستارے کا نام بھی اسی کے نام پر (کوہوٹیک) رکھ دیا گیا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ دُم دار ستارہ۔ اپنی چمک دمک میں مشہور دم ستارے ہیلی سے بھی آگے بڑھ جائے گا۔ ہیلی دام دار ستارہ آخری بار ۱۹۱۰ء میں نظر آیا تھا اور اب ۱۹۸۶ء میں اپنی صورت دکھائے گا۔

کہتے ہیں "کوہوٹیک" دم دار ستارہ اس صدی کا اہم اور سب سے بڑا دم دار ستارہ ہے جس کا انسان نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار مشاہدہ کیا ہے۔

یہ کوہوٹیک دم دار ستارہ صبح کو پو پھٹنے سے پہلے جنوب مشرق کی طرف نظر آتا ہے اور خلا میں میلوں تک پھیلی ہوئی اس کی دم آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرتی ہے۔ یہ اب دن بدن سورج کے قریب آتا جا رہا ہے۔ یہ ستارہ جنوری میں بھی نظر آتا رہا۔

دم دار ستاروں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کے متعلق ٹھیک ٹھیک پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات جوں جوں یہ سورج کے قریب آتے جاتے ہیں کئی حصوں میں تقسیم ہوتے جاتے ہیں۔ یا کبھی کبھی وہ اپنی انتہائی چمک دمک باقی نہیں رکھ سکتے۔ لیکن کوہوٹیک کے بارے ہارورڈ کے مشہور ماہر فلکیات نے یہ توقع ظاہر کی ہے کہ کوہوٹیک اس صدی کا اہم ترین دُم دار ستارہ ہوگا اور اپنی چمک دمک باقی رکھنے میں کامیاب ہوگا۔

یہ بھی امید کی جا رہی ہے کہ کائنات کی تخلیق کے بارے میں بہت قیمتی معلومات حاصل کرنے میں سائنس دانوں کو کوہوٹیک سے بہت مدد ملے گی۔ چونکہ سورج کے قریب پہنچنے سے بہت پہلے اسے دریافت کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کے بارے

بقیہ صفحہ پر

# آدھی ملاقات

کاغذ کی قیمت میں اضافہ کے ساتھ ہی طباعت کا خرچ بھی غالباً بڑھ گیا ہے۔ ایسے میں جب تک زیادہ خریدار نہیں بنتے اور اشتہارات شامل نہیں کیے جاتے، ایک رسالہ کو قائم رکھنا انتہائی مشکل ہے۔ تین صفحوں کے اشتہارات تو اب نکل رہے ہیں، آپ ایک آدھے اور صفحے کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ اشاعت کی کثرت کے ساتھ ہی اشتہارات کے لیے راستے کھل جاتے ہیں۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ دو چار خریدار بناؤں۔

(خالد عرفات)

برس ۱۹۷۳ء کا آخری پرچہ ملا۔ ٹائیٹل دیکھ کر بہت ہی مسرت حاصل ہوئی اور میرے والد صاحب بھی ٹائیٹل کو دیکھ کر اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ آپ نے اس ماہ کے پرچہ کو تو بہت ہی دلچسپ بنا دیا ہے۔ مجھ کو اس میں بہت سی کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں۔ جن میں ناظم سیواتی سہسرامی کی لکھی نظم "اہل وطن سے" اور آزاد صاحب کی لکھی نظم "کھیل لینے دو" بے حد پسند آئیں اور کہانیوں میں "ہمارا قومی پرندہ مور" "توتلی بیویاں" اور "بکریوں نے چیتے کو مارا" بہت ہی اچھی لگیں۔ مجھے لکھنے والوں سے امید ہے کہ وہ ہمیشہ اس طرح کی دلچسپ کہانیاں اور نظمیں چھپوانے کے لیے بھیجتے رہا کریں گے اور مجھے امید ہے کہ نئے سال کے پرچے اور بھی زیادہ دلچسپ ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ بچوں کے سوال و جواب کا کالم بھی شروع کر دیں۔

(محمد سلیم قریشی گنج ڈونڈوارہ)

دسمبر ۷۳ء کا پیام تعلیم ہر لحاظ سے اہم دلکش اور قابل [illegible]

ہے۔ اس کا سرورق تو بڑا پرکشش و پربہار ہے۔ خصوصاً ننھے منّوں کے لیے۔ اس سیب خور کو سیب کھاتے اور آس پاس تازہ سیب دیکھ کر اُن کے منہ میں ضرور پانی آیا ہوگا۔ آجکل بازاروں میں سیب بہت آتے ہیں۔ یہ سیب دیکھ کر وہ ضرور بازار سے سیب خریدنے کا سوچ رہے ہوں گے۔ مگر میرا مشورہ ہے کہ بازاری سیب خریدنے کے بجائے پیسے بچا کر وہ پیام تعلیم جیسا لذیذ پھل خرید کر خود کھائیں اور دوستوں کو کھلائیں تو اس کا مزہ مدتوں وہ نہ بھولیں گے۔ اہلِ وطن سے ناظم کی نظم بڑی پر عزم اور قابل درس عمل ہے۔ ہالینڈ کے بچوں کا تیوہار جناب جمیل قریشی صاحب نے بڑا دلچسپ معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ مبارک ہو۔ آزاد نوحی کی نظم کھیل لینے دو حبّ وطن کا آئینہ ہے۔ اور حسنِ سخن و لطف بیان سے بھرپور ہے۔ چند دائیکٹ ر زیر مطالعہ ہے۔ بڑا دلچسپ سفرنامہ ہے۔ قطعہ آزادی بارانی خوب ہے تو افسوس کے آنسو خوب تر سبق آموز ہے۔ موتی مونگے کا جزیرہ خلیق انجم اشرفی کا معلوماتی دلچسپ مضمون کہانی کی کہانی اور معلومات کا خزانہ ہے۔

جشن میں بانو محترمہ مسعود حیات ایم۔ اے نے موتی بکھیرے ہیں۔ اسکائی لیب سائنسی حیرت انگیز شہ پارہ ہے۔ ہمارا قومی پرندہ— اہم اور معلوماتی نسخہ ہے۔ توتلی بیویاں ابھی پڑھا نہیں مگر عنوان سے ظاہر ہے "تتنی اچھی تہانی ہوگی" سچائی ہزار سال پرانی کہانی ہے مگر سچی ہے۔ اس کے تازہ فٹ پاتھ پر چلو۔ سبق آموز ہے۔ کاغذ کی اس نایابی اور گرانی کے دور میں آپ کے نمبر سازی کے عزائم بھی قابل داد ہیں—

[illegible]

حضرت مجیب صاحب قبلہ پر نمبر نکالنے کا پلان تعمیری
ہے۔ حضرت کے قریبی احباب نیز ادارے کے ساتھی بھی اسے
خوب سنوارنے کی سعی فرمائیں گے۔

ایک مضمون ڈنگو بھی ابھی ترجمہ کرکے روانہ کر رہا
ہوں۔ ذرا نظر ثانی کے بعد پسند آئے تو شائع فرمائیے۔

مہر ردولوی

پیام تعلیم کے متعلق یہ کہنا سورج کو روشنی دکھانے
کے مترادف ہے۔ ہم اپنے بچپن ہی سے اسے دیکھتے چلے آرہے
ہیں اور آج بھی وہی تازگی لیے ہوئے ہے۔ ہماری خدمت
میں استادہ ہے۔ خدا کرے اس کی ترقی کی کوئی حد نہ ہو!
آمین!!

اگست کا شمارہ نظروں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اپنی رنگینیاں
سمیٹے ہوئے میرے قلم کو اس بات کے لیے مجبور کر رہا ہے کہ
میں بھی کچھ لکھوں جب بات لکھنے کی آئی تو میں ضرور لکھوں
گا کہ اس شمارے میں جناب انجم اشرفی صاحب کی کہانی
"مونگے کا جزیرہ" اور "میلے کی سیر" بہت پسند آیا ساتھ
ہی "پتھر کھیڑا" جناب عبدالسلام بن رزاق" اور "انوکھی
عدالت" جناب اسرار ندوی کی کہانیاں بھی بہت پسند
آئیں۔ میری طرف سے انھیں دلی مبارک باد دیجیے گا مہربانی
ہوگی۔ اور نظموں میں "بارش کیسے ہوئی" از جناب صدیقی
مسحور"، "برسات کا موسم از جناب کیف احمد صدیقی"
پندرہ اگست از جناب جوہر جام نیری" اور "کب ورشا
آئے گی از جناب عبدالرحیم نشتر کے ساتھ ساتھ دیگر تخلیقات
بھی پسند آئیں اپنی طرف سے میں انھیں دلی مبارک باد دیتا ہوں۔

صفحۂ "بزم نونہال" روز از آج تک برابر پیام تعلیم
پر تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جناب عبدالعزیز نشتر
[illegible]

اور ساتھ ہی ہم اس نیک کام میں اُن کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

سعید احمد رفاعی بمبئی۔

احوال ضروری یہ ہے کہ آپ کا بھیجا ہوا نمونے کا پرچہ ملا پڑھ کر
بڑی مسرت ہوئی۔ خاص کر شرمیتی سو بیتا جا جو دیا کی لکھی ہوئی نیند سولن
کی ہڑتال جس کا ترجمہ جناب روشن علی قاضی (بھیونڈی) نے کیا ہے۔
مجھے اور میرے ساتھیوں کو بے حد پسند آئی۔ میں آپ سے ایک
درخواست کرتا ہوں کہ آپ مہربانی کرکے "پیام تعلیم" میں قلمی دوستی
کے لیے ایک صفحہ ضرور رکھیں۔ عین نوازش ہوگی۔
اور میرے چند ساتھیوں کا خیال ہے کہ پیام تعلیم میں یہ بہت ضروری
ہے کہ آپ اس کا ایک ورق لطیفوں اور سوال و جواب کے لیے رکھیں اگر
یہ مشورہ آپ کو پسند ہو تو خط کے ذریعے ضرور آگاہ کیجیے۔

علاؤ الدین رافعی تینی پاڑہ

---

بقیہ ادھر اُدھر سے صفحہ ۳۸ سے

ہیں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے سائنس
دانوں نے بڑے پیمانے پر تیاریاں کی ہیں۔ ان کے علاوہ
اسکائی لیب اور دوسرے خلائی جہاز اور دنیا کے ہزاروں
سائنس داں اپنی طاقتور خوردبینوں کے ذریعے اس کا مشاہدہ
کر رہے ہیں۔

یہ تو سب کچھ ہے۔ مگر اس کے بارے میں ایک دلچسپ
خبر بھی سنیے ایک عیسائی انجمن نے یہ مزے دار پیشین گوئی
کی ہے کہ اس دم دار ستارے کی آمد سے عام تباہی و بربادی
آئے گی۔ کیا عجب جو قیامت ہی آجائے۔ ایک وہی نہیں دوسروں
نے بھی اسے بد شگونی کی علامت قرار دیا ہے۔ پہلے بھی جب
کبھی دم دار ستارے نظر آئے ہیں انھیں سیلابوں، وباؤں
سلطنتوں کے زوال کا پیش خیمہ خیال کیا گیا ہے۔

Regd. No. D. 1457

FEBRUARY
1974

# PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025



سبرٹ آرٹ پریس اپنے ویرائیٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۵۲۸ پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی



ماہنامہ

# پیامِ تعلیم

نئی دلّی


جلد ۱۱ شمارہ ۳

اڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

مارچ ۱۹۷۴ء

قیمت ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے

جمال پرنٹنگ پریس دلّی میں چھپوا کر

جامعہ نگر نئی دلّی ۲۵ سے شایع کیا


## فہرست مضامین





# بچوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ارکان اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | ۱/۵۰ |
| آں حضرت (اردو) | الیاس احمد مجیبی | ۰/۷۵ |
| پاک کہانیاں (دو حصوں میں) | مقبول احمد سیوہاروی | ۱/۳۵ |
| چار یار | الیاس احمد مجیبی | ۱/۳۰ |
| خلفائے اربعہؓ | خواجہ عبدالحی فاروقی | ۲/۲۵ |
| رسولِ پاکؐ | عبدالواحد سندھی | ۱/۸۰ |
| عقائدِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | ۰/۵۰ |
| مسلمان بیبیاں | مولانا اعجاز الحق قدوسی | -/۷۵ |
| نبیوں کے قصّے | خواجہ عبدالحیؒ فاروقی | ۱/۲۵ |
| ہمارے رسول | " " " | ۱/۶۵ |
| ہمارے نبی | سید نواب علی رضوی اردو -/۷۵ ہندی -/۴۰ | |
| سرکارِ دوعالم | محمد حسین حسان ندوی | ۲/۷۵ |

## معلومات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آدمی کی کہانی | مشتاق احمد | ۱/۷۵ |
| انوکھا عجائب خانہ | محمد حسین حسّان (چار حصّے) | ۱/۸۰ |
| بجلی کی کہانی | علی احمد خاں | -/۵۰ |
| بڑے دادا کی کہانی | عبدالغفور | ۰/۵۶ |
| تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل) | خجستہ سلطانہ | -/۸۰ |
| " " " (دوم) | ضیاء الرحمٰن | ۱/۰ |
| " " " (سوم) | مشتاق احمد اعظمی | ۱/۸۰ |
| " " " (چہارم) | " " " | ۰/۹۵ |
| چٹانوں کی کہانی | محمد امین | ۱/۷۵ |
| خبر رسانی کے طریقے | رفیعہ منظور الامین | -/۸۵ |
| دُنیا کے بچے | محمد حسین حسّان ندوی | ۱/- |
| دہلی | ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی | ۱/۸۰ |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| رابندر ناتھ ٹیگور | صفدر حسین | ۱/۲۵ |
| سماجی زندگی (اوّل) | احمد جمیل و غلام ابرار | -/۵۶ |
| " " (دوم) | " " " " | -/۸۱ |
| " " (سوم) | " " " " | -/۸۱ |
| سمندر کے کنارے | سلطانہ آصف فیضی | ۱/۳۰ |
| " " نیچے | " " " | ۲/۰ |
| قدرت کے کرشمے | (ادارہ) | -/۶۲ |
| میر انیس | محمد حسین حسّان ندوی | ۱/۲۵ |
| ہماری پارلیمنٹ | کیلاش چندر | ۱/۲۵ |

## کہانیاں، ڈرامے، ناول

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصّے | | ۴/۰ |
| اس نے کیا کرنا جانا (کہانیاں) | آصف مجیب | -/۳۷ |
| پریم کی جیت (ڈراما) | اسداللہ کاظمی | -/۳۷ |
| تانبیل خاں (کہانی) | محمد حسین حسّان | -/۵۰ |
| ترکوں کی کہانیاں (") | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | ۰/۵۵ |
| تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) | م - ندیم | ۱/۵۰ |
| تین اناڑی (") | عصمت چغتائی | ۱/۵۰ |
| چقماق کی ڈبیا (کہانی) | برکت علی فراق | -/۴۰ |
| چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی) | محمد معین | -/۳۵ |
| چنبیلی | محمد حسین حسّان | -/۵۰ |
| ستاروں کی سیر (ناول) | کرشن چندر | ۱/۷۵ |
| گورے دادا (سچا ناول) | مجیب احمد خاں | ۱/۷۵ |
| لال مرغی (کہانی) | عبدالواحد سندھی | -/۵۰ |
| مزہ چکھائیں گے (") | مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/۳۵ |
| مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں) | محمود علی خاں | -/۶۵ |
| ننھا منّا (کہانی) | خورشید سلطان | -/۴۰ |

# بچوں سے باتیں

ٹائیٹل کا کاغذ نہ ملنے کے سبب آپ کے پرچے کی اشاعت میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی۔ محض مجبوری کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے۔ آپ کی طرح ہمیں بھی اس کا بہت افسوس ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ پرچہ جلد سے جلد وقت پر آجائے۔ آپ بھی دعا کیجیے۔ ویسے کاغذ کی پریشانی اتنی بڑھ گئی ہے کہ لاکھوں چھپنے والے اخبار اور رسالے بوکھلا اٹھے ہیں۔ اکثر اخباروں نے صفحے کم کردیئے ہیں ہفتے میں ایک دن کا ناغہ کردیا ہے۔ غرض کاغذ کی نایابی کے سلسلے میں بڑے بڑے ہار مان گئے ہیں۔ بے چاروں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔

---

مگر ہمارے لیے ایک خوشی کی بات بھی ہے۔ بے حد خوشی کی۔ جنوری اور فروری کے ٹائیٹل متفقہ طور پر سبھی نے پسند کیے۔ فروری کے ٹائیٹل کی خاص طور پر تعریف کی گئی۔ ہم یہ بتادیں کہ ٹائیٹل کے ڈیزائن کی تیاری۔ ٹائٹل کی چھپائی۔ ٹائیٹل کے لیے کاغذ کی فراہمی۔ غرض سب کچھ ہمارے محترم جنرل منیجر جناب شاہد صاحب کا کارنامہ ہے۔ ہمارے شاہد صاحب کو آپ کے پیام تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی ہے اور وہی نہیں ان کی بیگم صاحبہ کو بھی پیام تعلیم سے اتنا ہی شغف ہے۔

---

ہمارے محترم کرم فرما، جمیل قریشی صاحب نے وعدے کے مطابق ہالینڈ کی پن چکی پر عین وقت پر اپنا مضمون مرحمت فرمایا۔ افسوس ہے کہ پچھلی جنوری کے آخری ہفتے میں قریشی صاحب کی والدہ محترمہ نے اچانک انتقال فرمایا۔ بیماری بھی دل کی تھی انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔ مرحومہ جمیل صاحب سے بہت محبت کرتی تھیں۔ جمیل قریشی صاحب پر بھی بہت اثر ہے۔ خدا انھیں اور دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ بھلا ان پریشان کن حالات میں قریشی صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ہمارے دل میں اس کی بڑی قدر ہے۔ اگلے پرچوں میں ہالینڈ کی اور اہم اہم چیزوں پر دلچسپ مضمون پڑھیے گا۔

---

وعدے کے مطابق اس پرچے میں محترم خالد عرفان۔ ام اس۔ سی کا مضمون پڑھیے اور اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھیے۔ انھوں نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے کہ پیامیوں نے یہ مضمون اپنے لیے مفید پایا اور اسے پسند کیا تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

---

کہتے ہیں قبلہ ذاکر صاحب مرحوم ۸۔ فروری کو پیدا ہوئے تھے پچھلی ۸۔ فروری کو مرحوم کی سال گرہ منائی گئی۔ جامعہ کے انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ میں جلسہ کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم احراری (بی اے جامعہ) جلسے کے صدر تھے۔ محترم ڈاکٹر سیّد عابد حسین، جناب سعید احمد اکبرآبادی، جناب مسعود حسین خاں (موجودہ شیخ الجامعہ) نے موزوں الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ عابد صاحب قبلہ نے ذاکر صاحب کی دو خصوصیتوں پر خاص طور پر زور دیا۔ ایک تو یہ کہ لوگوں کو اپنے ساتھ کام کرنے کی ترغیب

دیتے وقت وہ سبز باغ نہیں دکھاتے تھے بلکہ فرماتے تھے کہ ریگستان یا صحرا میں کنواں کھودتا ہے ممکن ہے کہ پانی نہ نکلے یہ بھی ممکن ہے کہ چشمہ پھوٹ نکلے ۔ دوسرے یہ کہ ان کے فلسفۂ زندگی میں کام کی اہمیت بہت زیادہ تھی اُن کے نزدیک کام ہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے ۔ جو کام اس کے سپرد ہو اسے وہ لگن سے کرتا ہے تو عبادت ہے ۔

---

جلسے کے آخر میں صدر جلسہ جناب ڈاکٹر علیم احراری نے امسال نہرو اوارڈ پانے والے طالب علموں کو انعام تقسیم فرمائے یہ انعام اب تک کانوکیشن کے موقع پر دیے جاتے تھے ۔ اس سال یہ انعام تین طالب علموں میں تقسیم کیے گئے ۔ پہلا انعام پانچ سو روپے کا عزیزی عزیز اختر ( ٹیچرس کالج جامعہ ) کو دیا گیا ۔ دوسرا انعام تین سو روپے کا عزیزی شمیم احمد درجہ دہم ہائی سکنڈری اسکول جامعہ کو اور دو سو روپے کا تیسرا انعام مسٹر فیضان بیگ نوری متعلم درجۂ ہفتم مڈل اسکول جامعہ کو دیا گیا ۔ یہ سن کر آپ کو شاید دلچسپی ہو کہ عزیز اختر جناب شفیع الدین نیّر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور ہاں کئی سال پہلے عزیزی فیضان بیگ نوری کی بڑی بہن کو یہی انعام مل چکا ہے ۔ ہم ان تینوں ہونہار عزیزوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں ۔

پچھلے مہینے پانچ فروری کو بہت ہی افسوس ناک حادثہ پیش آیا ہمارے دوست پیام تعلیم اور اس کے ایڈیٹر کے دلی قدر دان قیصر زیدی صاحب پرنسپل ٹیچرس کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اللہ کو پیارے ہوئے ۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا الیہ راجعون ۔

مرحوم زیدی صاحب کا تعلق سادات بارہ سے تھا محترم کرنل بشیر حسین زیدی کے بھتیجے تھے ۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں پائی ۔ جغرافیے میں ام اے کیا ۔ علی گڑھ ہی سے بی ٹی کیا اور شعبۂ تعلیم میں لکچرر مقرر ہو گئے معلمی کے زمانے میں اردو میں ام اے کیا اور کولمبیا یونی ورسٹی ( امریکہ ) سے بھی تعلیم میں ام اے کیا ۔ غالباً ۱۹۴۵ء میں کرنل زیدی صاحب نے اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے "کتابی دنیا" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا ۔ مرحوم قیصر زیدی صاحب شعبۂ تصنیف و تالیف کے انچارج تھے ۔ اسی زمانے میں مرحوم سے شناسائی ہوئی مرحوم کی فرمائش پر میں نے ادارے کی بچوں کی کچھ کتابوں پر نظر ثانی بھی کی ۔ بچوں کے لیے ایک بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی کہانی مرحوم نے اسی زمانے میں لکھی ۔ اس کہانی نے بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی بعض لوگ تو مرحوم کے بعض ہم نام حضرات سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے جلو مرغابی والے قیصر صاحب کہا کرتے تھے ۔ اسی زمانے میں میں نے ہماری زمین کے نام سے بچوں کے لیے ایک کتاب لکھی تھی ۔ قیصر صاحب نے یہ کتاب بہت پسند کی تھی اور لکھنے والے کی بہت ہمت بڑھائی تھی ۔ افسوس کہ یہ اب بالکل نایاب ہے ۔

کتابی دنیا کا ادارہ ۴۷ء کے انقلاب کی نذر ہو گیا تو مرحوم چند دنوں ادھر ادھر گھوم پھر کر پھر علی گڑھ آ گئے شعبۂ تعلیم سے تعلق ہو گیا اور ترقی کرتے کرتے اس شعبے کے صدر ہو گئے ۔ مرحوم نے ، ہم سے پہلے پیام تعلیم میں بہت قیمتی مضمون لکھے ہیں ۔ لیکن اُن کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی باوجود اس کے اس نئے دور میں ایک دو بہت ہی قیمتی مضمون لکھے ہیں ۔ بچوں کے لیے بہت ہی سادہ زبان میں دلچسپ اور انوکھے انداز میں لکھتے تھے ۔ انھوں نے اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی خاص طور پر کچھ کتابیں لکھی ہیں ان میں سے کچھ چھپی ہیں کچھ نہ چھپی ۔

ماخوذ ص ۳۶

جناب حافظ یاقوی

# ماں کی دعا

سورج، چاند تھے بھائی بھائی
اُن کی تھی اِک بوڑھی مائی
چاند کو تھی امّی سے محبّت
وہ کرتا تھا اس کی خدمت
سورج امّی سے لڑتا تھا
اُس پر خوب برس پڑتا تھا

---

ایک تھی سندر راجکماری
نام تھا اس کا دھنک دُلاری
برکھا رانی کی تھی پُتری
ہر دم رہتی تھی وہ سُتھری
نیلی، پیلی، سبز، گُلابی
رنگ برنگی پہن کے ساری
سیر کو ہر دن جاتی تھی وہ
سب کے من کو بھاتی تھی وہ
اک دن برکھا رانی کے گھر
دھنک دلاری کا تھا سوئمبر
سورج چاند وہاں جب پہنچے
راجکماری کو وہ بھائے
ان سے بولی دھنک دُلاری
"اس کی ہے بس سچّی یاری





میرے لیے جو جگ کو چھوڑے
اپنوں، پرایوں سے مُنہ موڑے
کون ہے جو میرا ہو جائے
میری ہی دھن میں کھو جائے
کہا دھنک سے چندا نے یوں
"امی کو میں کیسے چھوڑوں؟"
سورج بولا "اچھّا اچھّا
دھنک دلاری! میں ہوں سچّا
ساری چیزیں تم پر قربان
رشتے ناتے، ابّا، امّاں"
دھنک دلاری نے خوش ہو کر
ہار اُسے پہنایا سُندر
سورج بنا دھنک کا شوہر
ٹھیس لگی چندا کے دل پر
چندا آیا جب اپنے گھر
ناکامی کا داغ تھا دل پر
امی نے جب سنا یہ قصّا
چندا کو سینے سے لگایا
بولی "بیٹا غم مت کھاؤ
میری دعا ہے خوش ہو جاؤ
ساتھ چکوروں کے تم ہردم
رہو گے ٹھنڈی چھاؤں میں خرم[1]
شاد یہ میرا چندا ہو گا
اُس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا
مرجائے گی دھنک دلاری
دل سورج کا ہو گا بھاری

[1] خوش۔

غم میں جلتا رہے گا سورج
چڑھتا ڈھلتا رہے گا سورج
میرا چندا لالا ہوگا
سورج آگ کا گولا ہوگا
ہردم آگ بگولا ہوگا
آفت کا پرکالا ہوگا"
مرگئی اک دن دھنک دلاری
سورج تھا اور آہ وزاری
چاند ہے اس دن سے خنکی[1] میں
سورج برہا[2] کی اگنی[3] میں

---

برکھا رت میں دھنک دلاری
پہن کے رنگ برنگی ساری
کبھی کبھی سپنے میں آکر
اپنی جھلک سورج کو دکھا کر
اس کو راحت پہنچاتی ہے
پھر وہ غائب ہو جاتی ہے

اُس دم کچھ ٹھنڈا ہوتا ہے

پھر سورج لاوا ہوتا ہے



---

1۔ ٹھنڈک
2۔ جدائی
3۔ آگ

جناب جمیل قریشی ایم اے

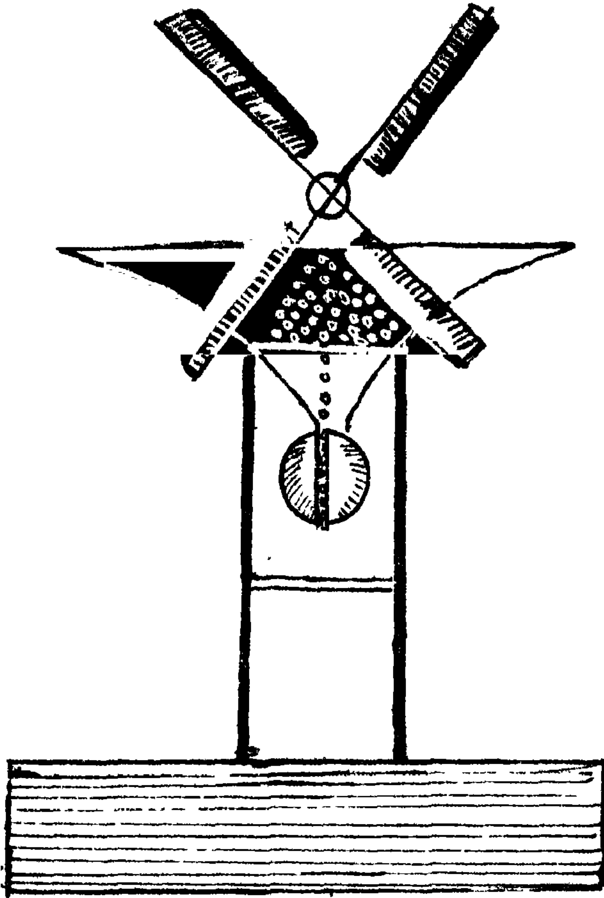
# ہالینڈ کی پن چکی

## WIND MILL

نہر پہ چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

نہر یا دریا کے کنارے آپ نے کبھی بڑے بڑے چار پروں والی پن چکی دیکھی ہوگی ۔ پرانے زمانے میں آٹا پیسنے کا کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں تو یہ قریب قریب ہر ملک میں پائی جاتی تھی ۔لیکن اب دنیا میں ہالینڈ ہی میں زیادہ استعمال ہوتی ہے ۔ ہالینڈ دراصل پن چکیوں کا ملک کہلاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ پن چکیاں بارھویں صدی عیسوی سے اس ملک میں استعمال ہوتی ہیں ۔ ۱۸۵۰ء میں ان کی تعداد تقریباً نو ہزار تھی ـــــــ اتنی بڑی تعداد میں پن چکیاں دُنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی ہیں ۔ لگ بھگ دو ہزار پانچ سو تو اب بھی باقی ہیں ۔ نو سو پینتالیس اچھی حالت میں ہیں تقریباً تین ہزار سے زائد لوگ ان میں اب بھی رہتے سہتے ہیں ۔ یہ کئی کئی منزل کی بھی ہوتی ہیں ۔پہلی منزل میں رہنے کی جگہ ہوتی ہے دوسری میں سامان ہوتا ہے اور تیسری میں چکّی کے پائے لگے ہوئے ہیں ۔ اس کے بعد اوپر کا حصّہ ہوتا ہے جہاں چار پر لگے ہوتے ہیں یہ پر ہوا سے چلتے ہیں پروں کے گھومنے سے چکّی کے پاٹ چلنے لگتے ہیں ۔ لائڈن شہر میں ایک چکّی ہم نے ایسی دیکھی جس میں نیچے کے حصّہ میں تین کمرے تھے ۔ ایک اسٹور تھا ۔ لیعنی یہ ایک بہت اچھا مکان بھی تھا اور ایک کارخانہ بھی ۔



ہالینڈ دُنیا کا بہت ترقی یافتہ ملک ہے ۔ یہاں ہر سو آدمیوں میں سے ۴۳ آدمی کارخانوں میں کام کرتے ہیں ۔ یہاں کے لوگ تجار قوم کے نام سے جانے جاتے ہیں اپنے ملک کا مال تیار کر کے باہر کے ملکوں کو بھیجتے ہیں اور باہر کے ملکوں سے بھی خوب سامان خریدتے ہیں ۔سامان مشین کا

استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ لیکن پن چکیاں اب بھی قصبوں
اور دیہاتوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے
بعد سے مشین کا استعمال زیادہ ہو گیا ہے۔ جہاں ہزاروں
پن چکیاں تھیں اب ان کی جگہ ہزاروں فیکٹریاں ہو گئی ہیں۔

آپ سوچیں گے کہ آخر یہ پن چکیاں کام کیا کرتی تھیں
یہ پن چکیاں اناج سے آٹا پیسنے، بیجوں سے تیل نکالنے،
کاغذ بنانے۔ لکڑی کاٹنے۔ سگرٹ کے لیے تمباکو پیسنے،
کپڑا تیار کرنے، رنگنے بٹنے وغیرہ کے کام آتی تھیں۔

ایک دوسرا اہم کام بھی کرتی تھیں۔ یعنی زمین کو
خشک کرنا۔ عام طور پر پن چکیوں کی دو قسمیں ہوتی تھیں پہلی
قسم تو استعمال کے لیے چیزیں تیار کرنے والی۔ دوسری زمین
کو خشک کرنے والی جن کو پولڈر مل کہتے ہیں (انگریزی میں
چکی کو مل (MILL) کہتے ہیں اور پن چکی کو (WIND MILL
ونڈ مل) پولڈر زمین کے اس حصے کو کہتے ہیں جو پانی
سے حاصل کیا گیا ہے۔

پولڈر ملیں ہالینڈ کے شمالی حصے میں کثرت سے
ہیں۔ یہ حصہ سمندر کی سطح سے نیچا ہے۔ یہاں پانی
و خشکی سے دور رکھنے کے لیے پشتے (ڈائک) بنائے
گئے ہیں۔ ان پن چکیوں کے ذریعے پانی کو نہروں میں (جو
اس حصے میں پھیلی ہوئی ہیں) لے جاتے ہیں اور نہروں کا
زائد پانی دریا میں چلا جاتا ہے۔ دریا کا زائد پانی سمندر میں
گر جاتا ہے۔ اس طرح خشکی باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں گھاس
اگ آتی ہے اور چوپاؤں کو چرنے کے لیے اچھے میدان
بن جاتے ہیں۔ یہاں کی گائیں دنیا میں سب سے زیادہ
دودھ دیتی ہیں۔

اس ملک کا مشرقی حصہ سمندر کی سطح سے اونچا
ہے۔ وہاں پن چکیاں نہیں ہیں۔ زائد پانی اپنا راستہ
خود بنا لیتا ہے۔ دوسری قسم کی پن چکیاں تمام ملک میں
موجود ہیں۔ کہیں کہیں تو ایک لائن میں کئی کئی ہوتی ہیں۔

یہی رہا لینڈ دنیا کا ایسا ملک ہے۔ جو بالکل سپاٹ
ہے۔ چاروں طرف میدان ہی میدان۔ ہری ہری گھاس
پر کتھئی سفید یا کالی سفید موٹی موٹی گائیں دکھائی دیتی
ہیں اور پن چکیاں یا ہوا چکیاں یہاں بغیر رکاوٹ کے زناٹے
سے چلتی ہیں۔ یہاں ٹیلے اور پہاڑ بالکل نہیں ہیں۔ لوگ
ہوشیار ہیں انھوں نے پن چکی کے ذریعے اس سستی
طاقت "ہوا" کا استعمال خوب کیا ہے۔

اب تک ...۳۱۵۱ ایکڑ زمین اس طریقہ سے
حاصل کی جا چکی ہے۔ اب بھی سمندر سے زمین چرانے کا
کام جاری ہے۔ پن چکیوں کی جگہ ڈزل پمپنگ اسٹیشن
بن گئے ہیں۔ جو سینکڑوں پن چکیوں کا کام کرتے ہیں۔
اندازہ ہے کہ لوگ ...۳۳۱۱ ایکڑ زمین اور حاصل
کرلیں گے یہ اس ملک کے کل رقبے کا دس فیصدی حصہ
ہوگا۔

پن چکیاں اب قومی ملکیت ہو گئی ہیں۔ ان کی پوری
نگرانی ہوتی ہے۔ کوئی انھیں نہ گرا سکتا ہے نہ ختم کر سکتا
ہے۔ ان کی مرمت بھی برابر ہوتی رہتی ہے۔ یہ صاف
ستھری رکھی جاتی ہیں۔ ان کی حفاظت کے لیے ایک علیحدہ
محکمہ ہے۔

ملک کے لوگوں کو ان سے عقیدت ہے۔ کہتے ہیں کہ اس
ملک پر جب جرمنی نے قبضہ کیا تو یہاں کے لوگوں میں (جو ڈچ
کہلاتے ہیں) وہ لوگ جو چھپ گئے تھے۔ ان پن چکیوں
ہی کے پروں کے رخ سے دشمن کی خبر ایک دوسرے
کو دیتے تھے۔ اس ترکیب سے وہ محفوظ رہے۔
خوشی اور شادی بیاہ کے موقعوں پر ان پن چکیوں

جناب سنجر انصاری کلکتہ

# ایک چھوٹی سی نیکی

بچو بڑھیا تھی ایک اندھی
لاٹھی کے سہارے جارہی تھی

مشکل سے اٹھا رہی تھی پاؤں
یکساں تھی نظر میں دھوپ چھاؤں

کپڑے جو تھے وہ پھٹے ہوئے تھے
اور گرد میں سب اٹے ہوئے تھے

کھانے کو نہ تھا غریب کے پاس
چہرے سے ٹپک رہا تھا افلاس

دنیا میں نہ تھا کوئی سہارا
قسمت پہ کسی کا کیا اجارا!

یہ روشنی پھول اور سبزہ
بڑھیا کو نظر نہ کچھ بھی آتا

دنیا کے یہ خوشنما نظارے
تھے اس کے لیے فضول سارے

ایک بوجھ تھا کانپتا ہوا سر
مشکل تھی اسے قدم قدم پر

کچھ ایسی اداس ہو رہی تھی
جینے سے نراس ہو رہی تھی

رستے میں کھڑی تھی ایک بچی
دیکھا جو اُسے تو پاس آئی

بڑھیا کا پکڑ کے کانپتا ہاتھ
کچھ دور تو لے گئی اُسے ساتھ

پھر چُپکے سے دے کے ایک پیسہ
بڑھیا کو بتایا سیدھا رستہ

بڑھیا نے ہزار لیں بلائیں
اور سینکڑوں دیں اُسے دعائیں

اے بچو! یہ نہ تم سمجھنا
یہ چھوٹی سی بات کا ہے قصہ

دنیا میں کرو ذرا سی نیکی
لگتی ہے خدا کو وہ بھی اچھی

معلوم ہے تم کو قطرہ قطرہ
ہو جاتا ہے جمع ہو کے دریا

مل جائے جو کوئی دکھ کا مارا
تم اس کو ضرور دو سہارا

نیکی کی جو راہ پر چلو گے
پھولو گے جہاں میں اور پھلو گے



جناب خالد عرفان ام ایس سی

# آبی تجربے

پانی ـــــ اللہ میاں کی ایسی نعمت ہے جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے زندہ رہنے کے لیے ہوا جتنی ضروری ہے اسی قدر پانی بھی ضروری ہے۔

اگر میں کہوں پانی جس قدر قیمتی اور اہم ہے اسی قدر حیرت انگیز بھی ہے تو شاید آپ نہ مانیں

اچھا بتائیے، پانی کو کن کن شکلوں میں آپ نے دیکھا ہے؟ آپ جھٹ سے کہہ دیں گے ـــــ واہ، یہ بھی کوئی بات ہوئی، پانی، ارے بھئی پانی تو بس پانی ہے ـــــ بہتا ہوا، ٹھنڈا ٹھنڈا، لیکن آپ جانتے ہیں، اشیا تین شکلوں میں ملتی ہیں۔ اوّل تو وہ ٹھوس ہوتی ہیں جیسے لوہے یا شکر کی ڈلی۔ دوسرے پانی کی شکل میں جس کو مایع کہا جاتا ہے اور تیسرے گیس کی صورت میں جیسے ہوا۔

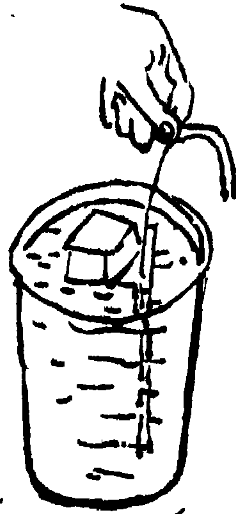
آپ نے لوہے کو پانی کی طرح بہتے نہ دیکھا ہوگا۔ یا پٹرول اور مٹی کے تیل کو لوہے کی طرح سخت ہوتے نہ دیکھا ہوگا نہ ہوا کو پانی جیسے مایع کی شکل میں لیکن بھئی یہ جو آپ پانی دیکھ رہے ہیں، وہی جو موسلا دھار بارش میں آسمان سے گرتا ہے، گنگا اور کاویری جیسی ندیوں میں چھل چھل بہتا ہے اور بحیرۂ عرب جیسے سمندر میں ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے۔ یہی پانی ایک ایسی شے ہے جو تینوں شکلوں میں پایا جاتا ہے۔

دیکھ چکے ہیں۔ کیا آپ نے برف نہیں دیکھی؟ برف پانی ہی تو ہے جو جم کر اور سخت ہوکر، ٹھوس شکل اختیار کر گیا ہے اور مایع یا سیال (بہتا ہوا) پانی تو اس کی عام شکل ہے ہی پانی کو خوب گرم کرنے پر بھاپ بنتی تو آپ نے دیکھا ہوگا، اسی سے تو ریل کا انجن دوڑتا ہے اور کئی دوسری مشینیں چلتی ہیں یہی بھاپ پانی کی گیس کی شکل ہے، اور یہ ہوئی نا تعجب کی بات! ایک ہی چیز کی تین شکلیں، تین مختلف حالتیں!!

اب اگر میں یہ کہوں کہ برف کی ڈلی ہوکر گلاس میں بھرا پانی یا کیتلی میں اُبلتا پانی ـــــ اصل میں نہایت عجیب وغریب ہیں تو شاید مجھے ثابت بھی کرنا پڑے۔ آپ یوں ہی میری باتوں پر کب یقین کریں گے! ـــــ آیئے آج کی محفل میں دو چار ایسے تجربے کریں جن سے پانی کی حیرت انگیز خصوصیات کا پتہ چلے۔

پہلا تجربہ ایک طرح کا کھیل ہے اس کے ذریعے آپ اپنے دوست کو شرط لگاکر ہرا سکتے ہیں۔ اس تجربے میں بس آپ کو تین ہی چیزیں لینی ہوں گی۔ ایک برف کی ڈلی، ایک پتلی ڈوری یا مضبوط تاگا اور پانی سے بھر پیالہ۔ ایک چیز اور بھی ہے، ایک چھوٹی سی شیشی اس کو علیحدہ رکھ لیجیے۔ اس سے کیا کام لینا ہوگا

برف کی ڈلی کو پیالہ کے پانی میں ڈال دیجیئے (شکل نمبر ۱)۔



شکل نمبر ۱

اور اپنے دوست سے کہیے "ذرا اس برف کی ڈلی کو پیالے سے باہر نکال دیجیے۔ اس ڈور کی مدد سے۔ شرط یہ ہے کہ ڈور میں نہ تو گانٹھ لگے نہ برف کی ڈلی کو ہاتھ لگے۔"

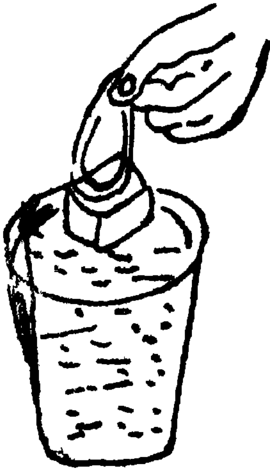
شاید آپ کے دوست ڈور میں حلقہ سا بنا کر برف کی ڈلی کو نکالنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ ناممکن ہوگا اس لیے کہ برف کی ڈلی حلقے کی گرفت میں نہ آ سکے گی۔ پھسل پھسل جائے گی آپ کے دوست کوشش کرتے کرتے تھک جائیں تو آیئے ایک سائنسی اصول کو اپنا کر برف کی ڈلی کو باہر نکال دیں اس طرح کہ نہ اس میں ہاتھ لگے اور نہ ڈور میں گانٹھ لگانا پڑے۔

اپنی جادو کی شیشی باہر نکالیے۔ اس میں پسا ہوا نمک بھر کر رکھا ہوگا۔ آپ ڈور کو پیالے کے پانی میں پوری طرح بھگو لیجیے، پھر اس گیلی ڈور کو پیالے میں تیرتی برف کی ڈلی پر پھیلا دیجیے،



شکل نمبر ۲

اس طرح کہ اس کے دونوں سرے پیالے سے باہر نکلے رہیں۔ اب ڈلی کے اوپر ڈور کے دونوں طرف پسا ہوا نمک چھڑک دیجیے۔ اور دو تین منٹ کے بعد ڈور کو اس کے دونوں سرے پکڑ کر اٹھائیے ارے یہ کیا! ڈور کے ساتھ برف کی ڈلی کھنچی چلی آئے گی۔ ہوئی نہ مزے کی بات!



شکل نمبر ۳

آپ آیئے دیکھیں کہ یہ ہوا کیسے؟ برف کی ڈلی میں ڈور اس قدر مضبوطی کے ساتھ کیسے لگ گئی؟

آپ جانتے ہیں پانی کو ٹھنڈا کرنے سے وہ برف بن جاتا ہے۔ درجۂ حرارت ناپنے کے لیے ایک پیمانہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں۔ فارن ہیٹ ڈگری۔ جب کوئی سیال شے جم کر ٹھوس بنتی ہے تو جس درجۂ حرارت پر وہ ٹھوس بنتی ہے اس کو کہتے ہیں نقطۂ انجماد۔ پانی کا نقطۂ انجماد ہے ۳۲ ڈگری فارن ہیٹ یعنی پانی کو جب ۳۲ درجہ فارن ہیٹ تک ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ تو وہ اس قدر ٹھنڈا ہو جاتا ہے کہ جم کر برف ہو جاتا ہے۔

لیکن جب پانی میں کوئی شے مثلاً نمک وغیرہ گھلی ہوتی ہے تو اس کا نقطۂ انجماد گھٹ جاتا ہے یعنی ایسا پانی ۳۲ درجہ فارن ہیٹ سے بھی نیچے جا کر برف بنتا ہے۔ اسی لیے جب آپ

برف کی ڈلی پر نمک چھڑکتے ہیں تو وہ اس پانی میں گھلنا شروع ہو جاتا ہے
جو برف کی ڈلی کی سطح پر ہوتا ہے۔
نمک ملے ہوئے اس پانی کا درجہ حرارت ۳۲ درجہ فارن ہیٹ
ہوتا ہے لیکن وہ اس نقطہ پر نہیں جم سکتا۔ آپ نے ڈور
کو پانی میں بھگولیا تھا نا، اسی لیے ڈور پر جو پانی ہوتا
ہے وہ قدرے گرم ہوتا ہے۔ یہ گرمی نمک گھلے پانی میں
منتقل ہو جاتی ہے اور اس طرح ڈور پر لگے پانی کا درجہ
حرارت گھٹنے لگتا ہے اور گھٹتے گھٹتے ۳۲ درجہ فارن
ہیٹ تک آ جاتا ہے اور برف بن جاتا ہے پھر یہ برف کی ڈلی
کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے ڈور کے سروں کو پکڑ کر اٹھانے
پر برف کی ڈلی بھی ڈور سے لگی چلی آتی ہے؟ سمجھ گئے نا
آپ!

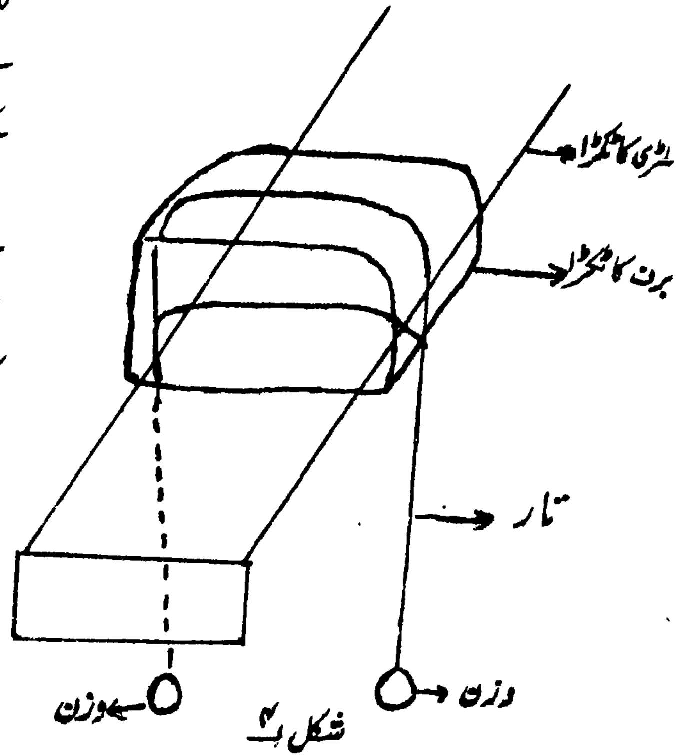
ایک اور بات سمجھیے گا۔ اسی پیالے میں ایک کنکری
ڈالیے، وہ سیدھی تہہ میں بیٹھ جائے گی۔ جب بھی آپ کوئی
ٹھوس اور وزنی شے پانی میں ڈالتے ہیں، وہ فوراً نیچے
کی طرف چلی جاتی ہے۔ لیکن برف ٹھوس ہوتے ہوئے بھی
پانی کی سطح پر ہی تیرتی ہے، بھلا کیوں؟

اس کی ایک وجہ آسانی سے سمجھ میں آسکے گی بات کچھ
اس طرح ہے عام طور سے جب بھی کوئی چیز ٹھنڈی ہو جاتی ہے
اور اپنی گرمی دوسرے کو منتقل کرتی ہے تو وہ سکڑنے لگتی ہے
چھوٹی ہوتی جاتی ہے، اور اس کا وزن بھی بڑھنے لگتا ہے ـــ
لیکن پانی ـــ پانی کے سلسلے میں ایسا ہوتا بھی ہے اور نہیں
بھی۔ ہوتا یوں ہے کہ جیسے جیسے پانی کا درجہ گرنے لگتا ہے
اور وہ ٹھنڈا ہونے لگتا ہے ویسے ویسے وہ بھاری ہونے
لگتا ہے۔ لیکن یہ عمل ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر رک
جاتا ہے یعنی پانی ٹھنڈا ہوتے ہوتے ۳۹ درجہ پھر فارن
بڑھتا دونوں رک جاتے ہیں۔ پھر ایک عجیب بات ہوتی
ہے۔ اب وہ اپنے حجم میں پھیلنے لگتا ہے اور حجم کے پھیلنے
کے ساتھ ہی اس کا وزن کم ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ
۳۲ درجہ فارن ہیٹ پر اگر وزن میں کمی کی حد بھی آ جاتی ہے
یعنی نقطۂ انجماد پر پہنچ کر وہ برف بننے لگتا ہے جس کا حجم بھی
پھیلنے لگتا ہے اور اس پھیلے ہوئے حجم میں برف اس قدر ہلکی
ہوتی ہے کہ وہ پانی کی سطح پر تیرنے لگتی ہے، پانی میں
ڈوب نہیں جاتی۔ آپ نے سمندر میں بہتی برف کی چٹانوں
کا ذکر سنا ہوگا جن کو گلیشیر کہتے ہیں اور جن سے ٹکرا کر
جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ان چٹانوں کے
سمندر کی سطح پر بہنے کا راز بھی یہی ہے۔

ایک اور پتہ کی بات بتاتا جاؤں۔ سردیوں کے موسم
میں آپ نے کبھی تالاب کی سطح پر برف جمی ہوئی دیکھی ہو
تو سمجھ جایئے کہ پانی صرف سطح پر جما ہوا ہے۔ تہ میں وہ
سیال پانی ہی ہے۔ اس راز کو مچھلیاں بھی جانتی ہیں
اور سردیوں کے موسم میں وہ تالاب کی تہ میں چلی جاتی
ہیں اور مزے سے تیرتی رہتی ہیں اس وقت سطح پر
آئیں تو وہ بھی جم کر رہ جائیں!

اب آیئے، اپنے دوست کو ایک بار اور ہرائیں،
ان سے کہیے گا کہ برف کی ڈلی کو کاٹے بغیر اس تار کو اس
کے درمیان سے گزار دیں جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ
سوچنے لگیں گے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ برف کاٹی بھی
نہ جائے، تار بھی گزر جائے اور برف کی ڈلی جوں کی
توں رہے! اور جب وہ ہار مان لیں تو آپ بس یوں کیجیے
کہ برف کے ٹکڑے کو لکڑی کے ایک ایسے ٹکڑے پر رکھیے
جس کی چوڑائی برف کے ڈلے کی چوڑائی سے کم ہو۔ اور

حصے لکڑی کے باہر رہیں۔ تار کو درمیان سے دو بار موڑ کر کمان کی شکل کا بنا لیجیے اور اسی کمان کو برف کے ٹکڑے کے اوپر اس طرح رکھیے کہ دونوں سرے باہر کی طرف جھولتے رہیں۔ اب ان سروں پر وزنی باٹ یا کوئی اور وزنی شیشے باندھ دیجیے۔ (شکل ۱۲)




شکل ۱۲

اور بس دیکھا کیجیے۔ تار آہستہ آہستہ برف کو کاٹتا ہوا نیچے کی طرف کھسکتا جائے گا یہاں تک کہ برف کے پار ہو جائے گا اور برف کا ٹکڑا ویسے کا ویسا رہے گا۔ پار ہونے کے وقفے کا انحصار تار کی موٹائی اور اس کے سروں پر بندھے وزن پر ہوگا۔ کہیے کیسی رہی ہے نا اچنبھے کی بات!

ہوتا یہ ہے کہ برف کو گرم کرنے پر پانی تو بنتا ہی ہے۔ لیکن جب برف پر دباؤ پڑتا ہے۔ تب بھی وہ پانی بننے لگتا ہے۔ تار کے سروں پر جو وزن بندھا ہوا ہے اس سے تار نیچے کی طرف کھینچا جاتا ہے اس طرح برف کی سطح پر تار کے بالکل نیچے دباؤ زیادہ ہو جاتا ہے اور یہاں کی برف پانی بن جاتی ہے۔ اب یہ پانی تار کے اوپر کی جانب منتقل ہو جاتا ہے، اب تار کے نیچے کی طرف کھسک کر برف کی نچلی سطح پر ٹک جاتا ہے جس پر اب دباؤ پڑنے لگتا ہے اور وہ پانی میں بدل جاتا ہے۔ برف سے پانی بننے کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور تار آہستہ آہستہ برف کے ڈلے کے پار ہو جاتا ہے؟

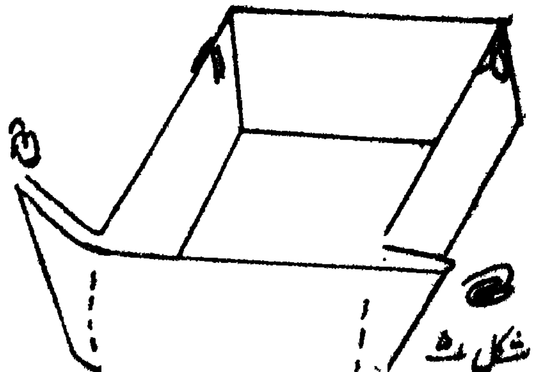
آپ پوچھیں گے، برف جو پانی میں بدلتا ہے اور تار کے اوپر کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کا کیا بنتا ہے؟ بھئی، ظاہر بات ہے، یہ پھر سے برف بن جائے گا۔ کیوں؟ وجہ معمولی ہے، آپ نے دیکھا تھا کہ برف پانی میں اس وقت تبدیل ہوا تھا جب اس پر دباؤ پڑا تھا۔ اب یہ دباؤ نہیں رہا تو وہ پھر سے برف ضرور بن جائے گا نا! خاص کر اس لیے بھی کہ اس کے اردگرد صرف برف ہوگی اور جس کا درجہ حرارت پانی کا نقطۂ انجماد ہی ہوگا۔ اس طرح برف کا ٹکڑا آدھے میں تقسیم ہو کر بھی تقسیم نہیں ہوا اور سارا کا سارا ہی رہا۔ ہوئی نا اچنبھے کی بات!

اب تک تو پانی کے جم کر برف بننے کی باتیں ہوئیں۔ آئیے دیکھیں پانی کو گرم کرنے پر کیا ہوتا ہے۔ شیشے کے ایسے برتن میں جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہو۔ پانی کو گرم ہوتے، اُبلتے آپ نے کبھی دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہے تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ پانی کی تہ سے بُلبلے سے اُٹھ رہے ہیں اور سطح پر آ کر غائب ہو رہے ہیں۔ یہ بلبلے کیسے ہیں؟ آپ نے سوچا ہوگا، شاید یہ ہوا ہے جو پانی میں گھلی ہوئی ہے، اور گرم کرنے پر خارج ہو رہی ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن اصل میں ہوتا یہ ہے کہ پانی جب خوب گرم ہو جاتا ہے

تو وہ بھاپ میں تبدیل ہونے لگتا ہے، اور یہ بھاپ نچلی سطح
سے بلبلوں کی شکل میں اُبھر کر سطح پر آتی ہے اور جب کے
سے سطح سے اوپر کی ہوا میں مل جاتی ہے۔ اس طرح ہوا میں
بھاپ کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ پانی کی سطح سے اوپر بھاپ
آپ کو دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن جب کسی ٹھنڈی شے سے
ٹکراتی ہے تو اس کی سطح پر پانی کے ننھے ننھے قطروں میں
بدل جاتی ہے اور آپ ان کو دیکھ سکتے ہیں۔

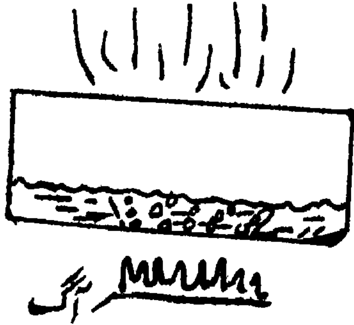
چلتے چلتے ایک پتے کی بات بھی بتا دوں۔ ہوا میں بھاپ
ہمیشہ گھلی ملی ہوتی ہے، ایک خاص مقدار میں، جس کا انحصار
اُس دن اور وقت کے درجۂ حرارت پر ہوتا ہے، اور آپ
جانتے ہیں کہ ہر دن اور رات میں درجۂ حرارت بدلتا رہتا
ہے، اس طرح ہوا میں بھاپ کی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔
جب یہ مقدار حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو بارش کے امکانات
ہوتے ہیں اس مقدار کو ناپ کر ہی تو موسم کا محکمہ بارش
ہونے یا نہ ہونے کی پیشین گوئی کرتا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی، پانی کے گرم ہو کر بھاپ
کی شکل اختیار کر لینے کی۔ ایک مرتبہ اور اپنے دوست کو چیلنج
کیجیے کہ آپ کاغذ میں پانی گرم کر سکتے ہیں۔ آپ کے دوست
کو بڑا تعجب ہوگا اور وہ اسی وقت ہار مان جائیں گے۔ آپ
کے لیے میدان خالی ہے۔ آپ ایک گتے کا مضبوط چوکور چھوٹا سا
ڈبا لیجیے ڈبا نہ ملے تو گتہ یا موٹا کاغذ لے کر اس کی شکل (۵ش)



شکل ۵ش

میں دیئے گئے طریقے سے موڑ کر پن لگا دیجیے۔ اب
اس میں اتنا پانی ڈالیے کہ تہ سے کچھ اوپر آ جائے اب
اس کو دھیمی آنچ پر چڑھا دیجیے۔ شکل ۶




شکل ۶

تھوڑی ہی دیر میں پانی گرم ہو کر اُبلنے لگے گا — اور
گتے کا ڈبا! — نہیں وہ بالکل نہیں جلے گا،
ہوتا یہ ہے کہ چولھے کی گرمی گتے کے ڈبے کے
تلے سے ہو کر پانی تک پہنچتی ہے۔ کاغذ کی راہ ہو کر
آنے والی تمام گرمی پانی جذب کر لیتا ہے اور پانی
اُبلنے لگتا ہے۔ لیکن ذرا احتیاط کیجیے پورا پانی بھاپ
بن کر اڑ جانے کے بعد گتہ جل اُٹھے گا۔ بھلا کیوں؟
دیکھیے ہر سیّال شے کو جب گرم کیا جاتا ہے تو
ایک خاص نقطہ پر آ کر وہ بھاپ بننے لگتی ہے اس
درجہ حرارت کو نقطۂ جوش کہا جاتا ہے۔ پانی کا نقطہ
جوش ہے ۲۱۲ درجہ فارن ہیٹ گتہ میں پلائے جانے
والا پانی جب گرم کیا جاتا ہے تو وہ ۲۱۲ درجہ فارن ہیٹ
سے زیادہ گرم نہیں ہو سکتا۔ اور اس درجہ حرارت پر گتہ
جل نہیں سکتا۔ جب گتہ کا پانی اڑ جاتا ہے تو گتہ کا درجہ
حرارت ۲۱۲ درجہ فارن ہیٹ سے بڑھ جاتا ہے اور
وہ فوراً جل اُٹھتا ہے۔

آخر میں ایک اور مزیدار تجربہ کر لیجیے۔
آپ نے نیوزی لینڈ کا نام سنا ہوگا۔ یہ جزیرہ

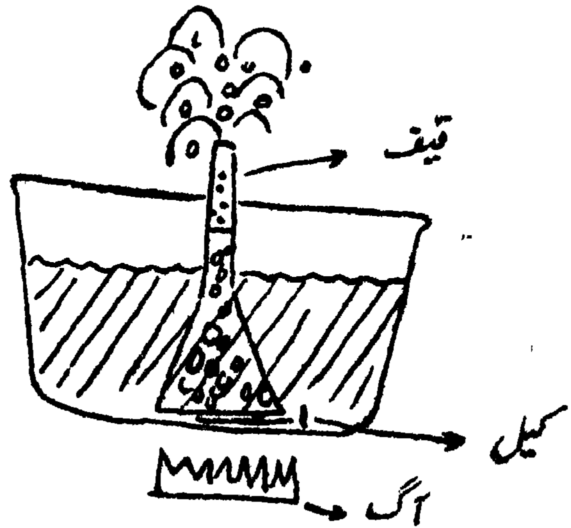
براعظم آسٹریلیا کے مشرق میں پایا جاتا ہے۔ وہاں زمین سے اُبلتے چشمے پائے جاتے ہیں۔ ان کو گیسر کہا جاتا ہے ان میں سے گرم پانی دس بارہ فٹ کی اونچائی تک اڑ کر نکلتا ہے۔ لوگ گرم پانی کے ان اڑتے چشموں کو دیکھنے کے لیے نیوزی لینڈ جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو اتنا لمبا سفر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ کو امی سے اجازت لے کر باورچی خانے تک جانا ہوگا اور ان کی مدد سے ہی ایک آسان سا تجربہ کر کے گھر بیٹھے گیسر کا لطف اٹھانا ہوگا۔ ویسے ایک فرق تو ہوگا ہی۔ نیوزی لینڈ میں گیسر قدرتی ہیں اور آپ کے گیسر مصنوعی۔

اپنی امی سے کہہ کر ایک گہرا برتن لیجیے۔ پتیلی سے کام چل جائے گا۔ ان سے ایک قیف بھی مانگ لیجیے، وہی جس سے مٹی کا تیل بوتل میں نکالا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو ایک لمبی اور موٹی کیل کی ضرورت پڑے گی۔

پتیلی میں پانی ڈالیے۔ اس قدر کہ وہ آدھی بھر جائے۔ کیل کو پیندے میں ڈال کر اس پر قیف اس طرح ڈھانپیے کہ نیچے تھوڑی سی دراز رہے، جیسا کہ شکل میں دکھایا گیا ہے۔ اب اس پتیلی کو چولھے پر چڑھا کر نیچے تیز آگ جلا دیجیے۔ تھوڑی دیر میں پانی اُبلنے لگے گا اور بھاپ کے بلبلے قیف (FUNNEL) میں گردن کے پاس جمع ہونے لگیں گے۔ جب وہ کافی مقدار میں جمع ہو جائیں گے تو ایک دم سے اوپر نلکے میں جمع پانی کو زور سے دھکیلیں گے اور گرم گرم پانی فوارے کی شکل میں اونچا باہر نکلے گا۔ اس کے بعد ہی بھاپ بھی "شوں" کی آواز کرتی نکلے گی، اس طرح قیف کے اندر سے پانی کے نکل جانے سے وہاں خالی جگہ بن جائے گی اور اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے نچلی دراز میں سے پتیلی کا پانی اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اور پھر سے وہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ اور وقفہ وقفہ سے گرم پانی اور بھاپ کا فوارہ چھوٹتا ہوتا ہے۔

بس قدرت نے بھی گیسر کا انتظام کچھ اسی طرح کیا ہے۔ پانی اور گرمی کے ذرائع زمین کے اندر پائے جاتے ہیں اور پانی زمین کی درزوں سے وقفہ وقفہ سے ہوا میں اڑتا رہتا ہے۔

کہیے پانی جیسی ایک عام اور معمولی چیز کے یہ تجربے کیسے رہے۔ آپ کو پسند بھی آئے ــــ؟ آپ نے ان کے ذریعہ سائنس کی کچھ معلومات حاصل کی ہیں تو لکھیے گا ایسے دوسرے تجربے بھی آپ کو بتائے جائیں گے۔ ★★




کونسی نیکی خدا کے نزدیک افضل ہے۔ فرمایا بہترین اخلاق، عجز و انکساری مصیبتوں پر صبر کرنا۔ خدا کے فیصلوں پر راضی ہونا افضل

# میں کیا بنوں گا

جناب عبدالمتین نیاز

جو ہے بات سچی وہ تم سے کہوں گا
بڑا ہو کے یارو سنو کیا بنوں گا

میں نیتا بنوں گا نہ دولت کے بل پر
چلوں گا ہمیشہ ہی راہِ عمل پر
نہ چھوڑوں گا میں آج کا کام کل پر
سدا بے غرض دیش سیوا کروں گا
بڑا ہو کے یارو سنو کیا بنوں گا

سپاہی بنوں گا مگر شانتی کا
سبق دوں گا میں پیار کا دوستی کا
سنواروں گا سارا چمن زندگی کا
میں کانٹوں میں بھی پھول بن کر کھلوں گا
بڑا ہو کے یارو سنو کیا بنوں گا

کبھی سیٹھ بن کر نہ لوں گا غلامی
کروں گا نہ مزدور سے بد کلامی
نہ ظالم کو دوں گا کبھی میں سلامی
محبت کی خاطر ہر اک دکھ سہوں گا
بڑا ہو کے یارو سنو کیا بنوں گا

یہ بیوپاریوں کے فریبوں کے پھندے
یہ دولت کی خاطر ملاوٹ کے دھندے
یہی کھا رہے ہیں غریبوں کے چندے
میں ان کے لیے موت ثابت کروں گا
بڑا ہو کے یارو سنو کیا بنوں گا

نہ موٹر نہ بنگلے نہ کوئی خزانہ
مجھے چاہیے پیار کا اک ترانہ
لکھوں گا میں انسانیت کا فسانہ

اٹھارہویں قسط

آر - ایم - بیلن ٹائن
تلخیص و ترجمہ: خلیق انجم اشرفی

# مونگے کا جزیرہ

## لڑائی

اس خطرناک اور حوصلہ آزما سفر کے بعد مہینوں تک ہم بڑے سکون اور مسرت کے ساتھ اس جزیرے پر رہتے رہے۔ کبھی ہم لیگون میں مچھلی کا شکار کھیلنے چلے جاتے کبھی جنگلوں میں بطوں اور سوروں کے شکار کی تاک میں رہتے۔ کبھی کبھی قریبی پہاڑی کی چوٹی پر بھی چڑھ جاتے محض تبدیلی کی خاطر حالانکہ پیٹرکن کا خیال کچھ اور ہی تھا۔

وہ ہمیشہ کہتا کہ ہم پہاڑی پر اس لیے چڑھتے ہیں کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا جہاز اتفاق سے نظر آجائے اور ہم اسے اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔ لیکن اس سلسلے میں مجھے یہ یقین تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی اس قید خانے سے نکلنا پسند نہیں کرتا کیونکہ ہم وہاں بہت خوش تھے اور پیٹرکن کا تو کہنا تھا کہ ہم لوگ ابھی بہت نوعمر ہیں اس لیے ہمارے لیے سال دو سال کا نقصان کوئی نقصان نہیں اور ہمیں اس کا بالکل افسوس نہ کرنا چاہیے۔

پیٹرکن جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں چودہ سال کا تھا، جیک اٹھارہ کا اور میں پندرہ کا۔ لیکن جیک تھا بہت لمبا۔ مضبوط اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ تندرست۔ کوئی بھی جسے اس کی صحیح عمر کا علم نہ ہو بڑی آسانی سے اسے بیس سال کا سمجھ سکتا تھا۔

موسم بڑا خوشگوار رہتا تھا۔ بہت سے پھل دار درخت سارے سال پھولتے پھلتے رہتے تھے اس لیے ہمیں کبھی غذا کی کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ پھر سُوّر کبھی ایسا لگتا تھا کہ گھٹنے کے بجائے مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ حالاں کہ ان میں سے دو تین ایک آدھ روز کے وقفے سے پیٹرکن کے خوف ناک، کھانے کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ اگر ہم کبھی ان کا کوئی گلہ جھاڑیوں میں گھومتے پھرتے نہ پاتے تو سیدھے اُس درخت کا رخ کرتے جہاں ہم نے پہلے پہل انھیں دیکھا تھا اور وہاں ہمیشہ ان کے گنیے کی ایک بڑی تعداد ہمیں سوتی ملتی۔

اس عرصے میں ہم نے اپنے وقت کا خاصا حصہ ناریل کے ریشوں سے لباس بنانے میں صرف کیا۔ کپڑوں کا جو جوڑا ہم پہنتے تھے اس نے اب جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ آخر چلتا بھی کب تک۔

پیٹرکن نے اس بوڑھی سورنی کی کھال سے جوتوں کا بڑا عمدہ جوڑا بنایا۔ آپ شاید اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کو بیتاب ہوں۔ اس لیے بتائے دیتا ہوں۔ سب سے پہلے اس نے پشت کی کھال سے اپنے دونوں پیروں سے ذرا بڑا ٹکڑا کاٹ لیا اور اسے کچھ دنوں کے لیے پانی میں

چھوڑ دیا۔ جب وہ نرم پڑ گیا تو اس نے ایک سرے کو اس طرح سی دیا کہ وہ جوتے کی پشت بن گیا۔ اس کے بعد اس نے اس کھال کے ٹکڑے کے کنارے کنارے سوراخ بنا دیئے اور اُن کے اندر ناریل کے ریشوں سے بٹا ہوا ایک مضبوط دھاگا پرو دیا۔ سلے ہوئے حصے میں اس نے اپنی ایڑی پھنسائی اور دھاگا کھینچنے پر کھال کے بقیہ ٹکڑے نے کنارے سے اٹھ کر اس کے پیروں کو ڈھک لیا۔ لیجیے جوتا تیار۔ یہ درست ہے کہ یہ جوتا کئی جگہوں سے بڑا بھدا اور بدنما لگتا تھا لیکن یہ تھا اتنا کارآمد کہ آخر میں جیک نے بھی اپنے لانگ بوٹ پر اسے ترجیح دی۔

ہم نے بہت سی دوسری کارآمد چیزیں بھی بنائیں جنھوں نے ہمیں بہت آرام پہنچایا۔ ایک آدھ بار ہم نے ایک بڑا مکان بنانے کے بارے میں بھی بات چیت کی۔ لیکن اپنا موجودہ مکان ہمیں کچھ اتنا پسند تھا کچھ ایسا آرام دہ لگتا تھا کہ ہم نے اسے نہ چھوڑنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اسی لیے ہم نے کبھی بڑا مکان بنانے کی کوشش ہی نہیں کی جو ایسی جگہ پر کارآمد ہونے کے بجائے تکلیف دہ ثابت ہوتا۔

آبی باغ میں غوطہ خوری سے ہم ہمیشہ کی طرح لطف اندوز ہوتے تھے اور پیٹرکن بھی اب مسلسل مشق کے بعد کچھ کچھ پانی کا عادی ہوتا جا رہا تھا جہاں تک میرا اور جیک کا تعلق ہے ہم دونوں کو تو اب کچھ ایسا لگنے لگا تھا گویا پانی ہی ہمارا اصلی وطن ہے اور اب ہم نے پانی میں کچھ اتنا زیادہ وقت گزارنا شروع کر دیا تھا کہ پیٹرکن نے کئی بار خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں ہم دونوں ایک روز مچھلی نہ بن جائیں اور اسے اس جزیرے پر تنہا چھوڑ کر سمندر میں جا بسیں۔ کچھ دنوں بعد اس نے اس فقرے میں اس جملے کا بھی اضافہ کر دیا کہ اسے کچھ دنوں سے جیک شارک مچھلی جیسا نظر آنے لگا ہے اس کا جواب جیک نے یہ دیا کہ اگر وہ مچھلی بن گیا تو پیٹرکن بھی کیکڑے سے زیادہ بہتر اور بڑی چیز نہیں بن سکتا۔

غریب پیٹرکن اب آبی باغ میں ہمارے دلچسپ و خوشگوار غوطوں میں ہمارا ساتھ نہ دے سکنے پر اتنا اداس نہیں ہوتا تھا سوائے ان موقعوں کے جب جیک غوطہ لگا کر آبی باغ کی کسی چٹان پر بیٹھ جاتا اور پانی کے اندر طرح طرح کے منہ بنا کر پیٹرکن کو چڑھاتا۔ ایسے وقت پیٹرکن بڑی حسرت سے کہتا کہ وہ ایسا بننے کے لیے کسی بھی قربانی کے لیے تیار ہے۔

جب پیٹرکن نے پہلی بار یہ بات کہی تو میں بے اختیار ہنس دیا تھا کیونکہ اگر وہ یہ دیکھنے کے قابل ہوتا کہ ایک معمولی سا غوطہ لگاتے وقت وہ جیسے جیسے اور مضحکہ خیز منہ بناتا ہے اس میں جیک اس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا تو شاید وہ یہ تمنا نہ کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ جیک جان بوجھ کر اس طرح کے منہ بناتا تھا جب کہ پیٹرکن بیچارے کا منہ بن ہی ایسا جاتا تھا۔

ہم جن دنوں ان دلچسپیوں میں مگن تھے اسی زمانے میں ایک دن اچانک ایک واقعہ پیش آیا یہ جتنا غیر متوقع تھا اتنا ہی بھیانک اور خطرناک بھی۔

جیک اور میں حسبِ معمول ہیروں کے غار پر ابھری چٹانوں پر بیٹھے تھے۔ پیٹرکن ساحل پر کھڑا اپنے کپڑے نچوڑ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی سمندر میں گر پڑا تھا۔ اتفاقاً نہیں یہ تو وہ مسلسل کر رہا تھا۔ اچانک ہماری توجہ افق پر نظر آنے والی دو چیزوں نے کھینچ لی۔

"ارے بھئی یہ کیا؟" "ذرا دیکھو تو!" میں نے جیک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" جیک نے جواب دیا "میں خود بھی کچھ دیر سے انھیں دیکھ رہا ہوں۔ پہلے میرا خیال

تھا کہ وہ سیاہ آبی پرندے ہیں لیکن جیسے جیسے میں انہیں زیادہ غور سے دیکھتا ہوں ویسے ویسے میرا یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ پرندوں سے بڑی کوئی چیز ہیں۔

"وہ تو ہماری ہی طرف آتی دکھائی دے رہی ہیں"، میں نے کہا۔

"ہیلو! کیا گڑبڑ ہے بھئی؟" جیک اوپر آتے ہوئے بولا۔

"ادھر دیکھو" جیک بولا۔

"مچھلی!" پیٹرکن چلایا اور پھر اپنی آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر دیکھتا ہوا بولا "نہیں! ارے ہو — یہ کشتیاں تو نہیں جیک!"

انسانی چہروں کو دوبارہ دیکھنے کے تصور ہی سے ہمارے دل مارے خوشی کے دھڑک اٹھے۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو پیٹرکن! لیکن نہ جانے کیوں ان کی رفتار کا انداز کشتیوں جیسا نہیں لگ رہا ہے۔ جیک نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا گویا اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے جیک ان دو عجیب چیزوں کو جو اب تیزی سے ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں، زیادہ غور سے دیکھ رہا ہے۔ ویسے ویسے اس کے چہرے کا رنگ اڑتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی زبردست خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ آخر کار وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ ڈونگے ہیں رالف! جنگی ڈونگے ہیں یا نہیں۔ یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن بہر حال اتنا میں جانتا ہوں کہ جنوبی سمندروں کے جزیروں میں رہنے والے سب کے سب خوفناک قسم کے آدم خور ہیں اور ان کے دلوں میں اجنبیوں کے لیے کسی قسم کی ہمدردی کا نہیں۔ اگر وہ اس جزیرے پر اترتے ہیں تو ہمیں کہیں چھپ جانا چاہیے حالانکہ مجھے امید نہیں کہ وہ یہاں اتریں گے۔"

جیک کی یہ تقریر سن کر میں چوکنا ہو گیا۔ خطرے کا ایک عجیب سا احساس میرے دل و دماغ پر چھا گیا لیکن میں اس کے الفاظ پر غور کرنے کے بجائے اس مخلصانہ اور پریشان لہجے پر غور کرنے لگا جس میں اس نے یہ جملے ادا کیے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے جھاڑیوں میں گھستے ہوئے ہمارے دلوں کی عجیب کیفیت تھی۔

"بچ بچ۔ ہم جھاڑیوں میں ایک جگہ پناہ لے چکے تو میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا "ہم اپنے ہتھیار لینا تو بھول ہی گئے ہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیک بولا۔" یہاں ڈھیروں لاٹھیاں ڈنڈے موجود ہیں۔ یہ دیکھو۔" یہ کہتے کہتے اس نے مختلف موٹائی اور لمبائی کی لاٹھیوں کے ایک ڈھیر پر ہاتھ مارا۔ یہ لاٹھیاں پیٹرکن کے چلبلے ہاتھوں کا کارنامہ تھیں۔ اسے نچلا بیٹھنا تو آتا ہی نہ تھا اس لیے جب کبھی ہم فرصت میں ان جھاڑیوں کی طرف آئے تو وہ بیکار مباش کچھ کیا کر کپڑے ہی پھاڑ کر سیا کر، مصداق درختوں سے لکڑیاں توڑ توڑ کر ان کی لاٹھیاں اور ڈنڈے بنایا کرتا۔

ہم تینوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ایک ایک لاٹھی منتخب کر لی اور ایک چٹان کے پیچھے اس طرح چھپ گئے کہ دیکھ لیے جانے کا خطرہ مول لیے بغیر ہم ان ڈونگوں کو دیکھ سکیں۔

شروع شروع میں تو ہم وقفے وقفے سے ایک آدھ لفظ ان ڈونگوں کے ظاہر ہونے کے بارے میں کہہ دیتے لیکن جب وہ لنگون میں داخل ہو گئے تو ہم نے مکمل خاموشی اختیار کر لی

اور انتہائی دلچسپی اور غور سے ان کو دیکھنے لگے۔

ہم نے دیکھا کہ دوسرا ڈونگا پہلے والے ڈونگے کا پیچھا کر رہا ہے اور اس پہلے والے ڈونگے میں چند مرد، عورتیں اور بچے سوار ہیں، لگ بھگ چالیس ہوں گے ان کا پیچھا کرنے والے ڈونگے میں سب کے سب مرد ہیں۔ وہ بھی لگ بھگ اتنے ہی تھے لیکن تھے سب کے سب باقاعدہ ہتھیار بند اور بظاہر یہ لگتا ہے کہ کسی جنگجو فوج کی ٹکڑی ہے۔ دونوں ڈونگوں کے سوار پوری قوت سے چپو چلا رہے تھے اور ایسا نظر آرہا تھا کہ پیچھے والے ڈونگے کے سوار زیادہ زور لگا رہے ہیں تاکہ آگے جانے والوں کو پکڑ لیں لیکن اس کوشش میں وہ بالآخر ناکام رہے۔

پہلے ڈونگے نے ساحل پر آلگنے کے لیے اسی چٹان کا رُخ کیا جس کے پیچھے ہم چھپے ہوئے تھے ان کے چھوٹے چھوٹے چپو مسلسل پانی میں جا رہے تھے اور نکل رہے تھے۔ اور ان کی تیز حرکت سے پانی کی ایک مسلسل پھوار اڑ رہی تھی کشتی کھینے والوں کی آنکھیں ان کے سیاہ چہروں پر چمک رہی تھیں اور وہ پوری قوت سے چپو چلائے جا رہے تھے انھوں نے چپو چلانا اس وقت تک بند نہیں کیا جب تک کشتی ساحل سے ایک جھٹکے کے ساتھ آکر ٹکرا نہ گئی اور پھر ایک چیخ کے ساتھ پوری پارٹی جیسے کسی جادوئی طاقت کے ذریعے ایک ساتھ کشتی سے ساحل پر کود پڑی۔ تین عورتیں جن میں سے دو اپنی گودوں میں بچے اٹھائے ہوئے تھیں، جنگل کی طرف بھاگیں اور مرد ہاتھوں میں پتھر لے کر اور بھالے اور لاٹھیاں سنبھال کر سمندر کے کنارے کھڑے ہو گئے تاکہ اپنے دشمنوں کو ساحل پر اترنے سے روک سکیں۔

دونوں ڈونگوں کے درمیان کوئی آدھ میل کا فاصلہ رہا ہوگا۔ لیکن جس رفتار سے دوسرا ڈونگا آرہا تھا اس سے یہ فاصلہ جلد ہی طے ہو گیا۔ جب دوسرا ڈونگا ساحل کے نزدیک پہنچا تو اس کے سواروں میں ہمیں کسی قسم کے خوف کے آثار نظر نہیں آئے۔ وہ کسی جنگلی گھوڑے کی طرح آگے بڑھے۔ پتھروں کی بارش ہوئی۔ لیکن انھوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ ان کا ڈونگا ساحل سے ٹکرایا اور وہ ایک چیخ کے ساتھ پانی میں کود پڑے۔ اور تیرتے ہوئے ساحل پر اپنے دشمنوں کے مقابل آگئے۔

---

(پھر کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے اپریل کے پیام تعلیم کا انتظار کیجیے)

عزیز مراد آبادی (ایم۔اے،بی۔ایڈ)

# بچّہ نامہ

بہنوں کو جو چڑھاتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ　　بھائی کو جو ستاتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ
اور شور جو مچاتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ　　شیطان کو جو مناتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ
خوشنودی اللہ کی خاطر ہی بڑوں کا
جو حکم بجا لاتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ

پڑھنے سے جی چُراتا ہے بچّہ ہی اے بچّو!　　مکتب سے بھاگ آتا ہے بچّہ ہی اے بچّو!
گپّوں میں وقت اُڑاتا ہے بچّہ ہی اے بچّو!　　ماں باپ کو ستاتا ہے بچہ ہی اے بچّو!
پڑھ لکھ کے بہت شوق سے ہر کام میں یکتا
خود آپ کو بناتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ

بچّہ ہی چھیڑتا ہے فقیروں کو بے وجہ　　بچّہ ہی چڑھاتا ہے غریبوں کو بے وجہ
بچّہ ہی ستاتا ہے ضعیفوں کو بے وجہ　　بچہ ہی پیٹتا بھی ہے بچّوں کو بے وجہ
کمزوری کمزوری کو دیکھ کے فوراً
امداد کو جو آتا ہے سو وہ بھی ہے بچہ

بچّہ ہے ایک وہ بھی زباں جس کی بُری ہے　　بچّہ ہے وہ بھی جس کی زباں جھوٹ ملی ہے
بچّہ ہے وہ بھی جس کو بڑی بات بھلی ہے　　بچّہ ہے وہ بھی شیخی جسے اچھی لگی ہے
سچ بول کے شیخی سے سدا دور ہی رہ کے
بدبولوں کو جو دباتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ

تڑکے ہر اک اٹھتا نہیں دھیان لگا کے　　اُٹھتا ہے کوئی دھوپ اُٹھاتی ہے جب آ کے
پڑھتا نہیں قرآن ہر اک دل کو لگا کے　　مسجد کو کوئی جاتا نہیں شوق میں آ کے
پڑھ کر کوئی قرآن، نمازیں ہر ایک دن
حق کی طرف بلاتا ہے سو وہ بھی ہے بچّہ



جناب نعیم پرویز صدیقی چاندپوری

# اُردو زباں ہماری

گُل ریز و گُل فشاں ہے اُردو زباں ہماری
عظمت میں آسماں ہے اُردو زباں ہماری

ہے یہ لطیف و شیریں اور ہے سلیس و سادہ
ہر فرد کی زباں ہے اُردو زباں ہماری

اتنی حسین جہاں میں کوئی زباں نہ ہوگی
جتنی حسین زباں ہے اُردو زباں ہماری

ہر سمت نورِ حسن کا بزمِ جہاں میں پھیلا
وہ شمع ضو فشاں ہے اُردو زباں ہماری

پنجاب ہو کہ یو پی، بنگال ہو کہ دِلّی
سب پر ہی گُل فشاں ہے اُردو زباں ہماری

تہذیب کا ہے مخزن، ہے پیکرِ محبّت
اور ایکتا کی جاں ہے اُردو زباں ہماری

ہر شخص مطمئن ہے ہرگز نہ مِٹ سکے گی
پرویزؔ جاوِداں ہے اُردو زباں ہماری



جناب مرتضیٰ ساحل تسلیمی

# اسکول جا رہے ہیں

یہ چھوٹے چھوٹے بچّے
لگتے ہیں کتنے اچھے
بستے گلے میں ڈالے
جلدی قدم بڑھاتے

اسکول جا رہے ہیں
تعلیم پا رہے ہیں

ہے امتحان سر پر
پڑھتے ہیں دل لگا کر
تفریح میں یہ دن بھر
یونہی نہیں گنواتے

اسکول جا رہے ہیں
تعلیم پا رہے ہیں

کرتے ہیں پیار سب سے
رہتے ہیں خوب مل کے
ہنس ہنس کے بات کرتے
اور چٹکلے سناتے

اسکول جا رہے ہیں
تعلیم پا رہے ہیں

کرتے نہیں شرارت
رکھتے نہیں عداوت
ہیں کتنے با سعادت
الفت کے گیت گاتے

اسکول جا رہے ہیں
تعلیم پا رہے ہیں

پروفیسر آفاق احمد

# کیچڑ کا بھوت

ہمارے اپنے بچپن کی بات ہے، لیکن ہے اتنی مزے کی کہ آج بھی جب یاد آتی ہے تو خوب ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

بچپن میں سیر سپاٹے کا شوق کسے نہیں ہوتا۔ اور پھر جب موسم برسات کا ہو تو دل چاہتا ہے خوب دھومیں مچائیں۔ گوٹ کریں، پکنگ پر جائیں۔ خود پانی میں بھیگیں اور دوستوں کو پانی میں نہلائیں۔

یہ بات بھی ایسی ہی ایک برسات کی ہے۔

لیکن اس کو سننے کا پورا لطف تب ہی آئے گا جب ہم تمھیں اپنے بچپن کے اُس دوست سے ملا دیں جس کے دم قدم سے ساری خوشیاں تھیں۔

ہمارے ان دوست کا پورا نام تو بہت لمبا چوڑا تھا مگر اُن کے گھر والے انھیں منّے صاحب کہتے تھے اس لیے ہم لوگ بھی انھیں اسی نام سے پکارنے لگے۔

منّے صاحب دل کے بہت اچھے تھے۔ ہمیشہ خیال رکھتے کہ دوستوں کے کام آئیں۔ لیکن عقل کے معاملے میں ذرا کورے تھے۔ بات دیر میں سمجھتے تھے۔ مگر ظاہر ایسا کرتے جیسے سنتے ہی سمجھ گئے ہیں۔ بڑا بہت جلدی مانتے تھے مگر جلد ہی من بھی جاتے تھے۔

جو سچ پوچھو تو حماقتیں وہ کرتے نہیں تھے بلکہ خود بخود ان سے ہو جاتی تھیں۔ ہم لوگوں کا فائدہ یہ تھا کہ ہماری بے وقوفیوں پر پردہ پڑا رہتا۔ اس معاملے میں اُن کے آگے کسی کا چراغ جلنا مشکل تھا۔

حماقتیں تو ہم تم سبھی کرتے ہیں لیکن یہ تو خدا کا شکر ہے کہ اس دنیا میں اور ہمارے ساتھیوں میں کوئی نہ کوئی ہم سے بھی بہت بڑا احمق موجود رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری بے وقوفی پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔

ہمارے ماسٹر صاحب تو بڑے پتے کی بات کہا کرتے تھے "اس احمق کو پھلنے پھولنے دو۔ ورنہ لوگ تمھاری حماقتوں پر ہنسا کریں گے۔"

تو صاحب، منّے صاحب کا ہم سب پر بڑا کرم یہ تھا کہ ان کی وجہ سے ہماری ساری بے وقوفیوں پر پردہ پڑ گیا تھا یہ دوسری بات ہے کہ منّے صاحب کا خیال تھا کہ دنیا میں جب عقل بٹ رہی تھی تو انھوں نے آگے بڑھ کر دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لے لی تھی اس لیے وہ اپنے سوا سب کو کم عقل سمجھتے تھے۔

تو بھئی ایسے تھے ہمارے منّے صاحب!

منّے صاحب کو ہم دوستوں نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ ہم سب کے لیڈر رہیں۔ انھوں نے اپنی عادت

---

۱ گوٹ بھی گویا پکنک ہے۔ یہ لفظ کھبوپال میں عام طور پر مروّج ہے۔

کے مطابق اسے بالکل سچ سمجھ لیا تھا۔ چناں چہ جس کام میں خطرہ ہوتا یا ہمیں نہ کرنا ہوتا ہم لوگ منّے صاحب کو آگے بڑھا دیتے۔ انجام جو ہونا سو ہوتا۔ ہمارا کام بن جاتا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ آخر کب تک منّے صاحب کا ذکر ہوگا۔ وہ قصہ کب شروع ہوگا جسے یاد کرتے ہی ہنسی کی پھُل جھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ ہم نہ ہوئے مداری ہو گئے کہ مسلسل رسّی دکھائے جا رہے ہیں، سانپ نکالنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

آپ کا سوچنا ٹھیک ہی ہے۔ لیکن جب تک آپ منّے صاحب سے اچھی طرح مل نہ لیں گے قصّہ کا لطف کیسے آئے گا۔ اچھّا تو سنیے۔

قصّہ یوں تھا کہ تین دن تک خوب موسلا دھار بارش ہوئی۔ پانی تھا کہ کھُلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ چوتھے دن خدا خدا کر کے کچھ پانی تھما۔

ہم سب جو اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گئے تھے، خوشی خوشی گھر سے نکلے اور اسکول پہنچے۔

اسکول میں سارے دوست تو ملے۔ مگر منّے کا کہیں پتہ نہ تھا ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ پاجامے بُش شرٹ پہنے تیز تیز آتے منّے صاحب دکھائی دیے۔

جوں ہی قریب آئے۔ راج نے پوچھا:-

"منّے صاحب خیریت؟"

"خیریت ہے — خیریت کہاں — وہ تو میں گھر چھوڑ آیا"، منّے صاحب نے فرمایا۔ منّے خیریت کو کیا سمجھے یہ وہ جانیں۔ ہم لوگ بہرحال ہنسنے لگے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ہم لوگوں نے طے کیا کہ اگر آدھے دن کی ماسٹر صاحب چھٹی دے دیں تو بھدبھدے جایا جائے۔ سُنا تھا خوب زور سے وہاں پانی آبشار کی شکل میں گر رہا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ماسٹر صاحب سے چھٹی کے لیے کون کہے۔ تین دن سے یونہی اسکول بند تھے۔ اوپر سے ماسٹر صاحب کا غصّہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ ذرا میں بید چلنے لگتا۔

انور کہنے لگے "بلّی کے گلے میں منّے صاحب سے گھنٹی بندھوائی جائے۔"

بات دل کو لگی۔ میں نے کہا۔

"منّے صاحب سُنا ہے آج کل بھدبھدا زوروں پر چل رہا ہے۔"

"ضرور چل رہا ہوگا"، منّے صاحب لاپرواہی سے بولے "کون سی نئی بات ہے۔ دنیا چلتی ہے۔ بھدبھدا چل رہا ہے تو کیا غضب ہو گیا۔ کیا یہ انوکھی چال چل رہا ہے یا پیدل؟"

"توبہ ہے یار تم سے"، میں نے سمجھایا! بھدبھدا ایک آبشار ہے۔ یہاں اُسے ایسا ہی بولتے ہیں۔"

پتہ نہیں منّے صاحب کیا سمجھے۔ سر ہو گئے۔

"تب تو ہم ضرور دیکھیں گے۔ ہم نے آج تک کوئی آبشار یا آگ شار نہیں دیکھا۔"

"آگ شار"، انھوں نے اپنی طرف سے جوڑا۔

ہمیں بات کچھ بنتی نظر آئی۔

راج منّے صاحب کی طرف سے پیٹھ کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے زور سے انور کو پکارا اور اس طرح کہنے لگا کہ منّے صاحب بھی سُن لیں۔

انور بھائی۔ اگر ماسٹر صاحب پورے درجے میں کسی کی بات مانتے ہیں تو منے صاحب کی۔ اور کیوں نہ مانیں اُن سا پڑھنے والا دوسرا درجے میں کوئی ہے؟"

منے صاحب نے اپنی تعریف سُنی تو کان کھڑے ہوئے۔

اب انور کی آواز آرہی تھی — "ہاں بھئی۔ کہتے تو سچ ہو۔ اس دن نہ دیکھا ہوم ورک نہ کرنے پر ماسٹر صاحب نے سب کو بید لگائے مگر منے صاحب سے کیا مجال جو ایک لفظ بھی کہا ہو۔"

منے صاحب نے اتنی تعریف سُنی تو خوشی سے پھول گئے۔ باچھیں کھل گئیں۔

میں نے کہا: "بس تو بھد بھدے کے لیے پوچھنے ہم کیوں چلیں۔ منے صاحب کی بڑی بات ہے۔ وہ چھٹی لے آئیں گے۔"

تیر نشانے پر لگا۔ منے صاحب بغیر ایک لفظ کہے ماسٹر صاحب کے پاس پہنچے اور پتہ نہیں اُن سے دھیرے دھیرے کیا باتیں کرنے لگے۔

ادھر ہم لوگ بے چین تھے کہ دیکھیں ماسٹر صاحب کب بید اٹھاتے ہیں۔ مگر سچ مچ کمال ہو گیا۔ منے صاحب ہنستے ہوئے سینہ پھلائے وہاں سے آئے۔

"کیا چھٹی مل گئی؟" ہم سب نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ملتی۔ ہم گئے تھے چھٹی لینے۔ مذاق تھوڑی ہے۔ ہاں۔"

ہم لوگوں نے سائیکلیں اٹھائیں اور بھد بھدے کی طرف روانہ ہوئے۔

ہم سب دوست سات تھے۔

راستے میں ایک اتوار پر راج کو شرارت سوجھی۔ کہنے لگا۔

"کوئی ہے جو ہم سے سائیکل دوڑائے؟"

کوئی تو کیا راضی ہوتا۔ منے صاحب فوراً راضی ہو گئے۔

اب دوڑ شروع ہوئی۔ دونوں بڑی تیزی سے سائیکل چلاتے رہے ہم اور باقی ساتھی بھی ان دونوں کی حماقت کا کھیل دیکھنے کے لیے تیز تیز سائیکل دوڑانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا راج نے اپنی سائیکل کی رفتار دھیمی کر دی اور ہم سے آملا۔ جب کہ منے صاحب اپنی سائیکل پر اُڑے چلے جا رہے تھے۔

راج بولا۔ "دیکھا کیسا بے وقوف بنایا۔ وہ چلے جا رہے ہیں اُڑے ہوئے۔ دم بھپوے گا تو مزا آئے گا۔"

وہ تو اچھا ہوا کہ بھد بھدے پر منے صاحب رُک کر ہمارا انتظار کرنے لگے۔ ورنہ پتہ نہیں کہاں ملتے۔ ہم جب پانچ منٹ بعد وہاں پہنچے تو وہ شیخی بگھارنے لگے۔

"دیکھا اسے کہتے ہیں سائیکل چلانا۔ ہاں، اب نہ کرنا مقابلہ۔"

ہم نے انھیں اصل بات بتائی کہ یہ تو راج کی شرارت تھی۔ مگر۔ وہ بھلا کہاں مانتے۔ کہنے لگے۔

"ہاں ہاں۔ ہارنے پر خوب بہانا بنایا ہے۔"

---

بھد بھدا خوب تیزی سے چل رہا تھا۔ ہم سب اس منظر میں کھوئے تھے کہ منے صاحب نے ٹوکا۔

"تم تو کہتے تھے کہ بھد بھدا چل رہا ہے۔ مگر یہ چل کہاں رہا ہے۔ یہ تو بہہ رہا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "ایسے ہی بولتے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "غلط بولتے ہیں۔ ٹھیک یہ ہے کہ بھد بھدا گر رہا ہے۔"

پھر بولے: "اچھا دیکھ لیا۔ بھد بھدا — اب چلو۔"

ہمیں اُن کی اس بد مذاقی پر غصہ آ گیا۔ آئے دیر

نہیں ہوئی کہ چلنے کی جلدی۔

لیکن ڈر یہ تھا کہ ہم سے پہلے گھر پہنچ گئے اور شکایت کردی تو بے بھاؤ کے پڑیں گے۔

اس بار انور کام آیا۔ "منّے صاحب مذاق کر رہے ہیں۔ تم اُلجھ رہے ہو۔ وہ تو قدرتی مناظر کے عاشق ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو ساری عمر یہاں سے نہ جائیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں منّے صاحب؟"

بولے۔ "اور کیا۔ بس مجھے تو انور اور راج سمجھتے ہیں۔ ورنہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

میں نے غصّے سے کہا۔ "تو ڈوب مرو۔ کلبھدرے سے اچھی جگہ کہاں ملے گی۔"

وہ ڈھٹائی سے بولے۔ "میں کیوں ڈوبوں۔ میرا مطلب تم سے ہے۔ تم ڈوب مرو۔"

میں نے سوچا بات کیوں بڑھاؤں۔ اور ہم سب بارہ دری کی طرف چلنے لگے۔ منّے صاحب سے اس لیے نہیں پوچھا کہ وہ ٹھہرے ایک عقل کے دشمن۔ پوچھیں گے جب در بارہ نہیں ہیں تو اسے تیرہ دری یا دس دری کیوں نہیں کہتے وغیرہ۔

وہاں ہم نے بھٹے ککڑی وغیرہ خرید کر کھائے منّے صاحب نے مونگ پھلی اپنی "جیب خاص" سے لے کر کھلائی۔ اب واپسی ہوئی۔

پانی ہلکا ہلکا پھر برسنے لگا تھا۔ ایک جگہ بالکل اتفاق سے انور کی سائیکل کا پچھلا پہیا منّے صاحب کی سائیکل کے اگلے پہیے سے ٹکرایا اور دیکھتے دیکھتے منّے صاحب پہلے سڑک پر اور سڑک سے پھسل کر ایک گڑھے میں۔ بڑی مشکل سے انھیں وہاں سے نکالا گیا۔ وہ خود اور ان کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے۔ وہ انور کو مستقل بُرا بھلا کہے جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انور نے جان بوجھ کر انھیں گرایا ہے۔ ہم نے لاکھ سمجھایا۔ نہیں مانے۔ آخر انور نے معافی مانگی اور ہم لوگوں کی سفارش پر انھوں نے اسے معاف کردیا۔

اس وقت منّے صاحب کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کیچڑ میں ٹہل کر نکلے ہوں۔ بالوں میں کیچڑ، بھوؤں میں مٹی، پاجامہ جگہ جگہ سے مٹیالا، بش شرٹ کی جیبوں میں کیچڑ۔ جوتوں میں کیچڑ اور رہے تو ہاتھوں میں گیلی مٹی کی تہہ۔ بھوت نہیں تو اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ضرور نظر آ رہے تھے۔ دیکھنے سے ہنسی آتی تھی۔ آج بھی اُن کی آج بھی اُن کی اس حالت کا خیال آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

دوسرے دن منّے صاحب اسکول نہیں آئے۔

پتہ چلا کہ جب وہ کیچڑ میں لت پت گھر پہنچے تو ان کی خوب خبر لی گئی اور سزا کے طور پر گھر سے نکلنا بند کر دیا گیا۔

تیسرے دن وہ اسکول آئے تو ہم سب سے خفا تھے۔ بولے۔ "اب کبھی تم لوگوں کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔"

مگر جیسا کہ شروع میں میں نے آپ سے کہا کہ ہمارے منّے صاحب دل کے بہت اچھے ہیں جلدی سے روٹھتے اور جلدی سے من جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی کئی بار وہ ہمارے ساتھ پکنک پر گئے۔ مگر جب بھی ہمیں موقع ملتا اور ہمیں کیچڑ میں لت پت منّے صاحب کا حلیہ یاد آتا ہم "کیچڑ کا بھوت" کہہ کر انھیں ضرور چھیڑتے۔ وہ بُرا مانتے اور پھر من جاتے۔

اب وہ پتہ نہیں کہاں ہیں۔ لیکن ہمیں اپنا کیچڑ کا بھوت اب بھی یاد ہے۔ جب خیال آتا ہے تو پورا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور زور سے ہنسی نکل جاتی ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے شکریہ کے ساتھ)

جناب مضطر داؤدنگری

# شاعر اور ستارے

خاموش رہنے والو اے آسمان کے تارو
کرنے کو دل کی باتیں تم سب مجھے بلا لو
بتلاؤں گا میں تم کو افسانۂ زمانہ
ساتھی نے ساتھ چھوڑا اپنا ہوا پرایا
تنگ آگیا ہوں اب میں دھرتی پہ رہتے رہتے
اس دورِ حاضرہ کا ہر ظلم سہتے سہتے
پینے کو زہر گھولا، اک جام مل رہا ہے
ہر ہر قدم پہ پیہم آلام مل رہا ہے
سب سو گئے ہیں لیکن میں اب بھی جاگتا ہوں
خاموش لب ہیں میرے، میں تم کو تک رہا ہوں
تپتی ہوئی زمین ہے اجڑا ہوا چمن ہے
اے شاعر حقیقت کیا تیرا یہ وطن ہے
دل کے اندھیرے گھر میں آجائیں گے اجالے
اے کاش تو بلالے اے کاش تو بلالے
پھر خوب باتیں ہوتیں ہم ایک ساتھ رہتے
ہم ایک ساتھ ہوتے ہاتھوں میں ہاتھ رہتے

بستر سے پہلے اٹھ کر آنکھوں کو اپنی ملتے
سبزِ چمن کو دونوں وقتِ سحر نکلتے
قدرت کے سامنے پر، مجبور ہوں میں شاعر
بستی سے تیری کوسوں ہی دور ہوں میں شاعر
تو بھی ہے اک مسافر اور میں بھی ایک راہی
میں آسماں کا باشی اور تو زمیں کا باشی
ہر شب تلاش منزل، ہر صبح نامرادی
اس طرح کٹ نہ جائے یہ عمر اپنی ساری
دریائے نیلگوں بھی اب سرد ہو رہا ہے
ننھے سے دل میں پیدا کچھ درد ہو رہا ہے
ناکام کارواں جب چلتا ہے رفتہ رفتہ
دامن سے پونچھتا ہوں اشکوں کو میں ہمیشہ
بدقسمتی کا اپنی، کس سے گلہ کروں میں
پی پی کے خون کے آنسو کب تک جیا کروں میں
انساں ہے ننگِ انساں بدلا ہوا چلن ہے
مرنے پہ مفلسوں کو ملتا نہیں کفن ہے

ناظم میواتی سہسرامی

# سچائی

عبدالملک ایک اموی خلیفہ تھا۔ اس نے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف ۷۲ھ میں ایک زبردست فوج بھیجی تھی جس کا سپہ سالار حجاج بن یوسف تھا۔

حجاج بن یوسف بڑا ہی ظالم اور سنگ دل آدمی تھا۔ اس نے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر ڈالا اور اور مدینہ منورہ پہنچ کر وہ آفت ڈھائی کہ گویا قیامت ہی آگئی۔ اس نے بے شمار عبادت گذار اور پرہیزگار عالموں، فاضلوں اور خدا کے نیک بندوں کا قتل عام کیا اور خون کا دریا بہا دیا روزانہ خون ریزی کرنا اس کا ایک دلچسپ مشغلہ ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کا خون کیا اور جب وہ ۹۵ھ میں مرا تو اس وقت بھی اس کی حراست میں تقریباً پچاس ہزار بندگانِ خدا تھے۔

حجاج بن یوسف کتنا بڑا ظالم اور سفاک انسان تھا، اس کا تمھیں کچھ اندازہ ہو گا۔ اب ذرا یہ بھی دیکھتے چلو کہ اتنا بڑا بے رحم اور سنگ دل آدمی بھی سچ کی آنچ کے آگے پگھل گیا یعنی ایک سچے انسان پر اس کی کچھ بھی نہ چل سکی۔

حجاج بن یوسف روزانہ اپنے مخالف مسلمانوں کی ایک جماعت کو طلب کیا کرتا تھا اور ان میں سے ایک ایک آدمی کو باری باری بلا کر سزا دیا کرتا تھا۔ ایک دن ایک شخص کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے چلا کر کہا۔

"اے حجاج! تو مجھے قتل نہ کر۔ مجھ پر میرا بھی کچھ حق ہے"

حجاج چیخ اٹھا۔

"آئیں! مجھ پر اور تیرا حق!! آخر وہ کیسا؟"

"تیرا ایک دشمن تجھے عام مسلمانوں میں بُرا بھلا کہہ رہا تھا اور تیرے نام پر لعنت و ملامت بھیج رہا تھا میں نے اسے اس کی ناجائز حرکت پر ٹوکا۔ غیبت اور بد کلامی سے روکا۔"

اس شخص کے جواب پر حجاج نے پوچھا۔

"آخر اس کا ثبوت؟"

اس نے قریب ہی کھڑے ایک افسر کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"وہ، وہ صاحب ہیں ثبوت۔ وہ اس اس موقعے پر موجود تھے۔ ان سے گواہی لی جا سکتی ہے۔"

دریافت کرنے پر اس افسر نے بھی تصدیق کی۔

"ہاں یہ شخص سچا ہے۔ میں نے اسے آپ کی غیبت و بدگوئی کرنے والے کو منع کرتے دیکھا ہے۔"

پھر کیا تھا۔ یہ سنتے ہی وہ ظالم اپنے اس افسر ہی پر برس پڑا۔ اور پوچھنے لگا۔

"تو پھر تم کیوں خموش کھڑے رہے؟ تم نے بھی اس شخص کا ساتھ کیوں نہ دیا؟ اور میرے اس دشمن کی زبان بند کیوں نہ کر دی؟"

اس افسر نے ظالم کا غصّہ اپنے اوپر اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جان بچانے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتا

تھا اور کہہ سکتا تھا۔

"حضور! میں نے کبھی آپ کی حمایت میں اسے روکا تھا۔"

لیکن یہ طریقہ سچوں کا طریقہ نہ ہوتا اس طرح جاں بخشی ہوتی یا نہیں یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں، جھوٹ بولنے کا الزام ضرور آجاتا۔ اس افسر نے ہمّت کی، بہادری سے کام لیا اور نڈر ہوکر کہہ دیا۔

"جناب والا! مجھے میری صاف گوئی پر معاف فرمایا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس وقت میں آپ کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ اس لیے آپ کی طرفداری میرا فرض نہ تھا۔"

یہ جواب دے کر افسر اس ظالم کے مُنہ سے اپنے قتل کے حکم کا منتظر تھا لیکن خلاف امید حجاج نے دونوں ہی کی رہائی کا حکم دے دیا۔

پہلا شخص اہل حق تھا اس نے غیبت و بدگوئی حجاج جیسے ظالم دشمن کی بھی گوارا نہ کی، اور پیٹھ پیچھے بُرا بھلا کہنے اور لعنت و ملامت کرنے والے دوسرے لوگوں کو بھی اس حرکت سے باز رکھا۔ یہ حجاج کی حمایت ہو یا نہ ہو لیکن ایک اچھی بات ضرور ہے۔ اس کار خیر کو کسی قدر ہمدردی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک معمولی سی ہمدردی اور کار خیر کرنے والے کا بھی کچھ حق ہوتا ہے۔ اس لیے حجاج نے اسے رہائی کا مستحق قرار دیا۔

افسر سچا تھا۔ سچّا آدمی بہادر ہوتا ہے۔ اُسے سچ کی رُوحانی طاقت حاصل تھی۔ اس نے ایک نہایت ہی نازک اور خطرناک موقعے پر بھی سچ بولنے سے گریز نہ کیا اور جھوٹ سے پرہیز کیا۔ اس لیے اُسے بھی رہا کر دیا۔

سچ میں ایک روحانی طاقت ہے جو انسان کو جرأت و ہمّت بخشتی ہے۔ سچّا آدمی اتنا نڈر اور بے باک ہوتا ہے کہ موت سے بھی ٹکرا جاتا ہے۔ اور فتح یاب ہوتا ہے۔

★★

---

# لطیفے

کلاس میں استانی صاحبہ پرندوں کی عادتوں پر سبق پڑھا رہی تھیں۔ پڑھاتے پڑھاتے بچوں سے اچانک پوچھ بیٹھیں "اچھا بتاؤ سارس ایک پیر پر کیوں کھڑا ہوتا ہے؟" ایک چھوٹے بچّے نے فوراً اُٹھ کر جواب دیا: "سر، اس لیے کہ وہ دونوں پاؤں اُٹھائے گا تو گر جائے گا۔" اس بے ساختہ جواب سے کیا بی استانی کیا بچّے سبھی پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ بتاؤ کیوں۔ (نجیب حسان)

ایک آدمی دوڑا دوڑا ہوٹل میں آیا اور منیجر سے بولا۔ جلدی سے چائے منگواؤ نہیں تو جھگڑا ہو جائے گا۔ منیجر نے فوراً چائے منگوائی۔ چائے پی کر کہنے لگا۔ جلدی سے کھانا منگواؤ نہیں تو جھگڑا ہو جائے گا۔ منیجر نے جلدی سے کھانا بھی منگوا دیا اور کھانا کھا کر وہ بولا۔ "مجھے جانے دو نہیں تو جھگڑا ہو جائے گا۔" منیجر زچ ہو کر بولا۔ "اب جھگڑا کس بات کا!" وہ بولا "اس بات کا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" یہ کہا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوٹل سے نکل گیا۔ منیجر بے چارہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

شکیب حسّان جامعہ نگر

★

محترمہ طاہرہ یاسمین دہلی

# جادو کا برش

سریش ایک غریب لڑکا تھا۔ دن بھر محنت مزدوری کرکے پیٹ کی آگ بجھاتا۔ اُسے تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ مزدوری کرکے جب وہ گھر لوٹتا تو تصویر بنانے بیٹھ جاتا اس طرح اس نے گھر کی دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں بناڈالیں۔ گانوٗں کے لوگ ان تصویروں کو دیکھتے اور حیرت کرتے وہ کہتے شاباش سریش! تم تو بہت ہونہار ہو۔ اگر اسی طرح مشق کرتے رہے تو ایک دن بہت اچھی تصویریں بنانے لگوگے۔ سریش ان کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتا وہ اور محنت اور شوق سے تصویریں بناتا لیکن اس کے پاس کوئی برش نہ تھا وہ سوچا کرتا۔

"میرے پاس ایک برش بھی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا!"

اس کے دل کی یہ خواہش بھی پوری ہوگئی ایک دن گھر آیا تو برش پڑا دیکھا اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا برش اٹھانے لگا تو وہیں ایک کاغذ بھی نظر آیا اس نے دونوں چیزیں اٹھالیں کاغذ پر لکھا تھا۔

"یہ جادو کا برش ہے۔ اسے سوچ سمجھ کر کام میں لانا"۔

کتنا اچھا برش ہے اس سے تو میں خوب صورت خوب صورت تصویریں بنا سکوں گا" برش کو ہاتھ میں لے کر اس نے کہا۔

پھر وہ ایک چڑیا کی تصویر بنانے لگا۔ بھئی واہ تصویر پوری ہوتے ہی وہ تصویر والی چڑیا تو سچ مچ کی چڑیا بن کر اڑ گئی۔ سریش ہکا بکا سا ہوگیا۔

اب وہ کتے کی تصویر بنانے لگا یہ تصویر بھی جیسے ہی پوری ہوئی تو بھئی کیا دیکھتا ہے سامنے سچ مچ کا ایک کتا کھڑا ہے" ارے! یہ تو سچ مچ جادو کا برش ہے"۔ وہ خوشی سے چلاّ اٹھا۔

سریش اس برش سے جو کچھ بھی تصویر بناتا وہ سچ مچ کی چیز بن جاتی اسی لیے اب وہ خوب سوچ سمجھ کر گانوٗں والوں کی ضرورت کی چیزوں کی تصویریں بناتا اور یہ چیزیں گانوٗں والوں کو دے دیتا۔ گانوٗں والے بہت خوش ہوتے۔

دھیرے دھیرے آس پاس کے گانوٗں میں سریش کے اس جادو والے ہنر کا چرچا ہونے لگا۔

ہوتے ہوتے سریش اور اس کے برش کی بات اس دیس کے راجا تک جا پہنچی۔ راجا کو بھی بہت حیرانی ہوئی اس نے سریش کو بلا کر طرح طرح کی چیزوں کی تصویریں بنانے کو کہا۔ سریش جانتا تھا کہ راجا کو ان کی ضرورت نہیں اس لیے اس نے کوئی تصویر نہیں بنائی۔

راجا کو بڑا غصہ آیا اس نے سریش سے برش چھین کر کہا "دیکھ بیوقوف! میں اس سے کیا کیا چیزیں بناتا ہوں راجا نے سونے کی تصویر بنانا شروع کی لیکن جیسے ہی تصویر پوری ہوئی سونے کے پہاڑ کی جگہ اس کے سامنے پتھر کا ایک پہاڑ کھڑا ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس پہاڑ کے پتھر ادھر اُدھر گرنے لگے۔

راجا کو بڑی حیرانی ہوئی اب اس نے سونے کی چڑیا کی

جگہ ایک کالا سانپ بن گیا۔ سانپ بڑی تیزی سے راجا پر جھپٹا مگر وزیر نے اسے مار ڈالا۔ یہ دیکھ کر راجا بُری طرح ڈر گیا اس نے برش ایک طرف پھینک دیا۔ اور سپاہیوں کو حکم دیا اس شیطان کو پکڑ لو اور جیل میں بند کر دو۔ سرلیش نے دوڑ کر برش اٹھایا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا جیل کی کوٹھری میں بڑا اندھیرا تھا وہاں سردی بھی بہت تھی سرلیش کو وہاں کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں دیا گیا۔ تین چار دن بعد راجا سرلیش کو دیکھنے گیا اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سرلیش کوٹھری کی دیواروں پر تصاویر بنا رہا تھا۔

یہ دیکھ کر راجا غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ حکم سنتے ہی سپاہی کوٹھری میں گھس گئے۔ پر وہاں کوئی نہ تھا۔ سپاہیوں نے باہر دیکھا کہ سرلیش ایک گھوڑے پر چڑھ کر بھاگا جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر سپاہی بھی اپنے اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر اس کا پیچھا کرنے لگے۔

سرلیش نے دیکھا کہ کچھ سپاہی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنے اور سپاہیوں کے درمیان ایک سمندر کی تصویر بنائی۔ اپنے سامنے سمندر دیکھ کر سپاہی آگے نہ بڑھ سکے۔

اس طرح سرلیش راجا کی پہنچ سے باہر ہو گیا۔ اب وہ جہاں کہیں جاتا۔ غریب لوگوں کی ضرورت کی چیزوں کی تصویریں بنا بنا کر ان کی مدد کرتا لوگ بڑے خوش تھے۔



# ہنڈکلیا

عزیزہ شاہدہ پروین

## بغیر گھی یا تیل کے آلو کی ترکاری

آج میں ایسی ترکیب لکھ رہی ہوں جس کا سامنا اکثر آخری ماہ میں کرنا پڑتا ہے۔

آلو ½ کلو دھوکر چھیل کر ٹکڑوں میں کاٹ لیجئے۔
مرچ پسی ۲ چائے کے چمچہ
ہلدی پسی ۱ " " "
زیرہ سفید ۱ " کا " بھون لیجیے } ساتھ میں
کھٹائی ۵ بڑی کلیاں } پیس لیجیے
کلونجی ½ چائے کا چمچہ
ہینگ بقدر ضرورت
ہری مرچ ۸—۱۰ عدد باریک کترئے
نمک حسب ضرورت — پانی ½۱ پیالی

ترکیب :- پتیلی میں ڈیڑھ پیالی پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیجیے۔ پسی ہلدی پانی میں ڈال دیجیے پانی اُبلنے لگے تو آلو کے ٹکڑے اُس میں ڈال دیجیے ساتھ ہی میں پسی مرچ، کلونجی نمک ڈال دیجیے۔ ۱۰ منٹ بعد زیرہ اور کھٹائی ڈال دیجیے۔ ہری مرچ بھی ڈال دیجیے۔

سب چیزوں کو پکنے دیجیے یہاں تک کہ آلو گل جائیں اور مسالہ گاڑھا ہو جائے۔ مسالہ گاڑھا ہونے لگے تو پانی میں ہینگ گھول کر ڈال دیجیے ایک اُبال آجائے اتار لیجیے۔

یہ ترکاری روٹی اور پوری کے ساتھ بہت اچھی لگتی ہے

نوٹ :- پانی اپنی مرضی کے مطابق کم وبیش رکھا جا سکتا ہے۔

★

## کابلی کباب

سامان :-

قیمہ ½ کلو اچھی طرح پیسے
پیاز ایک بڑی گانٹھ
ادرک ایک درمیانی گانٹھ
گری کدوکش کی ہوئی ایک بڑا چمچہ
دارچینی ایک ٹکڑا لگ بھگ ایک انچ بھر کا
الائچی بڑی ۴ عدد
ہری مرچ حسب منشا
ہرا دھنیا (باریک کترئے) حسب منشا
بادام (اگر جی چاہے) ۱۰ عدد
نمک حسب منشا
بیسن ۴ بڑے چمچے

(علاوہ ہرے دھنیے کے سب چیزوں کو باریک پیس لیجیے)

تیل یا ڈالڈا حسب ضرورت

ترکیب :- ایک بڑا چمچہ ڈالڈا گرم کیجیے اور سب پسا مسالہ بھونیے۔ قیمہ ملا کر بھونیے یہاں تک کہ سوکھ جائے۔ گولی حسب منشا بنا کر چپٹی کر لیجیے اور بیسن دونوں طرف لگا کر تیل یا ڈالڈا میں تلیے۔

## دہی کباب

سامان :-

قیمہ ½ کلو باریک پیسے
پیاز ۲ گانٹھ } ایک گانٹھ باریک کترے
لہسن ۵۔۷ جوئے } ایک گانٹھ اور لہسن کے جوئے ہمراہ

ونگ ۹ عدد
رخ سرخ ۵ عدد
بڑی الائچی ۳ عدد
دار چینی ½ انچ لمبا ٹکڑا
زیرہ سفید } سب چیزیں باریک گیلی پیسیے
ھبون لیجیے ۲ چائے کے چمچے
ھنیا بھون لیجیے ۲ چائے کے چمچے
نمک حسب منشا
بھنے چنے ۵۰ گرام چھلکے الگ کرکے باریک پیسیے
ہی اچھی طرح متھ لیجیے ۲۵۰ گرام
تیل ۵۰ گرام

ترکیب:۔ پسے ہوئے قیمے میں پسی ہوئی پیاز اور لہسن ملائیے۔ اس کے بعد سب پسے مسالے ملا دیجیے۔ ساتھ ہی پسے چنے بھی ملا دیجیے۔

ایک بھگونے میں تیل ڈال کر کڑکڑا لیجیے اور اس میں کتری ہوئی پیاز ڈال دیجیے۔ سرخ ہو جائے تو قیمے کی گولیاں بنا کر چپٹی کر لیجیے (گولیاں حسب منشا) اور بھگونے میں ایک ایک کرکے رکھ دیجیے۔ یہاں تک سب آجائیں۔ بھگونے کو ڈھانک دیجیے۔ جب پانی ختم ہو جائے اس میں دہی ڈال دیجیے۔ اور آہستہ آہستہ چلا دیجیے (یہاں تک کہ سب میں دہی لگ جائے)، دہی کا پانی جل جائے تو اتار لیجیے۔

روکھے کھائیے یا روٹی کے ہمراہ دونوں طرح اچھے لگتے ہیں۔



### بقیہ بچوں سے باتیں صفحہ ۲ سے

ان سب خوبیوں کے ساتھ مرحوم بہت وضع دار تھے بہت سادہ مزاج تھے۔ بہت مخلص زندہ دل اور دردمند تھے۔ یا خود اتنی قابلیت اور اونچے عہدوں کے تمکنت نام کو نہ تھی۔ اپنے دوستوں، ساتھیوں، اور شاگردوں میں بہت ہر دل عزیز تھے اور یہ ہر دل عزیزی ضرب المثل بن گئی تھی۔ مرحوم کا خیال تھا کہ موجودہ ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے بعد اطمینان و سکون سے علمی کام کریں گے۔ بچوں کے لیے کچھ لکھیں گے۔ افسوس موت نے مہلت نہ دی۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر کل ساٹھ سال دس مہینے کی تھی۔ یہ حادثہ مرحوم کے سب دوستوں اور عزیزوں کے لیے بہت دردناک حادثہ ہے خدا ان سب کو محترمہ ساجدہ زیدی مرحوم کے بچوں بچیوں محترمہ صالحہ عابد حسین اور محترم کرنل زیدی کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے۔

### بقیہ پن چکی صفحہ ۹ سے

کو خوب سجاتے ہیں۔ بچوں کو سمجھانے اور دکھانے کے لیے "پن چکی میوزیم" ہے۔ اس میوزیم کے ذریعے چھوٹے بچوں کو ان کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہے۔ بچے دیکھ کر حیرت کرتے ہیں۔ اپنے ملک کے لوگوں کی محنت، لگن پر فخر بھی کرتے ہیں۔ ان کے بڑوں نے ان کے رہنے کے لیے کس طرح محنت کر کے زمین کو بڑے سمندر سے حاصل کیا ہے اور ملک کو پانی میں ڈوبنے سے بچایا ہے۔ جو سچ پوچھیے تو یہاں کے کیا بڑے اور کیا بچے سبھی اپنے ملک سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھیں یہاں کی ہر چیز سے لگاؤ ہے۔ پن چکیوں کو ہی نہیں ملک کی ہر چیز کو صاف رکھنا اور ان کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

# آدھی ملاقات

پیام تعلیم پابندی سے مل رہا ہے۔ ماشاءاللہ مضامین اچھے ہیں۔ معیار بھی بلند ہے۔

ابراہیم عمادی ندوی جامعی بمبئی

کچھ مہینوں سے پیام تعلیم نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ اگست، ستمبر، اکتوبر (وغیرہ) کے سرورق (ٹائیٹل) پسند آئے۔ مجھے بڑی تمنا تھی کہ پیام تعلیم کی شان دوبالا ہو جائے۔ اب تمنا بر آئی۔ پہلے بھی میں پیام تعلیم کا خریدار بن چکا ہوں۔ مجھے اور سب گھر والوں کو مونگے کا جزیرہ، عقل مند لوگ، لالچ کا انجام، بہت اچھے لگے۔ اچھے شہری والی نظم بڑی مفید تھی۔ نوری تنکار سے والی۔ پیسا کا مینار، ڈولفن کا سرکس خاص طور پر اچھے لگے۔ محمد فاضل کھتری، جناب عبدالحق پرنسپل مدرسہ ثانوی محمد حسین حسّان کا شکریہ ادا کر دیجیے۔

سیّد فاروق حسن۔ مراد آباد

پیام تعلیم کے نئے شمارے میں عمدہ اور اچھی اردو جیسے سبق آموز مضامین کی اشاعت کا شکریہ۔ ان سے ایک طرف تو نونہالان فرزند کی ذہنی نشوونما میں مدد ملے گی، اخلاق اور کردار سنبھلیں گے تو دوسری طرف اپنے قومی ورثے اردو میں استعداد پیدا ہوگی۔

انجم قاسمی جامعہ نگر۔ نئی دہلی

جنوری کے پرچے کی کتابت پہلے سے بہت بہتر ہے اور باریک ہو جانے کے باعث اتنے ہی صفحات میں کم از کم سوا گنا مواد آ گیا ہے۔ طباعت بھی صاف ستھری ہے۔ یوں تو آپ ہر شمارہ ہی بڑی محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ لیکن اس شمارے پر تو آپ نے پورا زور ادارت لگا دیا ہے۔ اور یہ حسن ادارت کا شاہ کار بن گیا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ یہ شمارہ بڑا متنوع و متوازن ہے "انمول گہنا" میں علم کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے فوراً بعد "علم" میں نظم کے ذریعے اس کے فوائد ذہن نشین کرائے گئے ہیں یہی صحیح معنوں میں ترتیب و ادارت ہے۔ ویسے آپ نے انکسار کی بھی حد کر رکھی ہے "ادھر ادھر" سے میں اتنی دل نشین اور میٹھی زبان اور دلچسپ انداز میں آپ خبریں تحریر فرماتے ہیں۔ اور آخر میں اس اخبار کا نام دے دیتے ہیں۔ کم از کم شروع میں آپ کو اپنا نام دینا چاہیے۔ حالاں کہ اس کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ لوگ سمجھ ہی جاتے ہیں کہ یہ میٹھی اور دل نشین ہو جانے والی آسان زبان آپ ہی کا کارنامہ ہے۔

ہاں کتابت بہتر تو ہے لیکن اس میں جگہ جگہ میں نے غلطیاں پکڑی ہیں حالانکہ اس شمارے کی بیشتر صفحات کی تصحیح میں نے کی تھی۔ بڑی احتیاط سے کی تھی۔ یہ بھی یاد ہے کہ جگہ جگہ ادھر ادھر نشان دہی کی تھی۔ لیکن کاتب صاحب نے تصحیح دھیان سے نہیں کی۔

آپ نے قیمت میں برائے نام اضافہ کیا ہے دوسرے رسالوں نے ۲۵ پیسوں سے لے کر ۵۰ پیسوں تک اضافہ کیا ہے۔

(خلیق انجم اشرفی۔ دہلی)

---

★ جھوٹ بولنے سے رزق گھٹ جاتا ہے (بخاری)

★ ترا رب جسے چاہتا ہے رزق میں فراخی یا تنگی عطا کرتا ہے۔ (ق)

# اِدھر اُدھر سے

## دُنیا کا سب سے بوڑھا درخت

ایک کالج کے پروفیسر نے دنیا کے سب سے پُرانے درخت کا پتہ چلایا ہے۔ ایشیا انٹرنیشنل نے یہ خبر دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ درخت "تائی پے" کے قریب "پائی وان" کے گھنے جنگلوں میں موجود ہے۔

"تائی پے" میں چینی تہذیب کے کالج میں علم نباتات کے پروفیسر "چاؤ ہوتی ، ین" نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ درخت کم سے کم چھ ہزار سال پُرانا ہے۔ اور ابھی تک اس کے پھیلنے پھولنے اور بڑھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

کہتے ہیں یہ درخت کیلی فورنیا کے سب سے پرانے درخت سے بھی ساڑھے تین ہزار برس پرانا ہے۔ کیلی فورنیا کا درخت ڈھائی ہزار برس پرانا بتایا جاتا ہے۔ (الجمعیتہ)

## البیرونی کی ایک ہزارویں سالگرہ کے سلسلے میں تقریبی جلسہ

۱۴ ستمبر (۷۳ء) کو ماسکو میں ٹریڈ یونینوں کے ایوان میں البیرونی کی جوبلی سالگرہ کے سلسلے میں ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر سوویت یونین میں البیرونی کی شائع شدہ کتابوں کی اور اُن کتابوں کی نمائش کی گئی جن میں اس شہرۂ آفاق عالم کی زندگی اور اُن کے شاندار کارناموں کی جھلک پیش کی گئی ہے۔ مشہور دانشور فیڈوسنیف نے وسط ایشیا کے ایک اور ممتاز سائنس داں ابن سینا کے ساتھ خط و کتابت کی فلسفیانہ اہمیت کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ البیرونی ایک عظیم ماہر فلکیات، ایک ممتاز ریاضی داں، طبیعیات داں، فلسفی، جغرافیہ کے ماہر اور معدنیات، تاریخ، علم الاقوام، لسانیات اور سائنس کی تاریخ سے متعلق کئی اہم کتابوں کے مصنف تھے۔ البیرونی نے اپنے زمانہ میں کرۂ ارض کے گھیرے کا سب سے صحیح تعین کیا۔ کرۂ ارض کا نمونہ سب سے پہلے تخلیق کیا اور ریاضیاتی نقشہ گری کے مسائل حل کئے۔ پروفیسر سخوسکی نے بتایا کہ تاریخ ہند نامی کتاب کے لیے مواد جمع کرنے میں البیرونی کو ۱۳ برس لگے۔

(افکار و جائزے سوویت انفارمیشن)

اس کے علاوہ علامہ بیرونی نے (۱) زاویے کو تین حصّوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اور بعض ایسے مسئلوں کا حل معلوم کیا جو پیمانے اور پرکار سے حل نہیں ہو سکتے تھے۔ (۲) بہت سے مقامات کے صحیح صحیح طول بلد اور عرض بلد معلوم کئے۔ (۳) برِاعظم امریکہ کی نشان دہی کی (۴) یہ ثابت کیا کہ سندھ کی وادی کسی زمانے میں پانی میں تھی۔ جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے خشکی میں بدل گئی۔ (۵) پانی کے چشموں کے عمل کی ان آبپاشی (پانی کے) اصول کے تحت وضاحت کی جن کی رو سے پانی نالی کے ذریعے ایک ظرف سے دوسرے ظرف میں منتقل کیا جاتا ہے۔ (۶) یہ ثابت کیا کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ ہے (۷) کششِ ثقل کی وضاحت کی۔ (۸) گریوی ٹیشن یعنی مادوں کے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کے عمل کی تشریح کی۔

(ریحان عباسی دہلی)

## کتّوں کا ہوٹل

ٹوکیو (جاپان) میں ایک نئے انداز کا ہوٹل کھولا گیا ہے۔ کینائین اس کا نام ہے یہ صرف کتّوں کے لیے ہے۔ اور یہاں کتّوں کو سستا کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ اس ہوٹل میں، سب سے پہلے دن آنے والا گاہک ایک بڑا کتّا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی مالکہ بھی آئی اور جناب یہ پہلے گاہک یعنی کتّے صاحب اتنے پیٹو نکلے کہ ہوٹل میں موجود تمام کھانا صاف کر گئے۔ اس دن بعد کو جتنے بھی کتّے آئے سب بے چاروں کو منھ لٹکائے خالی پیٹ واپس جانا پڑا۔ (الجمعیۃ)

## نہانے کا ریکارڈ

جھرنے کے نیچے مسلسل نہانے کا ایک نیا ریکارڈ، امریکہ میں نیاگرا علاقے کے رہنے والے ڈیوڈ فورمین نے قائم کیا ہے۔ وہ جھرنے کے نیچے سات دن، سات گھنٹے سات منٹ لگاتار نہاتے رہے۔ اس سے پہلے نہانے کا ریکارڈ سات دن کا تھا۔ یہ بھی ڈیوڈ نام کے ایک اور آدمی نے قائم کیا تھا۔ (الجمعیۃ)

---

## لطیفہ

سکول پارک میں تین بچے کھیل رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچے کے جی میں کیا آئی کہ اپنے ایک ساتھی سے پوچھنے لگا۔ منّے منّے بتاؤ تم کس دن پیدا ہوئے تھے۔ منّے نے جواب دیا۔ میں منگل کو پیدا ہوا تھا۔ پھر بجّو سے پوچھا۔ بجّو تم کس دن پیدا ہوئے تھے۔ بجّو نے جواب دیا: "میں بدھ کو پیدا ہوا تھا"۔ پھر منّے نے خود ان حضرت سے پوچھا۔ "گڈّے صاحب آپ تو بتائیے آپ کب پیدا ہوئے تھے؟" گڈّے صاحب نے ذرا سوچ کر جواب دیا "اتوار کو پیدا ہوا تھا"۔ یہ سن کر منّے اور بجّو جھٹ بول اٹھے۔ "ہش — اتوار کو کیسے پیدا ہوئے تھے۔ اتوار کو تو چھٹّی ہوتی ہے"۔

نجیب حسان مدرسہ ابتدائی جامعہ


### فارم ۱۷ حسب قاعدہ ۸

بابت "پیامِ تعلیم" نئی دہلی

(۱) مقامِ اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

(۲) وقفہ اشاعت: ماہنامہ

(۳) پرنٹر کا نام: سیّد احمد ولی۔ قومیت ہندستانی
پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

(۴) پبلشر کا نام: سیّد احمد ولی۔ قومیت ہندوستانی
پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

(۵) ایڈیٹر کا نام:۔ محمد حسین حسان۔ قومیت ہندوستانی
پتہ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

(۶) مالکان کے نام اور پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

چیرمین: پروفیسر محمد مجیب جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ڈائرکٹرز: سید مجتبیٰ حسن زیدی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

(۲) ڈاکٹر عبد العلیم ویسٹرن کورٹ نئی دہلی

(۳) ہز ہائنس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور۔ کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵

(۴) کرنل بشیر حسین زیدی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

(۵) ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل جامعہ کالج جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

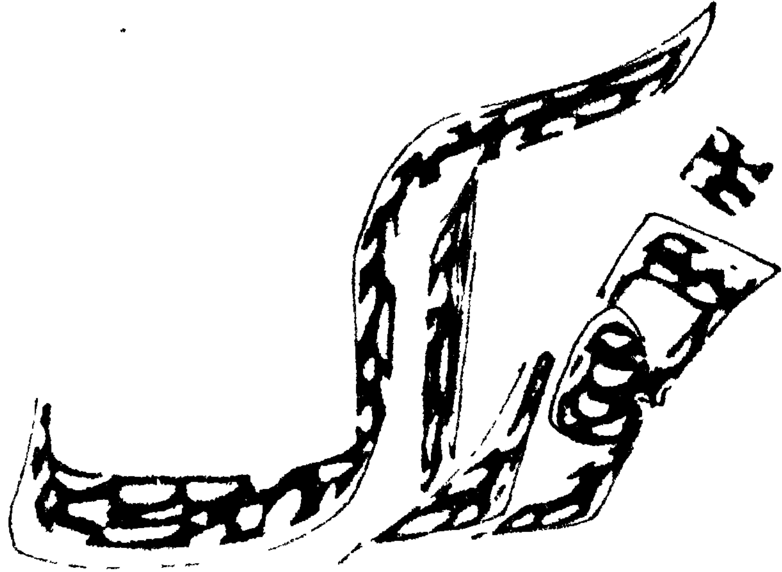
(۶) مالک رام لوہیجہ ۲۹۶ ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۳

(۷) کمپنی کے سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصے دار
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
اسلامی جیم خانہ کنیڈی، سی فیس۔ بمبئی ۲

میں سیّد احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط سیّد احمد ولی پبلشر

۲۸۔ فروری ۱۹۷۴ء


خوراک

تم التعليم

# پیامِ تعلیم



ماہنامہ

# پیامِ تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۱ شمارہ ۴

اڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

اپریل ۱۹۷۴ء

قیمت ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

## فہرست مضامین






پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

# بچوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ارکانِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | ۱/۵۰ |
| آں حضرت | الیاس احمد مجیبی (اردو) | -/۶۵ |
| پاک کہانیاں (دو حصوں میں) | مقبول احمد سیوہاروی | ۲/۳۵ |
| چار یار | الیاس احمد مجیبی | ۱/۳۰ |
| خلفائے اربعہؓ | خواجہ عبدالحئی فاروقی | ۲/۲۵ |
| رسولِ پاکؐ | عبدالواحد سندھی | ۱/۸۰ |
| عقائدِ اسلام | مولانا اعجاز الحق قدوسی | -/۷۵ |
| نبیوں کے قصے | خواجہ عبدالحئی فاروقی | ۱/۲۵ |
| ہمارے رسولؐ | " " " | ۱/۶۵ |
| سرکارِ دو عالمؐ | محمد حسین حسان | ۲/۷۵ |

## معلومات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آدمی کی کہانی | مشتاق احمد | ۱/۷۵ |
| انوکھا عجائب خانہ (چار حصے) | محمد حسین حسان | ۱/۸۰ |
| بجلی کی کہانی | علی احمد خاں | -/۵۰ |
| پرڑ دادا کی کہانی | محمد عبدالغفور | -/۵۶ |
| تاریخ ہند کی کہانیاں (اول) | خجستہ سلطان | -/۸۰ |
| " " " (دوم) | ضیاء الرحمن | ۱/- |
| " " " (سوم) | مشتاق احمد اعظمی | ۱/۸۰ |
| " " " (چہارم) | " " | -/۹۵ |
| چٹانوں کی کہانی | محمد امین | ۱/۷۵ |
| خبر رسانی کے طریقے | رفیعہ منظور الامین | -/۸۵ |
| دنیا کے بچے | محمد حسین حسان | ۱/- |
| دہلی | ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی | ۱/۸۰ |
| رابندر ناتھ ٹیگور | صفدر حسین | ۱/۲۵ |
| سماجی زندگی اوّل | احمد پٹیل و غلام ابرار | -/۵۶ |
| " " دوم | " " | -/۸۱ |
| " " سوم | " " | -/۸۱ |
| سمندر کے کنارے | سلطانہ آصف فیضی | ۱/۳۰ |
| " " نیچے | " " | ۲/- |
| قدرت کے کرشمے | ادارہ | -/۶۲ |
| میر انیس | محمد حسین حسان | ۱/۲۵ |
| ہماری پارلیمنٹ | کیلاش چندر | ۱/۲۵ |

## کہانیاں، ڈرامے، ناول

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے | | ۴/- |
| اس نے کیا کرنہ جانا (کہانیاں) | آصفیہ مجیب | -/۳۷ |
| پریم کی جیت (ڈراما) | اسداللہ کاظمی | -/۳۷ |
| تابیل خاں (کہانی) | محمد حسین حسان | -/۳۰ |
| ترکوں کی کہانیاں (" ) | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/۵۵ |
| تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) | م۔ ندیم | ۱/۵۰ |
| تین اناڑی (" ) | عصمت چغتائی | ۱/۴۰ |
| چپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی) | محمد معین | -/۳۵ |
| چنبیلی | محمد حسین حسان | -/۵۰ |
| ستاروں کی سیر (ناول) | کرشن چندر | ۱/۷۵ |
| کوے دادا (سچا ناول) | مجیب احمد خاں | ۱/۷۵ |
| لال مرغی (کہانی) | عبدالواحد سندھی | -/۵۰ |
| مزہ چکھائیں گے (" ) | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/۳۵ |
| مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں) | محمود علی خاں | -/۶۵ |
| ننھا شتو (کہانی) | خورشید سلطان | -/۳۰ |

**مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵**

# بچّوں سے باتیں

ہمارے اتر پردیس کی اُردو اکاڈمی جب سے قائم ہوئی ہے بہت جوش و خروش سے کام کر رہی ہے اچھی کتابوں پر انعام دینا، شاعروں اور مصنفوں کی بن چھپی کتابوں کے چھپوانے میں مدد کرنا، لائبریریوں خصوصًا اردو لائبریریوں کی امداد کرنا، اردو کتابیں خریدنے کے رقم فراہم کرنا، غرض یہ اور اسی طرح اور بہت سے کام اس نے اپنے ذمہ لئے ہیں۔

---

مگر ایک کام تو اس نے بہت ہی اچھا کیا ہے اور اس کارِ خیر کے لئے اس کی خدمت میں دِلی مبارکباد پیش کرتے ہیں ہمارے محترم بزرگ جناب رشید صدیقی صاحب کی خدمت میں ان کی اردو خدمات کی بنیاد پر اس نے پانچ ہزار روپئے پیش کئے ہیں۔ اسی طرح احتشام صاحب کو بھی نوازا گیا ہے۔ اور اتنی ہی رقم ان کی بیوی کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی انہی لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ جو صحیح معنوں میں اس کے مستحق ہیں

---

پچھلے پرچے کا ٹائٹل ہمارے پیامیوں کو بہت ہی ما لگا۔ ایک ہنستی ہوئی ننھی منھی پیاری پیاری بچی پنجرے پاس بیٹھی ایک ننھے سے پنچھی سے کھیل رہی ہے۔ وہ بھی کئی رنگوں میں ہے۔ اس لئے اور بھی مزہ دے گا۔

---

ٹائٹل کے علاوہ خالد عرفان صاحب کا مضمون "آبی تجربے"، جمیل احمد قریشی صاحب کا "پن چکی" پروفیسر آفاق کی مزاحیہ کہانی "کیچڑ کا بھوت"، خلیق انجم صاحب کی مسلسل کہانی "مونگے کا جزیرہ" محترم ناظم میواتی صاحب کی سچی کہانی "سچائی" سبھی پیامیوں کو غیر معمولی طور پر پسند آئیں۔

---

اسی طرح نظموں میں "ماں کی دعا" (حافظ باقوی) "ایک چھوٹی سی نیکی" (سنجر انصاری) "میں کیا بنوں گا" (متین نیازی) "اسکول جا رہے ہیں" (مرتضیٰ ساحل) "شاعر اور ستارے" (مضطر داؤد نگری) پیامیوں نے خاص طور پر پسند کیں۔

---

ہمارے بعض کرم فرما عزیز اور دوست پرانی چھپی ہوئی چیزوں میں ادھر ادھر کچھ ادل بدل کر کے اور اسے اپنا بنا کر، اپنی تخلیق بتا کر اور اس کے نیچے غیر مطبوعہ لکھ کر ہمارے پاس بھیج دیتے ہیں۔ ہم بہت احتیاط کرتے ہیں پھر بھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ کاش ہمارے یہ مخلص دوست ہم پر یہ احسان نہ کرتے تو بہت احسان ہوتا۔ (تفصیل آدھی ملاقات میں پڑھئے)

---

اپریل کے پرچہ میں بھی ہمارے عزیز کرم فرما جمیل احمد قریشی صاحب کا مضمون ہالینڈ کے مشہور شہر

اسٹرڈم پڑھئے۔ قریشی صاحب نے بہت ہی دلچسپ انداز میں اس شہر کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ قریشی صاحب اگلے پرچے کے لئے بھی ہالینڈ ہی کے سلسلے میں ایک دلچسپ مضمون لکھ رہے ہیں پڑھئے گا۔

---

کئی مہینے ہوئے ہم نے اپنے محترم دوست محمد امین صاحب سے نئے دم دار ستارے (کوہوٹیک) پر مضمون لکھنے کی بلکہ ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ کرنے کی درخواست کی تھی مگر کرنا خدا کا وہ مضمون ہی ضائع ہو گیا۔ کہیں نہ ملا۔ آخر اسٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں اسی طرح کا ایک معلوماتی مضمون ان کی نظر سے گذرا تو اسی کو سامنے رکھ ایک بہت ہی اچھا اور دلچسپ مضمون آپ کے لئے لکھ دیا۔ یقین ہے کہ آپکو پسند آئے گا۔ دنیا کے عجیب و غریب جانوروں پر بھی مضامین کا سلسلہ اس پرچے سے شروع کیا جا رہا ہے۔

---

ایک اور اہم مضمون محترم مولانا عبدالسلام قدوائی کا سفرنامہ ہے۔ مولانا پچھلے دنوں حج کو تشریف لے گئے تھے۔ ہماری درخواست پر انہوں نے یہ مختصر سا سفرنامہ تحریر فرمایا ہے۔ دو قسطوں میں پڑھئے گا۔

---

یہ اپریل کا مہینہ ہے اس لئے چند ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین بھی پڑھئے۔ ان میں ایک روسی کہانی خاص طور پر دلچسپ ہے۔ جناب عزیز مرادآبادی کا مضمون بدھو بھی خاصا ہے۔ ان کے علاوہ نظمیں بھی ایک سے ایک اچھی ہیں آپکو پسند آئیں گی۔

---

پچھلے دنوں ہماری جامعہ میں دو افسوسناک حادثے ہو گئے۔ فروری کی آخری ہفتے میں سلیم میاں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور چند دنوں بعد عبدالغفار چپراسی نے دنیا کو خیر باد کہا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

---

سلیم مرحوم رُدولی کے رہنے والے تھے بچپن ہی سے جامعہ میں آ گئے تھے۔ محترم ارشادالحق صاحب انھیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور پھر یہیں کے ہو رہے، پوری زندگی جامعہ میں گزار دی۔ پہلے مختلف بورڈنگوں میں رہے پھر ڈرائیوری سیکھ لی اور شیخ الجامعہ صاحب کی کار انکے چارج میں دے دی گئی۔ اور یہ خدمت انھوں نے بڑی خوبی سے انجام دی۔ مرحوم ذاکر صاحب قبلہ تو ان کے کام سے بہت ہی خوش اور مطمئن تھے۔ جب وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڈھ تشریف لے گئے تو سلیم صاحب کو بھی لے گئے یہ دوسری بات ہے کہ خو سلیم میاں کو علی گڈھ کا ماحول اجنبی اجنبی سا لگا اور ا چھوڑ کر اپنی جامعہ میں آ گئے۔ یہاں انکا سابقہ محترم صاحب سے پڑا۔ محترم مجیب صاحب بھی ذاکر صاحب کی طرح سلیم صاحب کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ اور ا خدمات سے بہت ہی خوش اور مطمئن تھے۔

---

سلیم مرحوم سچے اور اچھے ڈرائیور ہی نہ تھے۔ اپنی کو ٹھیک ٹھاک رکھتے تھے۔ دوسرے ڈرائیوروں خلاف اسے وہ اپنی ہی چیز سمجھتے تھے۔ اسی لئے ا گاڑی ہمیشہ نئی نئی لگتی تھی۔

---

پچھلے دنوں انھیں کچھ شکایتیں پیدا ہو گئیں

باقی ۵

(بڑے پیامیوں کے لیے)

جنابِ محبوب راہی

# جاگتے رہو

اے ساکنانِ ارضِ وطن جاگتے رہو
جینے کی دل میں لے کے لگن جاگتے رہو

تاریکیوں سے یاس کی پھوٹے گی جلد ہی
اُمیدِ نو بہ نو کی کرن جاگتے رہو

تم پر ہی انحصار ہے اس کے وقار کا
تم سے ہے آبروئے چمن جاگتے رہو

قائم ہیں تم سے کوہِ ہمالہ کی عظمتیں
اے پاسبانِ گنگ وجمن جاگتے رہو

زندہ ہیں تم سے مہر و وفا کی روایتیں
مٹ جائے یہ نہ رسمِ کہن جاگتے رہو

ہوگی مسرتوں کی سحر جلد ہی طلوع
مٹ جائیں گے یہ رنج ومحن جاگتے رہو

ہے تم کو جستجو جو حصولِ کمال کی
خود کو بنا کے مرکزِ فن جاگتے رہو

کہتے ہیں جس کو جذبۂ سوزِ دروں کبھی لوگ
لے کر دلوں میں ایسی لگن جاگتے رہو

جمہوریت کا مہر یوں ہی زرفشاں رہے
اس کو کہیں لگے نہ گہن جاگتے رہو

"غفلت میں پا کے تم کو اُٹھالیں نہ فائدہ
اس بار دشمنانِ وطن" جاگتے رہو

جدّت طلب تُلے ہیں مٹانے کے واسطے
ہر نقشِ داستانِ کہن جاگتے رہو

یہ راستہ ہے حق وصداقت کا راستہ
اس راہ میں ہیں دار ورسن جاگتے رہو

دیکھو کہیں سروں پہ تمھارے نہ گر پڑے
یارو مصیبتوں کا گگن جاگتے رہو

لائے گا رنگ راہی تمناؤں کا لہو
لہرائے گی عروسِ سخن جاگتے رہو

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی

# دہلی سے حجاز تک

آپ نے مکّے مدینے کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ شاید ان دونوں پاک اور متبرک شہروں کی تصویریں بھی دیکھی ہوں۔ اور بھئی کیا عجب جو آپ میں سے کچھ خوش نصیب پیامیوں کو ان کی زیارت کی سعادت بھی نصیب ہوئی ہو۔

اچھا بتلایے آپ نماز کس طرف منھ کرکے پڑھتے ہیں؟ خانہ کعبہ کی طرف نا! تو جناب یہ خانہ کعبہ اسی مکّے میں تو ہے۔ یہ خانہ کعبہ اب سے ہزاروں سال پہلے خدا کے حکم سے حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنایا تھا۔ کہتے ہیں دنیا میں خدا کا یہ پہلا گھر تھا۔

یہ گھر۔ ان گڑھ پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ اس کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے ان مخلص بندوں (حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ) کی محنت قبول کی اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں کو اس گھر میں آنے کے لیے پکارو۔

اس وقت نہ ریڈیو تھا نہ وائرلیس لیکن اس آواز کا اثر دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گیا، اور لوگ سینکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر کرکے اس گھر کی زیارت کے لیے آنے لگے۔

ذالحجہ کی آٹھویں تاریخ سے ۱۳ تک حج کا سلسلہ رہتا ہے۔ ۷ ذالحجہ سے تیاری شروع ہوتی ہے۔ اس دن ظہر کے وقت امام حرم ایک خطبہ دیتا ہے۔ اس خطبے میں وہ حج کی فضیلتیں اور حج کے مسئلے بیان کرتا ہے۔ آٹھ تاریخ کو منیٰ جاتے ہیں۔ وہاں اس دن ظہر، عصر، مغرب اور نو کو صبح کی نماز پڑھتے ہیں اس کے بعد عرفات روانہ ہوتے ہیں۔ عرفات کا اجتماع اصل حج ہے۔

مدینہ منوّرہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا شہر ہے پہلے یہ یثرب کہلاتا تھا۔ ہمارے رسول مکّے کو چھوڑ کر وہاں آباد ہوگئے تو اسی یثرب کو مدینۃ النبی (نبی کا شہر) یا المدینہ کہنے لگے۔

لوگ حج کرنے جاتے ہیں۔ تو یہاں بھی آتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ آپ کے مزارِ مبارک کی زیارت کرتے ہیں۔ اور آپ کی خدمت میں درود و سلام پیش کرتے ہیں۔

اس سال مجھے بھی حج و زیارت کا شرف حاصل ہوا آپ کے اڈیٹر حسین حسان صاحب ندوی کا حکم ہے کہ اس سفر کی سرگزشت آپ کو بھی سناؤں وہ آپ کی طرح میرے بھی بزرگ ہیں۔ اس لیے اُن کے حکم کی تعمیل کرنی پڑ رہی ہے خدا کرے اس میں آپ کے لیے دلچسپی اور برکت کا سامان ہو۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ ایک دن ڈاک سے ایک خط ملا۔ لفافہ کھولا معلوم ہوا کہ سعودی حکومت کی طرف سے حج کا دعوت نامہ ہے۔ اس سے پہلے ایک بار حج کی سعادت حاصل کر چکا تھا مگر ہر مسلمان کے دل میں کعبہ شریف کو دیکھنے اور روضہ رسولؐ پر حاضری کی آرزو، ہر وقت رہتی ہے۔ اور کبھی اس

سے جی نہیں بھرتا اسی لیے خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سعودی سفارت خانے کو اپنی آمادگی کی اطلاع دے دی اور سفر کی تیاری شروع کردی۔ ٹیکے لگواتے ہیں، پاس پورٹ بنوانے میں اور سفر کے سلسلے میں دوسرے انتظامات میں ایک مہینہ لگ گیا۔ پھر اپنے چند ضروری کام بھی انجام دینے تھے۔ غرض ان سب سے فارغ ہو کر دہلی پہنچ گیا۔

دعوت نامہ میرے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادی اڈیٹر صدق اور ناظم دارالمصنفین مولانا سید شاہ معین الدین احمد ندوی کے نام بھی تھا۔ مولانا عبدالماجد اب اچھے خاصے بوڑھے ہوگئے ہیں۔ عمر اسّی سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ انھیں ایک رفیق ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو سفر میں ان کی خدمت اور دیکھ بھال کرسکتا ہو۔ امید تھی کہ کسی خادم کا انتظام ہوجائے گا مگر اس کا انتظار ہی رہا۔ اور جب سعودی حکومت کی طرف سے اس کی منظوری نہ آئی تو مجبوراً مولانا کو اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ ہاں شاہ معین الدین صاحب دہلی تشریف لے آئے۔ تاکہ سفر کے کاغذات جلد مکمل ہوجائیں۔

بہرحال ان تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو کر ہم لوگ ۱۷۔ دسمبر کو انڈین ایرلائنز کے جہاز سے بمبئی روانہ ہوئے۔ یہ عجیب زمانہ تھا۔ ایک طرف ریلوں میں اسٹرائک تھی۔ دوسری طرف ہوائی جہازوں پر بھی اسٹرائک کا کافی اثر تھا۔ دن بھر میں بس دو ایک جہاز آتے جاتے تھے۔

دہلی سے ہمارے جہاز کے روانہ ہونے کا وقت آٹھ بجے تھا۔ لیکن ہم ہوائے اڈے رپالم پہنچے تو جہاز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس دن کہر بھی بہت تھا۔ انکوائری آفس (دفتر معلومات) سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ فضا کی خرابی کی وجہ سے جہاز ابھی تک بمبئی سے روانہ نہیں ہوسکا ہے۔

کئی گھنٹے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جہاز دہلی آیا مگر کہر کی وجہ سے زمین دکھائی نہ دیتی تھی۔ کچھ دیر منڈلاتا رہا۔ پھر واپس چلا گیا۔ اس طرح کی خبریں کئی بار ملیں۔

ہم لوگ بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ ارادہ کر رہے تھے کہ آج کا سفر ملتوی کردیں اتنے میں خبر ملی کہ جہاز چار بجے کے قریب آجائے گا۔ صبح سے جو تجربہ ہو رہا تھا اس کی وجہ سے خبر پر اطمینان نہیں تھا۔ مگر تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ جہاز آگیا ہے۔ ہم لوگ جلد جلد کسٹم کی کارروائی کرا کے جہاز پر پہنچ گئے اور پونے دو گھنٹے میں بمبئی پہنچ گئے۔

یہاں ہم نے اپنے میزبان منشی عبدالعزیز صاحب مالک منشی ٹرانسپورٹ کمپنی کو اطلاع دے دی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے انھیں خبر نہ مل سکی شاہ معین الدین صاحب کو منشی صاحب کا پتہ معلوم تھا۔ ٹیکسی کرکے وہاں پہنچ گئے۔

منشی صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ بڑے ہی مہمان نواز ہیں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لوگ ان کے ہاں ٹھہرے رہتے ہیں۔ شاہ صاحب سے ان کے تعلقات بہت پرانے ہیں منشی صاحب کا وطن اعظم گڑھ ہے۔ علامہ شبلی کے خاندان سے تعلق ہے۔ دارالمصنفین کے رکن بھی ہیں۔ اس لیے شاہ صاحب سے اور بھی گہرے تعلقات ہیں۔

میں نیا آدمی تھا۔ لیکن منشی صاحب کی مہمان نواز طبیعت نے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ میرا ان کا پہلا سابقہ ہے۔ بلکہ ایسا لگتا تھا کہ سالہا سال سے تعلقات ہیں۔

سفر کے سلسلے میں چند ضروری کارروائیوں کی وجہ سے بمبئی میں چار روز ٹھہرنا پڑا۔ ۲۱۔ دسمبر کو سعودی ایرلائنز سے روانگی کا پروگرام تھا۔ یہ جہاز بمبئی سے کئی گھنٹے لیٹ چلا تھا۔ راستے میں کراچی۔ ظہران اور ریاض میں ٹھہرا اور تینوں جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرا اس لیے جدّہ پہنچنے میں اور بھی دیر ہوگئی۔

ظہران سعودی عرب کا پہلا ہوائی اسٹیشن ہے۔ یہاں کاغذات کی جانچ ہوتی ہے۔ اس میں اندازے سے زیادہ وقت لگا۔ حج کے لیے جانے والوں کو اپنے مُعَلِّم (گائڈ) کا نام بتانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھیں جلد چھٹی مل جاتی ہے۔ لیکن عام مسافروں کو زیادہ دیر لگتی ہے۔

ہم لوگ بھی حج ہی کرنے جا رہے تھے مگر ہمارا کوئی معلّم نہ تھا۔ اس لیے کہ ہم سعودی حکومت کے مہمان تھے اور ہماری دیکھ بھال اور رہنمائی کا کام سعودی حکومت کو کرنا تھا۔ ظہران کے ہوائی اڈے کے کارکنوں کو اس بات کے سمجھنے میں خاصی دشواری ہوئی کہ ہمارے کاغذات کون سا افسر پاس کرے گا کبھی ہم ایک میز پر بلائے جاتے کبھی دوسری میز پر آخر ایک افسر کی سمجھ میں ہماری حیثیت آگئی۔ ہمارے کاغذات اور سامان دیکھ کر جہاز پر جانے کی اجازت دے دی۔

ابھی ہم بتا چکے ہیں کہ ہمارا جہاز بمبئی سے لیٹ چلا تھا راستے میں اور لیٹ ہو گیا۔ جدّے میں ایک بجے رات کو پہنچنا تھا۔ اور پہنچا یہ صبح کو سات بجے ہم نے دہلی سے روانہ ہونے سے بہت پہلے اپنی روانگی کی تاریخ اور جہاز کی روانگی کی اطلاع کئی صاحبوں کو دے دی تھی۔ دہلی کے سعودی سفارت خانے نے بھی بتایا تھا کہ ہم نے حکومت کو اطلاع دے دی ہے۔

خیال تھا کہ سعودی حکومت کا کوئی آدمی ہمیں مل جائے گا ہمارے اپنے احباب بھی موجود ہوں گے۔ مگر سرکاری اطلاع وہاں پہنچی نہیں اور جہاز اتنا لیٹ پہنچا کہ ہمارے جاننے والے انتظار کر کے واپس چلے گئے اور پھر یا تو وہ سو گئے یا انھیں وقت کی صحیح اطلاع نہ ہو سکی۔ بہرحال ہمیں کوئی نظر نہ آیا۔ اور بڑی پریشانی محسوس ہوئی۔

ہم لوگ راستوں سے بھی پورے طور پر واقف نہ تھے اور ہمارے پاس سعودی سکّے بھی نہ تھے۔ بمبئی سے چلتے وقت آٹھ ڈالر زرِ مبادلہ ملا تھا۔ اسے کہاں بدلواتیں قلی کو کیا دیں۔ ٹیکسی کے لیے کیا کریں!

ہم لوگوں نے ہوائی اڈے کے افسروں سے اپنی مشکل بیان کی اور دعوت نامہ دکھایا۔ ہم لوگ اصل میں تو وزارتِ اعلام (انفارمیشن) کے مہمان تھے۔ اس وزارت کی طرف سے ہر سال حج کے زمانے میں دنیا کے بہت سے ملکوں کے مشہور اشخاص بلائے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ حج میں شرکت کریں اور سعودی حکومت کے حالات اور ترقیوں سے واقف ہوں۔ لیکن دہلی کے سعودی سفارت خانے نے وزارت اعلام (انفارمیشن) کا ذکر دعوت نامے میں نہیں کیا تھا۔ اس کی جگہ وزارتِ خارجہ کا نام لکھا تھا۔ اس لیے وزارت خارجہ کو لکھا گیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے۔ مگر وہاں سے بھی کچھ پتا نہ چلا۔

آخر کار یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہمیں اپنے ہندستانی سفارت خانے جانا چاہیے اور وہیں اس مشکل کو حل کرنا چاہیے۔ قلی کو ساتھ لے کر بنک گئے۔ وہاں ڈالروں کو ریال میں بدلوایا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہندوستانی سفارت خانے کا رُخ کیا۔

ہندوستانی سفارت خانہ ہوائی اڈے سے دو میل سے زیادہ نہیں ہے۔ مقررہ کرایہ دو ریال ہے۔ مگر ہماری ناواقفیت کی وجہ سے ٹیکسی والے نے دس ریال وصول کیے۔ بہرحال جیسے تیسے ہم ہندوستانی سفارت خانے پہنچ گئے۔

یہاں ہمارے جامعہ نگر کے ایک دوست ندیم صاحب حج افسر ہیں۔ ان کے پاس پہنچ کر ہم نے اپنی پریشانی کی روداد سنائی۔ انھوں نے اطمینان دلایا اور کہا کہ تھوڑی دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اپنے بارے میں بتایا کہ "میں رات کو ہوائی اڈے

گیا تھا۔ لیکن جہاز کے آنے میں کئی گھنٹے کی دیر تھی۔ اس لیے واپس چلا آیا پھر صبح کو وقت پر نہ اٹھ سکا اور آپ کے آنے کے وقت ہوائی اڈے پر نہ پہنچ سکا۔ اب آپ میرے گھر چل کر منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیجیے۔ اور کچھ دیر آرام کیجیے۔ اتنے میں سعودی حکومت کے دفتر سے گفتگو کر کے تمام ضروری باتیں معلوم کر لوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ فرسٹ سکریٹری سے کچھ دیر کے لیے اجازت مانگنے گئے۔ اتفاق سے فرسٹ سکریٹری خالد علیم صدیقی نکلے۔ یہ میرے استاد مولانا عبدالحلیم صدیقی کے صاحبزادے ہیں۔ ندوے میں کئی سال میری نگرانی میں رہے تھے اور تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے میرا نام سنا تو اپنے دفتر سے نکل کر میرے پاس آئے۔ اپنے سفیر سے ملایا۔ اپنے گھر لے جا کر ناشتہ کرایا اور ہمارے کاغذات لے کر ہمارے میزبان کو ہماری آمد کی اطلاع دینے گئے۔ ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔

سہ پہر کو وزارتِ اعلام (انفارمیشن) کے نمائندے آئے۔ ہوائی اڈے نہ پہنچنے کی معذرت کرتے رہے۔ کہتے تھے۔ ہمیں صحیح اطلاع نہ مل سکی تھی۔ بہر حال خالد صاحب کے گھر سے لے جا کر وزارت کے مہمان کے طور پر جدّے کے مشہور ہوٹل "الکینڈرا" میں ٹھہرایا۔ بہت شاندار ہوٹل ہے اور ہر طرح کا آرام ہے۔ رات کو وہیں قیام رہا۔

وہیں سے ٹیلیفون سے مولانا ابوالحسن علی اور ڈاکٹر عبداللہ عباس کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ ڈاکٹر عبداللہ بھی ندوی ہیں میری اتالیقی اور شاگردی میں کئی سال رہ چکے ہیں۔ اور اب کئی برس سے رابطۂ عالم اسلامی میں کسی اہم عہدے پر کام کر رہے ہیں۔

مکّہ معظمہ کا فاصلہ جدّے سے تقریباً ۴۵ میل ہے۔ وہاں کی تیز رفتار گاڑیاں ایک گھنٹے سے کم ہی میں یہ فاصلے طے کر لیتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبداللہ عباس اطلاع ملنے کے تھوڑی دیر بعد ہوٹل پہنچ گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم ندوے میں ہیں۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ واپس بھی چلے گئے۔

صبح کے ناشتے کے بعد ہم لوگوں نے غسل کیا۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ احرام باندھا۔ اتنے میں وزارت اعلام (انفارمیشن) کے نمائندے آ گئے اور ہم لوگ ان کے ساتھ مکّہ معظمہ روانہ ہو گئے۔

حج کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ "ایک تو یہ کہ احرام باندھتے وقت حج اور عمرہ دونوں کی نیت کی جائے۔ اسے 'قِران' کہتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں حج کر چکنے کے بعد احرام اتارا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ احرام کی حالت میں بہت سی پابندیاں ہوتی ہیں۔ ان پابندیوں کو نبھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اس لیے آسان صورت یہ ہوتی ہے کہ 'عمرہ' کی نیت سے احرام باندھا جائے۔ پھر مکّہ معظمہ جا کر اور "عمرہ" سے فارغ ہو کر احرام کھول دیا جائے۔ پھر جب حج کا وقت آئے تو مکّہ معظمہ کے باشندوں کی طرح حج کا احرام باندھا جائے اس طرح آسانی ہو جاتی ہے۔ اسے تمتّع کہتے ہیں۔

(باقی اگلے پرچے میں)

★ مصیبت پڑنے پر ہرگز موت کی تمنّا نہ کرو۔ (ح)
★ نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو (ق)
★ لوگوں کے ساتھ بے رحمی سے پیش نہ آؤ۔

(بشیر الدین شیرکوٹی)

جناب فرحت قمر

# آرام کرو

کیا رکھا ہاتھ ہلانے میں کیوں پیر کو زحمت دیتے ہو
اس سردی کے موسم میں بھی کیوں روز سویرے اٹھتے ہو
ہے گندا لیکن اپنا ہے، کیوں رگڑ رگڑ منہ دھوتے ہو
جو کل بھی ہو سکتا ہے وہ اب کرنے کا نام نہ لو
آرام بڑی اک نعمت ہے آرام کرو، آرام کرو

پڑھنے سے آنکھیں دکھتی ہیں سر میں بھاری پن ہوتا ہے
ورزش سے جسم اکڑتا ہے، بیکار دکھی من ہوتا ہے
"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا"، کیوں مفت میں بچپن کھوتا ہے
دن لوٹ کے کب یہ آتے ہیں کھا، کھیل، سویرے دس تک سو
آرام بڑی اک نعمت ہے آرام کرو، آرام کرو

رکھو بالوں کو سوکھا ہی، سر میں خشکی بڑھ جائے گی
سر میں خشکی بڑھ جائے گی تو عقل میں پستی آئے گی
نہ پڑھنے کی زحمت ہوگی نہ کوئی مصیبت آئے گی
کانوں میں ٹھونس رکھو روئی مت ٹیچر کی اک بات سنو
آرام بڑی اک نعمت ہے، آرام کرو، آرام کرو

گر بات ہماری مانوگے تو بس جاہل رہ جاؤ گے
نہ نام ہی کچھ کر پاؤ گے نہ کام کچھ ہی کر پاؤ گے
اس دنیا میں یوں ہی رہ کر، اک روز یونہی مر جاؤ گے
گر بدھو بن کر رہنا ہے۔ آرام کرو، آرام کرو
ورنہ تو حقیقت اتنی ہے کچھ کام کرو، کچھ کام کرو

جناب جمیل احمد قریشی

# امسٹرڈم
## ہالینڈ کا ایک مشہور شہر

اپنے دیس کی ہاکی کی ٹیم تو آپ جانیں پوری دنیا میں مشہور ہے۔ پچھلے دنوں ہاکی کے بین الاقوامی مقابلے اسی مشہور شہر "امسٹرڈم" (AMSTER DAM) تو ہوئے تھے اور ہماری ہاکی کی تعلیم کرنے شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔

امیسٹیل ایک دریا کا نام ہے۔ ڈیم پُل کو کہتے ہیں تاریخ داں ابھی تک اسی شش و پنج میں ہیں کہ پہلے پُل بنایا پہلے گاؤں بسا؟ بہرحال اس دریا کے کنارے کچھ مچھیرے تو ضرور رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۲۷۵ سے اس جگہ کا نام امسٹرڈم پڑا۔ یہ ہالینڈ کے دوسرے شہروں مثلاً لائڈن، ڈورڈ یجنت اور مسترفت وغیرہ سے عمر میں کم ہے۔ اس کو شہر ہونے کے اختیارات ۱۳۰۰ء میں ملے۔ اس شہر کو نپولین نے ۱۸۰۶ء میں اپنا دارالخلافہ بھی بنایا تھا۔

بچوں کو تو کتابوں میں یہی پڑھایا جاتا ہے کہ امسٹرڈم ہالینڈ کا دارالسلطنت ہے۔ لیکن دراصل یہ فرائض "دی ہیگ" انجام دیتا ہے۔ پارلیمنٹ دی ہیگ میں ہے اور دوسرے ملکوں کے سفیر اور حکومت کے دفتر بھی دی ہیگ ہی میں ہیں۔

کئی صدیوں تک امسٹرڈم یہودیوں کا ڈچ یروشلم بھی رہا ہے۔ یورپ سے یہودی مہاجر آ آکر اسی شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ یہاں تجارت میں اور تعلیمی سرگرمیوں میں ان لوگوں نے خوب حصّہ لیا۔

امسٹرڈم، نہروں اور جزیروں کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں تقریباً ایک سو نہریں۔ نوے جزیرے اور تقریباً ۴۲۵ پل ہیں۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی سڑک پار کیجیے تو نہر موجود اس کے پل سے گزرئیے تو دوسری سڑک، اور پھر نہر۔ غرض پورے شہر میں اسی طرح سڑکوں اور نہروں کا جال ہے۔ نہروں کے دونوں طرف پرانے مکانات ہیں۔ یہ کئی کئی منزل کے ہیں۔

تقریباً چار ہزار ایسے مکان اب بھی اس شہر میں موجود ہیں جو سترھویں صدی کے بنے ہوئے ہیں۔

شاہی محل بہت مشہور عمارت ہے۔ اس محل کے سامنے ایک مشہور جگہ ہے اسے "ڈیم اسکوائر" کہتے ہیں۔ ویسے تو یہ ملک کی خاطر جان دینے والے سپاہیوں کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ یہ سفید پتھر کا ایک مینار جیسا ہے۔ اور دور تک پتلی پتلی سیڑھیاں ہیں۔ پر اب یہ جگہ ہپیّوں کے لیے مشہور ہو گئی ہے۔ دنیا بھر کے ہپّی ہم نے یہاں لیٹے اور بیٹھے دیکھے۔

دنیا بھر سے لوگ اس شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ یہ شہر سائیکلوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ یورپ سب سے زیادہ سائیکلیں اسی شہر میں استعمال ہوتی ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس چھوٹے سے شہر میں کئی لاکھ سائیکلیں ہیں۔

ویسے تو ہم نے ایک گھنٹے میں یہ پورا شہر دیکھ لیا تھا اسٹیشن سے نکلتے ہی سامنے والی نہر کی کشتی میں بیٹھ گئے۔ چار روپے دیئے اور پورے شہر کا چکر لگا لیا۔ نہر کے دونوں طرف صاف ستھرے کئی منزلہ مکان، سڑکوں کے کنارے کاروں کی کھڑی ہوئی قطاریں ان کاروں میں نہر میں کم از کم دو تین تو روز گرتی ہیں اور فوراً ہی نکال بھی لی جاتی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں ہماری (لوٹ) کشتی جو انجن سے چل رہی تھی ایک پل کے نیچے سے گزرتی تھی۔ کہیں کہیں پانی میں کھڑی ہوئی کشتیاں ہیں۔ ان کشتیوں میں مکانات ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو کشتیاں ایسی دیکھیں جن میں سینکڑوں لوگ بسے ہوئے تھے۔

کبھی ایک کشتی عجیب دیکھی۔ یہ بلیوں کی کشتی تھی۔ اس میں ایک سو سے زائد بلیاں رہتی ہیں۔ باقاعدہ ان کے گھر بنے ہوئے ہیں۔ بلیاں آرام سے ان میں رہتی ہیں۔ ان کے کھانے وغیرہ کا خاص انتظام ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بلیوں اور کتوں سے بھی بہت محبت کرتے ہیں۔

سڑکوں پر ٹھیلوں میں گانے کا یورپ کا پرانا رواج ہے اب صرف ہالینڈ میں باقی رہ گیا ہے جو خاص طور سے ہم نے اسٹرڈم میں دیکھا۔ ٹھیلا چلانے والے کو لوگ پیسے بھی دیتے جاتے ہیں اور گانا سن کر خوش ہوتے ہیں۔

ایمسٹرڈم میں کتنے ہی اچھے میوزیم اور [illegible] بھی رہی ہیں۔ دنیا کے مشہور آرٹسٹ ریمبراں کا مکان بھی اسی شہر میں ہے جو میوزیم بنا دیا گیا ہے۔

ریمبراں نام کا ایک چوک ہے۔ اس کا آس پاس [illegible] بڑے اور بچوں کے لیے [illegible]۔ پھولوں کی دکانیں ہر کونے پر موجود ہیں۔ سڑکیں بھی ہموار ہیں۔ صاف سڑکیں اور صاف ستھرے لوگ۔ نہروں کے پانی کو بھی برابر صاف کرتے رہتے ہیں۔ یہ شہر سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے۔

★

ل.م. شاہد

# ناقابلِ یقین ---- مگر سچ

★ ایک انوکھی بلی ماں کی طرح ایک چوہے کو اپنا دودھ پلا کر پالتی تھی۔ یہ بلی ۱۹۱۲ء میں انگلینڈ کے فرنسیس پیٹ نامی ایک شخص کے پاس تھی۔

★ ۱۸۹۹ء کی تیس جون کی صبح کو۔ نیویارک میں ریل انجن اور سائیکل کی دوڑ ہوئی۔ سائیکل سوار پولیس کا ایک سپاہی چارلس۔ ایم۔ مرفی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا کی کسی بھی ریل انجن کی رفتار کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور اس نے سچ مچ یہ کر دکھایا۔ مرفی نے ایک میل کا فاصلہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں طے کیا۔

★ میکسیکو کے گو یال واکن آگ میں نہاتے ہیں اور آگ پر دوڑتے ہیں۔ وہ اپنے جسم پر گیسولین مل کر آگ لگاتے ہیں۔

★ مصر کا ایوبی ۴۸۰ فٹ اونچے پرامڈ پر ۵ منٹ میں چڑھ جاتا ہے اور اتر بھی جاتا ہے۔ ایوبی کا یہ کمال یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو نے بھی دیکھا تھا اور خوش ہو کر اسے سونے کا سگریٹ کیس انعام میں دیا تھا۔

---

★ بد زبانی نفاق ہے۔ (ترمذی)

★ خدا کی رحمت سے گمراہ لوگ ہی ناامید ہوتے ہیں۔ (ح)

★ اللہ کے معاملے میں کسی کے برا بھلا کہنے کی پرواہ نہ کرو۔ (ح)

★ اس میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں۔

(بشیر الدین شیرکوٹی)

مبشر احمد عرسی

# طلسمی گھڑا

## (چینی لوک کہانی)

کسی جگہ ہک ٹک نامی اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا.... بے چارا بڑا غریب تھا لیکن تھا بہت محنتی کبھی کام سے جی نہ چراتا ــــ پہاڑی گاؤں کے علاقے میں ایک چھوٹے سے مکان میں دونوں میاں بیوی رہا کرتے تھے۔ گھر کے ساتھ لگی ہوئی تھوڑی سی زمین بھی تھی اس پر ہک ٹک ترکاریاں وغیرہ اُگاتا تھا۔ بے چارے کی گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔

ایک دن کیا ہوا ــ ہک ٹک اپنے کھیت میں کھدائی کر رہا تھا ــــ اچانک کھیت میں ایک بڑا سا تانبے کا گھڑا ہاتھ لگا ــــ لیکن اس گھڑے کے ملنے سے اُسے کچھ خوشی نہیں ہوئی ــــ گھڑا خالی تھا۔ پھر بھی اُس نے سوچا کہ خالی گھڑا بھی گھر میں کچھ نہ کچھ کام تو آ ہی جائے گا ــــ وہ اس بڑے اور وزنی گھڑے کو اُٹھانے کے لیے جھکا اور جھکتے ہی اس کی جیب میں رکھا ہوا بٹوہ نیچے زمین پر گر پڑا ــــ اس نے سوچا بٹوہ کے لیے گھڑے سے بہتر جگہ اور کیا ہو سکتی ہے اس نے بٹوے کو گھڑے میں چھوڑ ــــ گھڑے کو پیٹھ پر لادے گھر کی طرف چل پڑا

"یہ تم اپنی پیٹھ پر کیا اٹھائے لا رہے ہو۔" ہک ٹک کی بیوی نے سوال کیا۔

"یہ تانبے کا گھڑا ہے ــ مجھے ترکاری کے باغ میں ملا ہے" ہک ٹک نے جواب دیا۔ "میں نے سوچا گھر میں پڑا رہے گا کچھ نہ کچھ کام آئے گا.... ویسے پکانے کے لیے یہ بہت بڑا ہوگا اور نہانے کے لیے بہت چھوٹا ــ میں نے اس سے ایک کام تو لیا بھی ہے۔ وہ میرا بٹوہ سنبھالتا ــ آج میں اسی گھڑے میں رکھ کر لایا ہوں۔"

اس کی بیوی اُٹھ کھڑی ہوئی اور گھڑے کے اندر جھانکنا چاہا اس کے بالوں کا ایک کانٹا گھڑے میں گر پڑا اس نے جوں ہی اپنا کانٹا گھڑے سے نکالنا چاہا ــــ اس کی ایک چیخ نکل گئی۔

"یہ کیا" وہ چلائی "یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے اپنا کانٹا اور تمھارا بٹوہ نکالنے کے لیے اس گھڑے میں اپنا ہاتھ ڈالا تھا۔ لیکن ـــ یہ کیا ــــ دیکھو۔ میرے ہاتھ میں دو کانٹے اور دو بٹوے ہیں ــ نکال لائی ہوں"

"ارے ــــ یہ کیا ــــ بٹوا تو کھولو ــــ دونوں بٹوے ــ" ہک ٹک نے حیران ہو کر کہا۔ "دونوں میں سے ضرور ایک خالی ہوگا ــــ" لیکن ایسا نہیں تھا۔ دونوں بٹوؤں میں برابر برابر رقم رکھی تھی۔

"واہ بھئی واہ ۔ اب پہلے سے دُگنی رقم کے مالک ہوگئے"
ہک ٹک کی بیوی چلا پڑی ۔" ۔۔۔۔۔۔ مجھے بجائے ایک
کے دو بالوں کے کانٹے مل گئے ۔"

دونوں کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا ۔ کئی گھنٹے دونوں نے
مختلف چیزوں کو گھڑے میں ڈالنے اور دُگنے حاصل
کرنے میں گزار دیا ہک ٹک اپنا سردی کا کوٹ اٹھا لایا اور
گھڑے میں ٹھونس دیا ــــ اگلے ہی لمحے ہک ٹک کے
ہاتھ میں دو سردی کے کوٹ دکھے تھے ــ اس کی بیوی
اندر سے کمبل اٹھا لائی ۔ اُن کے ہاں اب تک صرف ایک کمبل
تھا ۔ سردیوں میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی ۔ ایک
ہی لمحے میں جادوئی گھڑے نے ایک کمبل کے دو کردیے ۔
تب اچانک ہک ٹک کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ۔

" نیک بخت" ، اس نے اپنی بیوی سے کہا " کیوں نہ
ہم اس بٹوے کو بار بار گھڑے میں ڈالتے جائیں ۔ اگر
ہمیں ہر بار دو بٹوے ملتے جائیں تو کل تک ہم بہت بڑی
رقم بنا سکیں گے ۔ کیوں ہے نا اچھی ترکیب "

" خوب ، کیا ترکیب سوچی ہے ۔" اس کی بیوی
نے خوشی سے نعرہ لگایا پھر اس نے ایک بٹوہ گھڑے
میں ڈال دیا

اور پل بھر میں دو بٹوے باہر نکالے ۔ نئی رقم
کو اس نے ایک ہی بٹوے میں جمع کیا پھر دوبارہ بٹوا گھڑے
میں ڈالا اور دُگنی رقم باہر کھینچی ــ کئی گھنٹے یہ شغل جاری
رہا ۔ ہوتے ہوتے ان کے پاس ان کی تمام ضرورتوں کے لیے
رقم جمع ہوگئی ۔

" واہ بھئی واہ ــ اب تو ہم کافی مالدار ہوگئے ــ
رات بہت ہوگئی ہے اب ہمیں سوجانا چاہیے ــ کل
بھی تو صبح ہوگی ــ کل بھی ہم اپنی دولت کو اور زیادہ
بڑھا سکتے ہیں ۔" ہک ٹک نے کہا ۔

اگلی صبح وہ بہت جلد بیدار ہوگئے ۔ ہک ٹک جلدی
جلدی گھڑے سے حاصل کی ہوئی رقم کو تھیلی میں ڈال ،
اپنی بیوی کو خدا حافظ کہہ کر ، سامان خریدنے شہر کی جانب
نکل پڑا ۔ آج اس نے اتنا زیادہ سامان خریدا کہ تیس سال
میں بھی نہ خریدا ہوگا ۔

دوپہر کے وقت ہک ٹک گھر واپس ہوگیا اور خوشی
سے اپنی بیوی کو بلانے لگا کہ دیکھو آج میں کیا کیا چیزیں
خرید لایا ہوں ۔

اُس کی بیوی جو گھڑے سے دُگنے بنانے میں مصروف
تھی اپنے شوہر کی آواز سنی تو اس کے استقبال کے لیے
مڑی ــ اسی لمحے ایک انہونی چیز ہوگئی ۔ وہ اپنا
توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دھڑام سے سیدھی گھڑے
میں آ رہی ۔ ہک ٹک نے جب یہ دیکھا تو جلدی سے
اپنی بیوی کو گھڑے سے نکالنے کے لیے کمرے میں دوڑا ۔
وہ ابھی اپنی بیوی کو سلامت باہر نکال رہا تھا کہ اس نے
دیکھا گھڑے میں ایک اور عورت ہاتھ پاؤں مار رہی ہے ۔
اس نے جلدی سے دوسری عورت کو بھی باہر نکال لیا ۔
یہ دیکھ کر تعجب کی انتہا نہ رہی کہ وہ عورت بالکل اس
کی بیوی کی ہم شکل تھی ۔ ہو بہو ۔"

جیسے ہی ہک ٹک کی بیوی نے اس نئی عورت
کو دیکھا اس نے غصّے سے چنگھاڑتے ہوئے کہا ۔
" میں کبھی اس گھر میں اپنی سوکن کو برداشت نہیں کرسکتی ۔
ڈال دو اس عورت کو واپس گھڑے میں ۔"

" کیا کہا ــ ہیں ــ ایک اور تیسری نکل
آئے گی ــ " ، ہک ٹک نے کہا " میرے لیے
دونوں بیویاں ہی بہت ہیں تینوں کس لیے ۔ "

یہ کہتے ہوئے ہک ٹنک ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا پھر اچانک اس کے قدم ڈگمگائے وہ بھی دھڑام سے گھڑے میں گر پڑا۔

دونوں بیویاں یہ دیکھ کر بھاگ آئیں اور ابھی ہک ٹنک کو نکالا ہی تھا کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک دوسرے ہک ٹنک صاحب بھی گھڑے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ جلدی سے انھوں نے اس کو بھی نکال لیا۔ جو بالکل ہک ٹنک کا ہم شکل تھا۔

"یہ کیا ہوگیا ——؟" پرانا ہک ٹنک غصہ سے کانپنے لگا۔ دراصل وہ اپنی بیوی کے سوا کسی اور کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

اچانک ہک ٹنک کی پرانی بیوی کے ذہن میں ایک روشن خیال آیا "میری سنو" اس نے کہا "یہ تو بڑا اچھا ہوا —— جہاں وہ شخص تمھارا ہمشکل ہے —— وہیں یہ عورت بھی میری ہمشکل ہے —— اس طرح ہم دونوں بالکل پہلے کی طرح رہ سکیں گے اور یہ دونوں ہمارے گھر سے لگا دوسرا گھر بنالیں گے —— رہے گا نا ٹھیک!"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا" پرانے ہک ٹنک نے کہا "اس سے کچھ فرق نہ پڑے گا۔"

پھر پرانے ہک ٹنک اور اس کی بیوی نے گھڑے سے حاصل کی ہوئی دولت سے ایک شاندار گھر بنا لیا اور اس سے لگا ہوا دوسرا ایسا ہی مکان اس نئے جوڑے کے لیے بھی بنوا دیا۔ وہ جو کچھ بھی لاتے اس کو گھڑے میں ڈال دیتے۔ اس طرح ان کے پاس ویسی ہی دوسری چیز اس نئے جوڑے کو دینے کے لیے ہوتی۔

تمام پڑوسی ہک ٹنک کی اس نئی دولت پر حیران تھے اور جب انھوں نے اس نئے جوڑے کو دیکھا جو ہک ٹنک اور اس کی بیوی کے ہمشکل تھا تو ان کی حیرانی بڑھ گئی —— وہ یہ سمجھنے لگے کہ شاید اس نئے جوڑے کا ہک ٹنک سے گہرا رشتہ ہوگا —— لیکن انھیں یہ کیا معلوم تھا کہ یہ سب "طلسمی گھڑے" کے کمالات ہیں۔

---

## بقیہ: بچوں سے باتیں صفحہ ۲ سے

کے مشہور اسپتال ہولی فیملی میں علاج کے لئے گئے، ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا۔ اور اسپتال میں داخل کرلیا یہاں خلاف معمول دل کے دورے پڑنے لگے اور آخر اس بیماری دل نے کام تمام کیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو صبر کی توفیق عطا ہو (آمین) جامعہ میں ان کے غم میں پورے دن کی چھٹی کردی گئی۔

---

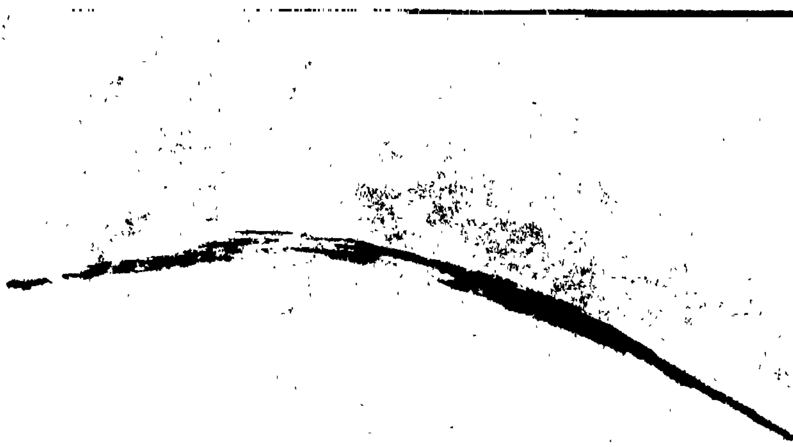
دوسرے مرحوم غفار میاں تھے بہت ہنس مکھ، مرنجان مرنج، خوش اخلاق، مدرسہ ابتدائی میں چپراسی تھے اور اپنا کام بہت مستعدی سے انجام دیتے تھے۔ بیس پچیس سال سے جامعہ میں تھے۔ اور مرحوم سلیم میاں کی طرح جامعہ کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کی موت بھی ایک حادثہ ہے۔ بھوگل اور آشرم سے ملا ہوا جو ریلوے پل ہے۔ اس کے نیچے انکی لاش پائی گئی۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا صورت پیش آئی۔ جامعہ والوں میں جس نے یہ خبر سنی بہت افسوس، دلی قلق کا اظہار کیا۔ جامعہ نے انکا بھی سوگ منایا۔ ایک دن کی چھٹی کردی۔ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور انکے عزیزوں کو صبر کی توفیق دے۔

---

# دُم دار ستارہ کوہاؤٹک

جناب محمد امین ایم اے

(KOHOUTEK)



ڈاکٹر لیوباس کوہاؤٹک جرمنی کے ایک زبردست سائنس داں ہیں علم نجوم کے ماہر ہیں، آسمان، ستاروں اور سیاروں کا مشاہدہ کرنا ان کا خاص مشغلہ ہے۔ ان کی تجربہ گاہ جرمنی کے مشہور شہر اور بندرگاہ ہمبرگ میں ہے۔

انھوں نے ۷۔ مارچ ۱۹۷۳ء کو ایک بالکل نیا دُم دار ستارہ دریافت کیا۔ اُس وقت سورج سے اس کا فاصلہ ساٹھ کروڑ کلومیٹر سے بھی زیادہ تھا۔ دوربین سے دیکھنے کے باوجود یہ نیا دم دار ستارہ ایک دھندلا سا نشان، وہ بھی بہت معمولی سا نظر آتا تھا۔

یوں سمجھو کہ آسمان میں ایک دھندلے سے دھندلا ستارہ جو بغیر دوربین کی مدد کے ہم دیکھتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ نیا دم دار ستارہ دس ہزار گنے سے بھی زیادہ کم دھندلا تھا۔ اس کے باوجود جب یہ دم دار ستارہ ظاہر ہوا تو اس نے ساری دنیا میں دھوم مچادی۔

تو اب سمجھ گئے تم کہ کوہاؤٹک نام کے دُم دار ستارے کا نام ڈاکٹر لیوباس کوہاؤٹک کے نام پر پڑا ہے۔ جنھوں نے اسے دریافت کیا تھا۔

دُم دار ستارہ ظاہر ہوتا کوئی عجیب قدرتی منظر نہیں۔ قریب قریب ہر سال کئی نئے نئے دم دار ستارے ظاہر ہوتے ہیں لیکن نیا دم دار ستارہ جو ڈاکٹر لیوباس کوہاؤٹک نے دریافت کیا تھا وہ اس لیے دلچسپ اور اہم ثابت ہوا کہ آسمان میں جس راستے سے یہ گزرنے والا تھا وہ بڑا عجیب وغریب تھا۔

رفتہ رفتہ یہ حرکت کرتا ہوا سورج کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اور ۱۹۷۳ء کے آخر تک سورج کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ اس طرح یہ بہت معمولی سے دھندلے

نشان سے بڑھ کر آسمان میں حیرت انگیز حد تک چمکیلا بن
گیا تھا اور کمال کی بات یہ ہے کہ پہلے کے دم دار ستارہ کی
چمک کی جو شہرت رہی ہے اس بھی یہ بڑھ گیا تھا۔ اور
کئی دن تک مسلسل سورج غروب ہونے کے بعد ہر روز شام
کو دکھائی دیتا تھا۔ پہلے کا ستارہ ۱۹۱۰ء میں ظاہر
ہوا تھا۔

یہ کوہاؤٹک نام کا دم دار ستارہ جس دن سے ظاہر ہوا
تھا اسی دن سے رفتہ رفتہ اس کی چمک بڑھنے لگی تھی۔
۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کو یہ اپنی آخری منزل یعنی عروج پر
پہنچ گیا تھا اس وقت چمک دمک میں اس کا کوئی جواب نہیں
تھا۔

اس دن کے بعد سے یہ چکر لگا کر سورج کے دوسری
طرف حرکت کرتا ہوا جانے لگا تھا اور پھر رفتہ رفتہ سورج
سے دور ہٹنے لگا تھا۔ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد
ہر روز شام کو یہ دکھائی دیتا تھا۔ ممکن ہے کہ تم میں سے
بہتوں نے اس عجیب و غریب دم دار ستارے کا مشاہدہ
بھی کیا ہو۔ اگرچہ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کے بعد سے اس کی
چمک درجہ بدرجہ کم ہونا شروع ہو گئی تھی۔

شروع جنوری (۱۹۷۴ء) کے چند دنوں میں
نہایت اطمینان سے یہ دکھائی دیتا تھا۔ یوں سمجھو کہ زہرہ
نام کا جو سیارہ ہے اسی کی طرح یہ بھی صاف اور چمکیلا
دکھائی دیتا تھا۔ مگر زہرہ سے یہ بالکل مختلف تھا یعنی
یہ کہ اس کی دم بھی تھی اور بہت چمکیلی۔ یہ کوئی ایسی معمولی
قسم کی دم نہیں تھی۔ آسمان کا جتنا حصہ عموماً ہمیں دکھائی
دیتا ہے اس کے ۱/۱ ویں حصے پر اپنی پوری آب و تاب کے
ساتھ چھائی ہوئی تھی۔ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں
نے اس کا مشاہدہ کیا اور اس قدر چمکیلے دم دار ستارے کو
دیکھ دیکھ کر لطف اٹھاتے رہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے
لوگ دہشت زدہ بھی ہوئے ہوں۔ اپنے بارے میں تمھارا
کیا خیال ہے؟ دم دار ستارے کو تم نے بھی دیکھا
تھا نا؟ ڈرے تو نہیں تھے؟

ویسے سائنس داں بھی کچھ کم خوش قسمت نہیں
تھے۔ انھوں نے ایسا غیر معمولی دم دار ستارہ دیکھ کر
اس کی تحقیق اور جستجو کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں
دیا۔ وہ فطرت اور اس کے ارتقا کا راز معلوم کرنے
میں مصروف ہو گئے۔

اور یہ جستجو کسی ایک ملک کے سائنس دانوں پر
موقوف نہیں تھی ساری دنیا کے علم نجوم کے ماہروں
نے مل کر ایک متفقہ پروگرام بنایا تھا اور دم دار
ستارے کو اچھی طرح دیکھنے بھالنے فوٹو اتارنے
اور اس کی رگ رگ سے واقفیت حاصل کرنے کے
لیے منظم اور باضابطہ کوشش کی تھی۔

زمین سے دنیا بھر کی مختلف قسم اور سائز کی
دوربینوں سے مشاہدہ کرنے کے علاوہ خلائی جہاز سے
بھی مشاہدے کیے گئے بلکہ اسکائی لیب کو بھی اس
کام کے لیے استعمال کیا گیا۔ ہمارے ملک ہندوستان
میں بھی بیشتر اسٹیشنوں یعنی تجربہ گاہوں سے دم دار
ستارے کو دیکھا گیا اور اس کا جائزہ لینے کی پوری پوری
کوشش کی گئی۔

دم دار ستارے موجودہ دنیا کی دریافت نہیں ہیں
ان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ایک
زمانے سے یہ ظاہر ہوتے رہے ہیں اور ان کا ریکارڈ
دو ہزار سال سے زیادہ دنوں سے ملتا ہے۔ سائنس داں
اور ستاروں کے علم کے ماہرین برابر ان کا بھید معلوم

کرنے کے متلاشی رہے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا کارنامہ ایک انگریزی سائنس داں اڈمنڈ ہیلے کا ہے۔ اس نے اٹھارہویں صدی میں یہ ثابت کردیا تھا کہ دم دار ستارے کائنات میں یا آسمان میں کہیں باہر کی دنیا سے آکر شامل نہیں ہوتے بلکہ یہ تو سورج اور اس کے خاندان کے ممبر ہیں یعنی ہمارے نظامِ شمسی کے افراد ہیں۔ البتہ سیّارے اور دم دار ستارے میں ایک بنیادی فرق ہے۔ سیارے سورج کے چاروں طرف کم و بیش ایک دائرے کی شکل میں گردش کرتے ہیں دم دار ستارے ایک لمبے راستے پر چکر لگاتے ہیں۔

تم نے نیوٹن کا نام سُنا ہوگا۔ بہت بڑا سائنس داں تھا۔ اس نے سب سے پہلے ثابت کر دکھایا تھا کہ زمین اپنے اندر کشش رکھتی ہے۔ اسی قوّتِ کشش کے قانون کی مدد سے ہیلے نے ۱۶۸۲ء میں ایک چمکدار دم دار ستارے کی گردش کا راستہ معلوم کیا تھا حساب کتاب لگا کر اس نے یہ بھی پیشین گوئی کردی تھی کہ یہ دم دار ستارہ پھر ۱۷۵۸ء میں ظاہر ہوگا اس کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اگرچہ اس وقت ہیلے زندہ نہیں تھا ورنہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی پیشین گوئی سچ ہوتے دیکھ لیتا۔ اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس دم دار ستارہ کا نام ہیلے کے نام پر رکھ دیا گیا تھا یعنی ہیلے کا دم دار ستارہ۔

ہیلے نام کا دم دار ستارہ ۷۶ سال کے بعد ظاہر ہوتا ہے یعنی ہر ۷۶ سال میں یہ سورج کے چاروں طرف اپنا ایک مکمل گردش کا راستہ طے کرتا رہتا ہے۔ ستاروں، سیّاروں اور دم دار ستاروں کے جہاں تک ریکارڈ کا تعلق ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہیلے کا دم دار ستارہ پچھلے دو ہزار سالوں سے وقتاً فوقتاً دیکھا جاتا رہا ہے اور جب بھی یہ آسمان میں ظاہر ہوا ہے لوگ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے ہیں اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی چمک اور تابانی دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں بڑا خوف دہراس بھی پیدا ہوتا رہا ہے۔ پیشین گوئی ہے کہ یہ پھر ۱۹۸۶ء میں ظاہر ہوگا۔

دم دار ستاروں کی خصوصیات الگ الگ ہوتی ہیں مثلاً بعض نسبتاً جلدی جلدی ظاہر ہوتے ہیں یعنی ۳ سال سے ۲۰۰ سال کے درمیان۔ ہیلے کا دم دار ستارہ ایسے ہی تنلو دم دار ستاروں میں سے ایک ہے۔

دوسری قسم کے دم دار ستارے ہزاروں بلکہ کروڑوں سالوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جو دم دار ستارے ہمیں زمین سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت ایسے ہی دم دار ستاروں کی ہے جو بڑی لمبی مدّت میں ظاہر ہوتے ہیں —— دم دار ستارے کوہاؤٹک کی گردش کی مدّت ... ۷۵ سال ہے۔ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۳ء کو جب یہ قریب ترین فاصلہ پر تھا تو اس کا راستہ عطارد کی گردش کے راستے کے اندر تھا۔ تم جانتے ہوگے کہ عطارد قریب ترین سیّارہ ہے۔ کوہاؤٹک سورج کے پاس سے ... ر ... ۴ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم کر بھاگ رہا تھا۔

دم دار ستارے کا ظاہر ہونا، چمکنا، چھوٹے سے ننھے ستارے کی طرح جگ مگانا اور پھر سائز میں بڑا ہونا، ان سب کا دارو مدار سورج سے فاصلے پر ہے۔ جب سورج سے یہ بہت دور رہتا ہے تو ننھے سے تارے کی مانند دکھائی دیتا ہے اور سائز میں ۱۰ کلو میٹر سے ۱۰۰ کلو میٹر تک بڑا ہوتا ہے اور اس میں برف منجمد گیسوں (کاربن ڈائی آکسائڈ، امونیا اور میتھین) کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

سورج کی کرنیں اس پر تیز پڑتی ہیں تو یہ روشن دکھائی دیتا ہے۔ جیسے جیسے پھر یہ سورج کے قریب آتا جاتا ہے اور سورج کی کرنیں اس پر تیز پڑنے لگتی ہیں تو گرمی اور تمازت کی وجہ سے منجمد گیس بھاپ بن کر اڑنے لگتی ہیں۔ اس کے اردگرد نصف دائرے کی شکل بن جاتی ہے۔ اور پھر اس سے نکلی ہوئی گیسیں ایک لاکھ کلومیٹر تک پھیل جاتی ہیں۔

جب یہ سورج کے اور قریب آجاتا ہے تو بھاپ بن کر اڑنے والی گیسوں سے ایک دُم سی بن جاتی ہے۔ دراصل اسی کی وجہ سے یہ ستارہ دُم دار ستارہ کہلاتا ہے۔ یاد رکھو کہ اس کی دم کی لمبائی اکثر بہت غیر معمولی ہوتی ہے یعنی ۲۔کروڑ کلومیٹر تک۔ یہ فاصلہ اس فاصلہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے جو زمین اور سورج کے درمیان ہے۔

اب ذرا تم سوچ کر بتاؤ کہ یہ کتنا فاصلہ ہے؟۔ یہ بات ہی نوٹ کرنے کی ہے کہ دم ہمیشہ سورج کی مخالف سمت میں پھیلی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کے اندر سے چمک روشنی اور کرنوں کی جو دھار نکلتی ہے اُن کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ سورج کے اندر سے ہر وقت بلکہ لمحہ بہ لمحہ جو الکٹران اور پروٹان نکلتے رہتے ہیں جسے تم سورج سے آنے والی ہوا کہہ سکتے ہو۔ دم دار ستارے کی دُم، اس کا بننا سنورنا اور اس کی سمت سب کا دارومدار اسی پر ہے۔

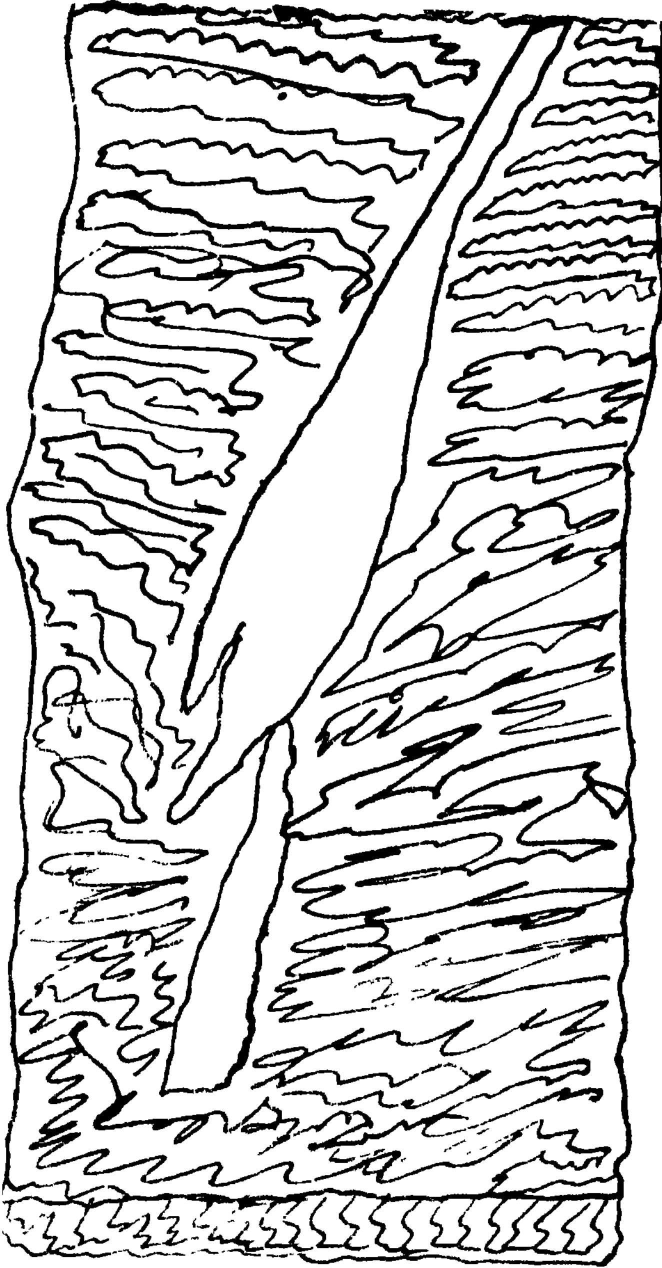
دم دار ستاروں کا گھیرا اور پھیلاؤ بہت ہی لمبا چوڑا اور بظاہر غیر معمولی بڑا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے اندر جو مادے ہوتے ہیں وہ باریک اور بہت معمولی سے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دم دار ستارے کی دم میں سے دوسرے تارے دیکھے جا سکتے ہیں اور کم و بیش وہ ویسے ہی چمکتے دکھائی دیتے ہیں گویا کہ کھلے ہوئے آسمان میں ہوں۔

بہت سے دام دار ستارے ایسے بھی ہیں جن کی گردش کا راستہ کافی حد تک بدل گیا ہے۔ اس کی وجہ مشتری سیارہ ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ ہمارے نو ستاروں میں مشتری سب سے بڑا سیارہ ہے اور اس کی قوتِ کشش بہت زیادہ ہے۔ چناں چہ وہ اپنی قوت کشش سے دم دار ستاروں پر بہت زیادہ اثر ڈالتا ہے۔ اس کے برخلاف دُم دار ستارا کسی سیارے یا اُس کے چاند کی گردش کے راستے پر کوئی اثر نہیں ڈال پاتا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ۱۸۸۹ء میں بروکس نام کا دم دار ستارہ مشتری کے ایک چھوٹے چاند امل تھیا کے بہت قریب پہنچ گیا تھا لیکن امل تھیا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ الٹا یہ ہوا کہ بروکس خود مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور پاش پاش ہو گیا۔ دوسری مثال خود ہماری زمین کی ہے۔ ۱۹۱۰ء میں ہماری زمین ہیلے نام کے دم دار ستارے کی دم میں سے ہو کر گزری تھی لیکن ہماری زمین پر اس کا ذرہ برابر بھی کسی قسم کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا اگرچہ لوگ بہت خائف تھے اور بعضوں نے تو یہاں تک اعلان کر دیا تھا کہ قیامت آن کر رہے گی۔

اس قسم کی مثالوں اور مشاہدوں سے ستاروں کے علم کے ماہرین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دم دار ستارے کی حیثیت بہت معمولی ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ اس کا حجم اتنا مختصر ہوتا ہے کہ دس ارب دم دار ستاروں کا حجم ایک جا کر کے ملایا جائے تب کہیں جا کر وہ ہماری زمین کے حجم کی برابر ہو گا۔

پر یہ دُم دار ستارے آتے کہاں سے ہیں اور جاتے کہاں ہیں یعنی ان کا وجود کیا ہے اور فنا ہو کر کہاں جاتے ہیں؟ یہ سارے معاملات ابھی زیر بحث ہیں۔ البتہ اس کے وجود کا تعلق بہت حد تک اس کے کیمیائی ذرّات سے وابستہ ہے۔ جو کچھ گیس ان سے نکلتی ہیں وہ بہت حد تک ہمارے کرۂ ہوائی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ ان کے وجود کے متعلق کوئی بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ کوہاؤٹک دم دار ستارہ کے متعلق سائنس دانوں کو جو اتنی دلچسپی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ایسے وقت میں ظاہر ہوا تھا جب خلا میں کئی خلائی جہاز خصوصاً امریکا کا اسکائی لیب چکر لگا رہا تھا اور اس طرح اسکائی لیب کے خلا بازوں نے دم دار ستارے میں سے جو (ریڈی ایشن) کرنیں چھن کر آ رہی تھیں ان کا خوب اچھی طرح مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ اس طرح شاید اس دم دار ستارہ کی اصلیت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

قدیم زمانے میں لوگ دم دار ستارے کو دیکھ کر بہت دہشت زدہ ہوتے تھے اور ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ یہ ستارہ منحوس ہوتا ہے اور جب بھی ظاہر ہوتا ہے زمین پر کوئی نہ کوئی مصیبت یا آفت ضرور آتی ہے۔ لیکن آج کل لوگ اس قسم کی۔ بیوقوفی کی باتیں نہیں کرتے۔ ہاں یہ بات البتہ اپنی جگہ مسلم ہے کہ دم دار ستاروں کے متعلق بہت سی باتوں کا ہمارے سائنس دانوں کو بھی پتہ نہیں ہے اگرچہ امید ہے کہ ستاروں کے علم کے ماہرین کی متفقہ کوشش اور خلائی دنیا کی ٹکنالوجی (حواب ممکن ہو گئی ہے) کی مدد سے کوہاؤٹک کا مشاہدہ نئے انداز سے کیا گیا ہے اور اس طرح دم دار ستاروں کے علم میں نہ صرف ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا بلکہ ان کے وجود حقیقت اور اصلیت کا بہت حد تک پتہ لگ جائے گا۔



یہ تصویر دم دار ستارے "اِکی یا سیکی" کی ہے جو ۱۹۶۵ء میں ہمارے ملک کے کودائی کینال کی تجربہ گاہ میں لی گئی تھی ابھی یہ بات پتہ نہیں کہ دم دار ستارے کیسے بنتے ہیں اگرچہ سورج اور اس کے خاندان میں یہ لاکھوں کی تعداد میں گھومتے پھرتے ہیں۔

★★

جناب حافظ باقوی

# کون ہوں میں

کاڑی کھینچا کرتا ہوں میں
کھیتی جوتا کرتا ہوں میں
کنوئیں سے کھیتی کے لیے اکثر
پانی کھینچا کرتا ہوں میں
روکھا سوکھا جو مل جائے
خوش خوش کھالیا کرتا ہوں میں
کبھی کبھی کولھو میں جُت کر
رس کو گھمایا کرتا ہوں میں
فکر نہیں کچھ کل کی مجھ کو
رب پہ بھروسا کرتا ہوں میں
گاہے گاہے موج میں آکر
اُمبا اُمبا کرتا ہوں میں

بچّو بوجھو! کون ہوں میں
جی میں سوچو! کون ہوں میں



جنابِ مضطرؔ داؤد نگری

# ماں کی یاد میں

زندگی کے لیے ہر عیش و مسرت دے کر
ناتواں جسم کو شہزاب سی طاقت دے کر
دلِ ناداں کو تمنائے شکایت دے کر
چھپ گئی ہائے کہاں دید کی حسرت دے کر

تھپکیاں دے کے کبھی مجھ کو سُلایا تونے
رات میں اُٹھ کے کبھی پانی پلایا تونے
بارِ غم و رنج و الم ہائے اُٹھایا تونے
میری خاطر کبھی آرام نہ پایا تونے

پیار سے آنکھوں میں جب تونے لگایا کاجل
چھا گیا روئے گلستاں پہ حسیں سا بادل
میرے گریے نے تجھے کر دیا جب بے کل
لطف سے تونے میرے سر پہ اُڑایا آنچل

زخم ہے ماں کی جدائی کا جگر میں ہم دم
بہتے رہتے ہیں مری آنکھوں سے آنسو ہر دم
ہے علاج اس کا نہ دنیا میں نہ کوئی مرہم
اس لئے وقت کی سہتا ہوں مصیبت پیہم

دستِ شفقت تھا کبھی ماں کا ہمارے سر پر
گلشنِ قلب میں کھلتی تھی کلی شام و سحر
میری نظروں سے بہت دور ہیں وہ پھر بھی مگر
یادِ مادر میں تڑپتا ہوں برنگِ مضطرؔ



جناب عزیز مراد آبادی
ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

# ہیسٹر بدّھو

(مزاحیہ)

جب بھی کوئی بڑا آدمی اپنی پچھلی زندگی، اپنے بچپن کے حالات کو یاد کرتا ہے تو اُسے اپنے بچپن کے بہت سے شرارت سے بھرپور واقعات یاد آجاتے ہیں۔ وہ ان واقعات پر غور کرکرکے دل ہی دل میں قلابازیاں کھاتا ہے۔ مصیبت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کسی واقعے کو بچوّں کے سامنے کہے تو بچے فوراً احتجاج کرنے لگیں گے کہ جناب خود تو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتے نہیں اور ہمیں ہماری جائز شرارتوں پر ڈانٹتے ہیں۔ دھمکاتے ہیں اور زیادہ تاؤ آجائے تو ڈنڈے سے تواضع فرماتے ہیں

لیکن آیئے آج ہم اپنے بچپن کا ایک واقعہ آپ کو سُنا ہی ڈالیں۔ بچے چاہے ہمیں ڈنگشی کہیں یا بگلا بھگت کا نام دیں!

تو اب سُنیے ہمارے اسکول میں ہر سال ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس کا سارا انتظام اُردو سے دلچسپی رکھنے والے طالب علم اور استاد کیا کرتے تھے۔ لیکن مشاعرے کا ہر سال کامیابی کے ساتھ ہونے کا سہرا پرنسپل صاحب ہی کے سر تھا۔

یوں تو اُردو زبان سے انھیں اس قدر لگاؤ تھا جس طرح بچوں کو ٹافی یا مٹھائیوں سے ہوا کرتا ہے۔ اُردو شاعری میں ہمارے پرنسپل صاحب کو ایسا مزہ آتا تھا جیسے دودھ میں شہد ڈال کر کسی ضدی بچے کو پینے میں آتا ہے۔ شاعری کے لطف سے پوری طرح محظوظ ہونے کے لیے پرنسپل صاحب نے اپنا تخلص وفاؔ رکھ کر باقاعدہ شاعری شروع کردی تھی۔ اُن کے شوق وذوق اور محنت نے انھیں بہت جلد اچھا شاعر بنادیا تھا۔ ان کا کلام بہت اچھے اچھے رسالوں میں چھپنے لگا تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر رہے ہیں سبھی لوگ اُردو سے محبت کرتے تھے اور جو سچ پوچھیے تو اُردو کی ترقی میں ہندو بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے غرض پرنسپل صاحب کے اس شوق ہی نے اسکول میں ہر سال مشاعرہ کو ایک روایت کی شکل دے دی تھی۔

مشاعرے میں کالج کے ہونہار بچوّں کو بھی شاعروں کی حیثیت سے اپنا کلام سُنانے کی اجازت ہی نہ تھی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی۔ مثلاً پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام اُن بچوّں کے لیے مخصوص تھا۔ جن کا کلام اچھّا ہوتا تھا۔

حسبِ روایت اس سال بھی مشاعرہ کی تاریخ کا اعلان کردیا گیا۔ مشاعرہ طرحی تھا۔ مصرعۂ طرح تھا۔

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

ہمارے ایک دوست ساجدؔ تھے۔ ہم سب لڑکے انھیں میاں بدّھو کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ پڑھائی لکھائی کے معاملے میں اتنے زیادہ تیز نہ تھے۔ کہ کبھی کبھی ان کی حرکتوں پر شیخ چلّی کی یاد ستانے لگتی تھی۔ ایک بار

حساب والے ماسٹر صاحب شاید تقسیم کا سوال بلیک بورڈ پر لڑکوں کی مدد سے حل کرا رہے تھے۔ لڑکوں کی توجہ بلیک بورڈ کی طرف تھی۔ کیوں کہ نہ جانے کس وقت کس لڑکے سے کیا پوچھ لیا جائے! لیکن بدھو اپنی دھن میں ایک چوہے کی حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جو سامنے کی دیوار میں بل کے اندر کبھی گھستا تھا تو کبھی باہر آتا تھا۔ اچانک ماسٹر صاحب سوال کے آخر میں مسٹر بدھو سے پوچھ بیٹھے "ساجد میاں! بتاؤ اب باقی کیا بچا؟" بدھو صاحب اس ناگہانی حملے پر ایک دم چونک پڑے۔ اور گھبرا کر جھٹ بول اٹھے۔

"سر! دُم باقی بچی ہے" اس وقت چوہا بل میں داخل ہو رہا تھا ـــــ یہ سن کر لڑکوں کے قہقہوں سے کمرے کی چھت اڑ گئی تھی۔ ماسٹر صاحب کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بجلی کی طرح لہرائی تھی۔

ہم نے مسٹر بدھو کو اس بار شاعر بن جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ ویسے بدھو میں ایک خوبی تھی کہ وہ شہرت اور تعریف کے ہر وقت اس طرح بھوکے رہتے تھے جیسے شیر خوار بچہ کئی وقت کے فاقے سے ہو۔ انھیں طرح پر غزل دینا ہم نے منظور کر لیا تھا۔

مزے کی بات یہ تھی کہ ان کا تخلص بھی بدھو تجویز کیا گیا تھا اس موقع پر مسٹر بدھو کی کورس کی کتابوں سے بیزاری نے ہمیں بڑا سہارا دیا تھا۔

اسکول کو خوب سجایا گیا تھا۔ اسٹیج بھی کافی بڑا تھا۔ ہال میں کرسیاں سلیقے کے ساتھ بچھائی گئی تھیں جو سامعین (سننے والوں) کے بیٹھنے کے لیے تھیں۔ بستی کے بہت سے لوگ اس مشاعرہ کو بڑے شوق سے سننے آیا کرتے تھے۔ پرنسپل صاحب کی دعوت پر کبھی تو ملک کے مشہور شاعر بھی تشریف لے آتے تھے۔ اور طلبا کی خوب خوب حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

رات کے نو بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ انسپکٹر آف اسکولس کو صدر منتخب کیا گیا اور پرنسپل صاحب نے شعراء کو بلانے کی ذمہ داری سنبھالی۔

کئی طالب علموں کا کلام سننے کے بعد پرنسپل صاحب نے مجھے بلایا: "اب آپ کے سامنے ہمارے اسکول کے طالب علم عزیز صاحب طرحی غزل پیش کریں گے۔" میرے ہوش حواس اپنی جگہ نہیں تھے کیونکہ اسٹیج پر آ کر کلام سنانا اور وہ بھی اپنا، ہر کچے پکے کے بس کا نہیں ہے۔ لیکن غزل تیار کی تھی ـــــ سنانا پڑی۔

"ابنِ ٹیچر ہوا کرے کوئی
میری کاپی لکھا کرے کوئی
لکھ رہا ہوں غلط سلط جو کچھ
ٹھیک سمجھے خدا کرے کوئی
ہم نے مانا کہ نیکیاں اچھی
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
پاس ہونے کی اب نہیں امید
مصلحت اس کی، کیا کرے کوئی
جب توقع ہی اے عزیز نہیں
اپنی محنت کو کیا کرے کوئی"

ہم نے بدحواسی میں پوری غزل ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالی۔ لوگوں نے کس کس شعر پر کب داد دی یا نہ دی ہمیں پتہ نہ چل سکا۔ لیکن ہمیں اپنی بدحواسی پر بے حد افسوس ہوا کیونکہ مشاعرے میں غزل پڑھنے کے جو آداب اور طریقے ہم نے بدھو کو بتلائے تھے۔

ڈر تھا کہیں مسٹر بدّھو ان سے بے خبر ہو کر ہماری طرح
اپنی مرصّع غزل کو نہ پڑھ ڈالیں ۔ خیر! خدا کا کرنا اچھا
ہی ہوا ۔ اسٹیج سے اترنے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ مسٹر
بدّھو نے ہماری غزل ہی نہیں سُنی کیونکہ وہ اپنی غزل
رٹنے میں لگے ہوئے تھے ۔

پرنسپل صاحب کی آواز پھر گونجی ۔" اب میں ایک اور
ہونہار طالب علم کو بلاتا ہوں جس نے پہلی بار غزل کہی ہے ۔
امید ہے اچھی ہوگی ۔ ہاں تو اب تشریف لا رہے ہیں
ساجد حسین ' بدّھو ' ! " لفظ بدّھو سن کر محفل پر ہنسی
کا دورہ سا پڑ گیا ۔

بدّھو نے اپنا نام سُن کر فوراً اپنی شیروانی کے
بٹن لگانا شروع کر دیئے ۔ جلدی جلدی میں بٹن اُلٹے سیدھے
لگے لیکن مسٹر بدّھو کو اتنا ہوش ہی کب تھا ۔ کہ وہ اس
تکلّف پر زیادہ توجّہ صرف کرتے ۔ کرسیوں کے بیچ میں
سے کودتے پھاندتے اسٹیج پر پہنچ گئے ۔ پہلے سب
کو سلام کیا ۔ اور نہایت ٹھسّے کے ساتھ بیٹھ کر فرمانے
لگے ۔

" وخّت ( وقت ) کی کمی کی وجہ سے میں اپنی
غزل پر زلدی زلدی ( جلدی جلدی ) میں کافی توجّہ
نہ دے سکا ۔ پھر بھی امید ہے کہ سب حاضرینِ محفل
ضرور لفظ اندوز ( لطف اندوز ) ہوں گے ۔" یہ بات
سُن کر اور ان کی شیروانی کے بٹنوں کی بے ترتیبی دیکھ کر
سارے مجمع میں جیسے شور مچ گیا ۔ پرنسپل صاحب نے سب
کو خاموش کیا اور غزل سننے کی درخواست کی ۔

" ہاں تو صاحبین مقطع ( مطلع ) پیش ہے ۔

" اپنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے مُدکھ کی دوا کرے کوئی "

چند چہرے مسکرائے باقی لوگ کچھ سوچ
میں پڑ گئے ۔

" دوسرا مصرعہ ( شعر ) ہے ۔"

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی "

" بدّھو صاحب کیا پچھلے جنم کی غزل سنا رہے
ہو ؟" مجمع میں سے کوئی چیخا ۔۔۔ بہت سوں نے
تو بہت زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا تھا ۔

" اگلا شعر عنایت فرمائیں بدّھو جی ! " کسی نے
اشتیاق کے ساتھ درخواست کی ۔

" نہیں صاحب ! آخری شعر ہو جائے .....
واہ واہ ! کیا غزل نکالی ہے ! "

پرنسپل صاحب نے مناسب سمجھا اور بولے ۔۔۔
" ہاں بیٹا ساجد آخری شعر پڑھو ماشاءاللہ بڑی
اچھی غزل ہے ۔"

" جب توقع ہی اُٹھ گئی بدّھو
کیوں کسی کا گِلہ کرے کوئی "

اب تو چھوٹے بڑے سب ہی لوٹن کبوتر
بن چکے تھے ۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر پیٹ پکڑے
ہنسے جا رہا تھا ۔ کوئی مسخرہ تو اب تک واہ واہ
کی صدائیں بلند کیے جا رہا تھا ۔ کسی کونے سے آواز
ابھری ۔" ہمیں کیا پتہ تھا کہ غالبؔ نے نام بدل کر
شاعری شروع کر دی ہے ۔ ہم سب سمجھ رہے ہیں کہ
غالبؔ مر چکے ہیں ۔ لیکن آج پتا چلا کہ غالبؔ مہنگائی اور
بے روزگاری کی وجہ سے گمنامی کی زندگی بسر کرنے کہیں
روپوش ہو گئے تھے ۔ ہائے غالبؔ ! وائے بدّھو ۔
بدّھو زندہ باد ! "

بڑی مشکل سے پرنسپل صاحب نے مجمع میں پھیلی ہوئی بدنظمی پر قابو پایا۔ چند دوسرے طلبا کی غزلوں اور اُستاد شعراء کے کلام کے بعد مشاعرہ پرنسپل صاحب کے اس اعلان پر ختم ہوا۔

" میں جانتا ہوں کہ مُدّھو جیسے لڑکے کے بس کا نہیں تھا کہ وہ اس غزل کو پڑھتا یا تیار کرتا جس طالب علم نے یہ حرکت فرمائی ہے۔ یعنی ساجد حسین کو غزل پڑھنے کے لیے اکسایا تھا۔ وہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں ...... "، یہ سُنتے ہی میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ کیونکہ اس یعنی سب حرکت کی سزا خدا معلوم پرنسپل صاحب نے کیا تجویز فرمائی ہو! پھر بھری محفل میں سزا کا ملنا! کتنا خوفناک منظر ہوگا! پرنسپل صاحب پھر بولے۔

" وہ لڑکا اگر موجود ہو تو فوراً اسٹیج پر آ جائے۔ یہاں موجود ہونے کے باوجود بھی اگر وہ لڑکا اسٹیج پر نہیں آتا ہے تو گویا وہ جھوٹ بول رہا ہے ——— میں اپنے بچوں سے ہر شرارت کی امید کر سکتا ہوں لیکن جھوٹ، بے ایمانی اور تکلیف پہونچانے کی امید کبھی نہیں کر سکتا۔ یہی ہمارے طلبا کا کردار ہے جس نے اسکول کا نام دور دور تک روشن کر رکھا ہے ——— میں دو منٹ انتظار کرتا ہوں اس لڑکے کا۔"

کہہ کر پرنسپل صاحب برابر میں بیٹھے شاعروں سے سرگوشی کرنے لگے۔ میں گھبراتا، شرماتا، جھجکتا اور ڈرتا اسٹیج پر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر پرنسپل صاحب کی آنکھیں مارے غصے کے سرخ ہو گئیں۔

" مجھے خوشی ہے کہ ہمارے اسکول میں ایسے ذہین بچے بھی ہیں جو اتنا خوبصورت پلان بنا لیتے ہیں۔ اس چیز کو سبھی نے پسند کیا ہے۔ مُدّھو کی غزل نے سامعین کو جو لطف بہم پہنچایا ہے۔ شاید سارے شعرائے کرام بھی مزاحیہ غزلیں سنا کر نہیں پہنچا سکتے تھے ——— اس لیے اس مرتبہ فرسٹ پرائز کا اعلان مسٹر عزیز کے لیے اور باقی دو انعامات کا اعلان کمیٹی کے فیصلے کے بعد کیا جائے گا۔

---

بقیہ عقلمند لڑکی صـ۳۲ سے

سے پوچھا۔ "تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟"

" تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھیں جن چیزوں کی ضرورت ہو اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو۔ میں نے تمھیں پسند کیا ہے۔ اس لیے اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میری نظر میں میری سب سے بیش بہا چیز صرف تمہاری ذات ہے۔ اس کی بیگم نے اسے بتایا۔

اپنی بیگم کے اس دانش مندانہ جواب سے جج کا دل بھر آیا۔ وہ دونوں اپنے گھر واپس آ گئے۔ اور اُس دن سے جب بھی جج کے سامنے کوئی اُلجھا ہوا مقدمہ آتا تو وہ اپنی بیگم سے ضرور مشورہ کر لیا کرتا۔

★

لطیفہ

ایک گاہک :- ایک چوہے دانی چاہیے۔ ذرا جلدی کیجیے۔ جلدی مجھے بس پکڑنی ہے۔

دُکان دار :- بھائی صاحب میرے پاس اتنی بڑی چوہے دانی نہیں جس میں بس پکڑی جا سکے۔

(نوشاد ہسپوروی)

مناظر عاشق ہرگانوی

# دُنیا کے عجیب و غریب جانور

## (۱) ضب

ضب ایک صحرائی جانور ہے۔ یہ گوہ سے ملتا جلتا ہے۔ کہتے ہیں ضب پانی نہیں پیتی اور اس کی عمر سات سو سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ چالیس روز میں ایک قطرہ پیشاب کرتی ہے۔ اس کے دانت کبھی نہیں گرتے۔ اس کے دانت علاحدہ علاحدہ بھی نہیں ہوتے ہیں۔ سب ایک ٹکڑے میں جڑے ہوتے ہیں۔ اُس کے دُم بھی ہوتی ہے اور دُم میں اکیس گرہیں ہوتی ہیں۔ یہ گرگٹ کی مانند سورج کی گرمی میں رنگ بدلتی ہے۔

ضب اپنا انڈا زمین میں گڑھا کھود کر ڈال دیتی ہے اور مٹّی سے ڈھک دیتی ہے۔ اس کا انڈا کبوتر کے انڈے کے برابر ہوتا ہے۔ یہ ایک مرتبہ میں لگاتار ستّر انڈے دیتی ہے۔ انڈے سے بچہ چالیس روز میں نکلتا ہے۔ یہ چالیس روز تک گڑھے کے انڈے کی خبر گیری کرتی رہتی ہے۔

ضب اپنے بچّے کو کھا جاتی ہے۔ اس کی خوراک بننے سے جو دو چار بچے بچ جاتے ہیں۔ وہی بڑھتے ہیں۔ ضب کی یہ خاصیت ہے کہ کتّے کی طرح یہ اپنی قے کھاتی ہے۔ ساتھ ہی اپنی بیٹ بھی کھاتی ہے۔

ضب جب اپنے سوراخ سے باہر نکلتی ہے تو اس کی نگاہ بہت کمزور ہوتی ہے اس کی نگاہ کی روشنی سورج سے ملتی ہے۔ یہ موسم سرما میں اپنے سوراخ سے شاذونادر ہی باہر نکلتی ہے۔ یہ اپنا گھر اونچی اور پتھریلی جگہ بناتی ہے سخت پتھریلی زمین کو کھود کر گھر بناتے وقت عموماً اس کے پنجے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اس کی دوستی بچھو سے بڑی گہری ہوتی ہے۔ ان دونوں کی دوستی اتنی پکّی اور سچّی ہوتی ہے کہ ضب بچھّو کو اپنے سوراخ میں جگہ دیتی ہے۔ اس سے اس کا محفوظ بھی رہتا ہے۔

ضب کی موت آتی ہے تو یہ اپنے بل میں ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور کمزور ہو کر مرجاتی ہے۔

بخاری اور مسلم نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ضب حرام ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں، لیکن وہ میرے ملک میں نہیں ہوتی لہذا مجھے کراہیت آتی ہے!

## (۲) ڈک بل

ڈک بل (Duckbill) ایک چھوٹا سا جانور ہے اس کا مُنہ بطخ کی چونچ سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ اس کے جسم کی لمبائی ڈیڑھ فٹ اور دُم چھ انچ کی ہوتی ہے۔ مادہ کا قد نر سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے۔

ڈک بل کے جسم کے اوپری حصے کا رنگ بھورا سیاہی مائل اور نچلے حصے کا رنگ ایک دم بھورا ہوتا ہے۔ دُم چوڑی اور چپٹی ہوتی ہے۔ ٹانگیں چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں اور اگلے پنجوں کی انگلیاں سب ایک ہی جھلّی میں منڈھی ہوتی ہیں اور جھلّی ناخن سے آگے جھالر کی طرح

لٹکتی ہے۔ پچھلے پاؤں کی انگلیوں پر جھلّی منڈھی نہیں ہوتی بلکہ ان پر بڑے بڑے تیز نوکیلے ناخن ہوتے ہیں۔ چونچ پر سیاہ ملائم کھال ہوتی ہے۔ دانت نہیں ہوتے ان کی جگہ پر ہڈی کی پٹریاں جڑی ہوتی ہیں جن پر گھنڈیاں ہوتی ہیں۔

نر کی پچھلی ایڑیوں پر ایک کھوکھلا خار ہوتا ہے۔ یہ پیچھے کی طرف ایک نلی میں جڑا ہوتا ہے جس کا تعلق ران تک ہوتا ہے۔ نلی کے آخر میں ایک گرہ ہوتی ہے جس میں ایک رقیق مادہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کو وہ اپنی اس نلی اور خار کے اندرونی خلا کے ذریعہ دور تک چھڑک سکتا ہے۔ اگر یہ انسان کے جسم پر پڑ جائے تو ورم آجاتا ہے۔

ڈک بل کی مادہ انڈے دیتی ہے اور بچہ انڈے سے پیدا ہوتا ہے۔ مادہ بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے۔

جسمانی بناوٹ میں ڈک بل پیٹ کے بل چلنے والے جانوروں سے بھی بہت مشابہت رکھتا ہے۔ دودھ پلانے والے جانوروں کے مقابلہ میں ڈک بل کے خون میں بہت کم حرارت ہوتی ہے۔ ڈک بل کی خوراک کیڑے مکوڑے ہوتی ہے۔ یہ زیادہ تر پانی میں رہتا ہے اور جھیل کے ڈھالو کنارے پر بل (سُرنگ) کھود کر کھوہ تیار کرتا ہے۔ جس میں اس کی مادہ انڈے دیتی ہے!۔

- سچائی ظالموں کی دشمن اور انسانوں کی دوست ہے۔ (کیمبل)
- غضبناک شخص اپنا منہ کھولتا ہے مگر آنکھیں بند رکھتا ہے۔ (کیٹو)
- دنیا میں جتنی برائیاں ہیں ان میں جھوٹ سب سے زیادہ رائج ہے۔ (سمائلز)

(بشیر الدین شیر کوٹ)

جناب سلام قادرزادے

# دوراہے پر

ایک دن شام کو میں موٹر سے دارا لبو لانگ جا رہا تھا کہ ایک دوراہا آگیا اور مجھے رکنا پڑا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کس طرف جانا ہوگا۔ سڑک کے کنارے ایک چائے خانہ تھا۔ میں نے سوچا وہاں جا کر معلوم کروں۔

اسی وقت چائے خانے کا دروازہ کھلا اور دو نوجوان باہر نکلے۔ وہ دھیمی دھیمی ناراض آوازوں میں کھسر پھسر کرتے اس "ماسکووچ" موٹر کار تک آئے جو قریب ہی کھڑی تھی اور اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

میں چائے خانے کے اندر داخل ہوا اور اس کے مالک کو سلام کر کے پوچھا "مہربانی کر کے بتائیے کہ مجھے دارا لبو لانگ جانے کے لیے کہاں مڑنا ہے، بائیں یا دائیں؟ میں آپ کے علاقے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں۔"

چائے خانے کے مالک نے مجھے گھور کر دیکھا اور ہنس پڑا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے سفید دانت چمک اٹھے۔

"میں اس وقت تک آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک آپ میری نفیس چائے کی ایک پیالی نوش نہ کرلیں۔"

"شاباش اوستا"، (بڑی خوشی سے) میں نے کہا۔

"وہ میرے لیے گرما گرم بھاپ نکلتی ہوئی چائے لایا۔ میں نے جلدی سے پی کر اپنا سوال دُہرایا۔

"مالک نے پھر میری طرف گھور کر دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔"

"ہمارے یہاں بہت اچھا قورمہ پکا ہے، یا آپ تکّا کباب پسند کریں گے؟"

"بہت بہت شکریہ، لیکن مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے ذرا جلدی میں بھی ہوں" میں نے جواب دیا۔

"آپ کی تندرستی کی قسم جب تک آپ کچھ نہ لیں گے میں آپ کو راستہ نہ بتاؤں گا۔ اگر میں سوالوں کا جواب فوراً دے دوں تو آخر ہوگا کیا؟ تو پھر چائے خانہ یہاں کھولنے سے کیا فائدہ؟

اس طرح تو میں دوراہے پر کھڑا ہو کر لوگوں کے سوالوں کا جواب دے سکتا ہوں لیکن کاروبار تو تباہ ہو جائے گا؟" ہے نا ٹھیک؟"

اب میں کیا کرتا، چارنا چار مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔

جلد ہی میز پر شلیک (تکّا کباب) اور روٹی وغیرہ آگئے۔ میں نے خوب کھایا اور جب میں اٹھ کر چلنے والا ہی تھا کہ میزبان نے اپنا بایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر مجھے بٹھاتے ہوئے دائیں ہاتھ سے چائے اور

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

روسی لوک کہانی
ترجمہ: شہیر امام

# عقلمند لڑکی

بہت دنوں پہلے کی بات ہے: کسی گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ کھیتی باڑی کے لیے اس کے پاس صرف ایک ہی بیل تھا۔ ہر سال جوتنے بونے کا وقت آتا وہ اپنے ایک امیر پڑوسی سے ایک بیل مانگ لیا کرتا اس طرح اس کا کام چل جاتا۔ ایک بار موسم بہار کھیت کی جتائی کے بعد اس نے اپنے پڑوسی کا بیل لوٹا دیا۔

اتفاق کی بات بیل لوٹانے کے ٹھیک ایک مہینے بعد یہ بیل بیمار ہوگیا۔ امیر پڑوسی کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے اس غریب کسان پر یہ الزام لگایا کسان نے اس کے بیل کو بُری طرح ہل میں استعمال کیا ہوگا۔ اس لیے وہ بیمار ہوکر مرگیا۔ اس لیے وہ اس کا نقصان پورا کرے مگر کسان نے کسی قسم کا کوئی خسارہ پورا کرنے سے صاف انکار کردیا۔ آخر نوبت مقدمے تک پہنچی۔

جج نے دونوں کے بیان سنے اور فیصلہ غریب کسان کے حق میں سنادیا۔ مگر امیر کسان نے اپنے دعوے اور حق سے دست بردار ہونے سے صاف لفظوں میں انکار کردیا۔ وہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑا رہا۔

یہ دیکھ کر جج نے اس سے کہا۔ "اگر تمھاری ضد یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ تمھارے حق میں ہو تو تم میرے ان تین سوالوں کے جواب دے دو۔

(۱) کیا تم بتا سکتے ہو کہ دنیا کی سب تیز رفتار چیز کیا ہوسکتی ہے۔

(۲) تمھاری نظر میں دنیا کی سب سے قیمتی چیز کیا ہے۔

(۳) کیا تمھیں پتہ ہے کہ دُنیا کی سب سے شیریں اور حسین چیز کیا ہوسکتی ہے؟؟

تم میں سے جس نے بھی میرے ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب دیا فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔

مگر دونوں فریقوں میں سے کسی سے ان سوالوں کا جواب نہ بن پڑا۔ تب جج نے ان سے کہا "بس دو، دنوں کے لیے تمھارے مقدمے کی کارروائی ملتوی کرتا ہوں۔ اور اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ مجھے امید ہے کہ واپسی پر تم لوگ ان سوالوں کا حل اپنے ساتھ ضرور لاؤگے۔"

غریب کسان لٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ گھر لوٹا اور آتشدان کے قریب اداس بیٹھا اپنی بیٹی کو واقعہ کی پوری روداد سنانے لگا۔ روداد کہہ چکنے کے بعد اس نے اپنی سعادت مند بیٹی سے کہا۔ ان باتوں کی روشنی میں ظاہر ہے کہ جج کو مجھ سے توقع ہے کہ میں اس کے لیے دنیا کی سب سے قیمتی چیز لے جاؤں گا، اسی طرح وہ مجھ سے توقع رکھتا ہے کہ میں اس کے پاس کوئی ایسی چیز لے کر پہنچوں گا جو سب سے زیادہ میٹھی ہوگی۔ اس نے میری ذات سے یہ امید رکھی ہوگی کہ میں دنیا کی سب سے تیز ترین چیز لے کر

اس کے پاس حاضر ہوں گا۔
تم مشورہ دو : مجھے اس کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔ میں یہ سب خریدنے کے لیے اتنے سارے پیسے کہاں سے لاؤں۔ میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔
غریب کسان کی بیٹی نے پوری روداد سُننے کے بعد کہا۔ "ابّا! اس کے لیے آپ کو نہ تو پریشان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ دل شکستہ ہونے کی، جج کو دراصل آپ کے کسی عطیہ کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف اپنے سوالوں کے جواب چاہتا ہے اور یہ کوئی اتنے مشکل سوال بھی نہیں۔ جتنے آپ نے سمجھ رکھے ہیں۔"
جب کورٹ میں حاضری کا دن آیا تو غریب کسان کی بیٹی نے اپنے باپ سے کہا۔ "ابّا جان! آپ جج سے بتا دیجیے گا کہ دنیا کی سب سے تیز رفتار چیز انسان کا تخیّل ہوتا ہے۔ دُنیا میں سب سے عمدہ اور قیمتی چیز زمین ہوتی ہے۔ اور یہ نیند ہے جو انسان کے نزدیک سب سے قیمتی اور دلربا چیز ہوتی ہے۔
ادھر امیر کسان نے بھی جج کے سوالوں کے حل ڈھونڈ لیے۔ اس نے اپنے ساتھ اپنا سب سے تیز گھوڑا، اپنا سب سے فربہ سوّر اور ڈھیر سارا شہد رکھ لیا۔ جب وہ کورٹ میں پہنچا تو اس نے جج کے سامنے فخر سے کہنا شروع کیا، "لیجیے میں آپ کے سوالوں کے جواب لے کر حاضر ہو گیا۔ میرا سوّر نہ صرف دنیا کا سب سے فربہ اور موٹا تازہ جانور ہے۔ بلکہ دنیا کا سب سے قیمتی اور عمدہ ترین جانور ہے۔ آپ خود، دیکھیں یہ سوّر کتنا قیمتی ہے۔ یہ دیکھیے میرا گھوڑا کتنا تیز ہے، آپ کو اس سے زیادہ تیز گھوڑا پورے علاقے میں نہ ملے گا۔ اور یہ شہد ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ میٹھی چیز بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟"
"اور اب تم بتاؤ۔ تمھارے پاس میرے سوالوں کے کیا جواب ہیں۔" اب جج غریب کسان کی طرف رجوع ہوا۔
"حضور! میرے خیال میں انسانی ادراک و خیال سے زیادہ تیز رفتار چیز اور کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ یہ زمین ہی ہے جو دُنیا کی سب سے فربہ اور قیمتی سے ہو سکتی ہے۔ اور بھلا نیند سے زیادہ میٹھی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔"
غریب کسان اپنے سوالوں کے جواب بتا کر خاموش ہو گیا۔
"پچھلی بار تو تم میرے سوالوں کے جواب دینے میں ناکام رہے تھے۔ پھر اتنی جلدی سوالوں کے جواب تمھیں کس نے بتا دیے؟" جج نے کسان سے دریافت کیا۔
"حضور، ان سوالوں کے جواب مجھے میری بیٹی نے بتائے ہیں۔"، کسان نے جج کو بتایا۔
"یہ لڑکی بڑی ذہین معلوم ہوتی ہے"! جج نے کسان سے کہا۔ اس سے ذرا مجھے بھی ملاؤ۔"
امیر آدمی سے جج نے کہا۔ تم میرے سوالوں کے جواب دینے میں ناکام رہے ہو۔ چنانچہ تم مال لے کر جا سکتے ہو۔ میں کچہری میں آنے والے لوگوں کے تحفے قبول نہیں کرتا۔"
دوسرے دن غریب کسان اور اس کی بیٹی جج سے ملنے پہنچ گئے۔ جج نے اس لڑکی سے بیاہ کر لیا۔
ایک روز جج کو کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر جانا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے بیگم کو بلا کر تاکید کی۔

"میری عدم موجودگی میں تم جو چاہو کر سکتی ہو۔ مگر میں تم کو تاکید کیے دیتا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں جج مت بن جانا اور جو کوئی تم سے ملنے آئے۔ اسے کسی قسم کا مشورہ مت دینا۔ تم نے میری مرضی کے خلاف کچھ کیا تو میں تم سے قطع تعلق کر لوں گا۔

جج کے رخصت ہوتے کے فوراً ہی بعد دو اجنبی اس کے گھر پر پہنچے۔ ان میں ایک تو گھوڑا سوار تھا اور دوسرا گاڑی بان تھا دونوں ایک گھوڑے کے بچھڑے پر اپنی ملکیت کا دعوٰی کر رہے تھے۔

گھوڑا سوار ایک گھوڑی پر سواری کرتا تھا جس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ پچھلی رات گھوڑی نے بچھڑا جنا اور صبح اتفاق سے وہ بچھڑا ایک بیل گاڑی کے نیچے پایا گیا۔

گھوڑا سوار نے اس بچھڑے پر اپنی ملکیت کا دعوٰی کیا۔ تو گاڑی بان نے اسے بتایا چونکہ یہ بچھڑا میری گاڑی کے نیچے تھا۔ اس لیے یہ میرا ہے۔ کیونکہ اسے میری بیل گاڑی نے جنم دیا ہے۔

دونوں فریقین کے درمیان یہ بچھڑا جھگڑے کی جڑ بن گیا۔ دونوں اس کے فیصلہ کے لیے جج صاحب کے گھر پہنچے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ جج صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں تب ان لوگوں نے جج صاحب کی بیگم سے اس کا فیصلہ کرنے کو کہا۔

بیگم صاحبہ کمرے سے برآمدے میں آئیں۔ دونوں کے بیانات لیے اور پھر کمرے میں واپس گئیں

دیر کے بعد جب وہ دوبارہ ان لوگوں کے پاس آئیں تو اس قدر انتظار میں رکھنے پر دونوں نے احتجاج کیا۔

بیگم صاحبہ نے انھیں جواب دیا "ہاں بات کچھ ایسی ہی تھی کہ مجھے دیر ہوگئی اور تم لوگوں کو انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑی۔ یہاں سے کچھ ہی دور ایک چھوٹی سی ندی ہے۔

کچھ دیر پہلے اچانک اس میں آگ لگ گئی۔ میں کیا کرتی۔ آگ بجھانے کے لیے میں نے اس پر سوکھے پتّے ڈال دیے۔ یہ سن کر دونوں فریقین ہکّا بکّا ہوگئے اور کہا۔

بھلا سوکھے پتّوں سے آگ کس طرح بجھ سکتی ہے یہ تو صرف پانی سے ہی بجھ سکتی ہے اور پھر یہ کہ پانی میں بھلا آگ کیسے لگ سکتی ہے نا؟"

"اب تم لوگ خود بتاؤ کہ اگر پانی میں آگ نہیں لگ سکتی تو پھر گاڑی، بچّے کیسے جنم دے سکتی ہے۔

اس طرح اس نے تصفیہ کر دیا۔ دونوں اپنے گھر واپس چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد جب جج واپس آیا معلوم ہوا کہ اس کی بیگم نے اس کی حکم عدولی کی ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔

"اپنی ضرورت کی جو چیز چاہو لے لو اور میرا گھر خالی کر دو۔" جج نے اپنی بیگم سے کہا۔

"بہت اچھا! میں آپ کی بات نہیں ٹالوں گی مگر جدا ہونے سے پہلے میں تمھارے ساتھ دن کا کھانا کھانا چاہتی ہوں" یہ کہہ کر اس نے کھانا چننا شروع کر دیا۔ کھانے کے دوران اس نے اپنے شوہر کو اتنی شراب پلائی کہ وہ نشے میں دھت ہو کر فوراً ہی گہری نیند سو گیا۔ اب اس نے جج کو ایک گاڑی میں بٹھایا اور اسے اپنے باپ کے گھر لے گئی۔ راستے میں جج کی نیند ٹوٹی تو اس نے حیران و پریشان اپنی بیگم

باقی صفحہ ۲۵ پر

ناظم میواتی سہسرامی

# ہمتِ مرداں مددِ خدا

بروس اسکاٹ لینڈ کا ایک نیک دل بادشاہ تھا۔ وہ رعایا کی خوش حالی اور بھلائی کے لیے کچھ اچھے کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہزار کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ناکامیوں نے اسے دلی صدمہ پہنچایا۔ وہ مایوس اور ناامید ہوگیا اور خودکشی کی سوچنے لگا۔

وہ اکیلا اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ چھت سے ایک مکڑا ٹپکا۔ وہ ریشم جیسے باریک دھاگے سے لگا لٹکا ہوا تھا اور وہ اسی کے سہارے پھر چھت تک واپس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن چھت اونچی تھی اور منزل بہت دور۔ اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر گر گیا پھر کوشش کی اور پھر گر گیا۔ اس طرح اس نے لگاتار نو کوششیں کیں لیکن ہر بار ناکام رہا۔ وہ اتنا تھک گیا تھا کہ کمزوری سے بے ہوش سا ہوگیا۔ بادشاہ نے سمجھا کہ یہ نادان مکڑا اب کوشش کرنا ضرور چھوڑ دے گا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ بہادر مکڑا اس پر بھی ہمت نہ ہارا اور تھوڑا دم لینے کے بعد پھر دسویں کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ آہستہ آہستہ بڑی مضبوطی سے قدم جما کر ایک ایک انچ بڑھتا گیا اور اوپر چڑھتا آخرکار وہ اپنے جالے میں پہنچ گیا۔

اس مکڑے نے بادشاہ کو ایک درسِ ہمت دیا۔ ناامیدی ختم ہوئی اور امید نے جنم لیا۔۔۔۔۔۔۔ بادشاہ محل میں لوٹ گیا اور اس نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ زندگی کا سبق جاوید ہوگیا۔

تیمور لنگ کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ اسے ہندوستان فتح کرنے کی دلی تمنا تھی۔ اس نے حملے پر حملہ کیا۔ لیکن ہمیشہ ناکام رہا۔ وہ بار بار کی شکست سے شرمندہ ہوتا رہا۔ سولہویں ہار نے تو اسے مایوس ہی کر دیا۔ اب وہ ناامید ہوگیا۔

وہ تنہا ایک کھنڈر میں بیٹھا اپنی ناکامیوں اور ناامیدیوں کو سامنے رکھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے ایک ننھی چیونٹی کو دیکھا جو اپنی بساط سے بہت زیادہ بھاری مٹھائی کا ٹکڑا لیے اک ذرا اونچے ٹیلے پر چڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کام اس کے بس کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جب بھی وہ اپنی پسندیدہ نعمت لیے چڑھتی تو کچھ اوپر جا کر ٹکڑے کے ساتھ زمین پر گر پڑتی لیکن پھر بھی ہمت نہ ہارتی اور کوشش پر کوشش کرتی رہتی۔ وہ اپنی کوشش سے ہرگز باز نہ آتی۔

سولھویں ناکامی کے بعد بھی چیونٹی نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا۔ تیمور لنگ بھی اس کی محنت اور جاں فشانی کا تماشا غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی جان توڑ مشقت کو وہ ایک جان لیوا نادانی ہی سمجھتا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے لیے کسی اچھے اور کامیاب منصوبے کی فکر

بھی بڑی سنجیدگی سے کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں اسی جانِ ناتواں نے جس کی ہمتِ مردانہ کو وہ نادانی سمجھتا ستر ہویں بار کوشش کی اور آخر کار کامیابی حاصل کرلی۔ تیمور لنگ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ننھی چیونٹی اپنا دل پسند توشہ لیے ٹیلے کی بالائی سطح پر خوش خوش رینگتی چلی جا رہی ہے۔

چیونٹی کی بلند ہمتی دیکھ کر تیمور لنگ کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ ناامیدی کا بادل چھٹ گیا اور مایوسی کا اندھیرا دور ہوا۔ امید کی نئی صبح آئی اور ایک نئی کرن لائی تیمور لنگ نے ایک بار پھر نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ کمر ہمت باندھی اور ہندوستان پر سترہویں حملے کی تیاری بڑے زور و شور سے کی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اس مرتبہ تیمور لنگ نے وہ تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مکڑے نے نو کوششیں کیں اور ہر بار ناکام رہی آخر دسویں مرتبہ کامیابی حاصل کرکے اسکاٹ لینڈ کے شاہ بروس کی آنکھیں کھول دیں اور اسے زندۂ جاوید کر دیا اسی طرح ایک ننھی چیونٹی نے سولہ بار ناکامیوں کا منہ دیکھا۔ لیکن آخر سترھویں مرتبہ کامیاب ہو کر تیمور لنگ لنگ کو وہ کارنامہ انجام دینے کی تلقین کی جس نے اسے حیات جاوداں بخشی۔

کوشش پر کوشش کرتے رہنا۔ ہمارا مقدس فرض ہے۔ ناکامی کامیابی کا ایک زینہ ہے۔ جو صرف حوصلہ مندوں کے قدم چوما کرتا ہے۔ لیکن ناکامیوں سے شکست کھا کر مایوس اور ناامید ہو جانا، بہادر کی موت ہے۔ در حقیقت بزدلی۔ مایوسی اور پست ہمتی انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے اس کے برعکس عزم و ہمت اور بلند حوصلگی بہادروں کا وہ حربہ ہے۔ جس سے وہ تاریخ ساز کارنامے انجام دیتے ہیں اور موت پر بھی فتح پاتے ہیں۔

---

بقیہ، آدھی ملاقات صد ۲۷ سے

روشن کی نظم "پودا" محترم سعادت نظیر کی نظم "ایک ذرا سا پودا (جو کھلونا کے مارچ ۱۹۷۲ء اور پیام تعلیم کے کسی خاص نمبر میں شائع ہو چکی ہے) کا چربہ ہے۔ ذرا دونوں نظمیں ملاحظہ ہوں۔ محمود صاحب کے لئے میرا پُرخلوص مشورہ یہ ہے کہ اگر انھیں چھپنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ خود کیوں نہیں محنت کرتے۔ جتنی محنت انہوں نے سعادت نظیر صاحب کی نظم کی روپ ریکھا بدلنے پر صرف کی اتنی محنت سے تو وہ خود ایسی نظم کہہ سکتے تھے۔

فقط— آپکا خادم
خلیق انجم دہلی

---

بقیہ دور لے ہے۔ صد ۲۹ سے

شکر میری طرف بڑھا دی۔

"اب یہ پی لیجئے تاکہ راستے میں پیٹ میں درد نہ ہو۔"

میں نے اس کی یہ فرمائش بھی پوری کر دی اور پیسے دے کر پھر اس سے کہا۔

"ارے اب تو بتاؤ گے ناکہ کونسا راستہ دارا لولاگ کو جاتا ہے؟"

چائے خانے کے مالک نے دوستانہ میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "دونوں راستے"

ترجمہ: ظہور رولوی

# جاپانی کبوتر اور کوّے

جاپان کے مشہور "رینوں اسٹلیس کے" کاواساکی" کارخانے کے اسٹور میں کبوتروں نے بڑا طوفان مچا رکھا تھا تقریباً دو سو کبوتر وہاں بس گئے تھے۔ یہ تمام چیزوں پر بیٹ گرایا کرتے تھے تقریباً بیس ملازموں کو روزانہ ایک گھنٹہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ تیل اور پانی سے روزانہ بیٹ صاف کرنا پڑتی تھی۔ پچھلے سال کارخانہ چلانے والوں نے ایک انوکھی تدبیر اپنائی ــــــ روزانہ صبح شام اور آدھی رات کے وقت اسٹور میں کوؤں کی کائیں کائیں کی ٹیپ بجانی شروع کی۔ اور سارے کبوتر غائب ہو گئے۔

اس کے بعد اینوں اسٹلیس نے کوؤں کی کائیں کائیں کے (آٹھ سو) ریکارڈ بنوائے اور دیس بدیس کی الگ الگ کمپنیوں فیکٹریوں اور عوامی اداروں کو تحفے کے طور پر بھیجے اس تحفے کے ساتھ یہ خط بھی تھا۔

پیارے سکون پسندو! (شانتی پریمیو!)

سب ہی چاہتے ہیں کہ سکون سے جئیں اور اطمینان سے اپنا کام دھندا کریں مگر ہمارے کاواساکی کارخانے میں سکون کے دشمن کبوتر غٹرغوں کے شور کے ساتھ بیٹ گرا کر ہمارے سکون کو برباد کر رہے تھے، ان ظالموں کو بغیر جسمانی سزا دیئے دور رکھنے کی ایک تدبیر کو عملی طور پر اپنایا ہے۔ امید ہے کہ اس عدم تشدد کے اصول پر سوچی ہوئی پرامن تدبیر کو عملی طور پر اپنایا ہے۔ امید ہے کہ اس عدم تشدد کے اصول پر سوچی ہوئی پرامن تدبیر کو ہر امن پسند اور سکون کی خواہاں کمپنی فیکٹری اور ادارہ قبول کرے گا۔

جہاں ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہم ساری دنیا کے امن و سکون پسندوں کی مدد کر رہے ہیں۔ وہاں یہ فکر ہے کہ جاپان کے باہر ان ریکارڈوں کے بجانے کا انجام کیا ہوگا؟ یہ کوّے جاپانی تھے۔ اس لیے ممکن ہے انہوں نے جاپانی زبان میں کائیں کائیں کی ہوگی۔ ہمیں شبہ ہے کہ کیا آپ کے یہاں کے کبوتر بغیر مترجم کی مدد کے اس کائیں کائیں کو سمجھ سکیں گے؟ "نیوّن اسٹلیس" کے دلیش بدیش سے مبارک باد کے آئے ہوئے خطوط میں سے ایک یہ ہے۔

ہم آپ کے ریکارڈ بجائیں گے اور دیکھیں گے کہ ہمارے امریکی زبان والے پرندوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے ہمیں یقین ہے کہ اگر آس پاس کے شہری شور و غل کو چیر کر ریکارڈ کی آواز کبوتروں کے کانوں تک پہنچ سکی تو وہ ضرور اس کا پیغام سمجھ سکیں گے۔ اس یقین کامل کی بنیاد یہ ہے کہ اگر جنوبی افریقہ کے جنگلوں میں کسی شہر سے میرا سامنا ہو جائے اور وہ مجھے دیکھ کر دہاڑے تو میں یقیناً اس کا پیغام (سندیش) سمجھ لوں گا۔ چاہے وہ سواحلی (زبان) میں دہاڑے یا انگریزی میں۔

آپ کا ــــ
کمشنر
شعبۂ نشر و اشاعتِ عامّہ!



# آدھی ملاقات

دسمبر ۷۳ء کے علاوہ کہانی نمبر اور دونوں ماہ کے رسالے موصول ہوئے۔ شکریہ!

"پیامِ تعلیم" ایک بہترین ادبی رسالہ ہے جس کی ہر کہانی اور نظم اپنی جگہ بہتر ہے۔

رسالہ مذکورہ کو خدا اور بھی ترقی عطا فرمائے (آمین)

زیادہ آداب

آپ کا — پیکر تھانوی

جنوری ۱۹۷۴ء کا پیامِ تعلیم پڑھ رہا تھا کہ اس میں دو ایک باتیں مجھے ایسی لگیں کہ انکے متعلق آپ سے اپنے خیالات ظاہر کرنا ضروری سمجھا،

پیامِ تعلیم گھر پر کافی عرصہ سے آرہا ہے۔ اور اسے گھر میں خوب پڑھا جاتا ہے۔ مضامین اس میں بہت اچھے ہوتے ہیں۔ انکے متعلق تو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

ہاں! پیامِ تعلیم میں "ہنڈکلھیا" کے نام سے ایک سلسلہ ہے۔ جس میں کھانے کے متعلق کچھ ترکیبیں ہوتی ہیں میں ان کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں

(۱) "آلو کی ٹکیاں" اس میں لکھا ہے کہ اُبالے ہوئے آلو چھیل کر پیس لیجئے میرے خیال میں ٹھیک نہیں کیونکہ آلو جب پیس لئے جاتے ہیں تو ان میں لیس پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے اگر اس کی بجائے انہیں ہاتھ سے مسل لیا جائے تو بہت کم وقت لگتا ہے اور لیس پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) "ترئی کے کباب" اسمیں کہا گیا ہے کہ ترئی کے چھلکے ½ کلو اب آپ خود سوچئے کہ ½ کلو چھلکوں کے لئے کتنی ترئی خریدی جائے کیا یہ مناسب نہیں کہ ترئی کی کہ ترکاری کو چھیلا ہی نہ جائے ویسے ہی پکا لیا جائے کیونکہ ایسا تو اکثر گھروں میں ہوتا ہے والسّلام

احمد مصطفےٰ خاں، مالیر کوٹلہ

اس بار پیامِ تعلیم کا سرورق بڑا آرٹسٹک ہے مجھے فوٹوگرافی میں بالکل شُدبُد نہیں، لیکن اچھے فوٹو کیسے ہوں۔ اس کے بارے میں چند مضامین السٹریٹڈ ویکلی میں ضرور پڑھے ہیں۔ ان کی روشنی میں سرورق کا فوٹو بہت اچھے فوٹو میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کی اہم ترین خوبی یہ ہے کہ یہ بالکل فطری ہے۔ اور صاحبِ تصویر کی بے خبری کے عالم میں کھینچا گیا ہے اسکے چہرے کے جذبات اور بلّی کے بچے کے تاثرات غضب کے ہیں۔ اتنے خوبصورت اور لطیف سرورق کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ کتابت وطباعت بھی اس بار کافی صاف ستھری ہے۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے۔ آمین

ترتیب میں اس بار بھی تنوع کا بڑا خیال رکھا گیا اس میں کہانیاں بھی ہیں ناول بھی ڈراما بھی ہے اور نظمیں بھی۔ سفرنامہ بھی ہے اور معلوماتی وسائنسی

مضامین بھی غرض گلدستۂ پیام میں فن کار مالی نے رنگارنگ کے پھول سجائے ہیں اور انکی دلکشی اور خوشبو بڑی کشش انگریز و جان فزا ہے۔ خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے اور ہم پیامی اسی طرح آپ کے سجائے ہوئے علمی گلدستہ کی خوشبو و دلکشی سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

جمیل قریشی صاحب کا مضمون دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ پیام تعلیم کے لئے ان کی شرکت اور مسلسل قلمی معاونت کا دعلاوہ ایک نیک شگون ہے۔ خالد صاحب نے بھی ایک عرصہ کے بعد خبر لی اور اگلے مہینے انکا یہ مضمون شائع ہو رہا ہے۔ یہ خبر سائنس سے دلچسپی رکھنے والے بہتیرے پیامیوں کے لئے خوش کن ثابت ہو گی۔

چچا غالب کی نذر ایک چھوڑ تین تین نظمیں آپ نے کی ہیں۔ انکی رُوح خوش ہو گئی ہو گی بمفتون کوثری صاحب کی نظم میں صفحہ ۸ پر آخری شعر کی کتابت کچھ غلط ہو گئی ہے۔ دوسرا مصرع یوں لکھا ہے" دوسری بات یہ کہ بہت ساہو" میرے خیال میں اسے یوں ہونا چاہیئے" دوسری بات یہ بہت ساہو"

حافظ باقوی صاحب کا "پھول" خاصا خوشبودار اور دلکش ہے۔ ناول کی قسط کی کتابت کافی احتیاط سے ہوئی ہے۔ پھر بھی بعض جگہ چند الفاظ اتنے غلط لکھے گئے ہیں کہ مطلب ہی الٹا ہو جاتا ہے مثلاً صفحہ ۲۱ پر پہلے کالم کی تیئسویں (۲۳) سطر میں "مسرّت" خوشی کی جگہ "حسرت" کتابت ہو گئی ہے۔

"موسمی پیشین گوئیاں" خاصا معلوماتی ہے۔ اور محنت سے لکھا گیا ہے۔

سعید احمد رفاعی صاحب کی نظم "میٹھی ہماری بولی" بڑی دلکش اور میٹھی ہے۔ ایسی نظموں اور گیتوں کی بہت ضرورت ہے۔

ندیم صاحب کا ڈرامہ مختصر اور سبق آموز ہے۔ پسند آیا۔ بنگلہ دیش کی لوک کہانی کو اکبر رحمانی صاحب نے اردو کا لباس خوبی سے پہنایا۔ ایک جملہ پر مجھے اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں" راجا اپنی بدنامی کی تشہیر برداشت نہ کر سکا" اس کے بجائے اسے یوں بھی لکھا جا سکتا تھا۔" راجا اپنی بدنامی برداشت نہ کر سکا"

بدر وفا صاحب نے "او ہنری" کی کہانی "گفٹ آف میگی" کو اپنایا خوب ہے۔ لیکن اصل کہانی میں یہ دونوں شوہر و بیوی ہوتے ہیں۔ اور کرسمس کے موقع پر ایک دوسرے کو تحفہ دینے کی سوچتے ہیں۔ دوسرے بیلی اپنے بال فروخت کر کے پیٹر کے لئے گھڑی کی سنہری چین لاتی ہے۔ اور پیٹر گھڑی فروخت کر کے اس کے بالوں کے لئے کنگھے۔ لیکن دونوں کے تحفے ایک دوسرے کے لئے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں کی قربانی ایک دوسرے کے لئے محبت کا ایک مسرت بخش دور لے آتی ہے۔

بچوں کے اقبال اچھا مضمون ہے۔ لیکن تھوڑی اور محنت چاہتا تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی زیادہ مثالیں بھی۔ ہنسند کلھیا "مزیدار" رہے۔ "ادھر اُدھر سے" بہت معلوماتی آدھی ملاقات میں کئی فن کار ساتھیوں کے خطوط نظر نواز ہوئے۔ مہر صاحب اور سعید صاحب کو میرا ناول اور مضمون میلے کی سیر پسند آئے۔ انکا شکریہ۔

ہاں پچھلے شمارہ (جنوری ۱۹۷۸ء) میں محمود حسین

بقیہ صفحہ ۴۴ پر

# اِدھر اُدھر

## ایک انوکھی مچھلی :-

آپ نے جل پری کا نام سنا ہوگا - وہی مچھلی جس کا سر انسان کا باقی دھڑ مچھلی کا ہو - جل پری پر بہت سی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں ، بہت سی زبانوں میں لکھی گئی ہیں بچوں کے لئے خاص طور پر شاید تم نے بھی پڑھی ہوں پر یہ جل پری تو بالکل فرضی چیز ہے - انسان کے دماغ کی پیداوار

مگر اب ایک نئے قسم کی مچھلی کا پتہ لگا ہے اس کا اوپر کا حصّہ بالکل مچھلی جیسا ہوتا ہے - باقی حصّہ انسانوں جیسا - یہ مچھلی کیسے دریافت ہوئی ؟ اس کی کہانی بھی سن لیجئے :- متحدہ عرب ریاستوں میں ایک ریاست شارجہ ہے - اسی ریاست شارجہ کے قریبی سمندر میں اس عجیب مخلوق کا پتہ چلا تھا - پچھلے دنوں رات کے وقت ساحل کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں نے ساحل کے ریتیلے میدان میں ایک جوڑے کو ننگ دھڑنگ بیٹھے دیکھا - سپاہیوں نے انھیں انسان سمجھا اور للکارا مگر ان کی للکار کا جوڑے پر کوئی اثر نہ ہوا - سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنے رائفل کی لبلبی دبادی گولی ان میں سے ایک کے لگی اور دوسرا شاید گولی کی آواز سنتے ہی سمندر میں کود پڑا - سپاہیوں کے خیال میں یہ نر مچھلی تھی -

محافظ سپاہی بھاگ کر اس جگہ پر پہنچے تو اس انوکھی مخلوق کو دیکھکر اچنبھے میں رہ گئے - انہوں نے زخمی مچھلی کو تو اپنے قبضے میں کیا - اور نر کو تلاش کرتے کرتے رہے - مگر ناکام رہے - شارجہ کی حکومت نے نر کی تلاش کیلئے سرکاری انتظام کیا ہے اور اسے پکڑنے کے لئے انعام مقرر کیا ہے - مادہ مچھلی چند گھنٹوں میں ختم ہو گئی - اسے لندن بھیجا گیا ہے - تاکہ اسے دواؤں کے ذریعہ محفوظ کر لیا جائے - یہ مچھلی بعد میں شارجہ کے عجائب خانے میں رکھی جائے گی - ہفتہ وار سب ساتھ (۲ / مارچ ۸۴، ۱۹ ء) نئی دلی میں اس مچھلی کی تصویر بھی شائع ہو چکی ہے - (سب ساتھ - نئی دلی)

## یمن کی ایک خاتون ۲۴۰ سال سے زندہ و سلامت ہیں -

ابھی تک سب سے زیادہ معمّر لوگوں میں روس کے مسلموف کا نام آتا تھا یا پھر پاکستان کے مولانا عبدالصبور صاحب کا جن کا وطن قلات بتاتے ہیں - مسلموف کا پچھلے سال ۱۶۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا مولانا عبدالصبور صاحب کی عمر لگ بھگ ۱۵۷ سال ہے پچاس سے زیادہ حج کر چکے ہیں - مگر اب یمن (عرب) کی ایک خاتون کا پتہ چلا ہے - انکی عمر ۲۴۰ سال ہے -

(الجمعیۃ)

## حیرت انگیز بچّی کی پیدائش

بمبی ۲۷ - فروری - یہاں ایک انوکھی بچّی پیدا ہوئی اسکے دو دو سر ہیں - دو منھ ہیں دو ناک میں ہیں اور بھی چار آنکھیں ہیں - اسے ٹیوب کے ذریعے غذا دی جا رہی تھی جوں ہی اسکے پیدا ہونے کی خبر ہسپتال سے باہر پھیلی

بمبئی والے اسے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے - اتنا مجمع ہوگیا کہ پولیس کو بلانا پڑا - یہ بھی کل تیرہ گھنٹے زندہ رہی - بیچاری اتنی ہی عمر لائی تھی - (الجمعیۃ)

## بڑے سے بڑا، چھوٹے سے چھوٹا مینڈک

کہتے ہیں دنیا میں سب سے بڑا مینڈک برازیل میں پایا جاتا ہے - اس کی لمبائی ایک فٹ کے قریب ہوتی ہے سب سے چھوٹا مینڈک کیوبا کا مینڈک ہے - پورے مینڈک کا قد آدھے انچ کے برابر ہے - تبت میں سطح سمندر سے بیس ہزار فٹ اونچی چوٹی پر یہ مینڈک دیکھے گئے ہیں - گیارہ سو فٹ نیچی کان کے اندر بھی دیکھے گئے ہیں - سب سے زیادہ زہریلا مینڈک جنوبی کولمبیا میں پایا جاتا ہے اس کے ایک گرام زہر کا لاکھواں حصہ بھی ایک آدمی کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے - لال ہندی تیر کو اسی زہر سے تو زہریلا کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے -

## سگریٹ کا دھواں بھی خطرناک ہے

سگریٹ کے خلاف یورپ اور امریکہ میں برابر مہم چل رہی ہے - انگلستان میں ڈاکٹروں کی حفظانِ صحت کی جو کونسل ہے اس نے تحقیق کی ہے کہ سگریٹ کا دھواں بھی بہت خطرناک ہے - خصوصاً بچوں کے لئے - ویسے دھویں سے بھری ہوئی ہوا میں سانس لینا بچوں، بڑوں سب کے لئے خطرناک ہے -

(الجمعیۃ)

## کاغذ کی سلیٹ

آسام کی ایک ریسرچ لیبوریٹری نے کاغذ کی سلیٹ تیار کی ہے - کارڈ بورڈ پر ایک خاص کیمیکل یا مصالحہ لگا دیا جاتا ہے - اس سلیٹ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہلکی ہوتی ہے سستی ہوتی ہے اور پائیدار ہوتی ہے - جلد خراب نہیں ہوتی ہے - اس سلیٹ کی ہر جگہ تعریف کی گئی ہے - اور کہا گیا ہے کہ بچوں کے لئے نعمت ثابت ہوگی - (دعوت)

## مسلمانوں کے زمانے کی چند رصدگاہیں :- مرتبہ مولانا ابراہیم عمادی ندوی

۱ - رصدگاہ مامونی ۲۱۲ھ/۸۲۷ء مقام شماسیہ (بغداد)
۲ - رصدگاہ مامونی ۲۱۴ھ/۸۲۹ء مقام تاسیون (شام)
۳ - رصدگاہ بنوشاکر ۲۴۸ھ/۸۶۲ء (بغداد)
۴ - رصدگاہ فاطمی مقام کوہِ مقطم (قاہرہ)
۵ - رصدگاہ علاء الدولہ ۴۲۰ھ/۹۹۴ء مقام اصفہان -
۶ - رصدگاہ مسعودی ۴۲۱ھ/۹۶۵ء مقام غزنی
۷ - رصدگاہ رے ۳۶۹ھ/۹۸۰ء مقام رے (ایران)
۸ - رصدگاہِ شرف الدولہ ۳۷۷ھ/۹۸۷ء مقام بغداد -
۹ - رصدگاہِ ابنِ زرقال ۴۹۸ھ/۱۰۰۸ء طلیطلہ (اندلس)
۱۰ - رصدگاہِ سلجوقی ۵۲۸ھ/۱۰۷۸ء مقام اصفہان
۱۱ - رصدگاہِ مراغہ قائم کردہ ہلاکو خاں ۵۲۸ھ/۱۰۷۸ء (مراغہ آذربائیجان)
۱۲ - رصدگاہ ابن الحماد ۶۶۹ھ/۱۲۲۰ء مقام تیونس
۱۳ - رصدگاہ الغ بیگ ۸۶۹ھ/۱۴۸۲ء مقام سمرقند
۱۴ - رصدگاہِ فہاد شروانی ۸۶۹ھ/۱۴۸۲ء مقام ایران

(دعوت)

# اساتذہ کو ہندوستانی زبانوں کی تربیت

ہندوستانی زبانوں کے دس ماہ کے تربیتی کورس کے لئے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز کے مندرجہ ذیل علاقائی مراکز میں سند یافتہ اساتذہ کی درخواستیں مطلوب ہیں ۔ یہ کورس جولائی ۷۴ء کے پہلے ہفتے سے شروع ہوکر ۳؍ اپریل ۷۵ء کو ختم ہوگا ۔

۱ ۔ کنڑ، تامل، تیلگو اور ملیالم کے لئے : جنوبی علاقائی لسانی مرکز، مناساگنگوتری، میسور (کرناٹک)

۲ ۔ آسامی، بنگالی اور اوڑیا کے لئے : مشرقی علاقائی لسانی مرکز، لکشمی ساگر، بھونیشور (اڑیسہ)

۳ ۔ گجراتی، مراٹھی اور سندھی کے لئے : مغربی علاقائی لسانی مرکز، دکن کالج، پونہ (مہاراشٹر)

۴ ۔ کشمیری، پنجابی اور اردو کے لئے : شمالی علاقائی لسانی مرکز، پنجابی بھون پنجابی یونیورسٹی کیمپس، پٹیالہ (پنجاب)

**استعداد :** امیدوار کے لئے لازم ہے کہ وہ (اوّل) گریجویٹ (یا مساوی) استاد ہو اور کسی سرکاری یا نیم سرکاری ملازمت میں ہو ۔ (دوم) کم سے کم بی ۔ اے (یا اسکے مساوی) ڈگری رکھتا ہو ۔ (سوم) ۵ سال کا معلمی کا تجربہ رکھتا ہو ۔ (چہارم) عمر ۴۵ سال سے کم ہو اور (پنجم) جس زبان کی تربیت کا خواہاں ہو ۔ اس کی پہلے سے واقفیت نہ رکھتا ہو ۔ **ترجیح :** زبان اور سماجی علوم کے ان استادوں کو دی جائیگی جو زبان سیکھنے کے لئے موزوں ہونگے

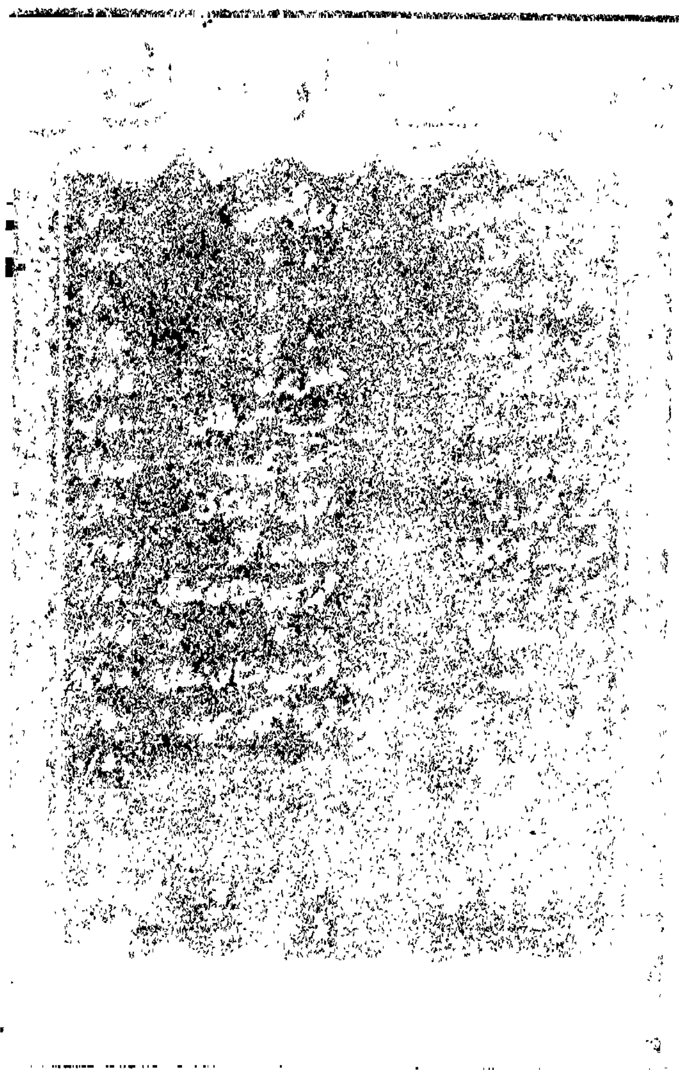
**مشاہرہ اور مراعات :** منتخب اساتذہ کو تنخواہ اور دوسرے الاؤنس متعلقہ مرکز سے دیئے جائینگے ۔ اسکے علاوہ انھیں مزید ایک سو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائیگا ۔ آمد و رفت کا کرایہ ریل، ضمنی خرچ اور یومیہ بھتہ ریاستی حکومتوں کے قواعد کے مطابق دیا جائیگا ۔

چوتھے پنج سالہ منصوبے میں کامیابی کے ساتھ تربیتی کورس ختم کرنے والے استادوں کو اس مدت کے لئے جس میں انہوں نے کم سے کم دس طالبعلموں کو زبان کی تعلیم دی، دو سالانہ ترقیوں کے برابر نقد انعام دیئے گئے تھے ۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے میں بھی ان مراعات کا جاری رکھنا حکومت کے زیر غور ہے ۔

امیدواروں کو اپنی درخواستیں ڈائرکٹر تعلیمات کی وساطت سے مندرجہ ذیل پتے پر اس طرح بھیجنا چاہئے کہ ۲۵ مارچ تک وہاں پہونچ جائیں ۔

ڈائرکٹر، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (وزارت تعلیم سوشل ویلفیر حکومت ہند) مانا سا گنگوتری، میسور ۶ ۔۔۔ ۵۷۰

DAVP. 511 (128)/73



# پیامِ تعلیم



ماہنامہ
# پیامِ تعلیم
نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۱ شمارہ ۶

اڈیٹر
## محمد حسین حسان ندوی

جون ۱۹۷۴ء

قیمت : ۷۰ پیسے
سالانہ چندہ : سات روپے

## فہرست مضامین



پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

# بچوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ارکانِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | ۱/۵۰ |
| آں حضرتؐ | الیاس احمد مجیبی (اردو) | ۰/۹۵ |
| پاک کہانیاں (دو حصوں میں) | مقبول احمد سیوہاروی | ۲/۳۵ |
| چار یار | الیاس احمد مجیبی | ۱/۳۰ |
| خلفائے اربعہؓ | خواجہ عبدالحی فاروقی | ۲/۲۵ |
| رسولِ پاکؐ | عبدالواحد سندھی | ۱/۸۰ |
| عقائدِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | ۰/۵۰ |
| مسلمان بیبیاں | مولانا اعجاز الحق قدوسی | ۰/۷۵ |
| نبیوں کے قصے | خواجہ عبدالحی فاروقی | ۱/۲۵ |
| ہمارے رسول | " " " | ۱/۶۵ |
| سرکارِ دو عالم | محمد حسین حسان | ۲/۷۵ |

## معلومات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آدمی کی کہانی | مشتاق احمد | ۱/۷۵ |
| انوکھا عجائب خانہ (چار حصے) | محمد حسین حسان | ۱/۸۰ |
| بجلی کی کہانی | علی احمد خاں | ۰/۵۰ |
| بڑے دادا کی کہانی | محمد عبدالغفور | ۰/۵۶ |
| تاریخ ہند کی کہانیاں (اول) | نجمہ سلطانہ | ۰/۸۰ |
| " " " (دوم) | ضیاء الرحمٰن | ۱/- |
| " " " (سوم) | مشتاق احمد اعظمی | ۱/۸۰ |
| " " " (چہارم) | " " | ۰/۹۵ |
| چٹانوں کی کہانی | محمد امین | ۱/۷۵ |
| خبر رسانی کے طریقے | رفیعہ منظور الامین | ۰/۸۵ |
| دنیا کے بچے | محمد حسین حسان | ۱/- |
| دہلی | ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی | ۱/۸۰ |
| رابندر ناتھ ٹیگور | صفدر حسین | ۱/۲۵ |
| سماجی زندگی (اول) | احمد پٹیل و غلام ابرار | ۰/۵۶ |
| " " (دوم) | " " | ۰/۸۱ |
| " " (سوم) | " " | ۰/۸۱ |
| سمندر کے کنارے | سلطانہ آصف فیضی | ۱/۳۰ |
| " " بچے | " " | ۲/- |
| میرا انیس | محمد حسین حسان | ۱/۲۵ |
| ہماری پارلیمنٹ | کیلاش چندر | ۱/۲۵ |

## کہانیاں، ڈرامے، ناول

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) (دو حصے) | | ۴/- |
| اس نے کیا کرنہ جانا (کہانیاں) | آصفہ مجیب | ۰/۳۷ |
| پریم کی جیت (ڈراما) | اسد اللہ کاظمی | ۰/۳۷ |
| تانبیل خاں (کہانی) | محمد حسین حسان | ۰/۳۰ |
| ترکوں کی کہانیاں (") | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | ۰/۵۵ |
| تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) | م۔ ندیم | ۱/۵۰ |
| تین اناڑی (") | عصمت چغتائی | ۱/۴۰ |
| چھپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی) | محمد معین | ۰/۳۵ |
| چنبیلی | محمد حسین حسان | ۰/۵۰ |
| ستاروں کی سیر (ناول) | کرشن چندر | ۱/۷۵ |
| کبڑے دادا (سچا ناول) | مجیب احمد خاں | ۱/۷۵ |
| لال مرغی (کہانی) | عبدالواحد سندھی | ۰/۵۰ |
| مزے چکھائیں گے (") | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | ۰/۳۵ |
| مزے دار پہیلیاں (پہیلیاں) | محمود علی خاں | ۰/۶۵ |
| ننھا ٹٹو (کہانی) | خورشید سلطان | ۰/۳۰ |

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

# بچّوں سے باتیں

مارچ سے مئی تک کا زمانہ ہمارے پیامیوں کے لیے بڑی مشغولیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ دن رات محنت اور نصابی کتابوں کے مطالعے سے کام ہوتا ہے۔ کیوں؟ پچھلے دنوں مدرسے میں جو پڑھا لکھا ہے، اس کی سالانہ جانچ ہوتی ہے جبھی تو ان اچھے بچّوں کا بھی جنھوں نے سال بھر شوق اور محنت سے پڑھا ہے کتابوں ہی کی طرف دھیان رہتا ہے۔

---

یہ سالانہ امتحان عموماً مارچ کے آخری ہفتہ سے شروع ہوتے اور مئی کے ہفتے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ پرچہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا امتحان کا نتیجہ بھی نکل آیا ہوگا۔ آپ سب لوگ کامیابی کی خوشی میں مگن ہوں گے اور بڑی چھٹیوں کے بعد اگلے درجے میں بیٹھنے کے خیال میں مست ہوں گے۔ ہماری طرف سے آپ سب کی خدمت میں مبارک باد۔ دلی مبارک باد۔

---

ان چھٹیوں میں آپ کا جی بے اختیار کھیل کود کی طرف مائل ہوگا۔ کچھ پیامی اپنے دور کے رہنے والے عزیزوں سے ملنے کے خواہش مند ہوں گے۔ ہماری تو بس اتنی خواہش ہے کہ ایسے میں وہ اپنے پیام تعلیم کو نہ بھولیں۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں میں اسے مقبول بنانے کی کوشش کریں۔

---

پچھلے پرچے میں ہم نے خوشی خبری سنائی تھی۔ اترپردیش اردو اکاڈمی نے اس قدر خوبصورت، شاندار کتابیں شایع کرنے پر۔ مکتبہ جامعہ کو دو ہزار روپیہ انعام دیا تھا۔ بہت سے قدر دانوں نے مکتبے کو مبارک باد کے خط بھی لکھے ہیں۔ مکتبہ جامعہ کو بجا طور پر اس کا مستحق قرار دیا ہے۔

---

مگر انعامی رقم ہمارے محترم جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کس مصرف میں لائے؟ مکتبے کے خزانے میں داخل کر دی؟ جی نہیں!

---

مکتبہ جامعہ کو جو سرخ روئی حاصل ہو رہی ہے، مکتبے کی ہر چار طرف واہ واہ ہو رہی ہے تعریفیں ہو رہی ہیں تو اس لیے مکتبہ کے کارکنوں نے مکتبے کو ترقی دینے میں، اس کے کاموں کو آگے بڑھانے میں رات دن ایک کر دیا ہے۔ انھی کی لگن، پرخلوص جدوجہد، لگاتار محنت کی بدولت مکتبہ اتنا آگے بڑھا ہے۔ ترقی کی اس منزل کو پہنچا ہے اور باوجود ہر قسم کی پریشانیوں کے خدا کا شکر ہے کہ اس کا ہر قدم آگے کی طرف ہے

---

اور کبھی اس بات کا سب سے زیادہ خیال خود شاہد صاحب کو تھا۔ موجودہ زمانے کی یہ ساری ترقیاں انھی کی رہنمائی میں تو ہوئی ہیں انھی کی اگوائی میں اس قافلے نے اپنے قدم تیز کیے ہیں۔ تو جناب انھوں نے کیا کیا کہ یہ ساری رقم اپنے ساتھیوں میں بانٹ دی۔ ساتھیوں کے ساتھ

ساتھ انھوں نے ان لوگوں کا بھی خیال رکھا جن سے مکتبے کے کاموں کو آگے بڑھانے میں مدد ملی ہے مثلاً ہمارے کاتب، خوش نویس حضرات مختلف پریس وغیرہ اور یہ شاہد صاحب کی فراخ دلی اور سیر چشمی کی بہت اچھی مثال ہے۔

---

پچھلے پرچے کے مضمونوں میں مونگے کا جزیرہ۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا سفرنامہ حجاز سہیل عظیم آبادی کی کہانی (غرور کا سرنیچا) مہر و رولوی صاحب کا ڈنکو بہت پسند کیے گئے اور بابل جمیل قریشی صاحب کا معلوماتی مضمون تو غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا افسوس ہے کہ اپنا اگلا مضمون وہ وقت پر نہ بھیج سکے بہت دلچسپ ہے۔

---

مونگے کا جزیرہ والی کہانی اپنی آخری منزلوں تک پہنچ رہی قسط ہوگی خلیق انجم اشرفی صاحب نے بڑے شوق اور دلچسپی سے اسے اپنا یا تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسی شوق اور دلچسپی سے یہ پڑھا بھی گیا۔

---

خلیق انجم کے خط سے یہ معلوم کرکے بڑی تشویش ہوگئی کہ ان کے والد صاحب پر اچانک دل کا دورہ پڑ گیا۔ آج کل اروِن اسپتال میں ہیں خلیق صاحب کے لیے یہ بڑی پریشانی کی بات ہے۔ خدا محترم بزرگ کو جلد صحت عطا فرمائے بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں۔ انسانیت شرافت اور اخلاق کا مکمل نمونہ ہیں۔ افسوس ہے کہ آج کل میں خود بیمار پڑا ہوں اس لیے ان کی خیریت معلوم نہ کر سکا۔

---

نظموں میں سورج کی کرن (ناوک حمزہ پوری) صاحب ایک تمہید (مسعودہ حیات) میرا کھارت (محبوب راہی) بہت ہی پسند کی گئیں۔

---

اس پرچے کے مضمونوں اور کہانیوں میں مونگے والی کہانی کے علاوہ ہمارے محترم امین صاحب کا مضمون پڑھیے یہ ہندوستان کے نہیں تمام دنیا کے موسم کے بارے میں ہے اور اس میں موسم کی آیندہ تبدیلیوں کی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں بہت اچھا، بہت معلوماتی مضمون ہے اور کسی انگریزی مضمون کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ امین صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اسے اپنایا ہے آپ کو پسند آئے گا۔

---

امین صاحب اگلے پرچے کے لیے بھی ایک دلچسپ مضمون لکھ رہے ہیں۔ یہ بھی جغرافیے پر ہی ہوگا۔ یہ بھی بہت انوکھا اور دلچسپ ہوگا۔

---

ڈاکٹر سید حامد حسین صاحب کا ایک مضمون اچھی اُردو کسی پچھلے پرچے میں چھپ چکا ہے۔ یہ اس کی دوسری قسط ہے ڈاکٹر صاحب نے بہت دیر میں بھیجی۔ اصل میں ہماری اردو زبان بہت سی زبانوں سے مل کر بنی ہے اس میں فارسی بھی ہے عربی اور ترکی بھی ہے ہندی تو ہے ہی۔ آپ ہندی سے، فارسی سے، عربی سے اچھی طرح واقف ہوں گے تو آپ کو اردو زبان پر بھی عبور ہو جائے گا۔

---

مہر و رولوی صاحب نے پچھلے پرچے کے لیے بہت دلچسپ مضمون لکھا آپ کو بہت پسند آیا تھا۔ اس پرچے میں بھی ان کا ایک کارآمد مضمون پڑھیے۔ ہماری لاپرواہی کی بدولت ایسے بہت سے حادثے ہوتے آتے رہتے ہیں اور جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ معلوماتی مضمونوں میں

بگ بین بھی بہت دلچسپ ہے ۔ امید ہے کہ قادری صاحب آئندہ بھی اس طرح کے مختصر معلوماتی مضمون مرحمت فرماتے رہیں گے ۔

---

کہانیوں میں "کھلونے والا" سب سے اچھا تحفہ اور دوسری کہانیاں پڑھیے ۔ پھر محترم نیر صاحب کی سیدہ عنوان چشتی کی نظمیں پڑھیے ایک نظم چھٹیوں کی سرگرمیوں پر پڑھیے یہ آپ کو خاص طور پر پسند آئے گی ۔

---

میری بیماری کا سلسلہ تو بہت دنوں سے چل رہا ہے آج کل طبیعت زیادہ خراب ہے دفتر بھی نہیں جا رہا ہوں اس لیے خطوط وغیرہ کے جواب میں تاخیر ہو جائے تو معذور تصور فرمائیں ۔

---

پچھلے پرچے میں مرحوم ارشاد الحق صاحب کے سلسلے میں ان کے بڑے صاحبزادے کا نام غلط چھپ گیا تھا صحیح نام عبید الحق ہے اور ان کے چھوٹے صاحبزادے کا نام چھوٹ گیا تھا ۔ ان کا نام جنید الحق ہے ٹیچرس کالج جامعہ میں استاد ہیں ۔ ★★

---

### لطیفہ

میاں قادر گوشت بھون رہے تھے ۔ اچانک پند بے تکلف ساتھی اُدھر آنکلے ۔ ایک صاحب ہنڈیا میں سے بوٹی نکال کر کھا گئے اور بولے "ہنڈیا پانی مانگتی ہے" ، دوسرے صاحب نے بھی یہی حرکت کی اور بوٹی کھا کر بولے "ہنڈیا مسالہ مانگتی ہے" اب تیسرے صاحب کیوں پیچھے رہتے بوٹی کھا کر بولے "ہنڈیا نمک مانگتی ہے" قادر میاں نے ہنڈیا کو جھانک کر اور منہ بسور کر بولے ۔ جی اب ہنڈیا گوشت مانگتی ہے "

ام عیسیٰ سنجر کلکتہ

---

حضرت افسر سیماب مرحوم

## خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں

(ذرا بڑے بچوں کے لئے)

درد جس دل میں ہو اس دل کی دوا بن جاؤں
کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دُکھ سے جلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں

---

اف وہ آنکھیں کہ ہیں بینائی سے محروم کہیں
روشنی جن میں نہیں ، نور جن آنکھوں میں نہیں
میں اُن آنکھوں کے لیے نور ضیا بن جاؤں

---

ہائے وہ دل جو تڑپتا ہوا گھر سے نکلے
اُف وہ آنسو ، جو کسی دیدۂ تر سے نکلے
میں اُس آنسو کے سکھانے کو ہوا بن جاؤں

---

عمر کے بوجھ سے جو لوگ دبے جاتے ہیں
ناتوانی سے جو ہر روز جھکے جاتے ہیں
ان ضعیفوں کے سہارے کو عصا بن جاؤں

---

خدمتِ خلق کا ہر سمت میں چرچا کر دوں
مادرِ ہند کو جنت کا نمونہ کر دوں
گھر کرے دل میں جو افسردہ دعا بن جاؤں



جناب محمد شفیع الدین نیّر

خدا کا شکر ہے کشمیر وادی کا چمن دیکھا
عجب اِس جنّتِ ارضی کا ہم نے بانکپن دیکھا

زمین کیا ہے حقیقت میں یہ جنت کا نمونہ ہے
یہ گہوارہ ہے فطرت کا یہ قدرت کا نمونہ ہے

زمین اور آسماں یوں تو جہاں جائیں وہاں ہوں گے
تکلّف برطرف، وہ دلنشیں ایسے کہاں ہوں گے

گل و گلزار ہوں گے یوں تو ایسے ہو نہیں سکتے
چمن ہوں، پھول ہوں، کشمیر جیسے ہو نہیں سکتے

ہے دیری ناگ یا تسنیم کے پانی کا سرچشمہ
یہ پانی کا نہیں ہے زندگانی کا ہے سرچشمہ

کہوں کیا چشمۂ شاہی کے پانی میں اثر کیا ہے
مقابل آئے اِس کے ایک قطرے کے گہر کیا ہے

یہ آبِ خضر سے تاثیر میں بھی اپنی بہتر ہے
جسے پینے کو مل جائے وہ قسمت کا سکندر ہے

عجب گلمرگ ہے دلکش، عجب اس کی فضائیں ہیں
عجب ہیں برف کے منظر، عجب ٹھنڈی ہوائیں ہیں

نہیں ڈل اور وُلر جھیلوں کا دنیا میں کہیں ثانی
یہ ہے وہ بات ہم ہی نے نہیں، دنیا نے ہے مانی

یہاں اِس جنّتِ ارضی میں آکر ہم نے کیا دیکھا
زمیں پر آسماں کا سا انوکھا ماجرا دیکھا

نگاہیں جس طرف اُٹھ جائیں نظارے نظر آئیں
اُبلتے حسن کے ہر سمت فوارے نظر آئیں

غرض نیّر ہے کچھ کھویا ہوا سا ان فضاؤں میں
عجب جادو ہے اِس کشمیر وادی کی اداؤں میں

بیسوں قسط

آر۔ایم ۔ بیلین ۔ ٹائن

تلخیص و ترجمہ : خلیق انجم اشرفی

# مونگے کا جزیرہ

## پھر اکیلے

جونہی لڑائی ختم ہوئی ، جنگلیوں نے ہمیں گھیر لیا حیران حیران نظروں سے ہمیں تکتے رہے اور ہم پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ ظاہر تھا کہ ہم ان میں سے ایک کا بھی جواب نہ دے سکے بہر حال اس بے مطلب سلسلے کو ختم کرنے کے لیے جیک نے سردار کا (جس کے زخم کسی حد تک بھر چکے تھے) ہاتھ تھام لیا اور اسے گرم جوشی سے ہلایا۔ کالوں نے جیسے ہی یہ دیکھا کہ یہ مصافحہ نیک خواہشات کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ انھوں نے بھی باری باری سے ہم سب سے اسی انداز میں مصافحہ شروع کر دیا۔

یہ سلسلہ ختم ہوا تو جیک اس لڑکی کی طرف دیکھنے گیا جو ابھی تک چٹان پر پڑی بے صبری سے یہ سب دیکھ رہی تھی وہ ابھی تک اپنی جگہ سے ہلی تک نہ تھی۔ جیک نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پھر سردار کا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف چلنے والا ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر اس غریب بچے پر پڑی جسے سمندر میں پھینک دیا گیا تھا اور ابھی تک ساحل پر اسی طرح پڑا تھا۔ سردار کا ہاتھ چھوڑ کر وہ بچے کی طرف لپکا۔ پیچھے وہ ابھی تک زندہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ ابھی تک زندہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس کی ماں بھی آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہی ہے۔

"ارے! ایک طرف ہٹو تم لوگ"، جیک نے ہمیں ایک طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔ (ہم اس غریب عورت پر جھکے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے) "میں ابھی اسے ہوش میں لاتا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بچے کو سینے پر لٹا دیا اور اس کے گال ماں کے گالوں سے لگا دیے۔ اس کا نتیجہ حیرت انگیز نکلا۔ عورت نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ بچے کو محسوس کیا۔ اسے دیکھا اور خوشی کی ایک چیخ کے ساتھ اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اسی لمحے اٹھنے کی کوشش کی، شاید جنگل کی طرف دوبارہ بھاگنا چاہتی تھی۔

"اب ٹھیک ہے"، جیک دوبارہ سردار کا ہاتھ پکڑے ہوئے بولا۔

"رالف اور پیٹرکن۔ اب تم دونوں ان عورتوں اور باقی لوگوں کو لے کر میرے پیچھے پیچھے گھر پہنچو۔ ہم انھیں کھانا کھلائیں گے۔

چند منٹ بعد جنگلی ہمارے مکان کے سامنے زمین پر بیٹھے دعوت اڑا رہے تھے۔ اور بھئی اس دعوت میں کھانا بھا سور تھا۔ کئی بطخیں تھیں۔ مچھلیاں۔ بے شمار ناریل

تھے، روئی کے درخت کے پھل تھے۔ یام۔ تارو، اور ڈھیر
سارے دوسرے پھل تھے۔

جس رغبت اور شوق سے جنگلی یہ ساری چیزیں کھا رہے
تھے اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان چیزوں کے عادی
ہیں اور انھیں پسند بھی کرتے ہیں۔

وہ لوگ ادھر کھانا کھانے میں مصروف تھے، ادھر ہم
لوگوں نے جو آج کے کام سے سخت تھک گئے تھے، سب ایک
ایک ناریل کا پانی پی کر اپنے کو بستروں پر گرا دیا اور جلد ہی گہری
نیند سو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگلیوں نے بھی ایسا ہی کیا اور
آدھے گھنٹے ہی میں ہمارا پورا کیمپ گہری نیند میں غافل
ہو چکا تھا۔

ہم کتنی دیر سوئے، میں نہیں بتا سکتا۔ اتنا ضرور معلوم
ہے کہ جب ہم لیٹے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور جب اُٹھے تو
وہ آسمان میں خاصا بلند ہو چکا تھا۔ میں نے جیک کو جگایا تو
وہ مارے حیرت کے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایک لمحے تک تو
یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ ہم کہاں ہیں۔

"اچھا تو اب،، وہ بولا " ذرا ناشتے کی فکر کریں،،
اے پیٹرکن۔ کیا مطلب ہے بھئی۔ کب تک اس طرح پڑے رہوگے
کاہل آدمی۔

پیٹرکن نے آنکھیں ملیں "اچھا،، اس نے نظر اٹھاتے
ہوئے کہا۔

"اوہ تو یہ دوسرے دن کی صبح ہے اور میں تو مستقل
یہی سوچ رہا تھا کہ یہ آج کی صبح ہے۔ ہیلو بوٹی۔ تم کہاں
سے آئی ہو؟ ارے! تم تو ایسا لگتا ہے جیسے اپنے گھر میں
براجمان ہو۔ خیر۔ ہاں۔ تم سے بات کرنے کی کوشش کرنا
تو ایسا ہی ہے جیسے کسی بلی سے،،

یہ آخری جملے دراصل ان دو عورتوں میں سے ایک کو
مخاطب کر کے کہے گئے تھے جو آکر ہمارے مکانوں کے سامنے
والی چٹان پر بیٹھ گئی تھی اور اپنے بچے کو اپنے پیروں کے
پاس ڈال کر رات کے بچے کھچے سور کا گوشت اڑانے میں
مصروف ہو گئی تھی۔

اسی اثنا میں باہر سوئے ہوئے سارے ہی جنگلی جاگ
چکے تھے اور ہمارا ناشتہ بھی تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ ناشتے
کے دوران ہم نے اشاروں کے ذریعے کئی بار جنگلیوں سے
بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایسے ٹھس تھے کہ ہماری
تمام کوششیں بیکار ثابت ہوگئیں۔ آخر ہم نے ان کے نام
معلوم کرنے کے لیے ایک طریقہ سوچا۔

جیک نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا اور بہت
صاف آواز میں 'جیک' کہا۔ پھر پیٹرکن اور پھر میری
طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے
کو تکنے لگا۔

سردار فوراً اس کی بات سمجھ گیا اور دو دفعہ "تارا رڈا"
جیک نے دہرایا اور سردار نے سر ہلا کر کہا "چک" یہ
لفظ سنتے ہی پیٹرکن ایک دم ہنس پڑا۔ جیک اس کی طرف
مڑا اور بولا "کاش! اس وقت مجھے تمھاری اس حرکت
پر غصہ آرہا ہے۔ کاش میرے چہرے سے بھی اتنے ہی
غصے کا اظہار ہوتا۔ تمھیں پتہ ہے یہ جنگلی یہ بات قطعی
پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان پر ہنسے،،

پھر وہ اس لڑکی کی طرف مڑا جو گھر کے دروازے پر
بیٹھی تھی اور اس کی طرف اشارہ کیا۔ "اواتیا،، سردار نے
کہا۔

اس کے بعد جیک نے ان جنگلیوں کو اپنے پیچھے آنے
کا اشارہ کیا اور اپنی کلہاڑی اٹھا کر اس طرف روانہ ہوا
جہاں لڑائی لڑی گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر ہم نے اپنے قیدیوں

کو دیکھا وہ ساری رات ساحل پر اسی طرح بندھے پڑے رہے
تھے۔ اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات کے سلسلے میں ہم انھیں
بالکل بھول چکے تھے۔ بہر حال اس سے ان کی حالت پر کوئی
خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس بات کا اندازہ ہم نے ان کے
ناشتہ کرنے کے انداز سے لگایا جو انھیں بعد میں دیا گیا۔

اب جیک نے ریت میں ایک سوراخ بنانا شروع کیا
اور چند لمحوں کی کھدائی کے بعد اس نے اس سوراخ یا گڑھے
کی طرف اشارہ کر کے پھر لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ جنگلی اس
کی بات فوراً ہی سمجھ گئے اور اپنے چپو اٹھا کر فوراً ہی
گڑھا کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ آدھے گھنٹے کی محنت
کے بعد وہ گڑھا اتنا بڑا ہو گیا کہ تمام مردے اس میں
سما سکیں۔

جنگلیوں نے پہلے اپنے مردوں کو اس میں ڈالا اور اس
کے بعد دشمنوں کی لاشوں کو اس میں اچھال اچھال کر پھینکنے
لگے۔ اُن کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اگر ہم ان سے نہ
کہتے تو شاید وہ یہ بیکار کی زحمت برداشت نہ کرتے۔ پیلے
بالوں والے سردار کی لاش سب سے آخر میں پھینکی گئی۔ وہ
بے چارہ شاید جیک کی لاٹھی کی اس ضرب سے جانبر ہو جاتا
جو جیک نے اسے آخر میں لگائی تھی اور اس نے گرنے کے
بعد لڑائی کے دوران ایک آدھ بار اٹھنے کی کوشش بھی کی
تھی لیکن اس کے دشمنوں میں سے کسی نے اسے حرکت کرتے دیکھ کر
لاٹھی کے ایک زوردار وار سے اس کا قصہ ختم کر دیا تھا۔

کشتی تیار ہو گئی تو ہم نے جنگلیوں کو اس میں اپنے قیدی
چڑھانے اور کھانے کا سامان لادنے میں مدد دی۔ پیٹرکن بھی
جنگل کی طرف سوروں کے شکار کو گیا اور ایک دو نہیں پورے
چھ شکار لایا۔ ہم نے انھیں پکا کر اپنے دوستوں کو ان
کی رخصت کے دن پیش کر دیا۔ اس دن تارارو نے بہت
اشارے کیے اور اشاروں کے بہت دیر کے تبادلے کے
بعد ہم سمجھ پائے کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ چلنے اور اپنے
جزیرے پر بسنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے
دل میں اس بات کی ذرہ برابر بھی خواہش نہ تھی اس [illegible]
ہم نے سختی سے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

ہم نے اسے لکڑی کی ایک تختی پر اپنے نام مزید کھود کر
دے دیے اور اس تختی میں ایک رسی بھی باندھ دی تاکہ وہ اس
تختی کو اپنے گلے میں لٹکا سکے۔

چند منٹ بعد ہم سب ساحل پر پہنچ گئے۔ ان جنگلیوں
سے بات تو کر نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے ان سب سے
ہاتھ ملائے اور یہ امید کی کہ اب وہ رخصت ہو جائیں گے
لیکن رخصت ہونے سے پہلے تارارو جیک کی طرف بڑھا اور
اس کی ناک سے ناک رگڑی اس کے بعد اس نے پیٹرکن اور
اور میرے ساتھ یہی حرکت کی، ہم سمجھ گئے یہ رخصت ہونے
کا ان کا طریقہ ہے۔ ہم نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور پارٹی
کے ہر آدمی سے ناک رگڑی۔ 'اواتیا' سب سے آخر میں
ہم سے رخصت ہوئی۔ جب وہ ہم سے رخصت ہونے
کے لیے ہماری طرف بڑھی تو ہمیں واقعی افسوس ہوا۔ اپنے مہذب طور
طریقوں کے علاوہ اس پارٹی میں وہ اکیلی ہستی تھی جس نے ہم سے رخصت
ہوتے وقت اداسی ظاہر کی۔

جیک کے قریب جا کر اس نے اپنی چھوٹی سی چپٹی ناک بڑھائی
تاکہ جیک اس سے اپنی ناک رگڑے اور اس کے بعد اس نے
پیٹرکن اور مجھ سے بھی اس انداز سے رخصت لی۔

ایک گھنٹے بعد ڈونگا ہماری نظروں سے اوجھل
ہو چکا تھا اور ہم بوجھل اور اداس دلوں کے ساتھ بالکل
خاموش اپنے مکان کے سائے میں بیٹھے پچھلے چند روز کے حیرت
انگیز اور بھیانک واقعات پر غور کر رہے تھے۔

دیکھیے کیا ہوا؟ جولائی کا پیام تعلیم پڑھیے۔

# حضرت افسر میرٹھی (مرحوم)

افسوس ہے کہ ۷ اپریل ۱۹۷۴ء کو سہ پہر کے وقت حضرت افسر میرٹھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے مرحوم بہت دنوں سے بیمار تھے۔ ایک ہفتہ پہلے لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے تھے وہیں انتقال ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ۔

اُردو پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی بچہ یا بڑا ہو جو افسر میرٹھی مرحوم کو نہ جانتا ہو۔ اب سے نہیں غالباً تیس چالیس سال سے اُردو کی کورس کی کتابوں میں ان کی کوئی نہ کوئی نظم ضرور ہوتی ہے۔ خصوصاً چاند والی نظم یا دعا والی نظم مرحوم نے آپ کے یعنی بچوں کے لئے اور بھی اچھی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

افسر مرحوم کا تعلق میرٹھ کے ممتاز اور مشہور مفتی خاندان سے تھا۔ کہتے ہیں ان کی ابتدائی تعلیم میں مولانا (ڈپٹی) نذیر احمد جیسے بزرگوں کا ہاتھ تھا۔

مرحوم کی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری بچوں کے جانے بوجھے اور مستند ادیب تو تھے ہی۔ اُردو ادب کے دوسرے شعبوں کی طرف بھی آپ نے پوری توجہ فرمائی۔ غزلیں لکھیں، نظمیں لکھیں، افسانے لکھے، ڈرامے لکھے۔ ادبی اور تنقیدی مضمون لکھے۔

مرحوم کی سب سے پہلی کتاب "پیام روح" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ اُن کی نظموں کا مجموعہ تھا کتاب بہت مقبول ہوئی اور ایک طرح سے ان کی شہرت کی بنیاد بنی۔ اس کے بعد ایک کتاب "ڈالی کا جوگ" چھپی یہ ان کے افسانوں کا مجموعہ تھا۔ پھر نظموں کا دوسرا مجموعہ "جوئے رواں" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے علاوہ تنقید کے سلسلے میں ایک کتاب "نقد الادب" اور ادبی مضامین کا ایک مجموعہ "نورس" شائع ہوا۔ یہ سب کتابیں عام طور پر بہت پسند کی گئیں اور افسر صاحب کی مقبولیت اور شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

[illegible] بتا چکا ہوں کہ انھوں نے [illegible] اور [illegible] طرف بھی توجہ فرمائی۔ یہ ان کا بڑا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مرحوم حضرت اسماعیل میرٹھی مرحوم کے ہم وطن ہیں۔ اور اسماعیل میرٹھی مرحوم ایک طرح سے بچوں کے ادب کے باوا آدم ہیں۔ افسر مرحوم نے حضرت اسماعیلؒ کے انداز کو اپنایا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بڑی خوب صورت نظمیں لکھی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ہمارے پرانے ساتھی اطہر پرویز صاحب (موجودہ لکچرر علی گڑھ یونی ورسٹی) نے "بچوں کے افسر" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اس کتاب میں پرویز صاحب نے مرحوم کی قریب قریب ان سبھی نظموں کو جمع کر دیا تھا۔ افسوس ہے کہ باوجود تلاش کے یہ کتاب نہ مل سکی۔

اردو میں جب ریڈروں کی تیاری کا کام شروع ہوا تو افسر مرحوم نے ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں مرحوم کے ساتھ مل کر بہت کام کیا تھا۔ عبادالرحمٰن خاں مرحوم اس وقت اُتر پردیش کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ افسر مرحوم نے اس وقت جو کچھ لکھا اس میں بچوں کی سمجھ بوجھ اُن کے مزاج اور شعور کا بہت لحاظ رکھا ہے۔

افسر مرحوم کی بہت سی نظمیں بچوں کی کورس کی کتابوں میں شامل ہیں۔ اب سے نہیں تیس چالیس سال سے ان کی دعائیہ نظم (دوا بن جاؤں شفا بن جاؤں) تو اب تک بہت سے مدرسوں میں خصوصاً جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں اکثر صبح کو ترانے کے طور پر گائی جاتی ہے بچے اسے ترنم سے گاتے ہیں تو کیا بچوں کیا بڑوں سب پر ایک عجیب اثر ہوتا ہے۔

۱۹۲۷ء میں جوبلی کالج لکھنؤ میں مرحوم کا تقرر اُردو کے استاد کی حیثیت سے ہوا اور یہیں سے لگ بھگ ۱۹۵۰ء میں ریٹائر ہوئے ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے قابل لوگ پیدا ہوئے محترم نورالحسن ہاشمی صدر شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونی ورسٹی بھی ان کے شاگرد رہ چکے ہیں انھوں نے اپنے استاد کی موت پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا

سیدّہ عنوان چشتی جامعہ نگر

# بچے کی دعا

دل کی پکار سُن لے اے دو جہاں والے
حاضر ہیں تیرے در پر ہم بچےّ بھولے بھالے
دل میں چراغ دیں کا جلتا رہے ہمارے
نیکی کا من میں دریا چلتا رہے ہمارے
اب دے ہمیں سہارا اپنا ہمیں بنا لے
دل کی پکار سُن لے اے دو جہاں والے

دل سے ہو دور اپنے دنیا کی ہر برائی
ہم سب کے کام آئیں، سب کی کریں بھلائی
اچھا ہمیں بنا دے دنیا بنانے والے
دل کی پکار سُن لے اے دو جہاں والے

علم و ہنر کی دولت یارب ہمیں عطا کر
ہم چاند بن کے چمکیں، عزّت ہمیں عطا کر
پھر کیسے گر سکیں گے، گر تو ہمیں سنبھالے
دل کی پکار سُن لے اے دو جہاں والے

اچھے ہوں کام اپنے ایسا ہمیں بنا دے
جو ہو سکے نہ ممکن تو کر کے وہ دکھا دے
ہم تیرے ہو گئے ہیں تو چاہے آزما لے
دل کی پکار سُن لے اے دو جہاں والے

جناب محمد امین ایم اے

# دنیا کا موسم اور اس کے متعلق پیشین گوئیاں

(ہندوستان ٹائمز کے ایک مضمون کو سامنے رکھ کر لکھا گیا)

نہ صرف ان لوگوں نے جن کی یادداشت اچھی ہے اور وہ پچھلے واقعات پچھلی تبدیلیوں کو یاد رکھتے ہیں بلکہ سائنس داں اور موسم کے ماہروں نے بھی جو اعداد و شمار اور دلیلوں کو سامنے رکھ کر بات کرتے ہیں، بہت حد تک یقین کرنا شروع کر دیا ہے کہ دنیا کا موسم بدل رہا ہے اور اس میں کافی حد تک الٹ پلٹ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ صحیح معنی میں موسم کیا صورت اختیار کرے گا۔ البتہ بہت ممکن ہے کہ موسم کی یہ تبدیلی ہمارے لیے خوشگوار ثابت نہ ہو۔

آئندہ موسم جو رنگ اختیار کرنے والا ہے صاف صاف لفظوں میں حقیقت یہ ہے کہ وہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر پیشین گوئی کے مطابق امریکا کی سرزمین میں طوفان اور سیلاب معمول سے زیادہ آئیں گے۔ افریقہ میں جو صحرائے اعظم کا علاقہ ہے۔ یعنی دنیا کا سب سے بڑا ریگستان وہ جنوب کی طرف اور کھسک جائے گا یعنی سوانا (گرم گھاس کے میدان) اور استوائی علاقہ کی طرف اس کے بڑھنے کی مسلسل کوشش جاری رہے گی۔ جہاں تک کہ ہمارے ملک ہندوستان کا تعلق ہے اس سلسلے میں خطرہ یہ ہے کہ آئندہ سالوں میں قحط ہم کو بار بار آگھیرے گا۔ ۱۹۶۰ء کے وسط میں جب کہ ہمارے ملک میں یکے بعد دیگرے دو قحط پڑے تھے تو عموماً لوگ یہ کہتے تھے کہ اس قسم کی مصیبت شاید ہمارے یہاں سو سال کے بعد آتی ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ موسم کی تبدیلی کے جو اعداد و شمار اور دلیلیں ہیں ان کو دیکھا جائے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے یعنی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں جو قحط پڑے تھے وہ یونہی الل ٹپ نہیں پڑ گئے تھے۔ دراصل ان کی پیشین گوئی پہلے سے کر دی گئی تھی اور وہ ہمیں آگاہ کر رہے تھے کہ یہ تو ابھی ابتدا ہے جیسے کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

موجودہ پیشین گوئی کے مطابق اب جو قحط پڑنے کا اندیشہ ہے وہ سو سال یا پچاس سال کے لمبے عرصے میں نہیں پڑے گا بلکہ دس سال یا زیادہ سے زیادہ بیس سال کے اندر اندر اس کا افتاد ہم پر پڑے گی اور اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ افتاد بہت خطرناک ثابت ہوگی۔

دنیا کے موسم میں جو تبدیلیاں آنے کے امکانات ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ جو خطرات لاحق ہیں ان کی وجہ سے امریکا میں خاصے لوگ خصوصاً موسم اور آب و ہوا کے علم۔ سے جن کا تعلق ہے بہت چونکنے، بہت بیدار ہو گئے ہیں اور موسم کی طرف توجہ زیادہ دے رہے ہیں۔ وہاں کا پڑھا لکھا طبقہ اور ماہرین، موسم کے نشیب و فراز پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔

جو پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہے ان پر قابو پانے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کر رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج سے دس سال پہلے ہمارے ماحول کو آلودہ کرنے کا جو مسئلہ ہے اس پر اس فن کے ماہرین غور کر رہے تھے یا پانچ سال پہلے طاقت حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں ان میں جو کمی پیدا ہونے کا سوال تھا اس پر غور کیا جا رہا تھا۔

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان نے بہت حد تک قابو حاصل کر لیا۔ ———— لیکن حال ہی امریکا میں جو بڑے بڑے طوفان اور خطرناک قسم کے سیلاب بار بار آئے ہیں ان کی وجہ سے موسم کے متعلق چھان بین اور تحقیقات اور بھی زور شور سے ہو رہی۔

مثال کے طور پر دریائے مسی سی پی (دنیا کا سب سے بڑا دریا) میں یکے بعد دیگرے دو سال خطرناک سیلاب آئے تھے۔ پھر دو سال پہلے جب ایک طوفان آیا تھا تو وہ بھی بڑا ہی خطرناک ثابت ہوا تھا اور امریکا کی کئی ریاستوں میں اس نے تباہی مچا دی تھی۔

اس کے بعد اپریل ۱۹۷۴ء کے پہلے ہفتے میں جو طوفان آیا تھا وہ بھی کچھ کم تباہ کن نہ تھا اور اس کی وجہ سے تین سو امریکی جنوبی اور وسطی مغربی ریاستوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ انسان کے لیے کیا یہ قدرت کی طرف سے کوئی چیتاونی تھی یا موسم کے ماہرین کے پاس اس کا کوئی سائنٹفک جواب ہے؟

موجودہ دور میں دنیا کے مختلف حصّوں میں ایک ہزار سے زیادہ ہوا اور پانی (موسم) کے دفتر کھل گئے ہیں۔ ان میں موسم کے ایک ایک پہلو کے متعلق اعداد و شمار جمع کیے جا رہے ہیں۔ پچھلے کئی دس سالوں کے اندر جو ریکارڈ اکٹھا کیے گئے ہیں ان کے مطالعے اور تحقیق کے بعد ماہرین نے جو رائے قایم کی ہے اس پر سبھی متفق ہیں اور وہ یہ کہ قدرت سیلاب اور طوفان بھیج کر جو امریکا میں بلا پہ بلا نازل کر رہی ہے اور ہندوستان اور ایتھوپیا قحط کی لپیٹ میں جو آ رہے ہیں وہ پیشین گوئی کے مطابق غلط نہیں ہیں۔

دنیا کا اوسط درجہ حرارت کچھ گھٹ رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساری دنیا کی آب و ہوا سرد ہو رہی ہے۔ البتہ یوں کہا جائے تو صحیح ہے کہ شمالی نصف کرہ کا درجۂ حرارت رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ اس کا ثبوت وہ مغربی ہوا ہے جو قطب شمالی کے ارد گرد زور شور کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ اس ہوا کی پیٹی کے کنارے پر ہوا کا دباؤ زیادہ رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے شمالی افریقہ کا موسم خشک اور بحر الکاہل کے اندر واقع جزیرہ ہوائی کا موسم غیر یقینی رہتا ہے اگرچہ وہاں زیادہ تر ہوا کا دباؤ کم رہتا ہے۔

موسم کے جو اعداد و شمار ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ہوا کی پیٹی کے کنارے کنارے باہر کی طرف زیادہ دباؤ کا جو خط ہے وہ بڑھ رہا ہے اور اس کے بڑھنے کی وجہ سے صحرائے اعظم اور جنوب کی طرف یعنی خطِ استوا کی طرف کھسک رہا ہے۔

آئندہ یہ ہوا کا دباؤ اور بڑھے گا اور زیادہ جگہ گھیرے گا اس طرح خشک ہوائیں جو سمندر کی طرف سے مغربی اور مشرقی افریقی ملکوں میں بارش لاتی ہیں مرطوب ہواؤں کو اندر نہیں آنے دیں گی یا جب مرطوب ہوائیں اندر آنے کی کوشش کریں گی تو خشک ہوائیں اپنے اثرات بڑھنے کی وجہ سے انہیں دھکیل دیں گی اور بڑی جد و جہد کے بعد جو معمولی سی نمی آ پائے گی وہ گرم ہوا کی تپش سے جل کر ختم ہو جائے گی۔

ان حالات کی روشنی میں اگر ہم براعظم افریقہ کے مختلف حصّوں میں موسم کی تبدیلی کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ پچھلے چھ سالوں (۱۹۷۴ء سے پہلے)

میں بارش کی مقدار نہ صرف کم ہوتی رہی ہے بلکہ زیادہ تر ہوئی ہی نہیں۔ وجہ؟۔ وجہ یہی ہے کہ صحرائے اعظم کے اثرات جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کیے جارہے ہیں۔ اور اس کی سمت سے چلنے والی گرم اور خشک ہواؤں کا زور دن دن بڑھتا جا رہا ہے۔

مغربی ہوا کی جو پیٹی ہے اس کے پھیلنے یعنی جس خطے میں وہ چلتی ہے اس خطے کے بڑھنے اور پھیلنے اور اس کے باہری کنارے پر ہوا کا جو دباؤ زیادہ رہتا ہے اس کے اور جنوب کی طرف کھسکنے کی وجہ سے دنیا کے ایک حصے میں قحط پڑتا ہے اور دوسرے حصے میں سیلاب آتا ہے۔ امریکا میں بھی موسم بدل رہا ہے اور یہ تبدیلی جنوب کی طرف زیادہ نمایاں ہے۔ اس طرح طوفان اور آندھیوں کا زور بڑھتا جا رہا ہے اور یہ نئے حصوں کو اپنی اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے حصوں میں بارش کی مقدار گھٹتی جا رہی ہے اور وقت پر اس کا ہونا غیر یقینی سا ہوتا جا رہا ہے۔

دنیا کا درجۂ حرارت کم ہو رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے اور سرد دور کے بعد گرم دور آیا ہے۔ ان دنوں جو سردی کا دور شروع ہوا ہے اس کی ابتدا ۱۹۴۵ء سے بتائی جاتی ہے۔ اس سے پہلے نسبتاً گرم دور تھا اور اس سے بہت پہلے یقیناً سردی کا دور دورہ تھا۔

آئس لینڈ جو شمالی بحر اوقیانوس میں سرد خطہ کے اندر واقع ہے وہاں موسم کے متعلق بہت کافی دنوں سے ریکارڈ کو پرکھ کر یہ تحقیق کی جا رہی ہے کہ درجۂ حرارت بدلتا ہے یا نہیں؟ پچھلے ریکارڈ سے واضح طور پر یہ نمایاں ہے کہ وہاں جب وائکنگ نام کی ایک قوم کے کچھ لوگ بہت پہلے آئے تھے تو آب و ہوا گرم تھی لیکن جب سولھویں صدی شروع ہوئی تو درجہ حرارت گرنے لگا اور سرد دور کا زمانہ آگیا۔

درجہ حرارت میں کمی بیشی آخر کیوں ہوتی ہے؟ یعنی دنیا میں کبھی سرد دور اور کبھی گرم دور کیوں آتا رہتا ہے؟ اس کے متعلق سائنس دانوں اور موسم کے ماہرین کی کوئی متفقہ رائے نہیں ہے۔ امریکا میں ماہرین کی رائے یہ ہے کہ درجۂ حرارت کے اتار چڑھاؤ کا تعلق آتش فشاں پہاڑوں کے ساتھ ہے۔ کوہ آتش فشاں جب پھٹتے ہیں اور اُن کے مادے فضا میں جا کر ملتے ہیں خصوصاً بہت زیادہ راکھ اور گرد و غبار اوپر پہنچ کر فضا میں بکھر جاتی اور اس کی ایک اچھی خاصی ایک تہہ قایم ہو جاتی ہے جو سورج کی کرنوں کو اپنے اندر جذب کر کے اس کی گرمی کو روک لیتی ہے۔

بیسویں صدی کے شروع کے نصف دور میں ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نسبتاً آتش فشاں کا زور ساری دنیا میں کم رہا ہے۔ اسی لیے شمالی نصف کرہ میں لگ بھگ ۱۹۴۵ء تک گرم دور تھا۔ ۱۹۵۵ء کے بعد یقینی طور سے آتش فشاں نے پھر سے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے اور بہت سے آتش فشاں پہاڑ جو بیسیوں سال سے خاموش پڑے تھے ایک دم سے ان میں جان آگئی ہے یا وہ بیدار ہو گئے ہیں اور انھوں نے آگ، لاوا، راکھ دھول اور مٹی نکالنا شروع کر دیا ہے۔

انسان کی اس ترقی کے دور میں ایک نقطہ اور بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

جو سرد دور شروع ہوا ہے۔ انسان دانستہ یا نادانستہ طور پر خود بھی اس میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس طرح کہ انسان اپنی فضا کو مکدر کرتا جا رہا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ صنعتی انقلاب نے ایسی صورت اختیار کی کہ دنیا کے مختلف حصوں

میں بہت سارے کارخانے اور ملیں بننا شروع ہو گئیں اور ان کا دھواں اور گیس فضا میں جا کر ہماری خالص اور صاف ستھری ہوا کو مکدّر کرنے لگا۔ اس کے جلد ہی بعد جیسا کہ اعداد و شمار صاف کرتے ہیں دنیا میں درجۂ حرارت رفتہ رفتہ نیچے کی طرف آنا شروع ہو گیا۔

شمالی نصف کرہ کے ان ملکوں کے لیے جو سال بھر گرمی کی تپش اور گرم ہوا کے جھونکوں میں جھلستے رہتے ہیں، آب و ہوا کا سرد ہونا یقیناً باعثِ مسرت اور خوشگوار ثابت ہو سکتا ہے لیکن بھلا ہماری ایسی قسمت کہاں؟ ہمارے ملک ہندوستان میں آب و ہوا سرد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قحط بڑھ جائے گا۔

بیسویں صدی کے شروع میں جب درجہ حرارت بڑھ رہا تھا تو ہندوستان میں بارش کئی سال ٹھیک سے نہیں ہوئی اس طرح پانی کی جگہ جگہ کمی رہی بلکہ بعض علاقوں میں قحط بھی پڑے۔

اب جو سرد دور شروع ہوا تو حالات بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے بلکہ ہمارے پہلے کے مقابلے میں حالت اور پریشان کن رہے گی۔ آب و ہوا کے ماہر ایک ڈاکٹر ہیں ریڈ برائسن۔ وہ امریکا کی ایک درسگاہ وس کانسن میں کام کرتے ہیں اور دنیا میں موسم کی جو تبدیلی ہو رہی ہے اس کی چھان بین کے لیے وہ ادارہ کا شعبہ پیش پیش ہے۔ ڈاکٹر ریڈ کو پکا یقین ہے کہ ان دنوں آتش فشاں کا زور بڑھ جائے گا اور کارخانوں اور فیکٹریوں میں زبردست اضافہ ہونے کی وجہ سے دنیا کے درجۂ حرارت میں کمی ضرور آئے گی۔ اس کمی کے ساتھ ساتھ دس سال کے اندر اندر بارش کئی بار قلیل ہو گی۔ ادھر ہماری مجموعی آبادی بڑھ کر کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔

ان باتوں کی وجہ سے ہمارے لیے بڑی زبردست آزمائش کا دور آنے والا ہے۔ ڈاکٹر ریڈ کا کہنا ہے کہ: "ہم ہندوستانیوں کے لیے مستقبل امید افزا اور شاندار نہیں ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جلد ہی آب و ہوا میں ایسی زبردست تبدیلی ہو جائے کہ ہمارا سارا ڈھانچہ خدانخواستہ تہس نہس نہ ہو جائے۔

---

بقیہ افسر میرٹھی مرحوم صفحہ سے

کہ ان کے انتقال سے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ لکھنؤ کے اور بڑے بڑے لوگوں مثلاً عبدالاحد خلیل (سابق استاد اُردو لکھنؤ یونیورسٹی) جناب صباح الدین عمر (سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی) لکھنؤ مشہور شاعر حضرت امین سلونوی وغیرہم نے ان کی دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

ہم نے ابھی بتایا ہے کہ مرحوم افسر میرٹھی نے ساری عمر ادب کی خدمت میں گذار دی اور اس خدمت کے صلے میں انھوں نے کبھی صلے کی اور ستائش کی پرواہ نہیں کی غرض مرحوم کی موت سے اُردو کا خصوصاً بچوں کے ادب کا بہت بڑا محسن ہم سے رخصت ہو گیا۔ ہم مرحوم کی ایک دو نظمیں اسی پرچے میں کسی اور جگہ شائع کر رہے ہیں۔

---

## لطیفہ

نعیم: میرے ابّا بہت ہی طاقت ور ہیں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

احمد: اچھا! بھلا وہ کیسے؟

نعیم: دادی اماں کہتی تھیں "بچپن میں جب تمھارے ابّا روتے تھے تو سارے گھر کو سر پہ اٹھا لیتے تھے۔

(آفتاب)

جناب شکیل فرحت ۔ اندور

# کھلونے والا

"آیا رے کھلونے والا
کھیل کھلونے لیکے آیا رے"

گلی میں کھلونے والے کی بہت ہی بھلی اور دلکش آواز گونجی اور تمام بچے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر کھلونے والے کے اردگرد جمع ہوگئے ایک بھیڑ سا اکٹھا ہوگئی دوسرے بچے بھی کھیل چھوڑ کر اس بھیڑ میں شامل ہوگئے۔ کھلونے والے کے پاس طرح طرح کے کھلونے تھے۔ یہ کھلونے وہ سب بچوں کو دکھا رہا تھا۔

دیکھو بچو! یہ چابی سے چلنے والی ریل گاڑی ہے، یہ موٹر کار ہے یہ بھی چابی سے چلتی ہے، یہ ہوائی جہاز ہے، یہ راکٹ ہے۔ یہ بیلی کاپٹر ہے۔ یہ ہاتھ پاؤں چلانے والی گڑیا ہے۔ یہ بینڈ بجاتا ہوا بھالو ہے۔ یہ ناچتا ہوا مور ہے۔ یہ گڈا ہے۔ اس میں ہوا بھری ہے۔ یہ بندوق ہے۔ یہ ٹینک ہے۔"

یہ کھلونے وہ سب بچوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر دکھا رہا تھا اور بچے بھی دلچسپی سے کھلونے دیکھ رہے تھے جنہیں خریدنا تھا وہ خرید بھی رہے تھے۔

کھلونے والے کا روز کا یہی معمول تھا۔ وہ روزانہ اپنا رنگ برنگے کاغذوں کی مدد سے سجا ہوا ٹھیلا لے کر آتا جو مختلف قسم کے چھوٹے بڑے کھلونوں سے بھرا رہتا۔

وہ ہمارے محلے میں کچھ ہی دنوں سے آنے لگا تھا اور محلے کے بچوں میں بہت جلد گھل مل گیا تھا۔ جیسے ہی وہ گیت گاتا ہوا آتا تمام بچے اس کے پیچھے لگ جاتے پھر وہ بچوں کو مختلف کھیل دکھاتا۔ کبھی اپنے چہرے پر خوفناک اور ڈراؤنا چہرہ لگا کر بچوں کو ڈراتا۔ کبھی اپنے سر پر لمبا سا ٹوپ لگا کر اور جوکر بن کر بچوں کو خوب ہنساتا۔ محلے کے بچے اس سے بہت خوش تھے۔

ایک دن شام کے تقریباً چھ بجے تھے۔ کھلونے والا جا چکا تھا۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا کہ رام آتا دکھائی دیا۔ رام ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر رہتا تھا۔ بےحد خوش مزاج تھا۔ ہمیشہ قہقہے لگاتا رہتا لیکن آج کچھ پریشان سا نظر آرہا تھا۔ اس نے قریب آتے ہی پوچھا

"خالد تم نے میرے بھائی شیام کو تو کہیں نہیں دیکھا"

"نہیں۔ رام مجھے تو نظر نہیں آیا۔ کیوں کیا بات ہے کچھ پریشان سے نظر آرہے ہو"

"ہاں خالد شیام کو ڈھونڈ رہا ہوں نہ جانے کہاں چلا گیا"

"کتنی دیر سے غائب ہے" میں نے پوچھا۔

"بس سکول سے آتے ہی کھلونے والے کے پیچھے چلا گیا تھا"

رام کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہیں بچوں کے اغوا میں کھلونے والے کا ہاتھ تو نہیں؟ یہ ایک عجیب

بات تھی کہ جب سے کھلونے والا آنے لگا تھا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سے چھوٹے بچوں کے اغوا کی واردا تیں شروع ہو گئی تھیں۔ پولیس بھی پریشان تھی کہ آخر یہ کام کون کر رہا ہے؟ خیال تھا کہ کوئی بہت منظم گروہ یہ کام کروا رہا ہے ابھی تک جتنے بھی بچے اغوا ہوئے تھے پولیس ان کا کوئی سراغ نہ لگا سکی تھی۔

یہ وارداتیں کھلونے والے کے آنے کے بعد سے شروع ہوئی تھیں اس لیے محلّے والے بھی اس ہی پر شک کرتے تھے لیکن اس کے چہرے سے تو ایسا بالکل نہ لگتا تھا کہ ایسا خطرناک کام کر سکتا ہے۔ بہت ہی سیدھا سادا اور بھولا بھالا آدمی تھا۔

میرے پاس سے جانے کے بعد رام کمار کے پاس گیا۔ کمار محلّے والوں کے لیے ایک پراسرار شخص تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کمار کا کھانے کمانے کا ذریعہ کیا ہے۔ وہ ایسا کیا کام کرتا ہے جو اتنے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ کمار اپنے چھوٹے لڑکے رمیش کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اسے رمیش سے [illegible] ماں کا ہو گیا تھا بہت محبت تھی۔ لیکن کچھ ہی [illegible] سے رمیش بھی لاپتہ ہو چکا تھا۔

رام نے کمار سے پوچھا۔

"کیوں کمار تم نے کہیں میرے بھائی شیام کو دیکھا؟"

"نہیں میں نے تو کہیں نہیں دیکھا۔" کمار نے جواب دیا۔

"نہ معلوم کہاں چلا گیا۔" رام نے مایوسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"کتنی دیر سے نہیں [illegible]"

"سکول سے آتے ہی کھلونے والے کے پیچھے لگ گیا تھا بس جبھی سے اس کا پتہ نہیں چلا۔ نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈ آیا۔"

"(کچھ سوچ کر) ارے ہاں یاد آیا۔ میں نے اسے تقریباً پانچ بجے کھلونے والے کے ٹھیلے پر بیٹھا دیکھا تھا۔"

"کھلونے والے کے ٹھیلے پر" رام نے چونکتے ہوئے کہا۔ "کہیں وہی تو میرے بھائی کو نہیں لے گیا؟"

"میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے جو بات دیکھی تھی وہ تمھیں بتا دی۔"

"نہیں کمار اب مجھ کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ بچوں کے اغوا میں ضرور اس کھلونے والے کا ہاتھ ہے۔ بچوں کو بہلا پھسلا کر لے جاتا ہو گا۔ کل آنے دو کمبخت کو مار مار کے اپنے بھائی کا پتہ پوچھوں گا۔" رام نے غصّے سے کہا۔

"لیکن رام بغیر جانے بوجھے تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ بچوں کا اغوا یہی کھلونے والا کرتا ہے۔"

"یہ میں نہیں کہہ سکتا کمار لیکن کل تم دیکھنا۔ میں اس سے سب قبول کرا لوں گا۔"

"رام اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو پھر میں بھی تمھارا ساتھ دوں گا مجھے بھی اپنے رمیش کو واپس لانا ہے۔"

"اچھا کمار اب میں چلتا ہوں۔" رام کے جانے کے بعد کمار کے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ ایک پراسرار مسکراہٹ۔

دوسرے دن کھلونے والا آیا تو رام نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ بچے ڈر کے مارے بھاگ گئے

"بتاؤ میرا بھائی شیام کہاں ہے؟" رام نے اس کا

گریبان تھامے ہوئے کہا۔

"بھلا مجھے کیا پتہ تمھارا بھائی کہاں ہے" کھلونے والے نے حیرانی سے کہا۔ محلے کے اور لوگ بھی آ گئے۔ کمار بھی آ گیا۔

"جھوٹ بولتے ہو تمھیں نہیں معلوم۔ کل شام کو اُسے میں نے تمھارے ٹھیلے پر بیٹھا دیکھا تھا۔" کمار نے آتے ہی کہا۔

"ارے بھئی سچ کہتا ہوں، مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہے کل تو وہ مجھے نظر ہی نہیں آیا"، کھلونے والے نے سیدھے سادے لہجے میں کہا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے"، اتنا کہہ کر کمار نے اس کے گال پر ایک زور کا تھپڑ مار دیا۔ کھلونے والا تھپڑ کھا کے گر گیا۔

"بتا کہاں ہے شیام، کہاں ہے میرا رمیش"

کھلونے والا چپ رہا "نہیں بتاتا" اور پھر کمار نے اسے بُری طرح پیٹ ڈالا یہ دیکھ کر محلے کے اور چند نوجوان بھی کھلونے والے کو مارنے لگے۔ رام نے بھی اسے بہت مارا بچارے کو مار مار کر ادھ مرا کر دیا اور لے جا کر کوتوالی چھوڑ آئے۔

بچے حیران حیران سے کھلونے والے کو پٹتے دیکھتے رہے۔

دوسرے دن بھی کھلونے والا نہیں آیا اور آتا بھی کیوں کر وہ تو بیچارہ کوتوالی میں بند تھا۔

بچے کھلونے والے کے نہ آنے کی وجہ سے بے حد اداس رہے۔ اتنے مختصر سے دنوں میں انھیں کھلونے والے سے ایک لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ محلے میں ایک ویرانی سی چھائی رہی۔

رات کے تقریباً آٹھ نو بجے تھے۔ سردی کا موسم تھا ٹھنڈ بہت زیادہ تھی۔ اسی لیے سڑکیں، گلیاں اتنی جلد سنسان ہو گئیں تھیں۔ اچانک فضا میں آواز گونجی۔

"پکڑو، پکڑو جانے نہ پائے"، ارے لیجیے آناً فاناً تمام گھر کے لوگ باہر نکل آئے۔ میں بھی باہر آ گیا باہر تاریکی تھی۔ باہر کی روشنی آج بند تھی۔ ہمیں دو سائے بھاگتے نظر آئے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں پیچھے دوڑنے والے سائے نے آگے والے کو پکڑ لیا۔ اتنی دیر میں اور سب لوگ بھی اُن کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ اُنھیں سب نے قریب سے دیکھا تو صاف نظر آ گئے ایک رام تھا اور دوسرا کمار تھا۔ رام نے کمار کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"کیا ہوا بھئی تم کمار کو کیوں پکڑے ہو؟" بھیڑ میں سے کسی نے پوچھا۔

"ارے یہ ایک بچے کو بہلا پھسلا کر لے جانا چاہتا تھا کہ میں وہاں پہنچ گیا۔ یہ مجھے دیکھتے ہی بھاگا لیکن میں نے اسے پکڑ لیا۔ یہی وہ شخص ہے جو بچوں کو اغواء کرتا ہے" رام نے کہا۔

"ہاں اسی لیے یہ کھلونے والے کو مارنے میں پیش پیش تھا۔ یہ اپنا جرم اس کے سر تھوپنا چاہتا تھا" میں نے کہا۔

"لیکن اس کا لڑکا بھی تو غائب ہے" کسی نے کہا۔

"ارے جناب اپنے لڑکے کو تو اس نے جان بوجھ کے غائب کیا ہو گا۔ تاکہ اس پر کوئی شک نہ کر سکے"

"ہاں ہاں بالکل یہی بات ہوگی" سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"جبھی تو ہم سوچتے تھے کہ آخر یہ کام کیا کرتا ہے آج اس کی ساری قلعی کھل گئی"

سب محلے والے مل کر کمار کو بھی کوتوالی لے گئے۔ وہاں جب کمار پر "تھرڈ ڈگری" آزمائی گئی تو کمار نے سب کچھ قبول دیا۔" اس کا تعلق ایک گروہ سے ہے جو بچوں کو اغوا کرتا ہے اور انھیں اپاہج اور معذور بنا کر ان سے بھیک منگواتا ہے۔ انھیں اندھا، لولا، لنگڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ اُن پر رحم کھا کر لوگ زیادہ سے زیادہ بھیک دیں۔"

کمار کی نشان دہی پر پورے گروہ کو گرفتار کر لیا ان کے اڈے پر بھی قبضہ کر لیا۔ جہاں سے کئی بچے نکلے۔ بچے "ابھی تک سلامت تھے۔ انھی میں رام کو اپنا بھائی شیام بھی مل گیا۔

کھلونے والے کو پولس نے چھوڑ دیا۔ رام نے اس سے معافی مانگ لی اور لوگوں نے بھی جنھوں نے اسے بُری طرح مارا تھا۔ کھلونے والے نے سب کو خوش دلی سے معاف کر دیا۔

اور آج پھر گلی میں کھلونے والے کی مدھر اور میٹھی آواز گونج رہی تھی۔ آج وہ اپنا گیت اور بھی شاندار آواز میں گا رہا تھا۔

" آیا رے کھلونے والا
کھیل کھلونے لے کے آیا رے "

---

★ گناہ نافرمانی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو (ق)
★ تیرے رب کی مغفرت کا دامن بہت وسیع ہے۔ (ق)
★ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہیں گن سکتے (ق)
★ ہر بھلی بات ایک صدقہ کا ثواب رکھتی ہے (ح)
(رشیرالدین شیرکوٹی)

# نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

۱۔ بابلو (حصہ اوّل) مصنف: بسم فری ٹاس مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ بابلو (حصہ دوم) " " " "
۳۔ کشمیر مصنف: مالا سنگھ مترجم: خدیجہ بیگم تصویریں: پرمانند
۴۔ پرندوں کی دنیا مصنف: جمال آرا " : محمد شفیع الدین نیرؔ
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر " : بریگیڈیر گیان سنگھ مترجم: محمد ذاکر
۶۔ ہمارے ندیوں کی کہانی " : لیلا مجمدار " : رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ ہیمنت کی سیر اور دوسری کہانیاں " : لیلا کھاگوت " : " "
۸۔ رسیلی کہانیاں " : منوج داس " : صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی (حصہ اوّل) " : وشنو پربھاکر " : انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں " : جگ جیت سنگھ " : حرمن ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح " : کے سی کھنہ تصاویر: کرشن [illegible]
۱۲۔ [illegible] ناٹک کھیلیں " : اوما شنکر مترجم: رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ [illegible] کی خوراک " : منوہر داس چترویدی " : محمد شفیع الدین نیر
۱۴۔ [illegible] (حصہ اوّل) " : [illegible] جوشی " : رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانی مصنف: راجندر اوستھی مترجم: انور کمال حسینی
۱۶۔ روہنت و نندیہ " : کرشن چینیہ " : " "
۱۷۔ سدابہار کہانیاں " : شانتا رنگا چاری " : " "
۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی " : میر عنایت علی " : سیّد احسان
۱۹۔ " " (دوم) " : " " : "
۲۰۔ بڑا پانی " : لیلا مجمدار " : صالحہ عابد حسین
۲۱۔ مورا " : ملک راج آنند " : انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل " : سریندر رسانیال " : پریتم لال

## ذاکر حسین سیریز

۲۳۔ ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت: ۳/۰
۲۴۔ انوکھی دکان " : قدسیہ زیدی " : ۲/۵۰
۲۵۔ گلابو چوہیا اور پیڑا نہ " : " " : ۲/۰
۲۶۔ دنیا کے جانور " : " " : ۲/۵۰
۲۷۔ راجہ موہن رائے " : عرش ملسیانی : (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ — اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ — پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مصنف: ای - بی - بورڈے
ترجمہ: مہر بریلوی

# پالتو جانوروں سے ہوشیار!

یہ کسی بلدیہ یا میونسپلٹی کا اعلان نہیں ہر ہنی کے ایک قابل اور ہمدرد انسانیت ادیب کے گرانقدر مضمون کا عنوان ہے جس کا آپ کے لیے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (مہر)

ایک خوبصورت بچہ ـــــ ماں کے شانے پر اپنا سر رکھ کر کیا ہنس رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ اداسی تھی ـــــ وہ صبح سے چڑچڑا بن گیا تھا۔ اور رہ رہ کر چونک پڑتا تھا جیسے کسی بھیانک چیز سے ڈر گیا ہو۔ وہ ڈر کر اپنی ماں سے لپٹ جاتا تھا ـــــ اس لیے فکرمند ماں اسے معائنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے آئی تھی۔ ڈاکٹر نے ابتدائی معائنہ کیا کسی بیماری کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ البتہ بچہ ہر دس بیس منٹ بعد لرز کر ماں سے لپٹ جاتا تھا اور اسے عضلوں سے تڑپتا تھا۔ ڈاکٹر کے سامنے بھی اس نے یہی حرکت کی۔ ڈاکٹر نے نرس سے تھوڑا سا پانی منگوایا۔ پانی کا نام سنتے ہی بچہ کی چیخ نکل گئی اور جب پانی سے بھرا برتن اس کے سامنے رکھ دیا گیا تو ایک دردناک چیخ کے ساتھ وہ بلبلا اٹھا۔

ڈاکٹر نے جو کچھ جاننا تھا جان لیا۔ انھوں نے بچہ کی ماں سے سوال کیا۔ "کیا تمھارے گھر پلا ہوا کتا ہے؟"

"ہمارے گھر میں تو نہیں لیکن پڑوس کا کتا کبھی کبھی ہمارے ہاں ضرور آتا ہے۔" ماں نے جواب دیا

"کیا اس بچے کو اسی کتے نے کاٹ کھایا ہے؟ وہ کتا فی الحال کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"وہ کتا کئی دن سے نظر نہیں آیا۔ ہاں اس نے بچے کو معمولی طور پر کاٹ لیا تھا۔ بچہ اسے روٹی کا ٹکڑا کھلا رہا تھا اور اتفاق سے کتے کے دانت بچے کے ہاتھ میں لگ گئے تھے" ماں نے کہا.... "لیکن اب وہ کتا نہیں نظر نہیں آتا" پھر رک کر ماں امید بھری نظر سے ڈاکٹر کا منہ تکنے لگی۔ لیکن خود ڈاکٹر صاحب اداس ہو کر اس بچے اور اس کی ماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صرف ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ موجودہ تمام ڈاکٹری علم مجبور تھا ـــــ کوئی اس بچے کو بچا نہیں سکتا تھا۔

اس تندرست خوبصورت بچے نے چوبیس گھنٹوں میں بڑی بے بسی کے ساتھ دم توڑ دیا۔

---

وہ آیا ـــــ سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا کیا ہٹا کٹا تندرست نظر آرہا تھا۔ صاف ستھرا لباس تھا اس کی عمر ہوگی چالیس سال کے لگ بھگ، اس کے ساتھ صرف ایک لڑکا تھا۔ کافی دیر تک خاموش بیٹھا اپنے نمبر کا انتظار کرتا رہا ـــــ اپنا نمبر آنے پر اس نے ڈاکٹر سے کہنا شروع کیا۔ "کل رات سے سر چکرا رہا ہے غشی سی چھا جاتی ہے۔ کھانے کی خواہش نہیں ہوتی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لینے پر سامنے دس بیس بلیاں لڑتی نظر آتی ہیں۔

"ڈاکٹر چونک پڑے چکر آنا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانا وغیرہ تک تو ڈاکٹر صاحب خاموشی سے سنتے رہے لیکن دس بیس بلیوں کی لڑائی کے جملہ پر ڈاکٹر صاحب کچھ اداس ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "اچھا! یہ تو بتائیے کہ آپ کو بھی کسی بلی نے کاٹ لیا تھا؟"

"مجھے بلی کے کاٹنے کے متعلق کچھ معلوم نہیں لیکن ایک دفعہ نیند میں میرے پیروں کو کسی نے کسی نوکیلی چیز سے کھرچ کر زخمی کر دیا تھا۔ میں اندھیرے میں سویا ہوا تھا اس لیے کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن دوسرے دن ہمارے محلہ والوں نے ایک خونخوار بلی کو مار دیا۔"

"کیوں مارا اُسے؟"

"وہ لوگوں کو کاٹنے دوڑتی تھی۔"

"تو صاحب اس بلی نے آپ کو کاٹ لیا ہوگا"، یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے نرس سے پھر پانی منگوایا اور جب پانی کا برتن اس آدمی کے سامنے رکھا گیا تو اس نے دونوں جبڑے مضبوطی سے بند کر لیے۔ اور ہم نے جو کچھ جان لیا تھا جان لیا۔

آخر ڈاکٹر نے اس آدمی کے بچے کو اپنے خاص کمرے میں بلایا اور آہستگی سے کہا "بیٹا تمہارا باپ اب چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ وہ کل تک مر جائے گا اس لئے تم اس سے لین دین وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کر لو۔ اور اس سے دستخط وغیرہ حاصل کر لو۔"

لڑکے نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب! اگر ہم اپنے ابا کو خاص ٹیکسی کے ذریعے بمبئی لے جائیں تو کچھ فائدہ ہو سکتا ہے؟"

"میرے خیال سے کچھ نہیں ہو سکتا"، ڈاکٹر نے مایوس ہو کر جواب دیا۔

آخر اس لڑکے نے خاص ٹیکسی کرایہ پر لے کر اپنے زندہ باپ کو بمبئی تک پہنچایا اور مردہ حالت میں اسی ٹیکسی کے ذریعہ اپنے گھر واپس لایا۔ اس ٹیکسی کا کرایہ اس کے باپ نے ہی طے کیا تھا۔

---

اس قسم کی کئی مثالیں ہیں۔ پالتو جانوروں کو پالنا ایک شوق یا مشغلہ ضرور ہے۔ لیکن ان سے احتیاط و خبرداری سے نہ رہنا بھی ایک بدنصیبی ہے۔

کتے، بلیاں، چوہے، چھپکلی، چمگادڑ، گدھے، گھوڑے وغیرہ کے کاٹنے پر بروقت علاج ہونا نہایت ضروری ہے۔ اکثر لوگوں کو کتے کاٹ لیتے ہیں اور وہ سب ہی فوت نہیں ہوتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کتے کے کاٹنے پر اسے صرف معمولی بات سمجھ کر اسے نظر انداز کیا جائے اور علاج وغیرہ سے گریز کریں۔ کسی بھی زہریلے جانور کے کاٹ لینے پر فوری علاج کرانا ضروری ہے۔ ورنہ یہ معمولی حادثہ بھی موت کا باعث بن سکتا ہے۔ علاج معقول اور موثر ہونا چاہیے۔

کچھ ہی دنوں پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ہاں ایک ہی دن میں بیک وقت ایک چودہ سالہ لڑکا، ایک گائے اور ایک بکری نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا تھا۔ انھیں ایک کتے نے کاٹا تھا۔

اس لڑکے کے باپ نے کتے کے کاٹ کھانے کے بعد مسلسل تین روز تک انجکشن لگوائے اور پھر علاج بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد بچے میں باؤلے پن کے آثار نظر آئے۔ ڈاکٹر نے کتے کو تلاش کروایا۔ مگر وہ لاپتہ تھا۔ کاٹ لینے کے بعد دس روز تک اس کتے پر نگاہ رکھنے کی تاکید کے باوجود لاپرواہی کرنے کا انجام کتنا خطرناک ثابت ہوا۔ کتے کا باولا پن زیادہ سے زیادہ دس روز بعد ظاہر ہوتا

ہے۔ اگر پاؤ لا کتا کاٹ لے تو کم از کم چودہ انجکشن لگوانا ضروری ہے۔ آخر ادھورے علاج کی وجہ سے اس لڑکے کا بھی وہی انجام ہوا جو ہونا تھا یعنی وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔

ہمارے ملک میں بے جا اور نقصان دہ رحم دلی کا مظاہرہ اکثر ہوتا ہے۔ جانوروں سے ہمدردی اور رحمدلی کا جذبہ انسان میں ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ایسے جانوروں سے جو ہماری ہلاکت و بربادی کا باعث بن سکتے ہیں رحم دلی کا مظاہرہ محض حماقت ہے۔ اپنے ساتھ دشمنی ہے سرکاری ملازمین جب لاوارث اور باولے آوارہ کتوں کو گولی کا نشانہ بناتے یا پکڑ لے آتے ہیں تو کچھ نا سمجھ لوگوں کے دلوں میں کتوں سے بے جا رحم کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ان وفادار ملازمین پر کاٹ کھانے کے لئے لپکتے والے کتوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے گلے میں بیلٹ یا پٹہ باندھ دیتے ہیں۔ اور ان لاوارث کتوں کے پلوں کو اپنے بچوں سے کھیلنے دیتے ہیں..... درحقیقت اس قسم کے لوگ انسانی زندگی سے کھیلتے ہیں۔

(مراٹھی امرت سے)

---

پیر۔ ا۔ پورانک

مترجم :۔ روشن علی قاضی بھیونڈی

# فیشن پریڈ

ایک مرتبہ جانوروں نے اپنی پنچایت جوڑی اور آپس میں یہ طے کیا کہ آج دنیا بڑی ترقی کر چکی ہے۔ انسان چاند پر جا پہنچا ہے۔ دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے تو پھر ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ دنیا کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی میں ہم نے بھی بہت ترقی کر لی ہے۔ انسانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب ہم ان سے کسی طرح کم نہیں۔ آخر ایک بہت بڑے پیمانے پر پروگرام ترتیب دیا گیا۔ پروگرام کا ایک حصہ تھا "فیشن پریڈ"۔

ایک بڑے سے اسٹیج پر نمائش ہونے والی تھی۔ سامنے کرسیوں پر تمام قسم کے جانور جمع تھے۔ سب سے پہلے اسٹیج پر بھالو میاں نمودار ہوئے۔ انھوں نے ہپی کٹ بال بنا رکھے تھے۔ سب جانوروں نے خوب تالیاں بجائیں۔ "بھئی واہ، واہ یہ تو ولایتی کٹ ہے"۔ اس کے بعد زراف صاحب بیل باٹم پہنے اسٹیج پر آئے۔ اونٹ میاں چلا اٹھے خوب کاٹن کا استعمال کیا ہے۔ اب بکرے میاں شارٹ کٹ لباس میں جھومتے ہوئے نمودار ہو رہے ہیں انھیں دیکھ کر بکری بڑے برے منہ بنا کر بڑبڑانے لگی۔

"لیجیے اب شیخ صاحب کا حلیہ ملاحظہ فرمایئے۔ پھولدار لباس پہن رکھا ہے" سب جانور ایکدم چلائے۔ "ارے یہ کتا ہے یا کتیا"!

اور یہ ہاتھی صاحب ہیں بیل باٹم (چست لباس) زیب تن کر رکھا ہے: "واہ واہ کیا خوب صورت اسٹم ہے۔ جسم کا ہر ہر عضو نمایاں ہو رہا ہے" سب جانوروں نے خوب خوب تعریف کی۔

آہا اب بلی خالہ کو چشمہ لگا کر آتے دیکھئے۔ لنگی پہنے مٹکتی ہوئی اسٹیج پر تشریف لا رہی ہیں۔ بندر میاں تو دیوانہ وار شہنائی بجانے لگے۔ تمام ہال میں بھانگڑا شروع ہو گیا۔ اور جناب اس طرح جانوروں کی فیشن پریڈ کے پروگرام کا ایک حصہ ختم ہوا۔

(مراٹھی سے)

جناب ڈاکٹر امانت، واڈیا کالج، پونہ

# ماں

فارسی کے شاعر ایرج میرزا کی نظم "مادر" کا آزاد ترجمہ

بڑے احسان ہیں امی تمہارے
سنا میں نے کہ میں پیدا ہوا جب
سکھایا تم نے مجھ کو دودھ پینا
سنا کر لوریاں دلکش رسیلی
سکھایا مجھ کو میٹھی نیند سونا
مرے لب چوم کر تبسم سکھایا
کلی کو پھول کی مانند کھلنا
سنا کر میٹھے میٹھے بول تم نے
سکھائے لفظ مجھ کو پیارے پیارے
مرے ننھے سے ہاتھوں کو پکڑ کر
سکھایا پاؤں پاؤں مجھ کو چلنا
تمہارے دم سے میری زندگی ہے
یہ جب تک ہے تم پہ میری ہر خوشی ہے
بڑے احسان ہیں امی تمہارے



بوھیمیا کی ایک لوک کہانی

از

جناب اکبر رحمانی جلگانوی

# سب سے اچھا تحفہ

بہت سال پہلے کی بات ہے۔ بوہیمیا میں ہورڈبور نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ بڑا نیک بادشاہ تھا اکثر راتوں میں بھیس بدل کر شہر کا گشت لگایا کرتا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ رعایا آرام اور سکھ کی زندگی بسر کر رہی ہے یا نہیں۔ ایک دن وہ گھومتے گھومتے ایک جھونپڑی کے پاس رک گیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا اور اُسے مسافر سمجھ کر اس کی خاطر مدارات کی۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ عورت بیوہ ہے۔ اس کی پانچ لڑکیاں ہیں۔ بادشاہ نے وعدہ کیا کہ جب وہ لوٹ کر آئے گا۔ تو اس کا بوجھ ضرور کم کرے گا۔ وہ ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔

جب بادشاہ چلا گیا تو بڑی لڑکیوں میں اس بات پر جھگڑا شروع ہوگیا کہ اُس خوبصورت اجنبی کے ساتھ کون جائے گا۔ سب سے چھوٹی لڑکی لی بتیا کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ اُس نے اِس جھگڑے میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔ باقی لڑکیوں میں سے ہر ایک نے سوچا کہ اجنبی آدمی اسی کو ساتھ لے جائے گا اور اُس سے شادی کرے گا۔

ہر صبح چھوٹی لڑکی چھوڑ کر سب بہنیں اچھے اچھے کپڑے پہن کر اس اجنبی کی راہ تکتی تھی۔ ایک ہفتہ بعد بادشاہ شاہی گھوڑا گاڑی میں آیا اور تمام لڑکیوں پر ایک نظر ڈالی۔ بڑی بہنوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بادشاہ نے سب سے چھوٹی لڑکی لی بتیا کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کی۔ بادشاہ نے اس کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ اس کی کوئی لڑکی نہ تھی۔ اور اُس کے تینوں لڑکے چاہتے تھے کہ ان کی بھی کوئی بہن ہو۔ بادشاہ نے لڑکی کے عوض بڑھیا کو بہت سے سونے کے سکّے دیے۔

جب لی بتیا محل میں آئی اور شہزادوں سے اس کی ملاقات کرائی گئی تو تینوں شہزادے بہت خوش ہوئے۔ اُس وقت سے وہ اصلی شہزادی بنکر زندگی بسر کرنے لگی۔ بادشاہ اور کوچوان کے علاوہ کوئی بھی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ وہ اصل شہزادی نہیں ہے۔ تینوں شہزادے اسے بہت چاہتے تھے۔ کوچوان نے لی بتیا کے بارے میں سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ لیکن کوئی بھی بادشاہ کے خاندان کے کسی بھی فرد کے سامنے اس راز کو فاش کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

ایک دن لی بتیا نے سیر کے لیے جانا چاہا۔ سب سے چھوٹے شہزادے نے گھوڑا گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا کوچوان سست اور کاہل تھا۔ اس لیے وہ بڑ بڑانے لگا "بادشاہ کے خاندان نے لڑکی کو لاڈ پیار میں بگاڑ دیا ہے اچھا ہوا کہ وہ اصلی شہزادی نہیں ہے ورنہ نہ جانے کیا کرتی۔" شہزادے نے یہ بات سُن لی۔ اس نے کوچوان سے پوچھا۔

"کیا لی بتیا ہماری سگی بہن نہیں ہے ؟"

گو جوان ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ لیکن وہ اصل بات کہنے پر مجبور ہو گیا۔

چنانچہ یہ بات فوراً دوسرے شہزادوں کو بھی معلوم ہو گئی۔ سب نے پھر لی بتیا سے شادی کرنے کی خواہش کی۔ بادشاہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ لی بتیا کی شادی کس سے کی جائے کافی غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ جو کوئی لی بتیا کے لیے سب سے اچھا تحفہ لائے گا۔ اسی کے ساتھ اس کی شادی ہوگی۔

تینوں شہزادوں نے اس فیصلے کو قبول کیا۔ اور پھر تینوں خوبصورت تحفے کی تلاش میں الگ الگ سمتوں میں نکل پڑے۔ لیکن جانے سے پہلے تینوں نے مل کر یہ طے کیا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد شہر کے باہر جو باغ ہے وہاں ملیں گے۔ اور پھر وہاں سے ایک ساتھ محل آئیں گے۔

سب سے بڑا شہزادہ مشرقی سمت روانہ ہوا۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑے شہر میں پہنچا۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی ایک بہت بڑی اڑن طشتری فروخت کر رہا تھا۔ اس کی قیمت دس ہزار سونے کے سکے تھی۔ جب شہزادے نے کہا کہ یہ تو بہت زیادہ قیمت ہے تو بوڑھے نے کہا کہ یہ معمولی اڑن طشتری نہیں ہے۔ یہ منٹوں میں کہیں بھی پہنچا سکتی ہے۔ شہزادے نے یہ اڑن طشتری فوراً ہی خرید لی اور اس میں بیٹھ کر اُس نے باغ میں پہنچنے کے لیے کہا۔ اڑن طشتری نے اسے چند ہی منٹوں میں پہنچا دیا۔

دوسرا شہزادہ مغربی سمت گیا تھا۔ کئی دن کے سفر کے بعد ایک گاؤں میں اسے ایک بوڑھا ملا۔ یہ بوڑھا ایک آئینہ بیچ رہا تھا اس کی قیمت دو ہزار سونے کے سکے تھی۔ شہزادے کو آئینے کے اتنے قیمتی ہونے پر تعجب ہوا جب اس نے پوچھا تو بوڑھے نے بتایا کہ یہ کوئی معمولی آئینہ نہیں ہے۔ کوئی کتنی ہی دوری پر ہو اس آئینے میں اُسے دیکھا جا سکتا ہے۔ شہزادے نے فوراً اُسے خرید لیا۔ پھر اُس نے آئینہ میں باغ کا منظر دیکھنے کی خواہش کی۔ فوراً باغ کا منظر دکھائی دیا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کا سب سے بڑا بھائی وہاں اڑن طشتری کے ساتھ ہے۔ پھر وہ باغ کی طرف روانہ ہو گیا۔

تیسرا اور سب سے چھوٹا شہزادہ شمال کی طرف گیا تھا۔ اس نے ایک بازار میں ایک بوڑھی عورت کو سیب فروخت کرتے دیکھا۔ ہر سیب کی قیمت سونے کے ایک ہزار سکے تھی شہزادے نے اتنی قیمت کا راز دریافت کیا۔ بڑھیا نے بتایا کہ اس سیب کے کھانے سے مرتا ہوا انسان پھر دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔ شہزادے نے تین سیب خرید لیے۔

جب تینوں شہر کے باہر باغ میں جمع ہوئے تو انھوں نے ایک دوسرے کے تحفے دیکھے۔ چھوٹے شہزادے نے اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ آئینے میں دیکھا جائے کہ محل میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ جب انھوں نے آئینہ میں دیکھا تو تمام شہزادوں کو دکھ ہوا کہ بادشاہ اور لی بتیا بیمار ہیں اور مرنے کے قریب ہیں۔ چنانچہ سب بھائی اڑن طشتری میں بیٹھ کر محل پہنچ گئے۔ چھوٹا شہزادہ تیزی کے ساتھ بادشاہ اور لی بتیا کی طرف بڑھا اور انھیں ایک ایک سیب کھانے کو دیا جس سے وہ دونوں جلدی ٹھیک ہو گئے۔

بادشاہ نے سب سے چھوٹے شہزادے کے تحفے کی تعریف کی اور کہا کہ اس کی وجہ سے ان کی جان بچی ہے باقی دونوں شہزادوں نے کہا کہ اگر آئینہ نہ ہوتا تو راج محل میں جو ہو رہا ہے وہ دکھائی نہ دیتا اور اگر اڑن طشتری نہ ہوتی تو وہ اتنی جلدی نہ پہنچ سکتے تھے۔ جب بادشاہ نے

یہ سُنا تو اپنے مشیروں کو حکم دیا کہ اب وہ بتائیں کہ سب سے اچھا تحفہ کس کا ہے۔ لیکن کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ پھر بادشاہ نے اس کا صحیح جواب بتانے کے لیے شہر میں اعلان کروایا۔

شام کو ایک بوڑھا آدمی محل میں آیا۔ اس نے کہا کہ میں اس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ لی بتیا کی شادی سب سے چھوٹے شہزادے سے ہونی چاہیے۔ کیونکہ باقی دونوں شہزادوں کے پاس اب بھی اڑن طشتری اور آئینہ ہے۔ جبکہ شہزادے کے لائے ہوئے سیب کھائے جا چکے ہیں۔ دربار میں حاضر ہر آدمی نے بوڑھے آدمی کی عقلمندی کی تعریف کی۔ اور پھر سب سے چھوٹے شہزادے کی شادی لی بتیا سے کر دی گئی۔

---

**بقیہ ادھر ادھر سے صفحہ**

جو صلح کانفرنس سوئٹزرلینڈ میں لوزان کے مقام پر ہوئی اس میں ترکی وفد کی قیادت بھی غازی عصمت پاشا ہی نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے جس عجیب و غریب دلیری اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اسی نے بڑی حد تک جدید ترکی کو جنم دیا۔

ترکی انقلاب کو کامیاب بنانے میں مصطفےٰ کمال پاشا کے دوش بدوش عصمت پاشا نے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انقلاب کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا ترکی کے پہلے صدر اور عصمت انونو پہلے وزیر اعظم بنے ۱۹۲۸ء میں اتا ترک کی وفات کے بعد ترکی کے دوسرے صدر کا عہدہ ان ہی کی طرف منتقل ہوا

عصمت انونو کی کے صدارت کے عہد کا یہ پہلو قابل ذکر ہے کہ مصطفےٰ کمال کے دور میں جو آمرانہ پابندیاں ترکی میں عائد تھیں۔ ان میں انھوں نے نرمی پیدا کی۔ اور اخبارات پر سے پابندیاں ہٹالیں۔ (سب ساتھ)

---

جناب رؤف خیر

## ایک آزاد نظم

یہ مونگ پھلی جو بیچتا ہے
یہ شخص میری طرح ہے لیکن
یہ چور تھا جھوٹ بولتا تھا
یہ اپنی امی کا بٹوہ چپکے سے کھولتا تھا
چرائے پیسوں کے چاکلیٹ منہ میں گھولتا تھا
یہ مونگ پھلی جو بیچتا ہے
یہ شخص میری طرح ہے لیکن
یہ شخص رکشہ چلا رہا ہے
کہ اس نے تعلیم چھوڑ دی ہے
کلائی علم و عمل کی اس نے مروڑ دی ہے
قسم چراغِ حیات بننے کی توڑ دی ہے
یہ شخص رکشا چلا رہا ہے
یہ شخص میری طرح ہے لیکن
یہ شخص کولی بنا ہوا ہے
کہ اس نے توہین کی کتابوں کی
کہ اس نے توہین کی ادیبوں کی شاعروں کی
کہ اس نے توہین کی ہے سچے پیمبروں کی
یہ شخص کولی بنا ہوا ہے
مگر میں ان کی طرح نہیں ہوں
نہ میں نے چوری شعار کی ہے
نہ میں نے تعلیم چھوڑ دی ہے
نہ بد دعا ہی بڑوں کی لی ہے
خدایا علم و عمل کی توفیق دینا مجھ کو
اگر کہیں گر رہا ہوں تو تھام لینا مجھ کو

★

جناب رشید احمد اعظمی سلمہ اعظم گڑھ

# چھٹیوں کی سرگرمیاں

ہے زمانہ چھٹیوں کا ہوئے ختم امتحاں سب
چلے گھر کو اپنے اپنے مرے آج مہرباں سب
یہ طرح طرح کے مضمون نہ پڑھیں گے آج سے ہم
یہ حساب اور سائنس نہ رٹیں گے آج سے ہم

نہ تو ٹیچروں کا ہم پر کوئی اب کرم ہی ہو گا
بڑا لطف آئے گا اب ہمیں کوئی غم نہ ہو گا
نہ قلم دوات ہوگی نہ بغل میں ہوں گے بستے
کوئی ہو گا اپنے رستے کوئی ہو گا اپنے رستے

جہاں دل کہے گا اپنا وہیں گھومتے پھریں گے
سبھی شادماں رہیں گے سبھی جھومتے پھریں گے
کبھی گرم سیر ہوں گے کبھی باغ میں رہیں گے
وہ خیال ہوگے پورے جو دماغ میں رہیں گے

یونہی کھیل کود کر ہم شب و روز کاٹ لیں گے
جو گڑھے کبھی ہوں گے حائل سر راہ پاٹ لیں گے
مرے ساتھیو! عزیزو! تمھیں ہو خیال اس کا
نہ کبھی دلوں میں لانا کوئی تم ملال اس کا

یہ زمانہ قیمتی ہے نہ اسے عبث گنواؤ...
بری صحبتوں سے خود کو مرے دوستو بچاؤ
پڑھو سال بھر یونہی تم نہ ڈرو کچھ امتحاں سے
جو اٹھو تو لیکے اٹھو میرے دوستو یہاں سے

یہ تمھاری محنتیں بھی کبھی ہوں گی بارور سب
کبھی پھولیں اور پھلیں گی یہی شاخ اور شجر سب

عبدالقدوس حامد بخش قادری بی اے بی ایڈ

# بگ بین

دنیا میں کون ہوگا جس نے دنیا کی اس مشہور گھڑی کے بارے میں نہ سنا ہو۔ شاید آپ میں سے کسی کسی نے بی بی سی لندن سے اس کی آواز بھی سنی ہو۔ لیکن بہت کم لوگ خاص کر "بچے" شاید ہی یہ جانتے ہوں کہ یہ گھڑی کہاں ہے اور کیوں اتنی مشہور ہے تو آیئے آج ہم آپ کو اس عظیم گھڑی کی کچھ داستان سنائیں۔

۱۸۳۴ء کی بات ہے لندن میں خوفناک آگ لگی تھی بہت سی عمارتوں کے ساتھ ویسٹ منسٹر کا محل بھی جل گیا تھا اس تاریخی محل کو دوبارہ تعمیر کرنے کی تجویز ہوئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس محل میں ایک گھنٹہ گھر بھی بنایا جائے اور اس میں ایسی گھڑی لگے جو اپنی مثال آپ ہو اور گھڑیوں کی ملکہ کہلائے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اس گھڑی کو لندن کے عین بیچوں بیچ نصب کیا جائے تاکہ یہ لندن کے دل کی دھڑکن بن سکے اور اس کی آواز لندن کی آواز ہو۔

جب یہ تجویز حکومت نے منظور کر لی تو ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا: ایک نجومی (ستاروں کے علم کے ماہر) نے جس کو شاہی سرپرستی حاصل تھی یہ سوال اٹھایا کہ یہ گھڑی ایسا صحیح وقت بتلائے کہ دن بھر میں ایک لمحہ فرق نہ آئے اور اس کا وقت لندن کی دوسری تمام گھڑیوں سے پہلے شروع ہو یا یوں کہیے کہ وقت کے لحاظ سے بگ بین کو سورج کی پہلی کرن ثابت ہونا چاہیئے۔

اب، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنی ٹیڑھی کھیر تھی۔ جبھی تو گھڑی ساز ان شرائط پر اتنی بڑی گھڑی بنانے سے ہچکچا رہے تھے۔ آخر ایک گھڑی ساز نے جس کا نام ڈینیسن (DENISON) تھا اس گھڑی کو بنانے کی حامی بھر لی۔

اس نے جو گھڑی تیار کی اس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں۔ اگر ہم گھڑی کے ڈھانچے پر ایک نظر ڈالیں تو نیچے سے گول "چکر" لگاتی ہوئی ۳۵۰ سیڑھیوں سے اوپر چڑھنا پڑے گا۔ اب ہم ایک پلیٹ فارم پر پہنچ جائیں گے اس کا ہر رخ ۲۳ فٹ کا ہے گھڑی کے ہندسے ۴ء۴ فٹ کے ہیں۔ منٹ کی سوئی ۱۴ فٹ اور گھنٹے بتانے والی سوئی ۹ فٹ لمبی ہے۔ گھڑی کے محور میں ایک منٹ سے دوسرے منٹ تک کا فاصلہ ایک فٹ تک کا ہے اور آپ کو یہ سن کر حیرت اور تعجب ہوگا کہ اس کے پینڈولم کا وزن تقریباً ۵ ٹن ہے۔ اس کا گھنٹہ ۱۸۵۶ء میں تیار کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کا وزن ½ ۱۶ ٹن تھا جو تانبا اور رانگ... کے مرکب سے تیار کیا گیا تھا۔ کارخانے سے تیار ہونے کے بعد اس گھنٹے کو پانی کے جہاز سے لندن لایا گیا۔ یہاں اس گھنٹے کو دوبارہ ڈھالا گیا تب اس کا وزن صرف ½ ۱۳ ٹن رہ گیا۔ اس کو اپنے مقام اور مرکز پر نصب کرنے میں مزدوروں کو آٹھ دن لگے تھے پہلی بار اس میں چابی ڈینیس نے ہی دی تھی۔

تم سوچ رہے ہوگے کہ سب کچھ بتا دیا مگر یہ نہیں

بتایا کہ اس گھڑی کو بگ بین کیوں کہتے ہیں۔ تو بھئی یہ کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے اس وقت لندن میں تعمیرات کے کمشنر مسٹر بینجمن تھے ایک دن پارلیمنٹ میں بحث ہو رہی تھی کہ گھڑی کا کیا نام رکھا جائے تو ایک ممبر نے مسٹر بینجمن کی طرف اشارہ کیا کہ اِن کے نام سے ملتا جلتا نام ہونا چاہیے چنانچہ کسی نے اس کا نام بگ بین تجویز کیا اور تب سے اس کو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

اب یہ گھڑی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے دو جنگوں کی تباہ کاریاں دیکھی ہیں۔ مگر چونکہ یہ لندن کی آواز ہے اس لیے اس نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ یہ انگریزوں کی ہمت اور استقلال کا مظہر ہے جو ہمیشہ بجتا رہتا ہے۔ چاہے لندن پر بمباری کا دردناک منظر ہو یا بادشاہ وقت کا انتقال ہو۔ ملکہ ایلزبیتھ کی تاجپوشی ہو یا شہزادی این کا بیاہ۔ بگ بین نے ہر وقت اور ہر موقع کا ساتھ دیا ہے اور شاید برسوں تک دیتی رہے گی۔ یہ لندن والوں کے لیے ایک نعمت ہے — انگلستان کے لوگ اپنی تہذیب روایات اور اقدار کے بڑے پرستار ہیں۔ اور اسی لئے وہ اس گھڑی سے بھی عقیدت رکھتے ہیں

بچو!! اگر تمھیں لندن جانے کا موقع ملے تو ہمیں ضرور بتانا کہ کیسی لگی یہ گھڑی۔

★★

---

★ آپ کہہ دیجیے اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو (ق)

★ حسد اور بدگمانی سماج کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے (ح)

★ کیا تم لوگوں کو نیکی کا وعظ کہتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو (ق)

★ اے اللہ تو نے میری تخلیق اچھی کی ہے میرے اخلاق بھی اچھے کر دے (ق)

★ سب سے بڑا عطیہ اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت ہے (ح)

★ وقفے سے نصیحت کرو تاکہ لوگ اکتا نہ جائیں (ح)

(بشیر الدین شیر کوٹی)

حضرت افسر میرٹھی (مرحوم)

# ایسی زمیں کہاں ہے

(مرحوم کی ایک وطنی نظم)

یہ آسماں بنایا — سارا جہاں بنایا
ہندوستاں بنایا — اور گلستاں بنایا
کیا شکر ہو الٰہی، سب کچھ عطا کیا ہے
میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

کانوں کو بھر دیا ہے — مٹی کو زر دیا ہے
اکسیر کر دیا ہے — کیا پیارا گھر دیا ہے
کیا شکر ہو الٰہی! سب کچھ عطا کیا ہے
میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

برسات آ رہی ہے — جھولے جھلا رہی ہے
کلیاں کھلا رہی ہے — دل کو لبھا رہی ہے
کیا شکر ہو الٰہی! سب کچھ عطا کیا ہے
میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

پربت جو اک یہاں ہے — ہم دوشِ آسماں ہے
کیسا عجب سماں ہے — ایسی زمیں کہاں ہے
کیا شکر ہو الٰہی! سب کچھ عطا کیا ہے
میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

یہ پھونس کی کٹی ہے — افسر کی جھونپڑی ہے
کس درجہ سادگی ہے — راحت کی زندگی ہے
کیا شکر ہو الٰہی! سب کچھ عطا کیا ہے
میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

محترمہ عظمیٰ ریاض خان

# ہوشیار چپّو

ایک چھوٹے سے گاؤں میں چپّو نامی ایک شخص رہتا تھا۔ چپّو کے گاؤں سے تھوڑی دور ایک اور گاؤں تھا۔ اور دونوں کے بیچ ایک ندی بہتی تھی۔ چپّو کے پاس ایک ناؤ تھی اس میں وہ لوگوں کو بٹھا کر اس گاؤں سے اس گاؤں لے جایا کرتا تھا۔

ایک دن شہر کا ایک آدمی چپّو کے پاس آیا اور ناؤ میں دوسرے گاؤں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ چپّو نے شہری کو اپنی ناؤ میں بٹھایا اور ناؤ کھینے لگا۔ دیر تک ناؤ ندی پر بہتی رہی اور دونوں خاموش رہے۔ تھوڑی دیر بعد شہری نے چپّو سے سوال کیا۔

"کیا تم نے کبھی تاریخ پڑھی ہے؟"

چپّو: "نہیں سرکار! ہم غریب تاریخ واریخ کیا جانیں۔"

شہری: اگر تم نے تاریخ نہیں پڑھی تو سمجھو تم نے کچھ نہیں سیکھا۔

تاریخ پڑھنے ہی سے ہمیں اپنے وطن اور دوسرے دیشوں کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ خیر۔ تم نے جغرافیہ تو ضرور پڑھا ہوگا۔

"نہیں صاحب" چپّو نے عاجزی سے جواب دیا۔

شہری: تو یہ! تو یہ! بڑی عجیب بات ہے! ہمارے دیش میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے تاریخ نہیں پڑھی۔ جغرافیہ نہیں پڑھا۔

شہری کی یہ باتیں سن کر چپّو کو غصّہ تو بہت آیا مگر وہ اپنے غصّے کو پی گیا اور خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد پھر شہری نے سوال کیا۔

تاریخ اور جغرافیہ شاید تمھیں مشکل لگے ہوں —— کم از کم تم نے سائنس تو ضرور سیکھی ہوگی کیوں کہ یہ آسان بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اسی سے تو ہمیں بادل۔ بجلی ہوا کے دباؤ۔ اور دوسری قوتوں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے اسی لیے اس کو پڑھنا بہت ضروری ہے۔

چپّو ان باتوں سے پہلے ہی پریشان ہو رہا تھا اور اب اس کی قوّتِ برداشت بھی جواب دے چکی تھی اس لئے خوب زوردار آواز میں کہنے لگا۔

"صاحب میں جاہل ہوں۔ میں نے زندگی بھر اسکول کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ اس لیے پڑھنے کا کیا سوال ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں دیہات کا آدمی ہوں۔ جاہل...

شہری: "بس کرو! بس کرو۔ اتنا کیوں چیخ رہے ہو۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ ہندستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اسکول کی صورت تک نہیں دیکھی..... مجھے تو....."

شہری اپنا جملہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ ایک زور کا دھماکہ ہوا اور ناؤ اُلٹتے اُلٹتے بچ گئی۔ یہ دونوں باتوں میں اتنے مصروف تھے کہ انھیں پتہ بھی نہ چلا کہ ندی میں سیلاب آگیا ہے اور اُن کی ناؤ بہتے ہوئے درخت سے ٹکرا گئی ہے۔

چیتّو اور شہری دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شہری بالکل بدحواس ہوا جا رہا تھا۔ مگر چیتّو کے چہرے پر اطمینان تھا۔ چیتو اپنی کوشش کرکے ناؤ کو قابو میں لانے کے لیے محنت کر رہا تھا۔ اور جب ناؤ سنبھلی تو چیتّو نے شہری سے پوچھا۔

"کیا تم کو تیرنا آتا ہے؟"

"نہیں" شہری نے شرم سے گردن جھکا کر جواب دیا۔

"تمھیں تیرنا نہیں آتا تو اب ڈوبنے کے لیے تیار ہو جاؤ" چیتّو نے کہا "کیونکہ جسے تیرنا نہیں آتا اُسے دُنیا میں کچھ نہیں آتا۔ افسوس! اب تمھاری جان بچانے کے لیے کوئی علم نہیں سوائے تیر کر باہر نکلنے کے"

شہری! گاؤں والے بھائی! بس تم ہی میری اور اپنی جان بچا سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنی باتوں سے تمھارا دل دکھایا۔ مجھے معاف کردو۔ اور اپنی کوشش۔ ہمّت اور تجربے سے کام لے کر ناؤ کو کنارے تک پہنچا دو"

چیتو: تب ایسا ہی کروں گا۔ پہلے تمھاری جان بچاؤں گا اور اپنی زندگی کی بالکل پرواہ نہیں کروں گا مگر ساتھ ہی ساتھ تم سے یہ بھی کہوں گا کہ بھائی دنیا میں کسی کو اپنے سے حقیر مت سمجھو۔ وقت پڑنے پر وہی لوگ جنھیں ہم حقیر سمجھتے ہیں ہماری مدد کرتے ہیں۔ خدا کی نظروں میں ہم سب ایک ہیں چاہے تعلیم یافتہ ہوں چاہے جاہل۔"

یہ کہہ کر چیتّو نے بڑی محنت اور ہوشیاری سے ناؤ طوفان سے نکالی اور شہری کو خیریت کے ساتھ کنارے پہنچا دیا۔

★★

جناب سعید احمد رفاعی

# زندگی میں سدا مُسکراتے چلو

زندگی میں سدا مُسکراتے چلو!
کھلکھلاتے چلو، گنگناتے چلو!

تم کسی کے چمن کا حسیں پھول ہو
اور قسمت میں اب دھول ہی دھول ہو
رُوٹھی قسمت کو اپنی مناتے چلو
زندگی میں سدا مسکراتے چلو

ناؤ طوفاں سے بچ کر نکل جائے گی
شام غم کی، یقیناً یہ ڈھل جائے گی
کوئی نغمہ ہی تم، گنگناتے چلو!

کوئی نغمہ ہی تم، گنگناتے چلو!
زندگی میں سدا مسکراتے چلو!

زندگی ہے تمھاری بناؤ اسے
خوب دل سے بناؤ سنوارو اسے
ہر کسی کو گلے سے لگاتے چلو
زندگی میں سدا مسکراتے چلو!

راہ دشوار ہے اور چلنا بھی ہے
صرف گرنا نہیں ہے سنبھلنا بھی ہے
سوئے منزل مگر ڈگمگاتے چلو
زندگی میں سدا مسکراتے چلو!
کھلکھلاتے چلو، گنگناتے چلو!

★

جناب ڈاکٹر سید حامد حسین

# اچھی اردو

(۲)

اردو میں فارسی زبان کی مدد سے بہت سے ضروری لفظ استعمال کیے جاتے ہیں اور اپنی اردو بہتر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن اصولوں سے واقف ہوں جن کے ذریعے ایسے الفاظ بنانے میں سہولت ہوتی ہے۔ ایسے ہی الفاظ کے کچھ نمونے میں نے اپنے ایک مضمون میں پیش کیے تھے۔ (یہ مضمون نومبر ۷۳ ۱۹ء کے "پیام تعلیم" میں چھپا تھا) فارسی کے کچھ دوسرے مصدروں سے بنے ہوئے لفظ، میں اس مضمون میں پیش کر رہا ہوں۔ ان الفاظ کو توجہ کے ساتھ پڑھیے اور ان کے مثل اخباروں اور کتابوں میں آپ کو جو دوسرے الفاظ ملیں ان کی ایک فہرست بنائیے۔ یہ فہرست اور آپ کو آپ کی اردو تحریر بہتر بنانے میں مدد دے گی۔

---

## آلود

(۱) آلودن
آلائیدن } = لتھڑا ہوا ہونا۔ "آلودن" سے "آلود" بنا ہے۔

آلودگی = لتھڑے ہونے کی حالت۔ ناپاکی۔

آلودہ : لتھڑا ہوا۔

آلائش : لتھڑی ہوئی چیز۔

(۲) آلود : لتھڑنے والا۔

خون آلود : خون میں لتھڑا ہوا۔

خاک آلود : مٹی میں لتھڑا ہوا

گرد آلود : مٹی سے اٹا ہوا۔

ابر آلود : بادلوں سے ڈھکا ہوا۔

زنگ آلود : زنگ سے ڈھکا ہوا۔
(جس دھات میں زنگ لگ جائے اس دھات کو زنگ آلود کہتے ہیں)

زہر آلود : زہر ملا ہوا

نفرت آلود : نفرت سے بھرا ہوا

غم آلود : دکھ سے غم سے بھرا ہوا

گناہ آلود : گناہ سے بھرا ہوا۔

شرم آلود : شرم سے بھرا ہوا۔

حسرت آلود : حسرت سے بھرا ہوا۔

## بردار

(۱) برداشتن : اٹھانا۔ یہ مصدر "بردار" کی اصل ہے

برداشت : اٹھانا، سہنا۔

برداشتہ : اٹھایا ہوا۔

قلم برداشتہ : قلم اٹھاکر، بلا توقف بلا غور و خوض کے، ایک دم تحریر کر دینا۔

(۲) بردار : اٹھانے والا

بار بردار : بوجھ اٹھانے والا

ناز بردار: نخرے اٹھانے والا

علم بردار: جھنڈا اٹھانے والا

حقہ بردار: حقہ اٹھانے والا

فرماں بردار / حکم بردار : حکم اٹھانے والا۔ تابعدار

حاشیہ بردار: کنارہ پکڑنے والا۔ طفیلی

---

## پیما

(۱) پیمودن: ناپنا۔ اسی کی شکل "پیما" ہے۔

پیمائش : ناپ

پیمانہ : ناپنے کا آلہ

(۲) پیما: ناپنے والا۔

فاصلہ پیما: فاصلہ ناپنے والا آلہ

باد پیما: ہوا کی رفتار ناپنے والا آلہ

باراں پیما: بارش ناپنے والا آلہ

فلک پیما: آسمان ناپنے والا۔ آسماں کا چکر لگانے والا۔

کوہ پیما: پہاڑوں پر چڑھنے والا

جہاں پیما: دنیا کا چکر لگانے والا۔

بادیہ پیما: صحرا، جنگل چھاننے والا

بادہ پیمائی: شراب ناپنا۔ شراب پینا۔

---

## خیز

(۱) خاستن : اٹھنا۔ کھڑا ہونا۔ اس سے ہی "خیز" نکلا ہے۔

(۲) خیز: اُٹھنے والا۔

سحر خیز: صبح اُٹھنے والا۔

شب خیز: رات کو اٹھنے والا

صبح خیز: سویرے اُٹھنے والا۔

نوخیز: نئی اٹھان والا۔

لرزہ خیز: کپکپی پیدا کرنے والا۔

سنسنی خیز: سنسنی پیدا کرنے والا۔

ہنگامہ خیز : ہنگامہ اٹھانے والا۔

ہیجان خیز : ہیجان پیدا کرنے والا۔

مضحکہ خیز: ہنسی پیدا کرنے والا

زرخیز: سونا پیدا کرنے والا (زرخیز زمین۔ اچھی زمین)

تعجب خیز: حیرت پیدا کرنے والا۔

معنی خیز: معنی پیدا کرنے والا۔

مردم خیز: لائق آدمی پیدا کرنے والا۔

بلا خیز: مصیبت پیدا کرنے والا۔

موج خیز: لہریں اٹھانے والا۔

نتیجہ خیز: نتیجہ پیدا کرنے والا۔

افتاں خیزاں: گرتے اُٹھتے۔ (گرتے پڑتے)

---

## رَو

(۱) رفتن : چلنا، جانا۔ اسی مصدر سے "رَو" نکلا ہے۔

رفت : گیا۔
آمدورفت : آنا جانا
رفتار : چال
رفتہ : گیا ہوا۔
عمر رفتہ : گذری ہوئی عمر
رواں : چلتا ہوا۔ بہتا ہوا۔
روانی : چلاؤ۔ بہاؤ۔
روانہ : چلنا
روانگی : چلنا
(۲) رو : چلنے والا۔ دھارا۔ بہاؤ
راہ رو : راستے پر چلنے والا۔
تیز رو : تیز چلنے والا
آہستہ رو : دھیرے چلنے والا
سبک رو : تیز تیز چلنے والا
بدرو : خراب چلنے والا۔
بدروی : خراب چلن
سلامت روی : اچھا چلن
کج روی : ترچھا چلن۔ خراب چلن۔

---

## ریز

(۱) ریختن : گرانا، ڈالنا، بکھیرنا
اسی سے "ریز" بنا ہے
ریختہ : بکھرا ہوا
ریزاں : ڈالتا ہوا۔ گراتا ہوا۔
ریزش : بکھرن۔ ناک ٹپکنا
(۲) ریز : ڈالنے والا، بکھیرنے والا، ٹپکانے والا
لبریز : سرے پر سے اُبل کر بکھر جانے والا۔
عرق ریزی : پسینہ بہانا۔
خوں ریزی : خون بہانا۔
تخم ریزی : بیج بکھیرنا۔ بیج بونا۔
برگ ریزی : پتّوں کا جھڑنا

---

## سوز

(۱) سوختن : جلنا۔ جلانا
اسی مصدر سے "سوز" بنا ہے۔
سوخت : جلن۔ ضبطی
سوختہ : جلا ہوا۔
دل سوختہ : دل جلا
جگر سوختہ : جس کا جگر جل گیا ہو۔
سوزاں : جلتا ہوا۔
سوزش : جلن۔
(۲) سوز : جلانے والا۔
دل سوز : دل جلانے والا۔
جاں سوز : جان جلانے والا۔
جگر سوز : کلیجہ جلانے والا۔
گلوسوز : گلا جلانے والا۔
انسانیت سوز : انسانیت کو نقصان پہنچانے والا۔
اخلاق سوز : اخلاق کو نقصان پہنچانے والا۔
نگاہ سوز : نظر کو جلانے والا۔
فکر سوز : خیال کو جلانے والا۔
دماغ سوزی : شدید دماغی محنت

---

## کوب

(۱) کوفتن : کوٹنا۔ اسی مصدر سے "کوب" متعلق ہے

کوفت: کوٹنا۔ شدید ذہنی تھکن۔ اور بیزاری
کوفتہ: کوٹا ہوا۔
(۲) کوب: کوٹنے والا
دواکوب: دوا کوٹنے والا
زرکوب: سونا کوٹنے والا
زدوکوب: مار پیٹ
پاکوب: پیر ٹپکنے والا۔ یعنی رقاص
سرکوبی: سرکچلنا۔

---

## اندوز

(۱) اندوختن: جمع کرنا۔ اکٹھا کرنا۔ اسی سے "اندوز" بناہے۔
اندوختہ: جمع کیا ہوا۔ جوڑا ہوا۔
(۲) اندوز: جمع کرنے والا۔
ذخیرہ اندوز: ذخیرہ جمع کرنے والا
لطف اندوز: لطف اکٹھا کرنے والا۔
بہرہ اندوز: فائدہ اٹھانے والا۔
غم اندوز: غم اکٹھا کرنے والا۔
فکر اندوز: فکر اکٹھا کرنے والا۔

---

## در

(۱) دریدن: پھاڑنا۔ اسی مصدر سے "در" بنایا جاتا ہے
دریدہ: پھٹا ہوا۔
دریدہ دہن: منھ پھٹ۔
دل دریدہ: دل پھٹا ہوا۔
درندہ: پھاڑنے والا۔
(۲) در: پھاڑنے والا۔ (صفت)
صف در: صف توڑ دینے والا۔
پردہ در: پردہ پھاڑ دینے والا۔
عصمت دری: عصمت لوٹ لینا۔

---

## فشاں

(۱) افشاندن: جھاڑنا۔ چھڑکنا۔ یہی مصدر "فشاں" کی اصل ہے
افشاں: چھڑکن۔
(۲) فشاں: چھڑکنے والا
آتش فشاں: آگ چھڑکنے والا۔
زرفشاں: سونا بکھیرنے والا۔
درفشاں / گہرفشاں: موتی چھڑکنے والا۔
گل فشاں / گل افشاں: پھول چھڑکنے والا۔
نورافشاں: روشنی بکھیرنے والا۔
جانفشانی: جان چھڑکنا۔

---

## آفریں

(۱) آفریدن: پیدا کرنا۔ اسی مصدر سے "آفریں" بنایا جاتا ہے
آفریدہ: پیدا کیا ہوا۔
آفرینش: پیدائش
(۲) آفریں: پیدا کرنے والا
جہاں آفریں: دنیا پیدا کرنے والا۔
زمانہ آفریں: زمانے کو پیدا کرنے والا۔
انقلاب آفریں: انقلاب پیدا کرنے والا۔
معنی آفرینی: معنی پیدا کرنا۔

# آدھی ملاقات

شدید انتظار کے بعد کل پوسٹ مین پیامِ تعلیم کا ایک پوسٹ دے گیا جس میں فروری اور مارچ کے شماروں کی ۵۔ ۵ کاپیاں تھیں۔ انھیں دیکھ کر دِل فرطِ مسرّت سے جھوم اٹھا۔ آپ لوگ قابل مبارک باد ہیں کہ ان نامساعد حالات میں بھی پیامِ تعلیم کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں ورنہ بہت سے کھلاڑی اس میدان میں ہار مان کر بیٹھ گئے ہیں۔ آج کے حالات میں اتنا اچھا مقصدی اور معیاری رسالہ پیش کرنے کے لیے آپ یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں۔

آج تقریباً سات سال کے بعد اپنا محبوب رسالہ دیکھنے کو ملا۔ اس کی نوک پلک سنوارنے میں آپ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ اب بھی اس کی جدّت، رعنائی اور دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ سرورق حسین اور جاذبِ نظر ہیں۔ سارے مضامین نظم و نثر عین بچّوں کی نفسیات کے پیشِ نظر سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں۔ جناب خالد عرفان صاحب کا مضمون "آئینہ بجیے" سائنس جیسا خشک اور بے جان موضوع ہوتے ہوئے بھی بہت دلچسپ مفید اور معلوماتی رہا۔ اُن سے میری گذارش ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح کے معلوماتی سائنسی مضامین لکھتے رہیں۔

بھائی جان، آپ کو شاید یاد ہوگا کہ چند سال پہلے میرے اکثر مضامین نظم و نثر پیامِ تعلیم میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ میری پہلی کہانی "بھوت" کے عنوان سے اپریل ۱۹۶۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ جسے ٹائمز والوں نے اپنے مئی کے شمارے میں ڈائجسٹ بھی کیا تھا۔ پھر اس کے بعد سے تو آپ برابر میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے اور یکے بعد دیگرے کئی منظومات منظرِ عام پر آئیں جیسے پہلا دن (جولائی ۱۹۶۵ء) امن کا ہم پرچم لہرائیں (نومبر ۱۹۶۵ء) برسات (اگست ۱۹۶۶ء) وغیرہ۔

۱۹۶۶ء میں جب بی ٹی کی ٹریننگ کے سلسلے میں مجھے باہر جانا پڑا تو اچانک ہی یہ سلسلہ ٹوٹ چکا۔ آپ نے بھی میرے پاس رسالہ بھجوانا بند کر دیا۔ شاید اس کی وجہ پتہ کی لاعلمی ہو۔

اور آج بھی آپ کی ذات سے ناچیز کو بھرپور امید ہے کہ ناچیز کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرماتے رہیں گے۔ تاکہ بچوں کے ادب کی کچھ خدمت کر سکوں۔ مجھے تو پیامِ تعلیم ہی کی چھاؤں میں دم لے کر مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

انشاء اللہ جلد ہی اپنا کوئی مضمون اپنے محبوب رسالہ کی نذر کو روانہ کروں گا۔ (عادل کہلگانوی)

میری دلی آرزو ہے کہ "پیامِ تعلیم" جیسا معیاری پرچہ آپ کی سرپرستی میں پھولے پھلے، اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہو۔ اور یہ ملک و قوم کے لیے پیامِ رحمت ثابت ہو۔ انشاء اللہ قریب میں اس کے کئی ایک خریدار بنا سکوں گا۔ امید کہ مزاجِ عالی بخیر ہوگا۔ (حافظ باقوی جمیل آباد و شارم)

پیامِ تعلیم کا تازہ ترین شمارہ موصول ہوا۔ ٹائٹل ہر بار کی طرح اس بار بھی بہت ہی خوبصورت اور جاذب نظر ہے یوں تو پیامِ تعلیم کی سب ہی تخلیقات پسند آئیں خاص کر "مونگے کا جزیرہ"

مسعید احمد رفاعی بمبئی ۳

میں پیام تعلیم کا پرانا خریدار ہوں۔ ادھر گذشتہ دو تین سالوں سے پیام تعلیم نہیں منگا رہا ہوں کبھی کبھی ایا دارالمصنفین شبلی منزل سے پیام تعلیم لاتے ہیں تو پڑھ لیتا ہوں۔ مارچ کا پرچہ سامنے ہے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا ہے کہ اب پیام تعلیم پہلے جیسا نہیں رہ گیا ہے۔ اس کی وضع اور شکل وصورت بالکل سے بدل گئی ہے۔ ٹائیٹل تو خوبصورت ہے لیکن اس میں پہلے جیسی جاذبیت اور دلکشی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ کہاں وہ ۴۴ صفحے کا پیام تعلیم اور کہاں اب صرف ۴۰ صفحے کا پرچہ۔ لیکن افسوس کرنے سے کیا فائدہ۔ اس گرانی کے زمانے میں ۴۰ صفحے کا ہی پرچہ نکال لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

پیام تعلیم پھر منگانے کا ارادہ ہے۔ جلد ہی انتظام کر کے سالانہ چندا بھیجوں گا۔

رشید احمد اعظمی۔ اعظم گڑھ

اپریل کا شمارہ زیر نظر ہے۔ سرورق کی خوبصورتی اور لطافت کے بارے میں کچھ کہنا پرانی باتوں کو دہرانا ہوگا۔ کتابت اور طباعت پہلے کے شماروں سے اس بار کافی نکھر گئی ہے۔ کوہاؤٹیک ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون رہا جس کے لئے محترم محمد امین صاحب قابل مبارکباد ہیں۔ کہانیوں میں طلسمی گھوڑا اور عقلمند لڑکی اور منظومات میں محبوب راہی کی نظم "جاگتے رہو" مجھے بہت پسند آئی۔ اب کی بار "ادھر ادھر" کے صفحات بھی دلچسپ خبروں سے پُر رہے۔ اور ایک مضمون جاپانی کبوتر اندکوٹے بھی خاصا مزیدار رہا۔

گرانی کے اس "سنہرے دور" میں بچوں کے لیے اس قدر بامقصد اور خوبصورت رسالے نکالنا آپ جیسے اردو نواز اور باہمت مدبر کا ہی کام ہے۔

خدا کرے رسالہ ترقی کی منزل کی طرف بڑھتا رہے آمین۔ دعاؤں کہ بھگا توی ہیڈ ماسٹر بیسک اسکول مغربی دیناج پور)

مارچ کا شمارہ نظروں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہر بار کی طرح خوبصورت ٹائیٹل جاذب توجہ ہے اور دل موہ لینے سے باز نہیں آتا۔ کہانی میں تسلسل اور تجسس برقرار رکھنا جناب انجم اشرفی صاحب کا ہی کمال ہے۔ جیسے قارئین "مونگے کا جزیرہ" پڑھتے وقت ضرور محسوس کریں گے۔ میرا تو جی چاہتا ہے آپ ایک ساتھ ہی "مونگے کا جزیرہ" کی ساری قسطیں چھاپ دیں اور میں ایک ہی وقت میں سب ہی پڑھ لوں۔ دیگر تخلیقات بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

جناب جمیل قریشی صاحب کی "ہالینڈ کی پن چکی"، جناب خالد عرفان کے "آبی تجربے" جناب ناظم سیوانی کی "سچائی" محترمہ طاہرہ یاسمین کا "جادو کا برتن" اور جناب پروفیسر آفاق احمد کا "کیچڑ کا بھوت" سچ مچ پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ ساتھ حصہ منظومات میں جناب حافظ یا قوی کی نظم "ماں کی دعا" اور "زبان ہماری اسکول جارہے ہیں اور شاعر اور ستارے بہت خوب ہے۔ میری طرف سے ان سبوں کو ضرور ضرور مبارک باد پہونچا دیجیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

(سعید احمد رفائی ۳۳۔ قاضی اسٹریٹ کمٹی)

جو اللہ اور یوم آخرت پہ ایمان رکھتا ہو (اور اس لیے اللہ کی رضا اور آخرت میں فلاح چاہتا ہو) تو اسے لازم ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو نہ ستائے۔
(بخاری مسلم)

# اِدھر اُدھر سے

## امام بخاری کی ۱۲۰۰ ویں سالگرہ

سوویت یونین کے مسلمان اس سال امام محمد ابن اسمٰعیل بخاری کا (جو امام بخاری کے نام سے ساری اسلامی دنیا میں مشہور ہیں) ۱۲۰۰ واں یوم ولادت منائیں گے

امام بخاری کی ۱۲۰۰ ویں سالگرہ منانے کے فیصلہ کا اعلان وسطی ایشیا اور قزاخستان کے مسلم مذہبی بورڈ کے سربراہ مفتی ضیاءالدین ابن ایشان بابا خان نے جو ۱۲۰۰ ویں سالگرہ تیاری کمیٹی کے صدر بھی ہیں پریس کانفرنس میں کیا۔

مفتی ضیاءالدین بابا خانوف نے بتایا ہے کہ یہ ۱۲۰۰ سالہ جشن اگست کے اواخر میں سمرقند میں منایا جائے گا۔ ان تقریبوں کی ابتدا مسجد امام البخاری میں نماز سے ہوگی۔ یہ مسجد اسی موضع میں ہے جہاں امام بخاری کا مزار ہے۔ نماز کے بعد امام بخاری کی تصنیفوں کے بارے میں ایک کانفرنس ہوگی۔

سالگرہ تقاریب کمیٹی کی طرف سے عرب ملکوں کے اور دوسرے ملکوں کے مسلم رہنماؤں کو ان تقاریبوں میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔

مفتی ضیاءالدین بابا خانوف نے بتایا ہے کہ سالگرہ کے پروگرام میں امام بخاری کی تصنیف "جامع الصحیح" کی اشاعت بھی شامل ہے۔ قرآن اور حدیث کے بعد اسلام میں یہ کتاب اہمیت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں تاشقند میں شائع کی جائے گی۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم مذہبی بورڈ کے کتب خانہ میں اسلامی علوم سے تعلق رکھنے والی کئی نایاب کتابیں محفوظ ہیں۔

اخبار نویسوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے مفتی ضیاءالدین بابا خانوف نے بتایا کہ جمہوریۂ ازبکستان میں کئی ایسے مقامات موجود ہیں جو امام بخاری کی یاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں شہر بخارا جہاں امام بخاری کی ولادت ہوئی تھی، اور سمرقند شامل ہیں۔ امام بخاری کا مزار سمرقند کے قریب ہی واقع ہے۔ (واقعات و تبصرے)

## معمّا حل ہو گیا:

اپریل کے "اِدھر اُدھر سے" کے عنوان کے نیچے۔ جل پری کی دلچسپ اور حیرت میں ڈالنے والی خبر شایع ہوئی تھی۔ یہ خبر آپ نے بھی دلچسپی سے خوب مزے لے لے کر پڑھی ہوگی مگر یقین نہ آیا ہوگا تو لیجیے اب یہ معمّا حل ہو گیا۔ خبر بالکل جھوٹی تھی۔ اب ذرا تفصیل سنیے۔

کویت۔ مارچ۔ مقامی انگریزی اخبار کویت ٹائمز نے عورت کے دھڑ والی مچھلی کا معمّا حل کر لیا ہے۔ ۱۲- جنوری کو اسی اخبار کے ہفت روزہ اڈیشن "گلف مرر" میں یہ خبر شایع ہوئی تھی۔ بعد میں یہ خبر تہران کے مشہور اخبار "کیہان" نے نقل کی پھر تو یہ خبر پھیلتے پھیلتے پاکستان اور دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی۔

اس خبر میں یہ بھی تو بتایا گیا تھا کہ عورت کے دھڑ

والی یہ مچھلی تحقیقات کے لیے لندن کے عجائب گھر میں بھیج دی گئی ہے! تو اب سنیے:

"کویت ٹائمز" کو بحرین کے انٹرنیشنل اسکول آف ریسرچ کے ایک طالب علم نے اطلاع دی ہے کہ لندن کے کسی عجائب گھر میں ایسی عجیب وغریب مچھلی نہیں بھیجی گئی۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ لندن کی ایک آرٹ گیلری میں ایک فرانسیسی مصور "اینے گریٹ" کی تصویر موجود ہے۔

پچھلے دنوں ایک با تصویر رسالے "ماڈرن فوٹو گرافی" میں ایک فرانسیسی فن کار کی تصویروں پر ایک مضمون نگار نے تبصرہ کیا تھا۔

تو بس اس رسالے میں شائع ہونے والی تصویر سے اس خیالی مچھلی کے متعلق خبروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

"کویت ٹائمز" نے اپنی کسی پچھلی اشاعت میں اس طالب علم مسٹر "ٹام ہل" کا شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے یہ تحقیق کی اور اس عجیب وغریب مچھلی کا معمّا حل کردیا۔

(سب ساتھ)

## چار آنکھوں والا بچّہ

اسفال ۱۵-اپریل۔ یہاں ایک منی پوری عورت کے یہاں چار آنکھوں والا لڑکا پیدا ہوا ہے۔ یہ عورت کھدرائی کے کائی نامی گاؤں میں رہتی ہے۔ ڈاکٹر اس بچّہ کی نگہداشت اور دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ بہت سے لوگ اسے دیکھنے آرہے ہیں۔

## آٹھ ہزار پونڈ کی بلّی غائب

لندن ۲۲-اپریل اسکس میں پولیس نے ارتھر کی تلاش کی مہم شروع کردی ہے جس کی قیمت آٹھ ہزار پونڈ بتلائی جاتی ہے اور جو برطانیہ کی سب سے زیادہ مشہور بلّی ہے۔ گذشتہ جمعہ کو آرتھر کا اغوا کیا گیا تھا۔ اور اس کی گمشدگی سے ملک کے مویشی پالنے والے ہزارہا شوقین انتہائی پریشان ہیں گذشتہ ۸ سال سے آرتھر ٹیلی ویژن گراموں میں عوام کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

## عصمت انونو

پچھلے دسمبر میں عصمت پاشا اللہ کو پیارے ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر نوے سال تھی ان کی وفات کے ساتھ ترکی ہی نہیں بلکہ اس صدی کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہوگیا۔

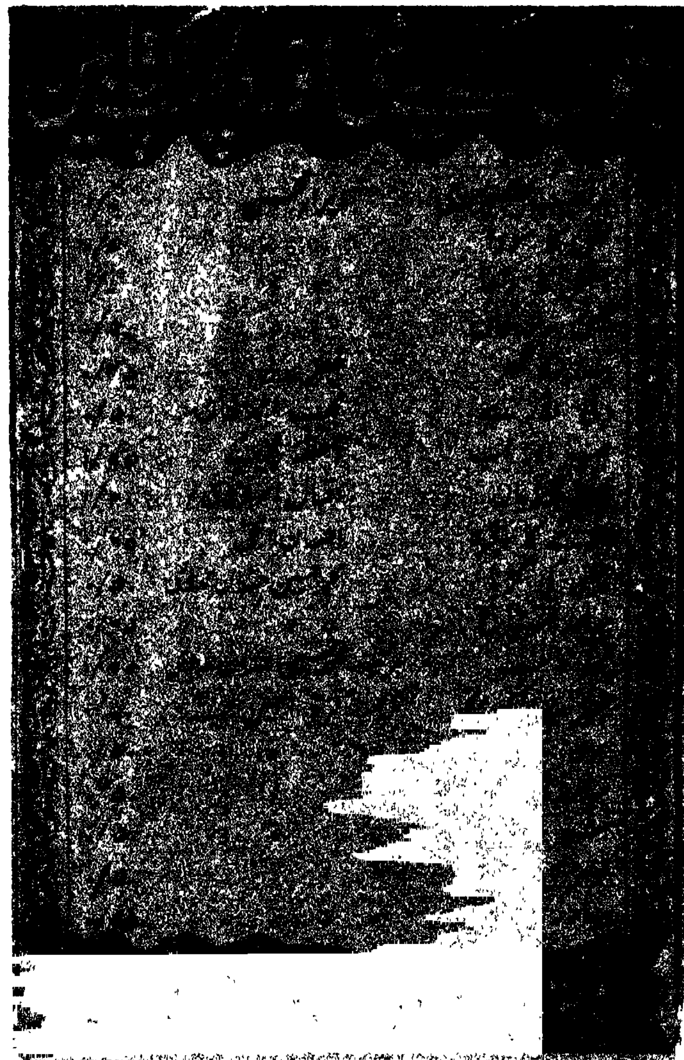
ہماری نئی نسل عصمت انونو سے تو واقف ہوگی جو جمہوریہ ترکی کے پہلے وزیراعظم اور دوسرے صدر تھے لیکن اس غازی عصمت پاشا کو شاید ہی جانتی ہو جو اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ترکی کے ایک کامیاب جنرل تھے۔ مارچ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے انونو کے میدان میں یونانیوں کو شکست دی اور اسی مناسبت سے ان کے نام کے ساتھ انونو کا اضافہ ہوا اور پھر یہ ان کے نام کا جزو بنا لیا۔

غازی عصمت پاشا ۱۸۸۳ء میں سمرنا میں پیدا ہوئے تھے۔ جسے اب ازمیر کہا جاتا ہے) قسطنطنیہ کی فوجی اکیڈمی میں انھوں نے فوجی تربیت حاصل کی۔ ینگ ٹرکس (نوجوان ترک) کی اس تحریک سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا جس نے ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ اس کے بعد ہی انھیں وزارت جنگ میں انڈر سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں جمہوریہ ترکی کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور دو سال بعد ترکی کے وزیر خارجہ مقرر کیے گئے۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی عثمانی حکومت جرمنی کی حلیف تھی لیکن کامیابی اتحادی طاقتوں کے حصے میں آئی۔ جنگ کے خاتمے پر عثمانی سلطنت کے یورپی اور ایشیائی مقبوضات کے حصے بخرے کے لیے

باقی صفحہ [illegible] پر

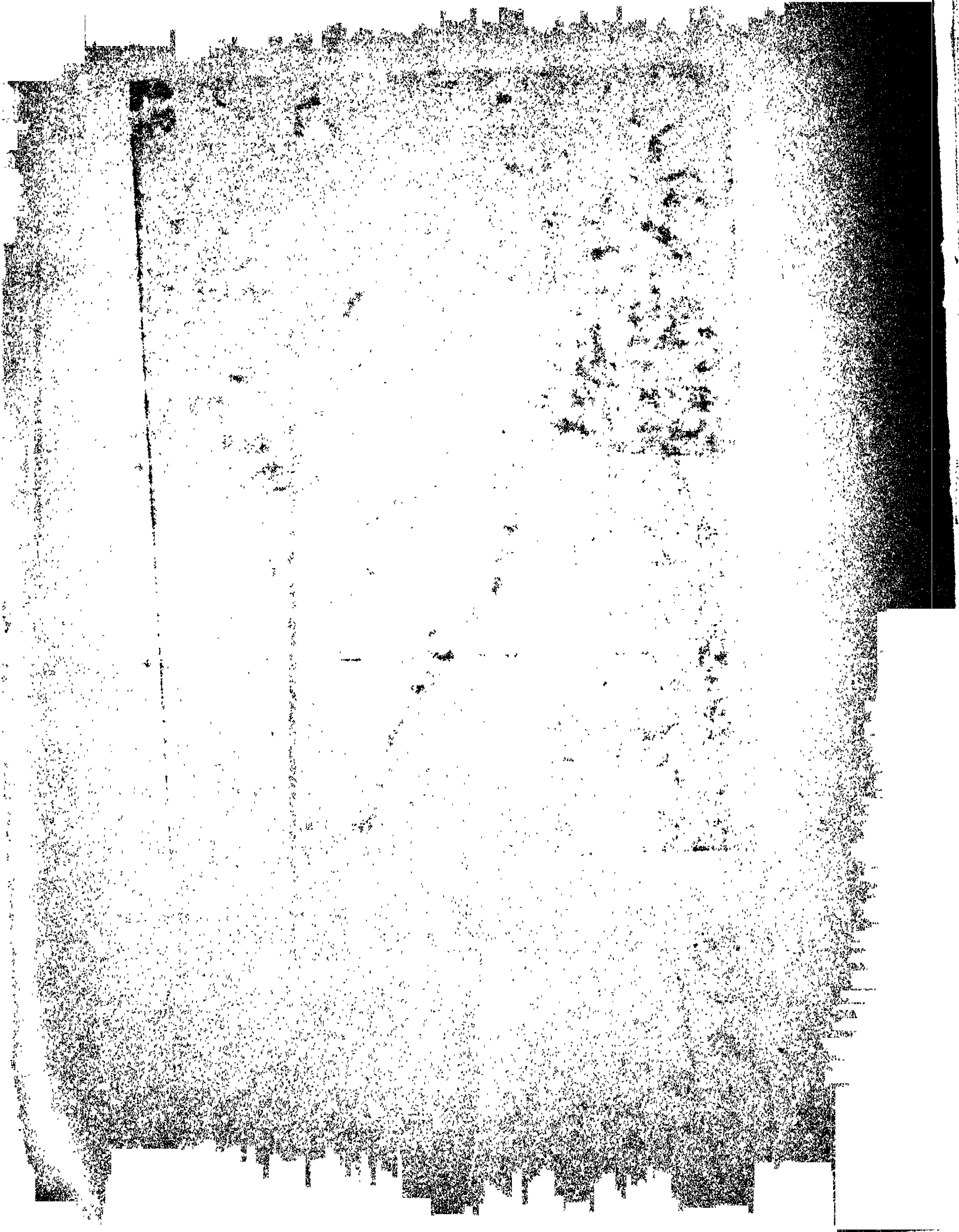








# پیامِ تعلیم



ماہنامہ

# پیامِ تعلیم

نئی دھلی ۲۵

جلد ۱۱ شمارہ ۷

اڈیٹر

محمد حسین حسّان ندوی

جولائی ۱۹۷۴ء

قیمت ۷۰ پیسے
سالانہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دلّی میں چھپوا کر جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

# فہرست مضامین





# بچوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ارکانِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/50 |
| آں حضرتؐ | الیاس احمد مجیبی (اُردو) | -/65 |
| پاک کہانیاں (دو حصّوں میں) | مقبول احمد سیوہاروی | 2/35 |
| چار یار | الیاس احمد مجیبی | 2/50 |
| خلفائے اربعہؓ | خواجہ عبدالحیٔ فاروقی | 2/25 |
| رسولِ پاکؐ | عبدالواحد سندھی | 1/80 |
| عقائدِ اسلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/50 |
| مسلمان بیبیاں | مولانا اعجاز الحق قدوسی | -/75 |
| ہمارے رسولؐ کے قصے | خواجہ عبدالحیٔ فاروقی | 2/- |
| سرکارِ دو عالم | محمد حسین حسان | 2/75 |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| رابندر ناتھ ٹیگور | صفدر حسین | 1/25 |
| سماجی زندگی (اوّل) | احمد جلیل و غلام ابرار | 1/- |
| 〃 〃 (دوم) | 〃 〃 | 1/25 |
| 〃 〃 (سوم) | 〃 〃 | 1/25 |
| 〃 〃 (چہارم) | 〃 〃 | 1/25 |
| سمندر کے کنارے | سلطانہ آصف فیضی | 1/30 |
| 〃 〃 بچے | 〃 〃 | 2/- |
| قدرت کے کرشمے | ادارہ | -/62 |
| میرا انیس | محمد حسین حسان | 1/25 |
| ہماری پارلیمنٹ | کیلاش چندر | 1/25 |

## معلومات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| آدمی کی کہانی | مشتاق احمد | 1/75 |
| انوکھا عجائب خانہ | محمد حسین حسان (چار حصّے) | 1/80 |
| بجلی کی کہانی | علی احمد خاں | -/50 |
| بڑے دادا کی کہانی | محمد عبدالغفور | -/56 |
| تاریخِ ہند کی کہانیاں (اوّل) | خجستہ سلطانہ | -/80 |
| 〃 〃 〃 (دوم) | ضیاء الرحمٰن | 1/- |
| 〃 〃 〃 (سوم) | مشتاق احمد اعظمی | 1/80 |
| 〃 〃 〃 (چہارم) | 〃 〃 | -/95 |
| چٹانوں کی کہانی | محمد امین | 1/75 |
| خبر رسانی کے طریقے | رفیعہ منظور الامین | -/85 |
| دنیا کے بچے | محمد حسین حسان | 1/- |
| دہلی | ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی | 1/50 |

## کہانیاں، ڈرامے، ناول

| کتاب | | مصنف | قیمت |
|---|---|---|---|
| جن حسن عبدالرحمٰن | (ناول) | (دو حصّے) | 4/- |
| اس نے کیا کر نہ جانا | (کہانیاں) | آصف مجیب | -/37 |
| پریم کی جیت | (ڈراما) | اسد اللہ کاظمی | -/37 |
| تانبیل خاں | (کہانی) | محمد حسین حسان | -/30 |
| ترکوں کی کہانیاں | ( 〃 ) | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/55 |
| تیس مار خاں کے کارنامے | (ناول) | م۔ ندیم | 1/50 |
| تین اناڑی | ( 〃 ) | عصمت چغتائی | 1/40 |
| چپاوت کا آدم خور شیر | (سچی کہانی) | محمد معین | -/35 |
| چلبلی | | محمد حسین حسان | -/50 |
| ستاروں کی سیر | (ناول) | کرشن چندر | 1/75 |
| کوے دادا | (سچا ناول) | مجیب احمد خاں | 1/75 |
| لال مرغی | (کہانی) | عبدالواحد سندھی | -/50 |
| مزہ چکھائیں گے | ( 〃 ) | مرتبہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/35 |
| مزہ دار پہیلیاں | (پہیلیاں) | محمود علی خاں | -/65 |
| ننھا منّا | (کہانی) | خورشید سلطان | -/30 |

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

# آہ محمد حسین حسّان ندوی!

جون کے پیام تعلیم سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کے اڈیٹر صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ ان کی بیماری اور پھر کاتب صاحب کی علالت کی وجہ سے جولائی کا پرچہ بروقت مرتب نہ ہو سکا۔ ادھر اس کے سرورق کے لیے کاغذ نہیں مل رہا تھا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ جولائی کا پیام تعلیم روک لیا جائے اور اگست کے شمارے کے صفحے بڑھا کر اس کمی کو پورا کر دیا جائے۔

یہ فیصلہ دفتر کا تھا۔ محترم اڈیٹر صاحب اس کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بغیر سرورق کے ہی پرچہ نکالا جائے۔ بالآخر بات انھی کی بالا رہی۔ اپنی علالت کے باوجود انھوں نے جولائی کا پرچہ مرتب کر لیا جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ واقعہ ۸ر جولائی ۷۴ء کا ہے۔ اگلے روز سے ان کی حالت زیادہ خراب ہونا شروع ہوئی یہاں تک کہ ۱۲ر جولائی کی صبح کو انھیں ایک اچھے مقامی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ دن میں ان کے صاحبزادے محمد شعیب حسّان اور بہت ہی قریبی رفیق محمد حسین صاحب (ابّو) ہسپتال میں رہے۔ رات کو محمد حسین صاحب (ابّو) تنہا ان کے پاس رہے۔

۱۳ر جولائی کو محمد حسین صاحب (ابّو) نے ٹیلی فون کے ذریعے یہ خبرِ بد سنائی کہ صبح چھ بج کر ۱۰ منٹ پر محمد حسین حسّان صاحب اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ اس خبر نے مکتبہ جامعہ پر بجلی سی گرا دی —— شاہد علی خاں صاحب یہ خبر سنتے ہی ہسپتال پہنچے۔ ۹ بجے کے بعد جسدِ خاکی کو جامعہ نگر لایا گیا۔ اس عرصے میں یہ خبر پوری بستی میں پھیل چکی تھی۔ جامعہ ملیہ نے اپنے تمام دفاتر بند کرا دیے۔ مکتبہ جامعہ اور اس کے دوسرے دفاتر اور پریس بند رکھے گئے اور بعد نمازِ ظہر مرحوم کو جامعہ ملیہ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

محمد حسین حسّان مرحوم کے انتقال سے سب سے زیادہ نقصان بچوں کی موجودہ نسل کو ہوا جن کے لیے وہ کم و بیش چالیس برس تک پیامِ تعلیم اور مختلف کتابوں کی صورت میں لکھتے رہے۔ ۱۹۳۱ء سے

تادمِ آخر مرحوم پیامِ تعلیم سے وابستہ رہے اور طرح طرح سے پیامیوں کی دلچسپی اور ان کے کردار کی تعمیر کا سامان فراہم کرتے رہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بچّوں کے ادب میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ بچّوں کی نفسیات، ان کی ذہنی کیفیات پر خاص نظر تھی۔ بچّوں سے کس زبان میں باتیں کرنا چاہیے، یہ راز بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

پیامِ تعلیم کے لیے جو مضامین آتے، انھیں بڑی توجہ سے دیکھتے، بڑی محنت سے ان کی نوک پلک درست کرتے، تب مضمون کاتب کے حوالے کرتے۔ کہانیاں لکھنے والوں سے کہتے کہ وہ سائنسی مضامین لکھیں، شاعری کرنے والے بچّوں کو مشورہ دیتے کہ وہ نثر میں مضامین لکھیں۔ جہاں انھیں بچّوں اور نوآموز لکھنے والوں کے مضامین پا کر خوشی ہوتی وہاں یہ افسوس بھی کرتے کہ ہمارے بڑے ادیب بچّوں کے لیے لکھنے میں بہت بخل سے کام لیتے ہیں۔

آپ کے ہاتھوں میں حسین حسّان صاحب کا ترتیب دیا ہوا آخری پرچہ ہے۔ آپ کی آنکھیں اس زبان کو دیکھنے کے لیے ترسیں گی جس زبان میں وہ آپ سے باتیں کیا کرتے تھے۔ بہت سے پیامی تقاضا کرتے کہ حسین حسّان صاحب اپنی تصویر رسالہ میں شایع کریں۔ مرحوم اس سے کتراتے تھے۔ بدقسمتی سے آج ہم ایسے پیامیوں کی خواہش کو اس وقت پورا کر رہے ہیں جب صاحبِ تصویر ہم میں نہیں رہے۔

اس حادثۂ جانکاہ میں ہم مرحوم کے بھائی حکیم محمد ذہین، اہلیہ، فرزندگان محمد حسیب، محمد شعیب، محمد نجیب، محمد شکیب حسّان، دختران صفیہ، ریحانہ اور فرزانہ سلّمہم کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو یہ غم برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔ آپ بھی ان دعاؤں پر آمین کہیے۔

ان حالات میں اگست کے پیامِ تعلیم کی اشاعت کب ہوگی اور کیونکر، یہ اس وقت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مکتبہ جامعہ کے تمام کارکن اپنے پرانے رفیق کی جدائی سے بہت متاثر ہیں اس لیے کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے کچھ سکون کی ضرورت ہے۔ خدا کرے یہ جلد میسّر آجائے۔ آمین!

(ادارہ)

# بچّوں سے باتیں

لیجیے کبھی یہ چھٹیاں تو جیسے بات کہتے گذر گئیں۔ خیر سے جولائی کا مہینہ آگیا۔ اسکولوں میں کالجوں میں پھر سے چہل پہل شروع ہو گئی۔ پرانے ساتھی گلے مل رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھ رہے ہیں۔ چھٹیوں کے زمانے کی روداد سنائی جارہی ہے۔ چہلیں ہو رہی ہیں قہقہے لگ رہے ہیں۔ عجیب چہل پہل ہے۔ ان میں کچھ نئے چہرے بھی ہیں اجنبی اجنبی سے یہ اپنے سرپرستوں کے ساتھ آئے ہیں۔ داخلہ لینے۔ بے چارے حیران پریشان سے۔ کچھ کھوئے کھوئے سے تھوڑے دنوں میں مانوس ہو جائیں گے آپس میں گھل مل جائیں گے۔ نئی امنگوں نئے ارادوں اور تازہ عزم کے ساتھ پڑھائی لکھائی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

---

اس پرچے میں "مونگے کا جزیرہ" والی کہانی کی آخری قسط چھپ رہی ہے۔ کیسی دلچسپ کیسی ایڈونچر کی کہانی تھی مسلسل دو سال تک چھپتی رہی اور اس کی دلچسپی میں ذرا جو کمی آئی ہو۔

---

اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ مصنف نے کہانی کہانی میں معلومات کو کس خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔ مونگے کے جزیرے کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔ ان میں کیا کیا اگتا ہے۔ کون کون سے درخت ہوتے ہیں۔ کون کون سے جانور ہوتے ہیں۔ ایک انوکھے درخت کا پتہ دیا ہے جس کے پھل روٹی کا مزہ دیتے ہیں۔

خلیق انجم صاحب نے اسی طرح کی ایک اور لمبی کہانی لکھنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ آج کل والد صاحب کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہیں۔ محترم والد صاحب پہلے سے بہتر ہیں۔ دعا کیجیے کہ خدا جلد صحت کلی عطا فرمائے اور خلیق انجم صاحب کو اطمینان نصیب ہو۔

---

اس پرچے میں ان کا ایک ڈراما پڑھیے۔ یہ انھوں نے ہندی سے ترجمہ کیا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس قدر لاجواب ڈراما ہے۔

---

ہمارے بہت ہی محترم بہت ہی مخلص دوست یوسف ناظم صاحب کو آپ بھولے نہ ہوں گے، ایک زمانہ تھا کہ آپ کی نوازشوں کی بارش مسلسل ہوتی رہی۔ اب کچھ دنوں سے موصوف پیام تعلیم کی بزم سے غیر حاضر تھے کچھ ہماری کوتاہی کچھ ان کی مصروفیت، پر اب انھوں نے پوری کسر نکال دی اور آپ کے لیے ایک بہت ہی اچھا بہت ہی دلچسپ مضمون مرحمت فرمایا۔ کھیل ہی کھیل۔

---

یوسف ناظم صاحب عموماً مزاحیہ مضمون لکھتے ہیں۔ یہ مضمون سنجیدہ ہے مگر جگہ جگہ قلم کی شوخی بے ساختہ پھوٹ پڑتی ہے۔ اس کی وجہ سے سارا مضمون گل و گلزار بن گیا ہے پہلی قسط اس پرچے میں پڑھیے۔ ازراہ نوازش

تصویریں بھی انھی نے مرحمت فرمائی ہیں۔

محترم بزرگ غلام ربانی صاحب نے بھی آپ کے بہت دنوں کے بعد ایک دلچسپ مضمون بھیجا ہے۔ یہ مضمون کا مضمون ہے پہیلی کی پہیلی ہے پڑھیے اور بوجھیے۔

اور ہمارے پرانے ساتھی اسرار ندوی صاحب کا معلوماتی مضمون پڑھیے "انگلستان کی پارلیمنٹ کیسے بنی"۔ ندوی صاحب نے بہت سلجھے ہوئے انداز میں پارلیمنٹ کی تاریخ بیان کی ہے۔ آپ کو پسند آئے گی۔

ہمارے پرانے قدردان اور مخلص بزرگ حضرت سہیل عظیم آبادی کی ایک دلچسپ کہانی بھی اسی پرچے میں پڑھیے۔ محترم پیام تعلیم پر برابر کرم فرماتے رہتے ہیں۔ اس کرم فرمائی میں ہمارے عزیز شان الرحمٰن صاحب کا بھی خاص حصہ ہے۔ شان الحق صاحب پیام تعلیم سے محبت ہے دلچسپی ہے۔ سہیل صاحب بچوں لیے جو کہانی بھی لکھتے ہیں شان الرحمٰن صاحب ہمیں بھیج دیتے ہیں۔ دونوں کا بہت بہت شکریہ۔

نظموں میں محترم نیرؔ صاحب کی نظم اور دوسری نظمیں پڑھیے — نیرؔ صاحب جو لکھتے ہیں خوب سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں لکھنے کے بعد بار بار نظر ثانی فرماتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نظموں میں امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے اور آپ انھیں خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔

محترم نیرؔ صاحب کی طرح ان کے زیادہ تر بچوں بچیوں نے معلمی کے پیشے کو ترجیح دی ہے ان کے ایک صاحبزادے طاہر سلّمہٗ دلی کے ایک مشہور اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ حسن کارکردگی کے صلے میں شان دار ایوارڈ ملا ہے۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے عزیز میاں اس سال بی ایڈ کے ہر سبجکٹ میں اوّل آئے ہیں۔ ہم ان کے دونوں صاحبزادوں اور خود نیرؔ صاحب کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

محترم قاضی محمد احمد صاحب جامعہ کالج کے جغرافیہ ڈپارٹمنٹ میں ریڈر ہیں۔ پیام تعلیم میں اُن کے مضمون برابر چھپتے رہے ہیں۔ اِدھر ایک عرصے سے ان کے بڑے بھائی بیمار تھے اسی پریشانی میں وہ پیام تعلیم کے لیے بھی کچھ نہ لکھ سکے۔ قاضی صاحب نے دوا علاج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ پچھلی مئی کو ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ قاضی صاحب کو اپنے بھائی صاحب مرحوم سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ انھیں غیر معمولی صدمہ ہوا۔ خدا انھیں اور مرحوم کے دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

افسوس ہے کہ اس پرچے کے چھپنے میں بہت دیر ہوگئی اس کی وجہ میری بیماری اتنی نہیں ہے۔ ہمارے کاتب صاحب مشکل سے بیس پچیس صفحے لکھ پائے کہ اچانک موسمی بخار نے آدبوچا اتنے کمزور ہوگئے کہ ڈاکٹر نے کچھ دنوں تک مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اتفاق کی بات مکتبے میں جتنے کاتب تھے وہ مختلف ضرورتوں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، اور ہاں ٹائٹل کا کاغذ لینے میں سخت دشواری ہوئی اس لیے یہی بہتر سمجھا گیا کہ پرچے کو وقت پر لانے کے لیے اسے دیر سے سہی بلا سرورق کے ہی نکالا ضرور جائے اس لیے اس بار صرف ۳۲ صفحے کا پرچہ پیش ہے۔ امید ہے کہ ان مجبوریوں کے پیش نظر پیارے ہمیں معاف کریں گے ہم

جناب محمد شفیع الدین نیرّ

# اپنا گھر

گھر تو ہے اپنا ہی گھر، خوش حال یا بدحال ہو
ہاں، مگر آپس کی الفت سے وہ مالا مال ہو

گھر وہی اچھا ہے سب کے سب جہاں خوش دل رہیں
باپ ماں، بھائی بہن، بیوی میاں خوش دل رہیں

ایک کا دکھ دوسرا دیکھے تو ہو بے چین وہ
دوسرے کو جس قدر بھی بن سکے دے چین وہ

ہر بشر گھر کا کرے یوں زندگی اپنی بسر
اپنے ہمسایہ کی آسائش رہے پیشِ نظر

ایک ہمسایہ ہی کیا، ہر ایک اُس کا رام ہو
ساری بستی کے لیے اس کی محبت عام ہو

باہمی الفت کی بارش ہو در و دیوار سے
پریم سے مطلب ہو سب کو اور غرض ہو پیار سے

مرد ہو، عورت ہو، یا بچہ ہو، کوئی بھی ہو فرد
جیت لے محنت سے اپنی زندگانی کی نبرد

چین دل کا، جان کا آرام ایسے گھر میں ہے
راحتوں خوشیوں کی صبح و شام ایسے گھر میں ہے

گھر یہ رحمت سے خدا کی شاد رہتا ہے مدام
ایسے ہی گھر کے تو ہیں مشتاق ہم سب خاص و عام

ا۔ لڑائی۔ کشمکش

# گائیوں کی تقسیم

جناب غلام ربانی

بہت دنوں کی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک سجن رہتا تھا۔ اسے گائے پالنے کا بہت شوق تھا جہاں کوئی اچھی گائے دیکھتا، خرید لیتا تھا۔ ہوتے ہوتے اس کے پاس تیرہ گائیں ہوگئیں، آدمی بہت اچھا تھا، گاؤں کے بچوں کو پڑھاتا تھا اور ان کو اپنی گایوں کا دودھ پلاتا تھا گاؤں کے لوگ اس سے بہت خوش تھے۔

ایک دن وہ بیمار ہوا۔ بہترا علاج کرایا۔ مگر بیماری بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس کے تین بیٹے تھے اس نے تینوں بیٹوں کو سامنے بلایا اور کہا میرے بعد آدھی گائیں غریب آدمیوں کو دے دینا اور باقی جو بچیں ان کو تم تینوں برابر برابر بانٹ لینا دوسرے دن وہ چل بسا۔

بیٹے کریا کرم سے فارغ ہوئے تو سوچنے لگے گائیں کس طرح تقسیم کی جائیں ان کے باپ نے کہا تھا۔

آدھی گائیں خیرات کر دی جائیں اور باقی تینوں بھائی برابر بانٹ لیں۔ اب مشکل یہ آپڑی تھی کہ گائیں تیرہ تھیں ان کی آدھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ گاؤں کے کچھ لوگ آئے۔ مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کیا جائے آخر کو وہ گاؤں کے چودھری کے پاس گئے چودھری بہت سمجھدار تھا، اس نے سارا حال سن کر سوچا اور کہا ٹھیک ہے گائیں اسی طرح تقسیم ہو جائیں گی جس طرح مرنے والے نے کہا ہے۔ بیٹوں نے کہا چودھری تیرہ گایوں کا آدھا کیسے ہو سکتا ہے، چودھری نے کہا ایک گائے میں تم کو دیتا ہوں۔ اس طرح چودہ ہو جائیں گی۔ ان میں سے سات خیرات کر دو، باقی سات بچیں گی، میری گائے مجھے دے دینا۔ اس طرح چھ گائے رہ جائیں گی تم تینوں بھائی دو دو لے لو، لڑکے خوش ہوئے اور اس طرح گائیں تقسیم کرلیں

اب ہم اپنے پیامیوں کا امتحان لیتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ تیرہ کے علاوہ اور کون عدد ہے جو بالکل اسی طرح تقسیم ہو سکتا ہے۔

اتنا بتائے دیتے ہیں کہ وہ عدد دس اور بیس کے درمیان ہے۔ بھلا بتایئے تو!۔

---

# سرکار دو عالم

(محمد حسین حسّان ندوی ایڈیٹر پیام تعلیم)

اس کتاب کا ذکر پیام تعلیم میں کئی بار آچکا ہے۔ پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ اب شائع ہوگئی ہے اور آسانی سے مل سکتی ہے۔ بہت ہی سادہ اور نکھری ستھری زبان میں لکھی گئی ہے۔ انداز بیان بھی غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے۔ مدتوں بہت سے اسلامی مدرسوں کے نصاب میں شامل رہی۔ اس مرتبہ اس کی لکھائی چھپائی اور ظاہری شکل و صورت پر بھی بہت توجہ کی گئی ہے

قیمت : ۲/۷۵

جناب سہیل عظیم آبادی

# ایک نصیحت

کسی ملک میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ یہ بہت ہی نیک اور شریف تھا۔ اس کے پاس ایک بہت بڑا باغ تھا اس باغ میں طرح طرح کے پھلوں کے پیڑ تھے ہر سال ان پیڑوں میں ہزاروں بلکہ لاکھوں پھل آتے تھے۔ یہ امیر آدمی جتنا نیک تھا اتنا ہی عقلمند اور سمجھ دار تھا۔ اس کے ایک ہی لڑکا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا لڑکا بھی نیک اور سمجھ دار ہو۔

اس نے اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم دلوائی اور اچھے لوگوں کی صحبت میں رکھا تاکہ ان سے وہ اچھی باتیں سیکھے۔

لڑکا بڑا ہوا تو اچھا اور سمجھ دار نکلا۔ لیکن باپ کو اس میں ایک بڑی کمی نظر آئی: وہ ہر کام کے بارے میں بہت زیادہ سوچتا تھا اور کافی دیر کرتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کو کافی سمجھایا مگر اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔

امیر آدمی بے حد پریشان رہنے لگا۔ آخر کار اس نے ایک بزرگ فقیر سے درخواست کی کہ اس کے لڑکے کو روشنی دکھائے اور اس کی رہنمائی کرے۔ فقیر نے کہا "وہ اپنے لڑکے کو بھیج دے" امیر آدمی لڑکے کو فقیر کی خدمت میں بھیجا۔ فقیر نے اسے دعائیں دیں اور کہا "اپنے باغ سے جا کر جو پھل سب سے اچھا ہو اسے توڑ لاؤ۔ پھر میں تمھیں دعائیں دوں گا۔ اور خدا کے فضل و کرم سے تمھارا بھلا ہوگا" لڑکا نیک تو تھا ہی۔ حکم کی تعمیل کے لیے چل پڑا۔

فقیر نے لڑکے کے باپ سے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ باغ میں جس طرف اچھے پھل لگے ہوں اسی طرف کا دروازہ کھلا رکھے اور دوسرے دروازے بند رکھے۔ لڑکا باغ میں جیسے جیسے آگے بڑھتا جائے پیچھے کے سب پھلوں کو فوراً توڑ ڈالا جائے۔ اس طرح کہ اسے خبر نہ ہو سکے باغ کے آخری کونے کے سب پھلوں کو فقیر کے حکم سے پہلے ہی توڑ لیا گیا تھا۔

لڑکا باغ میں گیا۔ بہت اچھے اچھے پھل لگے تھے۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس نے سوچا کہ ایک پھل تو کیا وہ ہزاروں پھل گاڑی پر لاد کر فقیر کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے۔ اور فقیر کو خوش کر کے دعائیں حاصل کر سکتا ہے۔ وہ کچھ دیر درختوں اور پھلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے سوچا کہ پھل تو بے شمار ہیں۔ ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھ لیا جائے اگر اس سے بھی اچھے پھل ہوں تو توڑ لیے جائیں۔ اس خیال سے وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن آگے بھی اسے اطمینان نہ ہوا تب وہ اور آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح وہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ ادھر پیچھے فقیر کے حکم کے مطابق امیر آدمی کے نوکر پھل توڑتے گئے اور ایک الگ جگہ بھیجے گئے لڑکا مسلسل آگے بڑھتا رہا اس خیال سے کہ باغ میں آگے اس سے بھی اچھے پھل ہوں گے لیکن کہیں پر اس کی طبیعت نہیں بھری یہاں تک کہ وہ باغ کے آخری کونے تک پہنچ گیا۔ لیکن وہاں ایک بھی پھل نہیں تھا سارے پھل پہلے ہی توڑے جا چکے تھے۔

لڑکے نے سوچا کوئی پرواہ نہیں پیچھے جاکر اچھے سے اچھا پھل توڑے گا۔ لیکن جب لوٹا تو اس نے دیکھا کہ سارے کے سارے پھل پیڑوں سے غائب ہیں۔ سب توڑے جا چکے ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔

یہاں تک کہ وہ باغ کے اس حصّے میں آگیا جہاں سے چلا تھا اور جہاں وہ بہت اچھے اچھے پھل چھوڑ کر گیا تھا۔ لیکن یہاں بھی پیڑوں پر کوئی پھل نہیں تھا۔ لڑکے کو بہت فکر ہوئی کہ اب کیا کرے۔ فقیر کے پاس خالی ہاتھ کیسے جائے مگر کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ شرمندہ ہوکر فقیر کی خدمت میں خالی ہاتھ پہنچا۔

فقیر نے پوچھا "پھل لائے؟" لڑکا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ فقیر نے لڑکے کو شرمندہ دیکھ کر بہت پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ مجھے پھلوں کی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ میں تمھیں ایک بڑی اور اہم نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ یہ دنیا بھی ایک بہت بڑا باغ ہے جس میں ایک سے ایک ان گنت (لاتعداد) پھل لگے ہیں اگر کامیاب ہونا چاہتے ہو تو سمجھ کے مطابق جو پھل تمھیں اچھا لگے اسے توڑ لو اور پھر اس سے اچھے پھل کی تلاش کرو۔ اور پھر اس سے بھی اچھے پھل کی کھوج میں آگے بڑھو۔ اسی طرح قدم بہ قدم اچھے پھل حاصل کرتے رہو۔ ورنہ لوٹ کر آنے پر تمھیں کوئی پھل نہ ملے گا۔ یہاں بے شمار لوگ پھلوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ جو پھل مل جائے اُسے لے لو اور تب پھر اس سے اچھا پھل حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر تم اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح باغ میں گئے تھے تو تمھیں کوئی پھل نہ ملے گا"

کہانی بالکل سیدھی سادی ہے۔ لیکن اس سے ایک بہت بڑا سبق ملتا ہے کہ انسان مستقبل کی امید میں حال (موجودہ زمانہ) کو نہ چھوڑے۔ جو حال کو چھوڑ دیتا ہے اسے مستقبل (آنے والا زمانہ) بھی حاصل نہیں ہوتا۔

---

# بچّے کی دعا

جناب نثار

الٰہی سب کو نیک اعمال کردے
چلن اچھا ئنا سب چال کردے
نئے اس سال کو، بخشا جو تو نے
انوکھا اور نرالا سال کردے
ہمارے دل کی امیدوں کے مالک
ہمارے دیس کو خوشحال کردے
اگر دنیا ہے کچھ اے دینے والے
تو فکر و فن سے مالا مال کردے
مجھے تو عقل دے آزادؔ جیسی
مجھے مولا، جواہرلال کردے
مقدر جگمگا دے یا الٰہی
مرے مولا مجھے خوش حال کردے
کھلونے، کپڑے اور میوے مٹھائی
براہِ پارسل ارسال کردے
ہے اک شاعر نثارؔ ناتواں بھی
اسے تو شاعرِ اطفال[1] کردے

[1] اطفال طفل کی جمع۔ "بچے" یعنی مجھے بچوں کا شاعر کردے

جناب یوسف ناظم

# کھیل ہی کھیل

(باتصویر)

کھیلے بغیر کس کا کھانا ہضم ہوا ہے یا کسے چین کی نیند آئی ہے! کھیل صرف بچوں کا مشغلہ نہیں۔ کھیل سبھی کھیلتے ہیں آدمی بوڑھا ہو جائے اور بھاگ دوڑ نہ سکے تو بلیرڈ کھیل کر اپنا شوق پورا کرتا ہے۔ حالانکہ بلیرڈ بھی نگاہ کا کھیل ہے۔ نظر کمزور ہو جائے تو کھیلنے والے اپنی گیند بھی نہیں پہچان سکتے لیکن کھیل سے باز نہیں آتے۔ یہ دنیا ہے ہی کھیلوں کی۔

آدمی اپنی عمر کے کسی نہ کسی حصے میں کسی نہ کسی کھیل میں ضرور دخل دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص چیمپین بنے لیکن آدمی کے جسم کا پسینہ تو بہنا ہی چاہیے۔

دنیا میں ہزاروں قسم کے کھیل ہیں۔ بعض کھیل صرف کھیل ہوتے ہیں اور بہت سے کھیل مہم کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے چنے اور لوہے کے چنے۔ بہت سے کھیلوں میں کھیلنے والے کے جسم پر خراش تک نہیں آتی۔ بہت سے کھیلوں میں کھیلنے والوں کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ چند کھیل تو ایسے ہوتے ہیں جن میں کھیلنے والا اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ مثلاً گھڑ دوڑ یا بازی۔ گھوڑ سواری کے مقابلے میں ایک فریق دوسرے فریق کا جبڑا توڑ دیتا ہے اور اسے اسٹریچر پر اٹھا کر رنگ سے باہر لے جانا پڑتا ہے۔ یہ بھی کھیل ہی ہے...... جیتنے والا اپنے ساتھیوں کے کاندھوں پر سوار ہوتا ہے تو ہارنے والا ایمبولنس پر۔

اب ہر کھیل کے میدان میں کھیل میں حصہ لینے والوں کی ٹیم کے علاوہ ڈاکٹروں کی بھی ایک ٹیم موجود رہتی ہے۔ پولس کا بھی بندوبست ہوتا ہے بلکہ بعض وقت تو لاری بھی تیار کھڑی رہتی ہے کھیلوں کے ریفری، گھر سے چلتے وقت اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے گلے مل کر رخصت ہوتے ہیں اور کھیل کے میدان پر پہنچتے ہیں۔ ان کی واپسی یقینی نہیں ہوتی۔ کھلاڑی بھی کھیل کے میدان پر اس طرح جاتے ہیں جیسے سپاہی، جنگ کے میدان پر جا رہا ہو۔ کھیل شروع ہونے کی سیٹی بجنے اور ہوائی حملے کے سائرن بجنے میں تھوڑا ہی سا فرق رہ گیا ہے۔

ہر ملک کسی ایک کھیل میں آگے نکل جاتا ہے۔ یہ اس ملک کا قومی کھیل کہلانے لگتا ہے۔ قومی کھیل کی پہچان

یہ ہے کہ پورے ملک کے شہروں گاؤں اور دیہاتوں میں وہی کھیل، ہر جگہ کسی نہ کسی طریقے پر کھیلا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے گلی کوچوں میں ربر کی گیند سے کرکٹ یا درختوں سے توڑی ہوئی لکڑیوں سے ہاکی یا کپڑے کی بنی ہوئی گیند سے فٹ بال کھیلتے نظر آتے ہیں۔

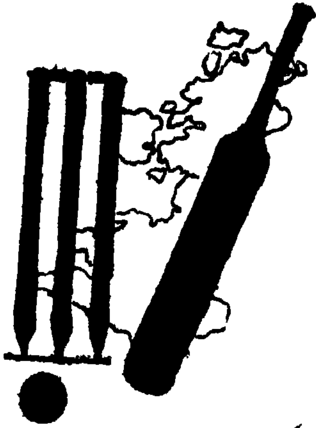
اب کھیلوں کے بھی اسکول اور کالج ہیں اور چھوٹی عمر سے بچوں کو ان کھیلوں کی باضابطہ مشق کرائی جاتی ہے۔ کھیلوں کی ترقی کے لئے اب بجٹ بننے لگے ہیں۔ اور ان کے لیے الگ محکمے قائم کرنے پڑ رہے ہیں۔

کھیل اب صرف کھیل نہیں رہا۔ ملک کی عزت اور وقار کا معاملہ بن گیا ہے۔ اب ٹیم کے کیپٹن کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی فوج کے کیپٹن کی بلکہ ٹیم کا کپتان تقریباً کمانڈر ان چیف ہوتا ہے اور اگر ٹیم ہار جائے تو اس کو ایک تحریری رپورٹ پیش کرنی پڑتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور غلطی کس کی تھی۔ کیپٹن، منیجر کو، منیجر ٹیم کا انتخاب کرنے والی کمیٹی کو اور یہ کمیٹی، دوسرے ملک کے موسم، میدان اور ماحول کو ہار کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔

ہر ملک اپنے قومی کھیل کا خود ہی انتخاب کرتا ہے اور خود ہی اس میں ہارتا ہے۔ قومی کھیل بنانے میں اس ملک کے باشندوں کے مزاج، رجحان اور دلچسپی کو بڑا دخل ہوتا ہے لیکن کوئی ایک کھیل، کسی ایک ملک کی ملکیت نہیں ہوتا۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ پچھلے چند برسوں میں یورپی ملکوں نے ہاکی کے کھیل میں ترقی کی ہے اور اتنی ترقی کی ہے کہ پچھلے اولمپک کھیلوں میں مغربی جرمنی نے سونے کا تمغہ اڑا لیا۔ حالانکہ مغربی جرمنی کا قومی کھیل کچھ اور ہے۔ کس ملک کا قومی کھیل کیا ہے اس کی تفصیل سنیئے:۔

(۱) کرکٹ: کرکٹ انگلینڈ کا قومی کھیل ہے۔ انگلینڈ والے اب اس کھیل میں کسی سے پیچھے رہ گئے ہوں۔ لیکن یہ کھیل ہے تو ایم سی سی کا۔ ایم۔ سی۔ سی ٹیم کا نام لیتے ہی ذہن میں ایک اعلیٰ درجے کی کرکٹ ٹیم کا خیال آ جاتا ہے۔ ایم سی۔ سی یعنی ملبون کرکٹ کلب۔

کہتے ہیں یہ کھیل ۱۷۵۰ء میں شروع ہوا۔ یہ کھیل کاہے کو ہے اچھا خاصا ایک ہفتہ کا نقصان ہے۔ چھ چھ دن تک یہ کھیل جاری رہتا ہے اور پھر بھی اس کا نتیجہ نہیں نکلتا۔ جب یہ کھیل شروع ہوا تو اس میں صرف دو اسٹمپ تھے اب اس میں تین لکڑیاں گاڑی جاتی ہیں۔ اور بیٹسمین ان لکڑیوں کی حفاظت ہی نہیں



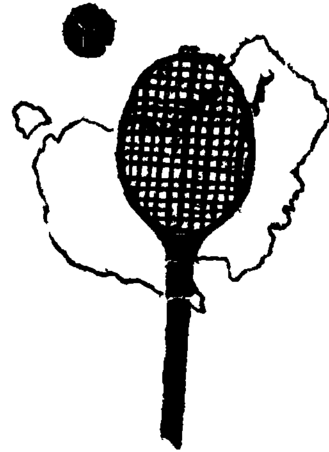
کرتا دوڑتا بھی رہتا ہے۔

بیٹسمین کا دشمن بولر ان لکڑیوں کا نشانہ باندھ کر گیند اس طرح پھینکتا ہے کہ گیند اپنا راستہ بدل دے اور بیٹسمین کی نظر بچا کر کسی ایک لکڑی کو گرا دے۔ بولر کی گیند، ٹھیک نشانے پر بیٹھے، یا بیٹسمین اس گیند کو اس طرح مارے کہ وہ کھلاڑی کے ہاتھوں میں جا گرے تو بیٹسمین کو کھیل کے میدان سے واپس آ کر کرسی پر براجمان ہونا پڑتا ہے۔

بڑا جان لیوا کھیل ہے دن بھر دھوپ میں بس یہی کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ برطانیہ کا قومی کھیل ہے اس لیے وہاں ہر گھر میں

ایک باپ، ایک ماں اور ایک لڑکے کے علاوہ، ایک بیٹ ضرور رہتا ہے۔ بعض گھروں میں کرکٹ کا پورا سامان موجود رہتا ہے اور سارے گھر والے اِس سامان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

(۲) ٹینس: یہ بڑا شریفانہ کھیل ہے اور آسٹریلیا والے اسے اپنا قومی کھیل مانتے ہیں۔



یہ کھیل سمینٹ اور موزم سے بنے ہوئے کورٹ پر کھلایا جاتا ہے اور ہری ہری گھانس کے کورٹ پر بھی۔ اس گھاس کو لان کہتے ہیں اور اُس ٹینس کو لان ٹینس۔ یہ کھیل ایک دو گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے لیکن اِن دو گھنٹوں میں کھلاڑی کی آدھی جان نکل جاتی ہے اور جو آدھی جان باقی رہتی ہے وہ گھر واپس جانے کے کام آتی ہے۔ ٹینس میں ایک آدمی والی ٹیم بھی ہوتی ہے۔ دو آدمیوں والی بھی اس کے علاوہ ایک مرد اور ایک عورت والی ٹیم بھی ہوتی ہے اور دو عورتوں والی بھی۔

یہ سب لوگ ملک کی عزّت کی حفاظت کے لیے کورٹ میں اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں۔ اس کھیل میں۔ کورٹ کے بیچوں بیچ ایک نیٹ (جال) باندھ دیا جاتا ہے اور مخالف ٹیموں کو یہ نیٹ پار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہاں کھیل ختم ہو جانے پر جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑی، اس نیٹ کو پھاند کر ہارنے والے کھلاڑیوں کی طرف جاتے اور ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔ سب کے ہاتھ پسینے میں بھیگے ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مصافحہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس میں مصافحہ تھوڑا سا پھسل جاتا ہے۔

ٹینس کے مقابلے کے ریفری کو ایک بہت اونچی کرسی پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شکاری مچان پر بیٹھا ہو۔ میچ ختم ہونے کے بعد اس ریفری کو احتیاط سے نیچے اتار لیا جاتا ہے۔ اور گھر واپس کر دیا جاتا ہے۔

(۳) فٹ بال: فٹ بال پیروں سے کھیلا جاتا ہے لیکن اس میں سر کا استعمال منع نہیں ہے اور کھلاڑی جب بھی موقع ملے۔ اپنا سر گیند سے ٹکرا سکتا ہے۔ یہ گیند کھلاڑی کے سر سے کافی بڑی ہوتی ہے۔ برازیل والے اس کھیل کو اپنا قومی کھیل سمجھتے ہیں۔ یہ کھیل بڑے معرکے کا ہوتا ہے اس کھیل میں مخالف کھلاڑی ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں جیسے بڑے گہرے دوست ہوں لیکن ان کا سلوک دوستوں جیسا نہیں ہوتا۔ یہ کھیل جوتے



پہن کر کھیلا جاتا ہے اور ایک کھلاڑی کے جوتے سے دوسرے

کھلاڑی کے ٹخنے یا گھٹنے کی ہڈی اپنی جگہ سے سرک سکتی ہے ۔ اس کھیل میں ایک کھلاڑی کی کہنی ، دوسرے کھلاڑی کی پسلی نرم کر سکتی ہے ۔

فٹ بال کا کھلاڑی قد کا جتنا اونچا ہوگا اتنا ہی اپنی ٹیم کے کام آئے گا ــــــــ بجلی کی طرح پھرتیلے کھلاڑی سے بھی مخالف ٹیم کو کافی نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ ایک پھرتیلے کھلاڑی کو روکنے کے لیے ــــــــ مخالف ٹیم کے دو دو تین تین کھلاڑی اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں لیکن یہ شخص ان سب کو چکمہ دے کر گیند سمیت ان کے حلقے سے نکل جاتا ہے اور دیکھنے والے تالیاں پیٹتے ہیں ۔ فٹ بال کے کھلاڑی بہت زندہ دل ہوتے ہیں ۔ کھیلتے وقت بہت غصے میں رہتے ہیں لیکن کھیل کے میدان کے باہر ہمیشہ ہنستے بولتے اور مگن رہتے ہیں ۔

برطانیہ کے ایک مشہور فٹ بال کھلاڑی نے تو اپنی شادی فٹ بال گراؤنڈ پر رچائی ۔ شادی سے پہلے اس نے ایک نمائشی مقابلے کا اہتمام کیا جس میں دُنیا کے اوّل درجے کے کھلاڑیوں نے حصّہ لیا ۔ خود دولھا میاں نے بھی اپنے کھیل سے عوام کو مسرور کیا اور میچ ختم ہونے کے بعد میں شادی کی ۔

برازیل والے اپنے اس قومی کھیل پر اپنا قبضہ چھوڑنا نہیں چاہتے ۔ پچھلے اولمپک میں جب ان کی ٹیم نے سونے کا تمغہ حاصل کیا تو برازیل کی حکومت نے اپنے ہر کھلاڑی کو ایک بنگلہ اور ایک موٹر کار تحفے میں دی ۔ لیکن برازیل کے کھلاڑی گھروں میں رہتے ہی نہیں دن رات فٹ بال کے میدان میں پائے جاتے ہیں ۔ ★★

---

★ جو خدا کے بندوں سے پیار نہیں کرتا وہ خدا کا بندہ نہیں ۔ (مہاتما بدھ)

مسز مسعودہ حیات

# آزادی کے پچیس برس

یوں جشن مسرت کی ہر سمت گھٹا چھائی
پھولوں پہ نکھار آیا کلیوں پہ بہار آئی
شاداب ہوئی کھیتی سرسبز ہوئی فصلیں
بہتی ہوئی ندیوں نے کی بادیہ پیمائی
باپو کے اہنسا کی، نہرو کے تخیل کی
تنویر نظر آئی، تصویر نظر آئی
ہر دل کو ملا باہم پیغام اخوت کا
ہر درد کے مارے نے بھارت میں اماں پائی
ذہنوں سے جہالت کو، ظلمت کو مٹا ڈالا
اب علم کے سورج کی گھر گھر میں کرن آئی
سائنس میں، حرفت میں حاصل ہوئی یکسوئی
اس دور میں بھارت نے ہر فن میں جلا پائی
اس عرصۂ سیمیں، ہیں وہ کام ہوئے جن سے
حیراں ہیں وطن والے دنیا ہے تماشائی
اب دل میں امنگیں ہیں، نظروں میں مسرت ہے
ہر سمت ہے زیبائی، ہر سمت ہے رعنائی
دنیا کی نگاہیں بھی پا بوس قیادت میں
اس بنتِ جواہر کی اللہ رے مسیحائی

اکیسویں اور آخری قسط

آر-ایم-بیلن ٹائن

تلخیص و ترجمہ: خلیق انجم اشرفی

# مونگے کا جزیرہ

## جزیرے سے رخصت

ایک دن ہم سب مچھلی کے شکار کو جانے سے پہلے آبی باغ میں تیرنے کے مزے لے رہے تھے۔ دراصل پیٹرکن کے روزانہ شکار کیے ہوئے سوّر کھا کھا کر اب ہم اتنا اکتا چکے تھے کہ تبدیلی کے لیے اس دن ہم نے مچھلی کے شکار کا پروگرام بنایا تھا۔ پیٹرکن چٹان پر بیٹھا تھا اور ہم پانی کے اندر کی چٹانوں کے درمیان رینگتے پھر رہے تھے۔

اچانک میری نظر اوپر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ پیٹرکن ہمیں اوپر آنے کے لیے اشارے کر رہا ہے۔ میں نے فوراً جیک کو دھکا دیا اور خود بھی جلدی سے پانی کی سطح پر آگیا۔

"جہاز۔ جہاز۔ رالف! ذرا دیکھو جیک۔ وہ اُفق کے پاس ارے وہ لیگون کے داخلہ کی جگہ سے ذرا اِدھر"

ہم چٹان پر چڑھ گئے تو پیٹرکن چلانے لگا۔

"اچھا! جہاز ہے!" جیک نے تیزی سے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

ہمارے دل اس انکشاف پر تیزی سے دھڑکنے لگے کیونکہ اگر یہ جہاز ہمارے جزیرے کے قریب آیا تو ہمیں یقین تھا کہ اس کا کپتان بڑی خوشی سے ہمیں کسی ایسے جزیرے پر پہنچا دے گا جہاں سے ہمیں بہ آسانی انگلینڈ یا یورپ کے کسی دوسرے حصے تک جانے والا جہاز مل جائے گا۔

گھر کا خوش کن خیال اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ میرے حواس پر چھا گیا اس طرح چھا گیا کہ مونگے کے جزیرے اور اس مکان سے (جس میں ہم اتنے دنوں سے رہ رہے تھے) محبت کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ میں یہ سب ایک لمحے میں دُکھ کے ذرّہ برابر احساس کے بغیر چھوڑ سکتا ہوں۔

خوشی اور امید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہم اپنے مکان کے قریب والی چٹان کی چوٹی پر چڑھ گئے اور جہاز کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ ہم نے دیکھ لیا تھا کہ تیز ہوا کے باعث وہ تیزی سے ہمارے جزیرے کی طرف آرہا ہے۔

ایک گھنٹے سے بھی کم میں وہ جزیرے کی باہری چٹان کے نزدیک پہنچ گیا اس نے ایک چکّر لگایا اور رک گیا۔ شاید ساحل دیکھنے کے لیے۔ یہ دیکھ کر ہمیں خوف ہوا کہ کہیں جہاز والے ہمیں دیکھ نہ پائیں۔ ہم تینوں نے فوراً ناریل کے کپڑے کے ٹکڑے ہوا میں ہلانے شروع

کر دیئے۔ جلد ہی اس کا اثر ہوا اور ہم نے دیکھا کہ جہاز والے پانی میں کشتی اتارنے کی تیاری کر رہے ہیں اور عرشے پر بھی بھاگ دوڑ مچ گئی گویا ان کا ارادہ یہاں لنگر ڈالنے کا ہے۔

دوسرے دن ہم ان تمام جگہوں پر الوداعی نظر ڈالنے گئے جہاں ہم نے اپنا بیشتر وقت گزارا تھا۔ ہم پہاڑی کی چوٹی پر چڑھے۔ آخری بار سرسبز و شاداب وادی کے ہرے بھرے درختوں، سفید ریتیلے ساحل، پرسکون لیگون اور مونگے کی چٹان اور اس پر سر ٹپکتی موجوں پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ہم اتر کر ہیرے کے غار پر بنی ہوئی چٹان پر پہنچے وہاں ہم نے اس زردی مائل سبز جانور پر ایک نظر ڈالی جسے گزشتہ دنوں بھائے سے چھید ڈالنے کی فضول اور ناکام کوششیں ہم نے کی تھیں۔ وہاں سے بھاگم بھاگ ہم آبی باغ پہنچے۔ اس کے صاف و شفاف پانی میں آخری غوطہ لگایا اور آخری بار رنگ برنگے حسین مونگوں سے کھیلے۔ میں اپنے ساتھیوں سے پہلے نکل آیا اور جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا تاکہ جانے سے پہلے چٹان میں بنائے اپنے سوراخ پر ایک نظر ڈال لوں۔

وہ بہت عمدہ حالت میں تھا۔ پانی بالکل شفاف تھا۔ سبز اور سرخ سمندری گھاس چمک رہی تھی سرخ گلابی۔ زرد اور سبز رنگ کے پھول نما سمندری جانور اپنے بازو پھیلائے ہوئے تھے۔ گویا اپنے مالک کا استقبال کر رہے ہوں۔ چھوٹی مچھلی بقول پیٹر کن کے ہمیشہ کی طرح مزہ دار لگ رہی تھی۔ یہ منظر اتنا خوب صورت اور دلکش تھا کہ میں نے بڑی مشکل سے خود کو وہاں سے ہٹنے پر آمادہ کیا۔

سب سے آخر میں ہم اپنے مکان پر آئے اور اپنی چیزیں اکٹھا کیں۔

انھیں لے کر کشتی میں سوار ہونے سے پہلے ہم نے فولادی لکڑی کے ایک بڑے ٹکڑے پر اپنے نام کھود دیے۔

جیک مارٹن
رالف روور
پیٹر کن گے

اور اسے مکان کے اندر جڑ دیا۔ کشتی عرشے سے لگ گئی۔ ہم چڑھ گئے اور جہاز چل پڑا۔

جس وقت بادبان کھولے گئے سورج غروب ہونے میں ذرا دیر تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہوا نے ہمیں تیزی سے جزیرے کی باہری چٹان سے گزار کر کھلے سمندر میں پہنچا دیا۔ شام کے دھندلکے کے ساتھ ساتھ ساحل تیزی سے دھندلا ہوتا گیا۔ آہستہ آہستہ پہاڑیوں کی چوٹیاں بھی افق سے مل گئیں۔ یہاں تک کہ صرف ایک دھبہ سا رہ گیا اور دوسرے ہی لمحے سورج اور مونگے کا جزیرہ ایک ساتھ بحرالکاہل کی گہری آغوش میں سما گئے۔

★★

---

## لطیفہ

اجمل: انسان کب روتا ہے؟

ساجدہ: جب اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔ (محمد مستقلی)

ایک غائب دماغ پروفیسر صبح کے وقت چہل قدمی کر رہے تھے یعنی ٹہل رہے تھے۔ راستے میں ان کے صاحبزادے ملے یہ بھی ٹہلنے نکلے تھے۔ اپنے والد کو دیکھ کر انھوں نے سلام کیا۔ پروفیسر صاحب نے کہا: کہو خیریت سے تو ہو۔ تمھارے باپ کیسے ہیں انھیں ہمارا سلام کہنا۔

جناب حمید عثمانی

# وہ بادشاہ بننا چاہتا تھا

(انگریزی کہانی)

(۱)

گاؤں کی گلی کے بیچوں بیچ کھلونوں کی چھوٹی سی دکان تھی بچے اس کا دروازہ کھولتے تھے تو چھوٹی سی گھنٹی ٹن ٹن بولنے لگتی تھی۔

ننھی منی سی یہ دکان سچ مچ بہت اچھی تھی۔ اس کی دیواروں میں الماریاں تھیں۔ ان میں کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ فرش پر دودھ کی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں کھڑی تھیں، لکڑی کے گھوڑے تھے جن میں پہیے لگے ہوئے تھے۔ وہ گاڑیاں بھی تھیں جن میں گڑیوں کو بٹھا کر گھمایا کرتے ہیں۔ دکان دار کی میز پر بہت سے کھلونے رکھے تھے۔ یہ کھلونے بہت سستے تھے۔ تھوڑے سے پیسوں میں ایک کھلونا مل جاتا تھا۔ یہ دکان بڑی اچھی تھی۔ بچے اس کو بہت پسند کرتے تھے۔

بعض کھلونے زیادہ دنوں تک دکان پر نہیں رہنے پاتے تھے۔ جیسے ہی دکان پر آتے تھے بک جاتے تھے۔ اپنے نئے گھر چلے جاتے تھے کچھ کھلونے ایسے تھے جو بہت دنوں تک رکھے رہ جاتے تھے۔

انھی کھلونوں میں ایک چھوٹا سا بھالو تھا۔ اس کا رنگ بھدا ہو گیا تھا اسے کوئی نہیں خریدتا تھا۔ ایک گھونگرالے بالوں والی گڑیا تھی۔ اس کی قیمت بہت زیادہ تھی وہ اپنی آنکھیں کھول لیتی تھی اور بند کر لیتی تھی۔ یہ اتنے زیادہ پیسوں کی تھی کہ اسے کوئی نہیں خریدتا تھا۔ ایک کالے رنگ کا بوا تھا اس کا کوٹ بہت میلا ہو گیا تھا۔ اس لیے بچے اس کو نہیں خریدتے تھے۔ وہ صاف ستھرے ببوے خرید لیا کرتے تھے۔

سب کھلونے ایک دوسرے کے دوست تھے۔ رات ہوتی تو وہ کھیلنے کودنے کے لیے الماریوں سے نیچے اتر آتے جب کوئی نیا کھلونا آتا۔ تو وہ اس سے بہت اچھی طرح ملتے۔ اسے پوری دکان گھماتے تھے۔ چھوٹا سا جھولے والا گھوڑا ان کو اپنے اوپر چڑھاتا، کھلونے والا انجن ان کو بٹھا کر پوری دکان میں دوڑتا پھرتا۔ اس لیے جب نئے کھلونے دکان پر آتے تو بڑا مزا آتا تھا۔

ایک دن تین نئے کھلونے آئے ایک بہت اچھا سا بھالو آیا اس میں جب چابی دی جاتی تو وہ کھڑا ہو کر بہت خوبصورتی سے جھکتا تھا۔ جب تک اس میں کوک بھری رہتی وہ بار بار جھکتا رہتا تھا۔

ایک کھلونے میں چابی دینے پر باجے بجنے لگتے تھے۔ تیسرا کھلونا ایک گڈا تھا۔۔۔ کھلونوں نے ایسا گڈا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ گڈا راجہ کی طرح تھا۔ اس کے کپڑے سنہرے تھے۔ ان کپڑوں پر اس نے نیلے رنگ کا لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کی کمر سے تلوار لٹک رہی تھی سر پر ایک تاج تھا۔ وہ تاج بالکل سونے کا معلوم ہوتا تھا۔ راجہ گڈا سچ مچ بڑا شاندار تھا۔

سب کھلونے رات کا انتظار کرتے رہے۔ وہ بھالو

میں چابی بھر کر اس کا بار بار کا جھکنا دیکھنا چاہتے تھے
اور باجے والے ڈبے کی چابی بھر کر باجہ سننا چاہتے تھے
وہ "راجہ گڈے" سے بات کرنے کے لیے بھی بے چین تھے۔
وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ کیا وہ ان کو اپنا سنہرا تاج
تھوڑی دیر کو دے گا؟ کھلونے یہ دیکھنا چاہتے تھے
کہ وہ خود تاج پہن کر کیسے دکھائی دیتے ہیں۔

جب رات ہوئی اور دکان بند کر دی گئی تو کھلونے
اٹھ کھڑے ہوئے گلی میں لگے بجلی کے کھمبوں سے دکان میں
روشنی تھی ایک ایک کر کے کھلونوں نے انگڑائی لی اور
الماریوں اور میز پر سے نیچے اترنے لگے۔

راجہ گڈا اٹھا اور سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ
بہت شاندار نظر آتا تھا۔ اس نے بھالو میں کوک بھری
بھالو نے فوراً اس کے سامنے جھکنا شروع کر دیا۔ راجہ
گڈا باجے والے ڈبے کے پاس آیا۔ اس نے اس میں بھی
کوک بھر دی اس میں سے باجے کی دھن سنائی دینے لگی۔

"کیا تم لوگ جانتے ہو یہ کون سی دھن ہے؟" راجہ
گڈے نے بڑے رعب سے پوچھا۔ "یہ خدا بادشاہ کو
سلامت رکھے" کی دھن ہے اور ہم کھلونوں کی دکان
کے بادشاہ ہیں۔ تم سب کو ہمارے سامنے جھکنا پڑے
گا اس چھوٹے سے بھالو کی طرح"

سب کھلونے راجہ گڈے کو گھورنے لگے۔
وہ اس کے سامنے جھکنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ راجہ
گڈے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہ تھے۔ مگر چابی والا
چوہا چمکتی ہوئی تلوار دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے اپنی ناک
زمین تک جھکا دی۔

"تم کیوں نہیں جھکتے ہو؟" راجہ گڈے نے
میلے کپڑے والے ببوے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ببوا بولا "اس کھلونوں کی دکان کا ایک سردار تو پہلے
ہی سے ہے۔ ہم لوگ ایک سردار اور کیسے بنا سکتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے ہم دو سردار نہیں رکھ سکتے تو اب ہم ہی
سردار رہیں گے۔ ہمارے سامنے جھکو"

گھونگھرالے بالوں والی گڑیا نے کہا۔ "میں یہ نہیں سمجھ سکی
کہ آخر ہم لوگ ایسا کیوں کریں۔ ہم لوگ تو اس گڑیا کے سامنے
بھی نہیں جھکتے جو اس دکان کی رانی ہے۔ وہ خود اپنے کو کچھ
نہیں کہتی پھر بھی وہ ہماری سردار ہے۔"

"کہاں ہے وہ گڑیا"، راجہ گڈے نے غصے سے پوچھا۔

ایک چھوٹی سی گڑیا سامنے آئی۔ وہ ذرا بھی خوبصورت
نہ تھی مگر اس کی مسکراہٹ بڑی پیاری تھی۔ وہ زیادہ عمر والی
دیہاتنوں کی طرح کپڑے پہنے تھی۔ اس کے جسم پر کالے رنگ کا
لہنگا اور کالا بلاؤز تھا۔ کندھوں پر خوب صورت شال تھی۔ اس
کے بال گندھے ہوئے تھے۔ سر کے چاروں طرف لپٹے ہوئے
تھے۔ بالوں کے اوپر اس نے چھوٹی سی ٹوپی پہن رکھی تھی۔
وہ بہت عجیب سی گڑیا لگتی تھی۔ بے چاری تین سال سے کھلونوں
کی دکان پر تھی۔ وہ خوب صورت نہ تھی اس لیے اُسے کسی نے
نہیں خریدا تھا۔ وہ مہنگی گڑیوں کی طرح اپنی آنکھیں کھول بند
نہیں کر سکتی تھی۔ راجہ گڈا اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"واہ میں تو سوچتا تھا کہ تم لوگوں کی رانی خوب صورت ہوگی۔
اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوگی" راجہ گڈے نے مذاق اڑاتے ہوئے
کہا۔ "تم لوگوں نے اس کو اپنی رانی بنا رکھا ہے۔ اسے رانی کون
کہتا ہے۔ یہ تو کالے کلوٹے ببوے ہی کی طرح ہے۔ ذرا ہماری طرف
دیکھو ہم کتنے شاندار ہیں۔ ہمارے سر پہ تاج ہے، ہمارے
ہاتھ میں تلوار ہے"

"آپ بہت شاندار نظر آتے ہیں"، ملاح گڈے نے
راجہ گڈے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں آپ کو بادشاہ مانے

لیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ سپاہی بھی اس بات کو پسند کریں گے۔ تھوڑی بہت پریڈ کرنا چاہتے ہیں۔"

"خوب! میں اپنی رانی کے خلاف کیسے جا سکتا ہوں۔" میلے کپڑوں والے بونے نے کہا۔

"وہ رانیوں کی طرح نہیں رہتی تو کیا ہوا۔ ہم سب کی اتنی دیکھ بھال تو کرتی ہے۔ ہم لوگوں کے بٹن ٹوٹ جاتے ہیں تو وہ ٹانک دیتی ہے۔ اس نے ایک بار ہاتھی کے جسم کا سوراخ سیا تھا جس میں سے لکڑی کا برادہ جھڑ جھڑ کر گرنے لگا تھا۔ اس نے جھولے والے گھوڑے کی دُم بھی ٹھیک کر دی تھی جسے ایک شریر لڑکے نے کھینچ کر ڈھیلا کر دیا تھا۔"

"چھی۔ بھلا ایک رانی کو یہ سب کرنا چاہیے؟" راجہ گڈے نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یہ معمولی ماؤں کا کام ہے۔ راجہ اور رانی سے کوئی اس طرح کے کاموں کی توقع نہیں رکھتا۔"

"میں رانی نہیں ہوں۔" کالے بالوں والی گڑیا نے دھیرے سے کہا۔ "اور میں رانی بننا بھی نہیں چاہتی۔ یہ صرف ان کھلونوں کا خیال ہے کہ میں رانی ہوں۔ آپ یقینی بادشاہ ہیں۔ آپ بادشاہ نظر بھی آتے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ بادشاہوں والا کام بھی کریں گے۔ میں رانیوں والے کام نہیں کرتی میں بہت معمولی سی ہوں۔"

"ہاں تم بہت معمولی سی ہو۔" راجہ گڈے نے کہا "اچھا آج سے تم لوگ یہ یاد رکھنا کہ جب ہمارے سامنے آنا تو جھکنا اور جب میرے سامنے سے واپس ہونے لگنا تو بغیر مڑے ہوئے الٹے پیروں جانا۔"

"الٹا چلتے ہوئے جانا پڑے گا۔" کالے بونے نے کہا۔ "اس طرح تو ہم دوسری چیزوں سے ٹکرا ٹکرا کر گر پڑیں گے۔ یہ بڑی بے کار سی بات ہے۔"

"اگر تم ہم سے اس طرح کی باتیں کرو گے تو ہم تمہارا سر کاٹ لیں گے۔" راجہ گڈے نے غصے سے کہا اور اپنی چمکتی ہوئی تلوار لہرائی۔ کالا بونا ڈر گیا۔ وہ راجہ گڈے کے سامنے جھک گیا۔ الٹا چلنے کی بھی کوشش کرنے لگا۔ جیسے ہی اس نے الٹا چلنا شروع کیا جالی والے چوہے سے ٹکرا کر اس پر گر پڑا۔

"تو سنبھالو چوہے میاں معاف کرنا میں پہلے ہی سے ڈرتا تھا کہ کسی پر گر پڑوں گا۔ کیا بے وقوفوں والی باتیں۔" راجہ گڈے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ کالا بونا بھاگ کر کونے میں جا چھپا۔ کالے بالوں والی گڑیا نے راجہ گڈے کو آداب کیا اور الٹے پیروں چلتی ہوئی کالے بونے کے پاس اسے تسلی دینے چلی گئی۔

(باقی اگلے پرچے میں)

---

ایک دلچسپ موسمی نظم
جناب رشید الدین۔

# پھسل پڑا

بارش کی رُت ہے دوستو چلنا سنبھل کے تم
وہ دیکھو سامنے کوئی موٹا پھسل پڑا
منّے میاں جو شوق سے اسکول کو چلے
تو راستے میں ان کا بھی جوتا پھسل پڑا
بوڑھوں کا تو جناب نہ کچھ حال پوچھیے
کہتے ہیں جو چلا وہی بوڑھا پھسل پڑا
چھوٹے بڑے کی اس جگہ کوئی نہیں ہے قید
شامت کا مارا جو کوئی آیا پھسل پڑا
برسات کا طفیل ہے شاعر نہیں رشید
کاغذ پہ آج خامہ جو اس کا پھسل پڑا

جناب مولانا اسرار ندوی

# انگلستان کی پارلیمنٹ کیسے بنی

بتایئے وہ کون سا ملک ہے جہاں بادشاہت بھی ہے اور جمہوریت (عام لوگوں کے ووٹوں سے بنی ہوئی حکومت) بھی ــــ ؟ اس ملک میں ابھی حال میں چناؤ ہوا ہے ــــ اور اس کے نئے وزیر اعظم کا نام مسٹر ولسن ہے۔

جی آپ کا خیال ٹھیک ہے وہ انگلستان یا انگلینڈ ہے۔ دنیا میں انگلینڈ ہی ایک ایسا ملک ہے۔ جہاں بادشاہ بھی ہے اور پارلیمنٹ بھی۔ یہاں کی پارلیمنٹ دنیا کی ساری پارلیمنٹوں کی ماں کہی جاتی ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی جمہوریت دنیا کی سب سے اچھی جمہوریت سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کہ بادشاہ کے دباؤ سے بالکل آزاد ہے۔

اچھا اب آیئے میں آپ کو دنیا کی اس پہلی پارلیمنٹ کے بارے میں بتاؤں کہ یہ کیسے بنی

کہتے ہیں انگلینڈ پر پہلے رومیوں کی حکومت تھی۔ یہ فوجی ڈکٹیٹر شپ (فوج کی خود مختاری) تھی رومیوں نے انگلینڈ کو اپنی جاگیر اور وہاں کے شہریوں کو غلام بنا رکھا تھا۔ آپ جانتے ہیں ظلم کی ہنڈی کبھی چلتی نہیں۔ کچھ دنوں بعد انگلستان کی سکسن قوم اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے رومیوں کو مار بھگایا۔

نئے حاکموں نے انگلینڈ پر حکومت کرنے کے لیے اپنے عقلمند لوگوں کی ایک کونسل (مجلس) بنائی اور حکومت کے کاموں میں اس سے مشورے لینے لگے۔ اس وقت اس کونسل کو "وتان" کہتے تھے۔

یہی "وتان" پارلیمنٹ کی نیو کی پہلی اینٹ ہے اس کا ہر ممبر آزادی کے ساتھ ملک کے مسئلوں پر بے دھڑک تقریریں کرتا تھا۔ بادشاہ کی طرف سے کوئی پابندی نہ تھی۔

"وتان" کا ایک ممبر لندن کا بڑا پادری تھا۔ اس نے ۱۷۵۹ء میں لندن میں ایک بڑا گرجا گھر بنوایا تھا۔ اس کے پاس ہی اس کا مکان بھی تھا۔ اس زمانے میں سمندری لٹیروں کا بڑا زور تھا۔ ایک بار ان لٹیروں نے بڑے پادری کا مکان اور گرجا گھر لوٹ کر تہس نہس کر دیا۔

چند سال بعد ایڈورڈ انگلینڈ کا بادشاہ ہوا۔ یہ بڑا خدا ترس بادشاہ تھا۔ اس نے پادری کے چرچ کے کھنڈروں پر اس سے بھی بڑا چرچ بنوایا۔ اس کا نام "ویسٹ منسٹر" پڑا۔ یہی انگلینڈ کا پہلا پارلیمنٹ ہاؤس ہے۔

۱۰۶۶ء میں ایڈورڈ مر گیا۔ تخت کے دعوے دار دو آدمی ہو گئے۔ ہیرالڈ اور ڈیوک آف نارمنڈی۔ "ویسٹ منسٹر" میں "وتان" کی بیٹھک ہوئی۔ عقلمندوں نے ہیرالڈ کے حق میں فیصلہ دیا۔ ڈیوک نے فیصلے کو نہ مانا ــ دونوں میں بھیانک جنگ ہوئی۔ ہیرالڈ مارا گیا۔

ڈیوک وتان سے چڑھا ہوا تھا۔ (وتان کے ممبروں نے اس کے خلاف فیصلہ جو دیا تھا) اور جناب اس نے وتان کو توڑ دیا۔

لیکن خود ڈیرک کو بھی صلاح مشورے کی ضرورت پڑی اس نے اس کام کے لیے اپنے خیر خواہوں کی ایک کونسل بنا ڈالی۔

پھر یہ رواج بن گیا جو بادشاہ آتا اپنے ڈھنگ کی کونسل بنالیتا۔ رفتہ رفتہ اس شاہی کونسل میں چرچ، تاجروں اور کارخانے داروں کے نمائندے بھی لیے جانے لگے۔

پھر ہنری دوم کا زمانہ آیا۔ انگلینڈ کی تاریخ میں یہ قانون ساز (بنانے والا) بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کونسل کو قانون بنانے کا حق دیا۔ اور اسے انگلینڈ کی سب سے بڑی عدالت کا درجہ بھی دیا۔ اب شاہی کونسل "پارلیمنٹ" کہی جانے لگی۔ پارلیمنٹ اوپر سے انگریزی لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ فرانسیسی لفظ ہے۔ انگریزوں نے اسے اپنا لیا ہے۔

ہنری دوم کے بیٹے جان کے زمانے میں انگلینڈ اور فرانس کی جنگ چھڑ گئی۔ بادشاہ نے بے تحاشا ٹیکس لگائے امیروں سے بھی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں۔ ٹیکس کی بھرمار سے عام لوگ چیخ اٹھے۔ آخر ان امیروں نے بادشاہ کے سامنے ایک چارٹر (دستاویز) رکھوا۔ بادشاہ کو اس پر دستخط کرنے پڑے۔ اس میں لکھا تھا کہ عوام کے نمائندوں کی منظوری کے بغیر بادشاہ رعایا پر ٹیکس نہیں لگا سکتا۔ تاریخ کی زبان میں اس کو میگنا چارٹا کہتے ہیں۔ یہی میگنا چارٹا انگلینڈ کی جمہوریت کی بنیاد بنا۔

بعد کے بادشاہوں نے اور بھی ہمت دکھلائی۔ ابھی پارلیمنٹ کے ممبر عوام کی رائے سے چنے جانے لگے۔ اس طرح دھیرے دھیرے بادشاہ کی پارلیمنٹ پر جمہور یعنی عوام کا غلبہ بڑھتا گیا۔

لیکن ۱۶۳۲ء میں پارلیمنٹ کے امیروں نے کچھ ایسی گڑبڑ کی کہ بادشاہ نے پارلیمنٹ توڑ دی۔ اور اپنی مرضی سے حکومت کرنے لگا۔ بادشاہ کی یہ خود سری زیادہ دن نہ چلی۔ عوام نے اپنی پارلیمنٹ کی مانگ کی۔ یہ پارلیمنٹ پھر بنی اور جناب ایسی جڑ پکڑ گئی کہ تب سے اب تک قائم ہے۔ ویسٹ منسٹر کی عمارت بہت دنوں تک پارلیمنٹ ہاؤس کا کام کرتی رہی موجودہ پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت تو ۱۸۵۲ء میں بنی ہے۔

انگلینڈ کی جمہوریت کی اچھائی یہ ہے کہ اس نے پورے ملک کا مزاج جمہوری بنا دیا ہے۔ کوئی بھی ایسے کام نہیں کرتا جس سے ملک کو نقصان ہو۔ پچھلے سال کوئلے کی کانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی تھی۔ بہت سے کام ٹھپ پڑ گئے۔ ملک کا نقصان ہوا۔ کان کے وزیر نے استعفا دے دیا پھر پوری پارلیمنٹ ٹوٹ گئی۔ دوبارہ چناؤ ہوا۔ یہ ہے سچی اور اچھی جمہوریت کی شان۔

---

جناب حمید قیصر دھولیہ

# حمد

اے خدا ہستی عالم کے بنانے والے
آدمیت کی ہمیں راہ بتانے والے

علم عرفان مرے دم سے ہو پیدا ہر دم آئے
مرے دل میں نہ کسی چیز کا لالچ آئے

زندہ سو سال رہوں کام ہو خدمت کرنا
علم پر وقف ہو یارب مرا جینا مرنا

سیدھی راہوں کے اصولوں کو سکھائے رکھنا
عادت بد سے ہمیشہ تو بچائے رکھنا

اپنے انوار سے دل کو مرے روشن کر دے
دل میں تو میرے اب اخلاص و محبت بھر دے

ہندی ڈراما

وشنو پربھاکر

آزاد ترجمہ :- خلیق انجم اشرفی

# جان جائے وچن نہ جائے

## کام کرنے والے :-

بسنت :- ایک غریب اور بے سہارا لڑکا - عمر بارہ[12] سال -
پرتاپ :- بسنت کا چھوٹا بھائی - عمر نو[9] سال
پنڈت راج کشور :- مزدوروں کے لیڈر - عمر چالیس[40] سال
کرشن کمار :- پنڈت راج کشور کے ایک شناسا - عمر پینتیس[35] سال
بھیکوا ہیر :- بسنت اور پرتاپ کو پناہ دینے والا - عمر اڑتیس[38] سال
ڈاکٹر اور دو راہ چلتے آدمی -

---

### پہلا منظر

(ایک بڑے شہر کا بازار - اسٹیج پر آنے جانے والوں کا شور اور بھیڑ کا منظر - پھیری والوں کی پکار - انھی کے بیچ بسنت ننگے پیر، پھٹے کپڑے پہنے اور ایک تھیلے میں سامان سنبھالے بھاگتا نظر آتا ہے - آواز لگا لگا کر سامان بیچ رہا ہے)

بسنت : "چھلنی لے لو - بٹن لے لو دیا سلائی لے لو"

(کوئی اس کی بات نہیں سنتا - سب اسے دیکھتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں - اسی وقت کھدر کا لباس پہنے ایک شخص ادھر سے گزرتا دکھائی دیتا ہے - سر پر گاندھی ٹوپی ہے اور اور کندھے پر ایک تھیلا لٹکا ہے - جس میں کچھ سامان بھرا ہے یہ مزدوروں کے رہنما پنڈت راج کشور ہیں بسنت انھیں دیکھ کر ان کے پیچھے بھاگتا ہے)

بسنت : صاحب بٹن لیجیے دیسی بٹن - صاحب - دیا سلائی لیجیے "

راج کشور : "نہیں بھائی، مجھے کچھ نہیں چاہیے "

بسنت :- " صاحب - ایک پنّہ ہی لیجیے - دیکھیے کتنے سستے بٹن ہیں "

راج کشور :- " بھائی مجھے کچھ نہیں چاہیے جا کسی اور کو دو "

بسنت :- " صاحب - یہ چھلنی لے لیجیے - دودھ چھاننے، چائے چھاننے "

راج کشور : " مجھے ضرورت نہیں اس کی "

بسنت :- " بٹن ...... "

راج کشور :- نہیں -

**بسنت :۔** "دیا سلائی ؟"

**راج کشور:۔** "نہیں ! نہیں !! "

**بسنت :۔** (بڑی لجاجت سے) "صاحب ایک چھلنی لے لیجیے۔ تیس پیسے ہی کی تو ہے "

**راج کشور:۔** "لیکن بھائی ۔ مجھے نہیں چاہیے تو کیسے لے لوں ؟"

**بسنت :** "اچھا آپ پچیس پیسے ہی دے دیجیے "

**راج کشور:۔** "بھائی تم تو ......"

**بسنت :** (بات کاٹ کر) "صاحب ایک لے لیجیے۔ پچیس پیسے!"

**راج کشور:** (جھنجھلا کر غصّے سے) "پرے ہٹو۔ کہہ تو دیا ایک بار کہ مجھے نہیں چاہیے "

**بسنت :** (روہانسا سا ہو کر) "صاحب ابھی تک کچھ نہیں بکا۔ آپ سے امید تھی صاحب۔ ایک تو لیجیے ۔"

**راج کشور** (ترس کھا کر جیب سے پیسے نکالتے ہوئے)
"اچھا تمھیں پیسے چاہئیں۔ لو یہ پانچ پیسے اور جاؤ "

**بسنت** (ایک دم تیزی سے) "نہیں صاحب نہیں۔ میں یہ پیسے نہیں لوں گا "

**راج کشور** (حیران ہو کر) "نہیں لوگے! کیوں ؟ "

**بسنت :** "جی نہیں۔ آپ چھلنی خرید لیجیے "

**راج کشور:** "اچھا ایک چھلنی میں تمھیں کیا بچے گا "

**بسنت :** "پانچ پیسے "

**راج کشور:** "بس تو یہ پانچ پیسے لے لو اور سمجھ لو کہ میں نے چھلنی خرید لی "

**بسنت :۔** "نہیں صاحب ۔ یہ تو بھیک ہے۔ میں بھیک نہیں لوں گا۔ آپ چھلنی لے لیں "

(راج کشور اس بات سے متاثر ہو جاتے ہیں ـــــ جیب ٹٹولتے ہیں۔ لیکن اور پیسے نہیں ملتے)

**راج کشور:۔** "بھائی میرے پاس ریزگاری نہیں۔ ہوتی تو لے لیتا۔ نوٹ ہیں "

**بسنت :** (اداس ہو کر) "نوٹ ہیں ؟ ریزگاری تو میرے پاس بھی نہیں ۔ کچھ بکا ہی نہیں "

**راج کشور:** "تبھی تو کہتا تھا ۔ اچھا کل لے لوں گا یا میرے گھر آنا کشن گنج میں رہتا ہوں "

**بسنت :** (ایک دم) "نہیں صاحب ۔ آج ہی لے لیجیے۔ آپ نوٹ مجھے دیجیے ۔ میں بھناتا ہوں ۔"

**راج کشور:** "بھائی تم تو.... اچھا لو بھنا لاؤ مگر جلدی آنا "

**بسنت :** "ابھی آیا صاحب ۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ پلک جھپکتے میں آؤں گا"

(بسنت بازار میں ادھر سے ادھر دوڑا چلا جاتا ہے ۔ راج کشور وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ دھیرے دھیرے بیس پچیس منٹ گزر جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اکتاہٹ اور بے چینی بڑھتی جاتی ہے اور وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر بسنت کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اتنے میں ان کا ایک شناسا کرشن کمار ادھر سے گزرتا ہے ۔ انھیں وہاں اس طرح کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے اور پوچھتا ہے)

**کرشن کمار:۔** "پنڈت جی ۔ جے ہند ۔ کہیے آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں "

**راج کشور :** (ہنس کر) : جے ہند ۔ کیا بتاؤں بھائی۔ ایک پھیری والا لڑکا پیچھے پڑ گیا تھا ۔ ایک چھلنی دے گیا ہے ۔ پیسے تھے نہیں ۔ نوٹ بھنانے گیا ہے ۔"

کرشن کمار: "نوٹ بھنانے وہ لڑکا گیا ہے؟"
راج کشور: "جی ہاں"
کرشن کمار: "کتنی دیر ہوگئی؟"
راج کشور: "کوئی پندرہ بیس منٹ ہوگئے۔"
کرشن کمار: "(ہنس کر) تب اطمینان رکھئے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔"
راج کشور: "سچ؟"
کرشن کمار: "اجی۔ آج کل ہر جگہ ایسے لڑکے مل جاتے ہیں جن کا کام گڑگڑا کر ہم لوگوں کو ٹھگنا ہے۔"
راج کشور: ٹھگنا کیا۔ ایک ہی روپے کی تو بات ہے۔"
کرشن کمار: "اجی جناب۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہاں۔ آپ کو کیا۔ آپ تو غریبوں اور مزدوروں کے خادم ہیں۔ لے بھی گیا تو گھر ہی میں ہے۔"
راج کشور (ہنس کر) "بے شک! میرے پاس جو کچھ ہے انھی کا ہے۔ لیکن بھائی اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اس طرح ٹھگی کرتے پھریں۔"
کرشن کمار (ہنس کر)، "دیکھ لیجیے۔"
راج کشور: لیکن بھائی۔ وہ لڑکا تو بہت نیک اور سیدھا لگتا تھا۔ یقین نہیں آتا۔ خیر چلو کوئی بات نہیں سمجھیں گے ایک روپیہ گنوا کر یہی سبق سیکھا۔"
کرشن کمار: (زور سے ہنس کر) "سبق بڑا خوب صورت ہے اور بھلے لڑکے سے سیکھا ہے۔ اجی صاحب۔ بھولا نہ بنے تو اس کے جال میں کون پھنسے۔ اچھا جے ہند۔ میں تو چلا۔"
راج کشور: "جے ہند"
(دونوں دو مختلف راستوں پر بڑھ جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر (اسی دن شام کو)

(شہر کا وہ حصہ جہاں متوسط طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک طرف کشن گنج کا بورڈ لگا ہے۔ ہلکا سا شور ہو رہا ہے۔ شام ہوگئی ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ انھی کے بیچ ایک دبلا پتلا سا لڑکا جلدی جلدی قدم اٹھا رہا ہے۔ ننگے پیر ہے اور کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ شکل بسنت سے ملتی جلتی ہے۔ یہ بسنت کا چھوٹا بھائی پرتاپ ہے۔ چہرے سے پریشانی ٹپک رہی ہے اور آنے جانے والوں سے کچھ پوچھ رہا ہے)
پرتاپ: "کشن گنج یہی ہے؟"
ایک آدمی: "ہاں!"
پرتاپ: "راج کشور جی کہاں رہتے ہیں؟"
وہی آدمی: "کون راج کشور؟"
پرتاپ: وہی جو لیکچر دیتے ہیں مزدوروں کی بستی میں جاتے ہیں۔"
وہ آدمی: میں نہیں جانتا۔ آگے پوچھو۔"
(پرتاپ آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک دوسرے آدمی سے پوچھتا ہے)
پرتاپ: "یہاں راج کشور جی رہتے ہیں؟"
دوسرا آدمی: "کون؟ پنڈت راج کشور؟ جو مزدوروں کے نیتا ہیں؟"
پرتاپ (خوش ہو کر): ہاں ہاں وہی!"
دوسرا آدمی (ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے): "ادھر دیکھو! وہ نیلا پردہ ہے نا؟"
پرتاپ: (سر ہلاتا ہے): جی ہاں۔
دوسرا آدمی: "وہیں آواز دو۔ اوپر رہتے ہیں۔"
(وہ آدمی آگے بڑھ جاتا ہے۔ پرتاپ نیلے پردے والے مکان کے نیچے جا کر پکارتا ہے)

پرتاپ :۔ پنڈت راج کشور جی !"

راج کشور :۔ "کون ؟ (اوپر سے جھانک کر دیکھتے ہیں) کیوں بھائی ۔ کیا بات ہے ؟"

پرتاپ :۔ جی میرے بھائی نے بھیجا ہے "

راج کشور :۔ "تمھارا بھائی ۔ اچھا ٹھہرو ! میں آتا ہوں ۔"

راج کشور (نیچے آکر) :۔ "ہاں تمھارا بھائی کون ہے بچے ؟"

پرتاپ :۔ آج دوپہر کو اُس نے آپ کے ہاتھ ایک چھلنی بیچی تھی "

راج کشور (جلدی سے) :۔ "ہاں ہاں ۔ آج میں نے ایک لڑکے سے ایک چھلنی لی تھی اور اُسے ایک روپے کا نوٹ دیا تھا "

پرتاپ :۔ " وہ نوٹ بھنانے گیا تھا ۔ مگر جب بھنا کر لوٹ رہا تھا تو موٹر کی لپیٹ میں آگیا ۔" موٹر اس کے اوپر سے نکل گئی "

راج کشور (زور سے) :۔ "کیا ؟ موٹر اس کے اوپر سے نکل گئی ؟"

پرتاپ (دھیمی آواز میں) :۔ "اس کے پیسے بکھر گئے سامان نہ جانے کہاں گیا ۔ اس کے دونوں پیر کچل گئے "

راج کشور (سہم کر) :۔ پیر کچل گئے !

پرتاپ (روہانسا ہوکر) اسی لئے وہ آپ کے پاس نہ آسکا ۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا ۔ بڑی مشکل سے اسے گھر لے گیا ۔ بڑی دیر میں ہوش آیا تو اس نے مجھے آپ کے پاس پیسے لوٹانے بھیجا ۔ میں آپ کے پچھتر پیسے لایا ہوں "

راج کشور (کھوئے کھوئے سے انداز میں) پچھتر پیسے لائے ہو ۔ لاؤ " (ہاتھ بڑھا کر پیسے لے لیتے ہیں ۔ پرتاپ ایک دم رونے لگتا ہے ۔ وہ اچانک چونک پڑتے ہیں)

راج کشور :۔ "بچے ! وہ اب کہاں ہے ؟"

پرتاپ : "گھر میں "

راج کشور :۔ "گھر میں اور کون ہے ؟"

پرتاپ :۔ "کوئی نہیں "

راج کشور :۔ (حیران ہوکر) :۔ "کوئی نہیں ؟"

پرتاپ :۔ "میں اور میرا بھائی دونوں ایک امیر کے گھر میں رہتے ہیں ۔ اس کا نام بھیکو ہے ...."

راج کشور : "تمہارے ماں باپ کیا ....."

پرتاپ (رونے کی آواز تیز ہو جاتی ہے) :۔ وہ مارے گئے ۔ پرسال دنگوں میں انھیں کسی نے مار ڈالا ...."

راج کشور :۔ "انھیں کسی نے مار ڈالا (ایک دم چونک کر) بیٹا ! رو مت میں ابھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں ابھی "

پرتاپ : "آپ چلیں گے "

راج کشور :۔ "ہاں چلو ۔ پھر دیر ہو جائے گی ۔ لیکن ہاں ۔ تمھارا گھر کہاں ہے ؟"

پرتاپ :۔ امیر ٹولے میں "

راج کشور (پکار کر) :۔ "امر سنگھ ۔ دیکھو میں امیر ٹولے جا رہا ہوں ۔ تم اسی وقت ڈاکٹر ورما کو لے کر وہاں آجاؤ ۔ کہنا ایک لڑکے کی ٹانگیں موٹر کے نیچے آکر کچل گئی ہیں ۔ جلدی کرو ۔ بھیکو امیر کا گھر پوچھ لینا (پرتاپ کی طرف مڑ کر) چلو بیٹا "

(پرتاپ حیرت اور خوشی بھرے جذبات سے ان کی طرف دیکھتا ہے پھر جیسے کھوئے کھوئے سے انداز میں ان کے آگے تیز تیز قدم سے چلتا ہے چند لمحوں بعد وہ تیزی سے بھاگنے لگتا ہے ۔

(پردہ گرتا ہے)

## تیسرا منظر

(اہیر ٹولے میں ایک کچا گھر۔ اسٹیج پر اندر سائبان کا منظر۔ زمین پر بھوس کا ڈھیر۔ اسی پر بسنت لیٹا ہے۔ بھیکو اہیر کھانس کھانس کر غصہ ظاہر کر رہا ہے)

بھیکو اہیر: "میں کہتا ہوں تو دیکھ کر نہیں چلتا۔ آج کل کے چھوکرے ہوا میں اڑتے ہیں۔ اتنا بڑا بازار ہے۔ موٹر۔ سائیکل۔ تانگے سبھی کچھ ہے۔ کہتے کہتے تھک گیا...؟ آنکھیں کھول کر چلا کرو۔ پر صاحب۔ کون سنتا ہے۔ بھاگیں گے....."

بسنت: "چاچا غصہ نہ کرو۔ بڑا درد ہے"

بھیکو (دھیما پڑ کر): "درد تو ہوگا ہی اور کیا آرام ہوگا۔ ابھی تو مہینہ بھر پڑا رہنا پڑے گا۔ کہا تھا اسپتال چلا جا۔ وہاں جاتا تو آرام ملتا دوا ملتی"

بسنت: "چاچا بڑا درد ہے۔ اب اسپتال پہنچا دو"

بھیکو (پھر تیز ہوکر): "میں پہنچا دوں؟ مجھے بڑی رقم سونپ رکھی ہے! کہاں گیا وہ پرتاپ؟"

(پرتاپ اور راج کشور داخل ہوتے ہیں)

پرتاپ: "یہ رہا صاحب"

راج کشور (حیرت سے): "او! یہ تو زمین پر لیٹا ہے!"

بھیکو (ایک دم حیران ہوکر): "نمستے صاحب۔ بے سہارا صاحب۔ غریب لڑکا ہے۔ بیچارہ مارا گیا۔ ٹانگ ٹوٹ گئی ہے صاحب"

بسنت (سکھو چکا ہوکر): "آپ آئے ہیں!"

راج کشور: "کہاں چوٹ لگی ہے بیٹا؟ دیکھوں!"

(راج کشور پاس آکر ٹانگ دیکھتے ہیں۔ کسی نے فرسٹ ایڈ دی ہے۔ پٹی بندھی ہے۔ پٹی چھوتے ہی بسنت کی چیخ نکل جاتی ہے رنگ سفید پڑ جاتا ہے اور وہ ہونٹ بھینچ کر آہ بھرتا ہے)

بسنت (درد سے کراہتے ہوئے): "میں موٹر سے ٹکرا گیا تھا اس لیے آپ کے پیسے نہ لوٹا سکا۔ آپ نے جانے کیا سوچا ہوگا!"

راج کشور: "اس بات کی فکر نہ کرو بیٹا۔ میں نے ڈاکٹر بلایا ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے"

(ڈاکٹر داخل ہوتا ہے)

بھیکو (خوش ہوکر): "ڈاکٹر صاحب آگئے۔ ڈاکٹر صاحب بسنت یہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب اسے ہلدی ڈال کر دودھ پلایا ہے۔ شلاجیت بھی دی تھی۔ تبھی تو یہ چپ چاپ لیٹا ہے۔ صاحب غریب لڑکا ہے"

(ڈاکٹر پیر دیکھتے ہیں۔ بسنت زور سے ہونٹ بھینچتا ہے۔ پرتاپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ وہ کبھی بھائی کو دیکھتا ہے کبھی ڈاکٹر کو راج کشور بے چین سے ہو جاتے ہیں)

راج کشور (بے چینی سے): "کیوں ڈاکٹر؟ ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

ڈاکٹر: "پنڈت جی ایسا لگتا ہے ایک پیر کی ہڈی تو ٹوٹ گئی ہے دوسرا پیر ٹھیک ہے لیکن اب اسے فوراً اسپتال لے جانا چاہیے ورنہ دیر ہوگئی تو....."

راج کشور (بات کاٹ کر جلدی سے): "تو ابھی لے چلیے۔ میں ایمبولینس کے لیے فون کرتا ہوں"

ڈاکٹر: "جی ہاں کیجیے۔ میں تب تک انجکشن لگاتا ہوں"

بسنت (آنکھیں کھول کر): "آپ! آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں غریب ہوں نا....."

راج کشور (جوش سے): "تم غریب ہو بیٹا! تمھارے پاس تو وہ دولت ہے جس کے لیے دنیا ترستی ہے اور ترستی ہے (ڈاکٹر کی طرف مڑ کر) ڈاکٹر صاحب۔ جب تک میں

نہیں آتا آپ یہیں رہیں اور دیکھیے بیسیوں کی فکر نہ کیجیے گا۔ یہ غریب ہے مگر اس میں ایک خوبی ہے جو آج کل کم یاب ہے۔ یہ ایمان دار ہے اور ایماندار کی زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے ......"

بھیکو: "حضور آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ رڈلکا کھرا سونا ہے۔ حضور تبھی تو اسے اپنے گھر میں رکھے ہوئے ہوں۔ ان کے ماں باپ کو لڑائی میں کسی نے مار ڈالا۔ اب یہ بے سہارا ہیں حضور ڈیڑھ سال سے میرے پاس ہیں۔ دن بھر بازار میں محنت کرکے کماتے ہیں۔ حضور بڑے ایمان دار ہیں۔ ایمان دار کی آخر سنی ہی جاتی ہے۔"

(بھیکو اسی طرح بولتا بولتا راج کشور کے پیچھے جاتا ہے ڈاکٹر پرتاپ کی مدد سے انجکشن تیار کرتا ہے۔ بسنت تکلیف سے آنکھیں بند کیے لیٹا ہے۔ بھیکو کی باتیں سن کر اس کے چہرے پر سکون اور خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ پردہ گرنے لگتا ہے۔ پھر ڈاکٹر انجکشن لگاتے ہیں۔ بسنت ہونٹ بھینچتا ہے پرتاپ کھائی کا سر تھام لیتا ہے۔ پردہ گر جاتا ہے)۔

---

بقیہ شیر کی خالہ صفحہ ۲۹ سے

مار کر اسے ہوش میں لائی اور بولی "ارے تم تو بہادر ہو بے ہوش کیوں ہو گئے۔ اچھا خیر ٹھہرو۔ میں ابھی تمھیں روپے لا کر دیتی ہوں۔"

"نہیں — نہیں مجھے روپے نہیں چاہئیں مجھے جانے دو" گیدڑ نے بھاگتے ہوئے کہا۔

گیدڑ اس قدر بدحواس تھا کہ وہ بھاگے چلا جا رہا تھا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا — آج تک اس کی نسل اس پر عمل کرتی ہے۔ ★★

جناب ناوک حمزہ پوری

# گھمنڈی

اتوار کا دن تھا۔ پاٹھ شالہ میں چھٹی تھی۔ رامو سویرے سویرے اپنے پتا کے ساتھ کھیت کی طرف نکل گیا کھیت میں گیہوں کے پودے سنہری بالیوں سے لدے جھوم رہے تھے۔ کچھ پودے سیدھے کھڑے تھے رامو نے پوچھا۔

"پتا جی! کچھ پودے سیدھے کھڑے ہیں، کچھ دھرتی کی طرف جھکے ہوئے ہیں، یہ کیا بات ہے؟"

پتا نے جواب دیا: جو پودے سیدھے اکڑے کھڑے ہیں وہ گھمنڈی ہیں بیٹا!"

"گھمنڈی؟" رامو کو حیرت ہوئی۔

"ہاں بیٹا" پتا نے کہا "تم یہیں ٹھہرو" اور وہ دونوں طرح کے ایک ایک پودے کی دو بالیاں توڑ لائے۔ پہلی بالی ہاتھ پر مل کر رامو کو دکھائی۔ اس میں سے کچھ نہ نکلا۔ "دیکھو بیٹا! یہ اندر سے خالی ہے۔" پھر انھوں نے دوسرے پودے کی بالی لی اور ان کے ہاتھ پر گیہوں کے چمچماتے ہوئے سنہرے دانے نکل آئے "اور دیکھو! یہ خوبیوں سے بھرا ہے" پھر انھوں نے بات آگے بڑھائی "اسی طرح انسانوں میں بھی جو گھمنڈی ہوتے ہیں، وہ اکڑ کر چلتے ہیں شان دکھاتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی خوبی کوئی گن نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جن میں خوبیاں ہوتی ہیں، اچھے گن ہوتے ہیں وہ جھک کر چلتے ہیں، عاجزی اور انکساری ظاہر کرتے ہیں"

★

جناب زاہد اقبال

# شیر کی خالہ

بہت زمانہ کی بات ہے ۔

ایک بلّی اور گیدڑ میں بہت دوستی تھی ۔ ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہ آتا تھا۔ ایک دن گیدڑ نے بلّی سے کہا "تم اتنی تو چھوٹی ہو۔ تمھارا قد بھی بہت چھوٹا ہے۔ تعجب ہے لوگ تمھیں شیر کی خالہ کیوں کہتے ہیں "

بلّی کچھ نہ بولی بس مسکرا کر رہ گئی ۔

گیدڑ پھر بولا۔ "تم سے تو کہیں زیادہ بہادر میں ہوں ۔ مجھے دیکھ کر بکری کی روح فنا ہوتی ہے ۔ اور تم بکری کے پاس بھی نہیں جا سکتیں۔"

بلّی مسکرائی اور بولی "کسی کی شخصیت کا اندازہ اس کے قد سے نہیں اس کے عمل سے لگایا جاتا ہے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ لوگ مجھے شیر کی خالہ کیوں کہتے ہیں۔"

کچھ ہی دنوں بعد، ایک دن بلّی گیدڑ کے گھر گئی اور بولی "مجھے ابھی ایک سَو روپے کی سخت ضرورت ہے کل ٹھیک دس بجے میں تمھیں ایک سو کے دو سَو روپے دے دوں گی ۔"

گیدڑ نے فوراً ایک سو روپے بکس سے نکال کر بلّی کے حوالے کئے اور بولا "تو میں بالکل ٹھیک دس بجے تمھارے گھر آؤں گا ۔"

"ضرور آنا۔ میں تمھارا انتظار کروں گی"، بلّی بولی اور پھر گیدڑ کے گھر سے نکل کر کتّے کے گھر گئی۔ کتا گھر ہی پر تھا۔ کتے کو دیکھتے ہی بلّی بولی۔ "مجھے ایک سو روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آج تم مجھے ایک سَو روپیہ دیتے ہو تو کل میں تمھیں دو سو روپے دوں گی۔"

کتّا بہت خوش ہوا اور جلدی سے ایک سو روپے بلّی کو دیتے ہوئے کہا۔

"تو کل میں کتنے بجے آپ کے گھر آؤں ؟"

"ٹھیک دس بج کر پانچ منٹ پر"، بلّی بولی

اور پھر بلّی لکڑ بگھے کے گھر گئی جو تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ لکڑ بگھے سے بھی یہی کہا۔ "مجھے ایک سو روپے کی سخت ضرورت ہے ۔ اگر آج تم مجھے ایک سو روپیہ دیتے ہو تو کل میں تمھیں دو سو روپے دوں گی ۔"

"ضرور کیوں نہیں۔ بھلا آپ سے بھی انکار"، لکڑ بگھے نے سَو روپے بلّی کو دیتے ہوئے کہا۔ "کل میں کس وقت آؤں ؟"

"ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر کل میں تمھارا انتظار کروں گی"، بلّی بولی۔

اور پھر لکڑ بگھے کے گھر سے نکل کر بلّی چیتے کے گھر گئی۔ چیتے نے بلّی کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیا بات ہے خالہ جان آج کل نظر ہی نہیں آتی ہو۔ کبھی کبھی تو آیا کرو۔"

"ارے کیا بتاؤں آج کل ذرا بھی فرصت نہیں ملتی ہے"، بلّی بولی "آج ایک سَو روپے کی سخت ضرورت تھی ۔ اس لیے وقت نکال کر آئی ہوں۔"

باپ رے باپ ایک سو روپے آج کل تو خالہ جان

ایک دم مندا چل رہا ہے۔'' چیتا بولا۔

"کیا بکتا ہے۔ تیرے پاس ایک سو روپیہ نہیں ہوگا تو کس کے پاس ہوگا۔" بلی بولی۔

"آج مجھے ایک سو روپے کی سخت ضرورت ہے۔ کل تو گھر آئے گا تو میں تجھے ایک سو کی جگہ دو سو روپے دوں گی اب تو ہوا نا؟"

"کیا ایک سو کے دو سو روپے ---؟" چیتے نے چونک کر پوچھا اور پھر بولا: "اچھا خالہ دیکھتا ہوں۔ شاید ہوا دھر اُدھر رکھا ہوا تمھارا کام چل جائے گا۔" اور پھر لپکتا ہوا کمرے میں گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد ایک سو روپیہ بلی کو دیتے ہوئے بولا۔

"تو کل کتنے بجے آؤں خالہ؟"

"ٹھیک دس بج کر پندرہ منٹ پر میں تمھارا انتظار کروں گی بیٹا۔" بلی بولی۔

کچھ دیر بلی چیتے کے گھر ٹھہری پھر وہاں سے نکل کر سیدھی شیر کے گھر گئی۔ شیر ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ جیسے ہی بلی کی نظر شیر پر پڑی۔ بولی۔

"تو ہر جگہ تو جاتا ہے لیکن میرے یہاں آنے میں نہ معلوم تجھے کیوں شرم آتی ہے۔" ارے بیٹا کم از کم میری زندگی میں تو آیا جایا کرو۔

"نہیں خالہ آج کل واقعی ایک دم فرصت نہیں ملتی ہے۔ لیکن تمھارا آنا آج کیسے کیسے ہوا؟" شیر نے پوچھا۔

"مجھے ایک سو روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اسی لیے تمھارے پاس آئی ہوں۔" بلی بولی۔

"خدا شاہد ہے خالہ ---" شیر بولا۔ "آج کل ہاتھ تنگ ہے۔ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ گھر کی تو بات ہے۔"

"لیکن بیٹا مجھے روپے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر

"آج تو مجھے ایک سو روپے دیتا ہے تو کل میں تجھے دو سو روپے دوں گی۔" بلی بولی۔

"جب تم کہتی ہو تو دیکھتا ہوں خالہ۔ شاید ہو رکھا ہوا۔" شیر بولا۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں ایک سو روپے بلی کو لا کر دیتے ہوئے بولا۔ "کل کتنے بجے آؤں خالہ؟"

"ٹھیک دس بج کر بیس منٹ پر میں تمھارا انتظار کروں گی۔" بلی بولی۔

دوسرے دن ٹھیک دس بجے گیدڑ بلی کے گھر پہنچا۔ بلی نے گیدڑ کو دیکھتے ہی اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ گیدڑ نے جب دیکھا کہ کام کی بات نہیں ہو رہی ہے تو اُس نے کہا: "میں خاص کر روپے لینے آیا ہوں مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔"

"ابھی دیتی ہوں۔" بلی بولی

"اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔" بلی گھبرا کر بولی: "ارے جلدی سے صندوق کے پیچھے چھپ جاؤ۔ کتا آرہا ہے۔"

"کیا کتا آرہا ہے؟ صندوق کے پیچھے جاتے ہوئے گیدڑ نے کہا۔

اور جب بلی نے دیکھا کہ گیدڑ صندوق کے پیچھے جا چکا ہے تو اس نے کواڑ کھول دیا اور کتے سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

پہلے تو کتا ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ کام کی بات نہیں ہو رہی ہے تو اس نے کہا۔ "روپے کہاں ہیں میں اس کے لیے آیا ہوں۔"

"ابھی دیتی ہوں گھبراتے کیوں ہو۔" بلی بولی

"اتنے میں دروازہ کھٹ سے ہوا۔ بلی گھبرا کر بولی۔"

"ارے جلدی سے چھپ جاؤ کمرے میں لکڑ بھگا آرہا ہے۔"

"بے موت مارے گئے۔" کتے نے بھاگتے ہوئے کہا۔

اور جب بلی نے دیکھا کہ کتا کمرے میں جاچکا ہے تو اُس نے کواڑ کھول دیئے لکڑ بھگا آتے ہی بولا۔ "مجھے جلدی جانا ہے روپے لاکر مجھے دو۔"

"افسوس ہے۔ اس وقت میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔" بلی بولی

"تو پھر ـــ" لکڑ بھگا بولا

"تمھارے لیے میں نے ایک کتے کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔" بلی بولی "چلو دکھاتی ہوں۔"

"پھر تو مزہ آجائے گا۔" لکڑ بگھا بلی کے ساتھ جاتے ہوئے بولا۔

اور پھر کمرے میں جیسے ہی لکڑ بگھے کی نظر کتے پر پڑی اُس پر ٹوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُسے مار ڈالا۔

اتنے میں پھر کھٹ سے ہوا۔ بلی بولی "جلدی کمرے کے کونے میں چھپ جاؤ۔ چیتا آرہا ہے۔"

"کیا چیتا آرہا ہے؟ اب تو بچنا بہت مشکل ہے۔" لکڑ بھگا بولا۔

اور پھر کواڑ کھولتے ہی چیتا اندر آیا اور پھر بولا "خالہ ابھی میں آتا بھی نہیں۔ لیکن روپے کی ضرورت تھی۔ ذرا جلدی روپے نکال دو تو۔"

"ارے کیا کروں بٹیا۔ اس وقت تو ایک پیسہ نہیں ہے۔" بلی بولی۔ "لیکن تیرے لئے میں نے لکڑ بگھے کو پکڑ رکھا ہے۔"

"ارے خالہ تم میری کمزوری کو سمجھتی ہو۔ ذرا جلدی سے بتاؤ۔ کہاں ہے وہ لکڑ بگھے کا بچہ،" چیتا بولا۔

بلی اُسے اُس کمرے میں لے گئی جس میں لکڑ بگھا تھا۔ لکڑ بگھے کو دیکھتے ہی چیتا اُس پر ٹوٹ پڑا اور آن کی آن میں اُس کی گردن توڑ ڈالی اور لگا مزے لے لے کر کھانے۔

اتنے میں پھر کھٹ سے ہوا۔

"لو شیر آگیا،" بلی بولی

"آنے دو" چیتے نے کھاتے ہوئے کہا۔

پہلے تو بلی کچھ نہ بولی۔ کھڑی چیتے کو کھاتی ہوئی دیکھتی رہی۔ جب دو تین دفعہ کھٹ کھٹ ہوا تو اس نے کواڑ کھول دیئے۔

"کیا بات ہے خالہ تم جلدی کواڑ نہیں کھولتی ہو کتنی دیر سے میں کھٹ کھٹا رہا ہوں۔" شیر بولا۔

"ارے بیٹا کیا بتاؤں۔ بڑی مشکل سے تو کواڑ کھولا ہے۔ چیتا تو کواڑ کھولنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا شیر سب کھا جائے گا۔ بہت بڑا پیٹو ہے۔" بلی بولی۔

"کیا ـــ؟" شیر بولا۔

"ارے تیرے لیے میں نے لکڑ بگھے کو پکڑ رکھا تھا۔ لیکن پہلے چیتا آگیا اور لگا کھانے اتنا منع کرتی رہی لیکن کون سنتا ہے یہاں۔ بڑا ضدی ہے۔" بلی بولی۔

اچھا تو وہ میرے حصے پر ہاتھ صاف کر رہا ہے ابھی بتا دیتا ہوں اس کو،" شیر نے کہا اور پھر بھاگتا ہوا کمرے میں گیا اور چیتے پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ اور آخر میں دونوں لڑتے لڑتے بری طرح گھائل ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ بلی نے موقع اچھا پایا۔ جلدی سے گرم گرم تیل دونوں کے چہروں پر ڈال دیا اور پھر گیدڑ کے پاس گئی۔ لیکن اس کی حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا کیوں کہ گیدڑ پہلے ہی سے بے ہوش پڑا تھا۔ جلدی سے وہ گیدڑ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے

باقی صفحہ ۲۶ پر

# نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

۱۔ بالپو (حصّہ اوّل) مصنف: سی فری ٹاس مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ بالپو (" دوم) " : " " " " "
۳۔ کشمیر " : مالا سنگھ " خدیجہ بیگم نصیر، پرکاش چند
۴۔ پرندوں کی دنیا " : جمال آرا " : محمد شفیع الدین نیّر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر " : بریگیڈیر گیان سنگھ " : محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی " : لیلا مجمدار " : رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں " : لیلا کھجا گوت " : " " "
۸۔ رسیلی کہانیاں " : منوج داس " : صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل) " : وشنو پربھاکر " : انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں " : جگجیت سنگھ " : عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیّاح " : کے۔ سی کھنہ تصاویر: کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں " : او ما نند مترجم: رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خالہ بلّی کا خاندان " : منوہر ناتھ چترویدی " : محمد شفیع الدین نیّر
۱۴۔ بہت دن ہوئے (حصّہ اوّل) " : چیمبی بی ام جیہ کشی " : رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانیاں مصنف: راجندر اوستھی مترجم: انور کمال حسینی
۱۶۔ روہنت ونندیہ " : کرشن جینیہ " : " " "
۱۷۔ سدا بہار کہانیاں " : شانتا رنگاچاری " : " " "
۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی " : میر نجابت علی " : سیّد احسان
۱۹۔ " " " (دوم) " : " " : " "
۲۰۔ بڑا پانی " : لیلا مجمدار " : صالحہ عابد حسین
۲۱۔ مورا " : ملک راج آنند " : انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل " : سروبندر سانیال " : پریتم لال

## ذاکر حسین سیریز

۲۳۔ ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت: ۳/۰
۲۴۔ انوکھی دکان " : قدسیہ زیدی " : ۲/۵۰
۲۵۔ گلا لو چوہیا اور پیر زادا " : " " " : ۲/۰
۲۶۔ دنیا کے جانور " : " " " : ۲/۵۰
۲۷۔ راجہ موہن رائے " : عرش ملسیانی " (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

# آدھی ملاقات

"پیام تعلیم" جون ۷۴ء کا شمارہ نظر نواز ہوا شکریہ!
آج کل کچھ عدیم الفرصت ہوں۔ ہاں کبھی کبھی ہلکے پھلکے
افسانے اور مضمون لکھا کرتا ہوں۔ یوں تو بچوں کے اور بھی رسالے
ہیں۔ لیکن آپ کا خلوص مجبور کرتا ہے کہ میں بچوں کے لئے
جو کچھ بھی لکھوں۔ آپ کی نذر کروں۔ "لاسلکی کا بانا آدم"
کے بعد جلد ہی کوئی مضمون ارسال کروں گا۔

آپ کی علالت باعثِ تشویش ہے۔ آپ اپنی صحت
کا خیال رکھیے! میرا دل تو یہی کہتا ہے۔

جب سے آپ سے رابطہ قائم ہوا ہے "پیام تعلیم"
متواتر مل رہا ہے۔ یہ آپ کی محبت اور بیکراں شیل نہیں
تو کیا ہے۔؟

زیرِ نظر شمارہ میں یوں تو سبھی تخلیقات اچھی لگیں۔
لیکن نیر صاحب اور سیدہ عنوان صاحب کی نظمیں اور
محمد امین صاحب کا مضمون پسند آیا۔

(وجیہہ ادیب)

پیام تعلیم بلا واقعی اپنی طرز کا واحد رسالہ ہے اُردو
میں شاید ہی کوئی رسالہ اتنی ساری خوبیوں کا حامل ہو
خدا اسے مزید ترقی عطا فرمائے تاکہ یہ اُردو کی زیادہ
سے زیادہ خدمت انجام دے سکے۔

اس ماہ "پن چکی" "ایک تجربہ" "کیچڑ کا بھوت"
"سچائی" اور کچھ دوسری تخلیقات پسند آئیں سبھی مصنفین
کو میری جانب سے شکریہ ادا کر دیجیے۔

(نعیم پروینہ صدیقی)
چاند پوری

پیام تعلیم کا مطالعہ ایک عرصہ سے کر رہا ہوں دن
دونی رات چوگنی ترقی دیکھ رہا ہوں تو بے تاب ہو گیا اور
خط لکھنے بیٹھ گیا آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہا
ہوں ایک کہانی "بادل" لے کر اور امید کرتا ہوں
کہ گرمجوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ ویسے میں دوسرے
کئی رسالے اور اخبارات میں شرکت کر چکا ہوں جن میں
روزنامہ انقلاب، آج، ہندوستان، رپورٹر، شریڈ
چکور، نئی منزل، گل کدہ، نسرین، دلچسپ، پندرہ
روزہ فلم ڈکشنری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں تو آئندہ بھی آپ کی
محفل میں شرکت کرتا رہوں گا۔

شیر خاں رنگیلا

آپ کا پرچہ پیام تعلیم ماہ جون کا نظر نواز ہوا ٹائٹل
واقعی میں بہت خوب ہے آپ کی طبیعت ناساز ہے یہ
پڑھ کر بہت دکھ ہوا اللہ تعالیٰ آپ کو صحتیاب کریں آمین۔

اتنی ناسازگی کے باوجود ادب کے گلدستہ میں چنیدہ
چنیدہ پھولوں کو کس خوبصورتی سے آپ نے سجایا ہے
واقعی آپ کی کاوش کارگر ہے۔

"پیام تعلیم" کے لیے میں کوشش خریدار بنانے
اور عوام میں خاص کر بچوں بچیوں کو پڑھنے اور
علم معلومات میں اضافہ کا صحیح پیامبر سمجھتا ہوں۔ خدا
میری کوششوں کو کامیاب بنائے اور میں آپ کو خریدار پیش کرسکوں۔

عبدالمنان عبدالسبحان منصوری بمبئی

REGD NO-D(S)-097

# ادھر اُدھر سے

## قالین ـ ڈیڑھ کروڑ روپے کا!

آپ شاید جانتے ہوں۔ ایرانی قالین تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ ایران کی یہ خاص صنعت ہے۔ اب سے نہیں سیکڑوں برس پہلے سے عجیب بات یہ ہے کہ ایرانی قالین جتنا پرانا ہوتا ہے اتنی ہی اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

پر ہم جس قالین کا ذکر کر رہے ہیں وہ تو ابھی تیار ہی ہو رہا ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہمارے دیس کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی۔ ایران تشریف لے گئی تھیں۔ وہاں وہ ایران کے پرانے شہر اصفہان کے آرٹ اسکول میں گئیں تو اسکول کی لڑکیاں ایک بڑے سے قالین کی تیاری میں لگی ہوئی تھیں معلوم ہوا کہ قالین تین سال سے تیار ہو رہا ہے اور اس کے مکمل ہونے میں تین سال اور لگیں گے۔ گویا چھ سال میں بن کر تیار ہوگا۔ بہت بڑا قالین ہے۔ ۱۲۱ مربع میٹر ایران کے سینٹ ہال کے لیے تیار کیا جا رہا ہے اور کبھی قیمت اس کی ڈیڑھ کروڑ روپے ہوگی۔ (الجمعیۃ)

## دیکھو اور بات کرو:-

جالندھر کے ایک صاحب بال کرشن نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے۔ یہ آلہ ایک طرح کا ٹیلی فون ہے اس کے ذریعے آپ بات بھی کر سکیں گے اور جس سے بات کریں گے اس کی صورت بھی دیکھ سکیں گے۔ بال کرشن جی نے تیار کردہ فون ٹیلی ویژن سیٹ بنا سکتے ہیں۔ اور اس کی لاگت زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے ہوگی۔

(بہ ترجم ہند ہفتہ وار)

## یہ پیٹ ہے یا کیا!؟

ناوک چوٹ (NOUAKCHOTT) کے اسپتال میں ڈاکٹر نے ایک صاحب کے پیٹ کا آپریشن کیا تو اس میں سے دو تو چاقو نکلے آٹھ شاٹ گن کے کارتوس کانٹے دار تار کے ۳۶ ٹکڑے۔ گاڑیوں کے فالتو پرزے چھوٹے سکے، پتھر اور ریت۔ یہ صاحب بہت دنوں سے دماغی مرض میں مبتلا ہیں اور اسی مرض کے علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔

(ہندوستان ٹائمس)

## بسیں بغیر کنڈکٹروں کے!

کیا بسیں بغیر کنڈکٹروں کے چل سکتی ہیں؟

جی ہاں دنیا میں ایک ایسا شہر بھی ہے جہاں بسیں بغیر کنڈکٹروں کے چل رہی ہیں سوویت دیس کی راج دھانی ماسکو ہے یہاں نو سال سے بسیں بغیر کنڈکٹروں کے چل رہی ہیں۔ بس میں سکوں یا پیسوں کا ایک بکس ہے بس پہ چڑھنے والا ہر مسافر کرایے کے پیسے اس بکس میں ڈال دیتا ہے۔ ان بسوں میں ۵۴۰۰ کنڈکٹر تھے ان سب کو علیحدہ کر کے دوسرے کاموں پر لگا دیا گیا۔ اور وہ اپنے دوسرے کاموں سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

شروع شروع میں جب یہ تجویز سامنے آئی تو یہ اعتراض اٹھایا گیا اور کچھ لوگوں کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ بہت سے مسافر کرایہ ہضم کر جائیں گے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ایسے چند ہی بد دیانت ہوں گے اور لاکھوں کی ایمان داری اور دیانت کے مقابلے میں برتر ہے۔ ان کنڈکٹروں کا رواج ختم کرنے سے ماسکو ٹرانسپورٹ سسٹم کو دو کروڑ بیس لاکھ روبل سالانہ کی بچت ہوتی ہے۔ کاش ہمارے دیس کے شہروں خصوصاً راج دھانی دلی میں اس باعزت طریقہ کا تجربہ کیا جاتا!

(الجمعیۃ)

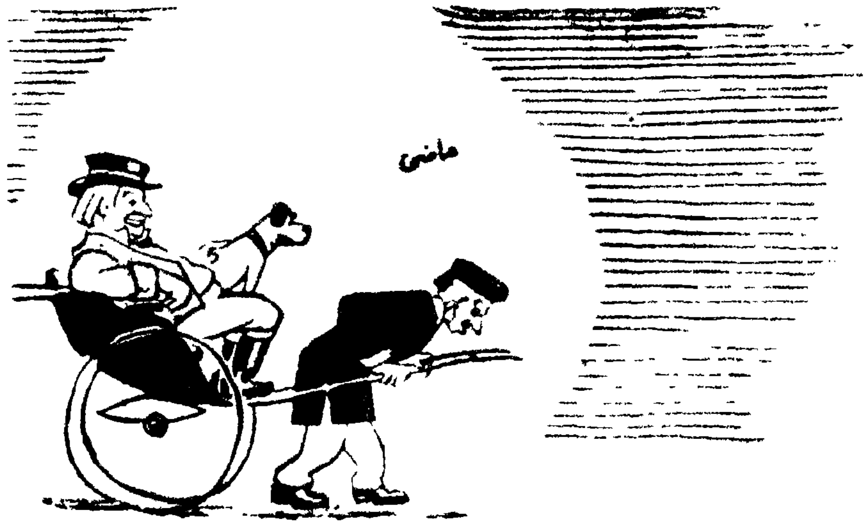


Regd. No. D(S)-097 July 1[illegible]

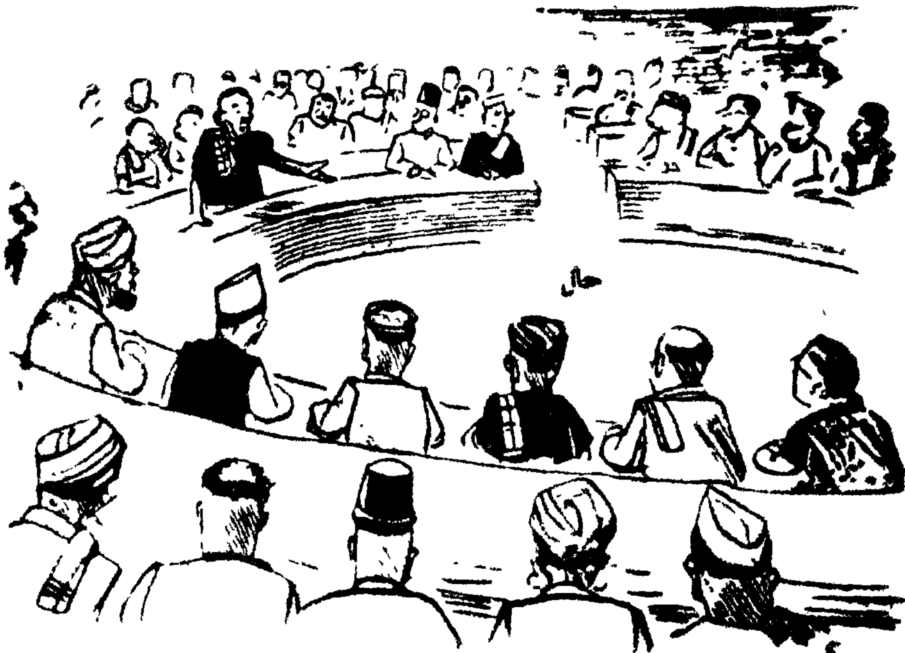
# PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI - 110025

# پیامِ تعلیم

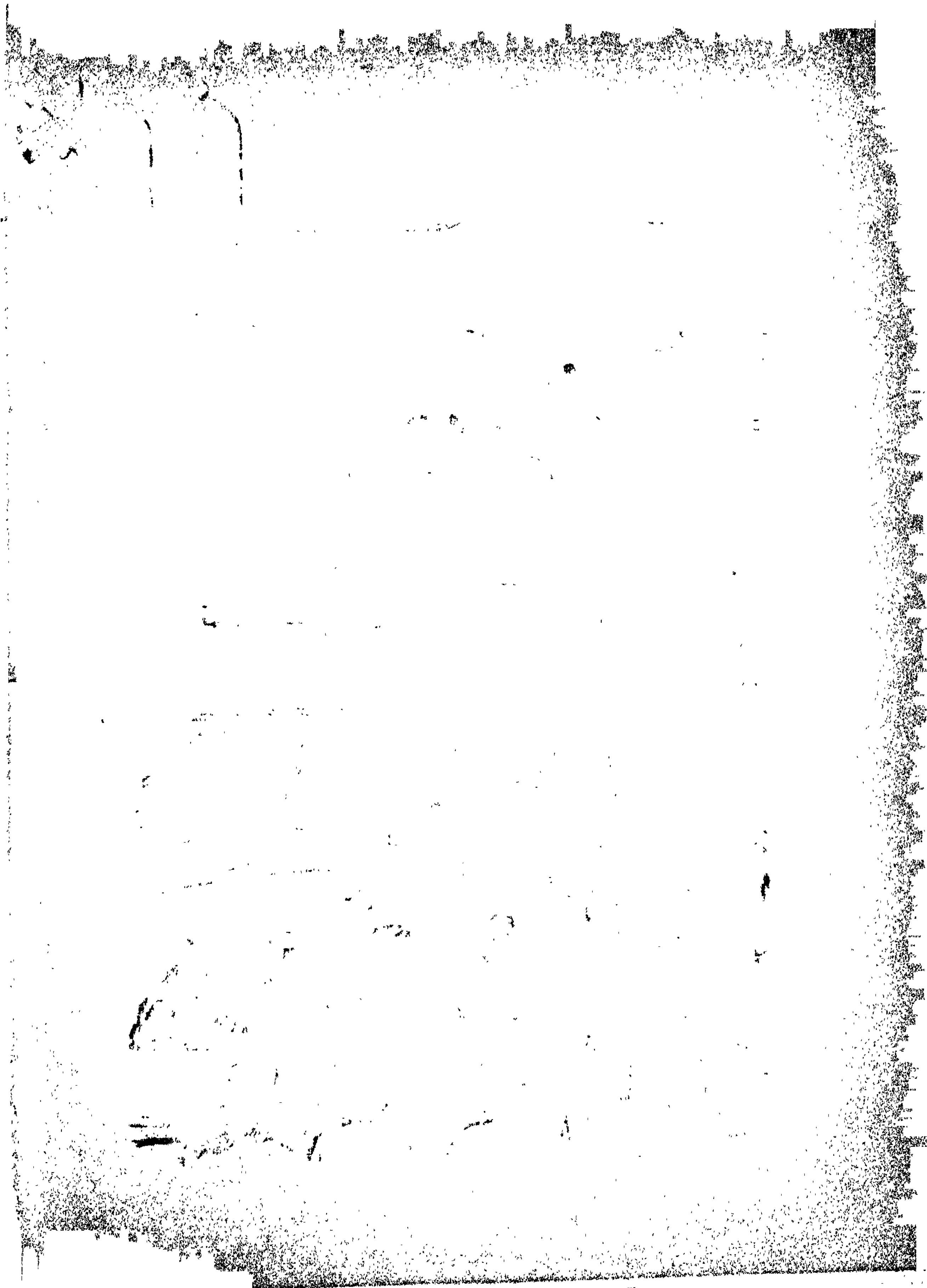



قومی حکومت





مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی



# پیام تعلیم

نئی دہلی ۲۵

جلد ۱۱ شمارہ ۸

ایڈیٹر
ولی شاہجہانپوری

معاون
صفیہ حسان

اگست ۱۹۷۰ء

قیمت فی پرچہ [illegible] پیسے
سالانہ سات روپے

[illegible] مکتبہ جامعہ [illegible] کے لیے [illegible] سے شائع کیا

## فہرست مضامین



★

# دلی ترقی کی شاہراہ پر

## گذشتہ دو سالوں کے کارنامے

**صنعت**

نریلا میں نئی صنعتی بستی قائم کی جا رہی ہے جہاں ایک ہزار بے روزگار انجینئروں کے لیے [illegible] صنعتی [illegible] زیر تعمیر ہیں۔

## پانچ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنے کا پروگرام

اس پروگرام کے تحت تقریباً ۱۹ ہزار تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے والی ۵۰ نئی اسکیموں پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اور دیہی علاقوں کے بے روزگاروں کے لیے انقلابی پروگراموں پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ اس سال بیس لاکھ روپے کی لاگت سے خصوصی روزگار اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔

**تعلیم**

دلی میں تعلیم کو کام، تجربہ اور سائنس کے اعتبار سے مکمل بنانے کے لیے ترقی پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔

**ہریجنوں کی فلاح بہبود**

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو اضافی اسکیمیں چوتھے پلان میں مخصوص تھیں ان کی تعداد دوگنی کر دی گئی اور ۳۰ ہریجن بستیوں کا سدھار کیا گیا۔

**طبی سہولیات**

۷۳-۱۹۷۲ء میں پسماندہ اور جھگی جھونپڑی علاقوں میں مزید [illegible] ڈسپنسریاں کھولی گئی ہیں اور اس طرح ڈسپنسریوں کی تعداد [illegible] ہو گئی ہے۔ اور [illegible] بستروں والے دو اسپتال زیر تعمیر ہیں۔

**زراعت**

کسانوں کو [illegible] کے لیے [illegible] قائم کی گئی ہیں [illegible]

[illegible]

دلی کو [illegible] صاف بنانے [illegible]

[illegible]

# بچوں سے باتیں

جولائی کا مہینہ آپ کے اور ہمارے، دونوں کے لیے
تکلیف کا مہینا ثابت ہوا۔ آپ کے پورے تیس دن پیام تعلیم
کے انتظار میں بے چینی سے گزرے مگر آخرکار پیام تعلیم
آپ تک پہنچ ہی گیا۔ لیکن ہم نے تو اس عرصے میں اپنی بہت
عزیز متاع کو کھو دیا اور ایسا کھویا کہ اب اس کے ملنے کی کوئی
امید ہی نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ حسین صاحب کے انتقال کی
خبر سے آپ کو بھی صدمہ ہوا ہوگا۔ مرحوم کے انتقال کی خبر،
حیدرآباد، لکھنؤ، کانپور، علی گڑھ اور بمبئی کے کئی اخباروں
میں شائع ہونے کے بعد اس مختصر سی مدت میں بھی مرحوم
کے احباب اور پیامیوں کے خطوط آنے شروع ہو گئے ہم
ان حضرات کے ممنون ہیں اور اپنی نیز مرحوم کے پسماندگان
کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

سرِدست پیام تعلیم کی ادارت کی ذمہ داریاں راقم
کو سونپی گئی ہیں۔ کیوں؟ اس کا علم تو مکتبہ جامعہ کے
جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب ہی کو ہوگا۔ لیکن میرا اپنا
خیال ہے کہ شروع سے پیام تعلیم کے ساتھ کسی نہ کسی
صورت میں میری وابستگی ان اسباب میں سے ایک ہو سکتی
ہے [illegible] انتخاب مجھ پر [illegible] ہے میں کہاں
تک اس ذمہ داری کو سنبھال سکوں گا۔ اس کا جواب آپ سب
[illegible] جہاں تک [illegible] کوشش یہی ہوگی کہ
پیام تعلیم کا معیار اور اونچا نہ ہو سکے تو اسے
گرنے تو نہ دیا جائے۔ اگر ہمارے کرم فرما ادیبوں اور پیام تعلیم
کے ہمدرد اور بہی خواہ وہ تعاون دیتے رہے جو مرحوم
کو حاصل رہا تو یقین ہے کہ میں اس اعتماد کو مجروح نہ
ہونے دوں گا جو شاہد علی خاں صاحب کو مجھ پر
ہو گیا ہے۔

---

اگست کے اس شمارے کے تقریباً سارے مضامین
مرحوم حسین حسان صاحب کے دیکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس
کو میری کامیابی یا ناکامیابی کا پیمانہ نہ بنایا جائے۔ اس
شمارے میں جناب یوسف ناظم کے دلچسپ معلوماتی
"کھیل ہی کھیل" کی دوسری قسط چھپنی چاہیے تھی
بدقسمتی سے حسان صاحب کی علالت کے دوران اس
کا مسودہ بہت سے کاغذوں میں دب گیا ہے۔ تلاش
کیا جا رہا ہے۔ یقین ہے مل جائے گا۔

---

حمید عثمانی صاحب کی دلچسپ کہانی "وہ بادشاہ
بننا چاہتا تھا" کی دوسری اور آخری قسط آپ کو
پسند آئے گی۔ باقی مضامین نثر و نظم بھی آپ کی دلچسپی
اور معلومات میں اضافے کا سبب بنیں گے۔

---

حسین حسان صاحب نے بچوں کے ادب کو

[illegible] ارادہ ہے کہ [illegible]
[illegible] شکل میں شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں
[illegible] احباب سے گزارش کی ہے کہ مرحوم کے
[illegible] اپنے خیالات اور تاثرات بھی لکھیں۔ حضرت
[illegible] نے بسم اللہ کر دی ہے ان کی خدمت میں
[illegible] کی ہے۔ شاہ معین الدین ندوی، ایڈیٹر
[illegible] مولوی محمد حفیظ الدین ندوی، خالد عرفان
[illegible] اور صالحہ عابد حسین صاحبہ نے
[illegible] کے لکھنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔

محترم ڈاکٹر رشید [illegible] پروفیسر رشید احمد صدیقی،
[illegible] غلام ربانی، جناب [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

# اسکول کھلا اسکول کھلا

احباب ہمارے ہم کو ملے
پھر قلب کے پیارے ہم کو ملے
یہ چاند ستارے ہم کو ملے
الفت کے اشارے ہم کو ملے
آپس کے سہارے ہم کو ملے

سب مل گئے باہم شکر خدا
اسکول کھلا اسکول کھلا

لطف آئے گا پیار سے ملنے میں
کچھ باہم مل کر کہنے میں
الفت سے رہنے سہنے میں
آپس میں مل کر رہنے میں
پڑھنے میں کچھ سمجھنے میں

خوش ہوگا کوئی ادھر کوئی خفا
اسکول کھلا اسکول کھلا

مصلحی پاس اس سال ہوئے
محنت سے بلند اقبال ہوئے
جو ہم میں سے بدحال ہوئے
ناکامی سے پامال ہوئے
اللہ کرے خوشحال ہوئے

ہم دل سے پڑھیں گے اچھا
اسکول کھلا اسکول کھلا

جناب [illegible] ایم اے

# سوالک کی پہاڑیاں

# اور

# ان کی جغرافیائی اہمیت

ہندوستان کا نقشہ دیکھیے اور اب سوالک کی پہاڑیاں ڈھونڈیے۔ کہاں ہیں؟ یہ ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ ہیں۔ ان کا سلسلہ زیادہ تر یوپی، ہماچل پردیش اور پنجاب میں پھیلا ہوا ہے۔

علم ارضیات یا زمین کے علم کے ماہروں کا خیال ہے کہ ہمالیہ کے مقابلے میں سوالک کی پہاڑیاں عمر میں کم ہیں اور بالکل نئی ہیں۔ ان پہاڑیوں میں ریت کے پتھروں کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ چکنی مٹی اور دریاؤں کی لائی ہوئی دوسری قسم کی مٹی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ یہ سب علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ پہاڑیاں حال ہی میں بنی ہیں۔ آپ ان کی عمر کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ —————— ان پہاڑیوں کی عمر تیس لاکھ سال اور دو کروڑ پچاس لاکھ سال کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

یہ پہاڑیاں بنیں کیسے کہ کروڑوں برس پہلے [illegible]

[illegible]

تیزی سے بہتا تھا اور اس کے ساتھ چٹانیں، پتھر، کنکر، ریت اور مٹی بہہ کر آتی تھی اور کچھ تو پانی کے زور سے بہہ کر نکل جاتی تھی۔ پانی کی بہتات اور ریل پیل کی وجہ سے سیلاب بھی آتا رہتا تھا اور ریت اور مٹی جمع ہونے کی رفتار تیز ہوتی رہتی تھی۔ سیلاب بھی ایک بار نہیں بیسیوں، سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں بار آئے۔

غرض یہ کہ لاکھوں سال سے ایسا بار بار ہوتا رہا۔ یوں سمجھیے کہ ان گنت بار ہوا تھا۔ اس طرح جو ریت اور مٹی اور چٹانیں جمع ہوتی تھیں سیلاب کے میدان میں جمع ہوتی گئیں۔ غرض بار بار ہونے کی وجہ سے سیلاب کے میدان کی سطح بلند ہونے لگی اور وہاں بہت سارے دلدلی علاقے بن گئے۔ سالہا سال کے بعد ان میں [illegible] جنگل اگ آئے اور [illegible] ہو گئے۔

ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟

[illegible]

[illegible] بہت سے [illegible] ہو گئے ہیں

کے [illegible] ہو گئے۔ لیکن جب [illegible] بلند ہوئے تو [illegible] مرطوب ہوا [illegible] ہو گئے۔ اس طرح بارش کا دور شروع ہوا اور [illegible] سال تک چلتا رہا۔

پھر [illegible] سے پھر پودے اُگے اور جلدی یہ پودے بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن گئے۔ اور پھر یہ علاقے گھنے جنگل کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے سوالک کے علاقے میں ان کی اتنی بہتات ہو گئی کہ جنگلی جانوروں کی نشوونما ہونے لگی۔ ماحول کچھ ایسا خوشگوار ثابت ہوا کہ ارتقا کی ساری منزلیں طے کرنے کے بعد جلد ہی بہت سارے اور مختلف قسم کے گھوڑے وجود میں آ گئے، ہاتھی، جنگلی سور، زرافہ، بندر، شیر اور چیتے بہت تیزی کے ساتھ بڑھ گئے۔ جنگل میں انہی کا دور دورہ ہو گیا۔ سوالک کی پہاڑیوں پر ان کے چنگھاڑنے، گرجنے اور دہاڑنے کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ ان کی افزائش نسل و نسل کی بڑھوتری یا ترقی کے لیے ماحول اس قدر حیرت انگیز حد تک سازگار تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ یہ جنگلی جانور اور ان کی نسلیں کبھی ختم نہ ہوں گی لیکن دیکھتے دیکھتے زمین کی تاریخ میں ایک نیا موڑ آیا۔

وہ کیا تھا؟ ہم کیا بتا سکتے ہیں؟

[illegible] سال پہلے ایک نیا دور شروع ہوا ہے [illegible] کا دور کہتے ہیں۔ اس دور کے شروع ہوتے ہی آب و ہوا سرد ہونے لگی۔ بدلتے ہوئے ماحول میں سوالک کی پہاڑیوں کے جنگلی جانور رہتے تھے ان میں ایک بے چینی اور ہیجان پیدا ہو گیا۔ ان کے لیے سرد آب و ہوا برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ جان بچانے کے لیے یا تو وہ دوسرے علاقوں میں بھاگ کھڑے ہوئے یا پھر وہیں جنگل میں زندہ درگور ہو گئے۔ چٹانوں کی تہیں کئی کئی بار الٹ پلٹ ہوئیں۔ کیچڑ اور مٹی میں پھنس پھنسا کر جنگلی جانوروں کی نسلوں پر نسلیں دفن ہو گئیں۔

سوالک کے علاقے میں سیکتی فاسل نام کا ایک پارک ہے۔ اس جگہ جتنے بھی جنگلی جانور رہتے تھے وہ آناً فاناً آنے والے انقلاب میں ایسا پھنسے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ لت پت ہو کر کیچڑ میں پھنس کر بے بس ہو گئے۔ ان کے اعضا، گوشت پوست سب گل کر سڑ گئے لیکن ان کے ڈھانچوں نے کیچڑ پر اپنا نشان اور اپنی چھاپ چھوڑ دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مٹی اور چٹان کے ٹکڑے اور گیس کم ہوتی گئی اور ان کی تہیں ہٹنے لگیں۔ پھر موجودہ دور میں ہمارے سائنس دانوں کی نظر ان پر پڑی۔ چٹان میں سے [illegible] ان کی کھوج لگائی گئی اور پھر ہمارے اس علمی دور میں ان کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو گئی۔

کئی فاسل ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے گئے اور ان کو ترتیب دے کر اور چھانٹ کر چنڈی گڑھ کے میوزیم میں رکھ دیے گئے۔ اتفاق سے ایک بھی سائنس دان نے غور کر کے دیکھا تو [illegible]

---

ف [illegible] دور [illegible] تھا جب دنیا کی آب و ہوا تیزی کے ساتھ [illegible] ہو گئی [illegible] گزر [illegible] تھی۔ [illegible] شروع ہوئے [illegible] ہو چکے ہیں۔

ف [illegible] دور [illegible] تھا جب [illegible] کے [illegible] میں آ گئے تھے جیسے [illegible]

ہے کہ [illegible] موجود [illegible] ان سے پہلا
پایا [illegible] ملتا ہے۔ مثال کے طور پر [illegible]
علاقے [illegible] سالہ کا فاسل ہے۔ [illegible]
پہاڑیوں کے دامن میں [illegible] کے فاسل کا علاقہ ہے
[illegible] کے نشان [illegible] کے جنگلات
کا علاقہ ہے۔ ہمارا [illegible]
اندھیرا [illegible] کا نام ہے۔ سوالک کا جو سلسلہ
[illegible] چلا گیا ہے وہاں [illegible] میں سوالک کے فاسلوں
کا ایک اہم خطہ ہے اور کشمیر میں [illegible] فاسل ملتے
والی پہاڑی کا سلسلہ ہے اور اسی طرح کا ایک اہم خطہ
[illegible] کی پہاڑیاں [illegible] یہ [illegible] کشمیر میں واقع ہے۔

★★

★ جو آدمی اللہ کے لئے کوئی کام کرتا ہے اللہ خود اس کا کفیل ہو جاتا ہے۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

★ اللہ تعالیٰ کو [illegible] زمین پر فساد نہ کرو۔
(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

★ اللہ کے [illegible]
(قرآن پاک)

★ [illegible] کر لیا جاتا ہے
([illegible])

★ [illegible]

[illegible] ہوا کہ سوالک [illegible]
فاسل ملتے ہیں جو سب کے سب [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] کے معنی یہ ہیں کہ سوالک کے علاقے
[illegible] کا دھات کا دور ہے (یہ دور ہی دھات ہے)
[illegible] ۲۱ مئی ۱۹۷۲ء کو راجستھان کے [illegible]
[illegible] ہے جو جیسلمیر کے [illegible]
[illegible] تحریر کیا ہے۔ جس کا
[illegible] ساری دنیا میں چرچا ہے)
[illegible] حال یہ ہے کہ [illegible] کا جائزہ لیا جا رہا ہے
[illegible] بات کو جانا جا رہا ہے کہ کتنی مقدار میں موجود
[illegible] ہے تاکہ ان کے مطالعے [illegible]
[illegible] کا پروگرام مرتب کیا جائے اور [illegible]
[illegible] جا سکے [illegible]
[illegible] سے پہلا
[illegible]
[illegible] جاتا ہے
[illegible] سوالک کی پہاڑیوں [illegible] دھات
[illegible]

# بھارت مرا وطن ہے

— جناب [illegible]

پھولوں کا یہ وطن ہے رنگوں بھرا چمن ہے
نغموں سے گونجتی یاں ہر صبح کی پون ہے
پربت ہے یہ ہمالہ، یا اپنا بانکپن ہے
مدّاح ہوں میں جس کا میرا حسین وطن ہے
بھارت مرا وطن ہے، بھارت میرا وطن ہے

ذرّہ یہاں کا اک اک راحت لیے ہوئے ہے
ہر شخص یاں انوکھی طاقت لیے ہوئے ہے
آنکھوں میں یہ نظارہ جنت لیے ہوئے ہے
میرے چمن کی گنگا پرکیف و نغمہ زن ہے
بھارت مرا وطن ہے، بھارت مرا وطن ہے

ہم نے ترقیوں کے سب راز پا لیے ہیں
جن میں ہے سوز دو با وہ ساز پا لیے ہیں
پرواز کرکے اونچی دمساز پا لیے ہیں
ہے رات اپنی شاداں اور صبح خندہ زن ہے
بھارت مرا وطن ہے بھارت مرا وطن ہے

ہم پر کرم خدا کا ہر آن ہو رہا ہے
علم و عمل کا ہر سو ساماں ہو رہا ہے
انسان دیش کا اب انسان ہو رہا ہے
میداں پہ تازگی ہے کہسار بھی مگن ہے
بھارت مرا وطن ہے بھارت مرا وطن ہے

بلبل نے اس چمن کے دنیا میں گیت گائے
یاں کے چراغ روشن دنیا میں جگمگائے
دنیا کو رہ دکھائی ظلم و ستم مٹائے
اپنے حسیں گگن میں تاروں کی انجمن ہے
بھارت مرا وطن ہے بھارت مرا وطن ہے

جناب حمید عثمانی

# وہ بادشاہ بننا چاہتا تھا

(انگریزی کہانی)

(۲)

اُس دن کے بعد تو کھلونوں کی دکان میں بہت گڑبڑ شروع ہوگئی۔ سارے کھلونے ہر وقت جھکتے اور آداب کرتے دکھائی دیتے۔ ان میں سے کسی کو باجے والے ڈبے "پر خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" کی دھن بجانا پڑتی۔ سب کو کھلونوں کو بادشاہ کے سامنے الٹا چلنا پڑتا تھا۔ روزانہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر بار بار گرتے تھے خوب چوٹیں آتی تھیں۔

سپاہی روز رات کو پریڈ کرتے۔ سلامی دیتے۔ لفٹ رائٹ کرتے۔ بادشاہ کے چاروں طرف سپاہیوں کو ٹہلنا پڑتا۔ بادشاہ بہت اکڑ کر سلامی لیا کرتا تھا۔

کچھ دنوں بعد راجہ گڈے نے طے کیا کہ روز رات کو اپنے کام کرانے کے لیے تین نوکر رکھے اور اب باری باری ہر کھلونے کو رات میں اس کا کام کرنا پڑتا تھا۔ کھلونوں کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ کیونکہ راجہ گڈا بہت کام لیا کرتا تھا۔

پھر ایک دن راجہ گڈے نے سب کو منع کر دیا کہ کھلونے والے انجن یا جھولے والے گھوڑے پر آئندہ اس کے سوا کوئی سوار نہ ہو۔ اس نے کہا: "بادشاہ کو ایک گھوڑا اور ایک انجن صرف اپنے لیے رکھنا چاہیے"

کھلونوں نے اس بات پر بہت شور مچایا۔ بادشاہ سنتا رہا۔ پھر اس نے تلوار سے کالے بھوے کے کوٹ میں سوراخ کر دیا۔ "اُف آپ نے تو مجھے کاٹ ہی ڈالا تھا۔ آپ کتنے بے رحم ہیں!"

وہ بھاگ کر کالے بالوں والی گڑیا کے پاس گیا اور رو رو کر اپنی بپتا سنانے لگا۔

"تم فکر نہ کرو"، کالے بالوں والی گڑیا نے کہا، "میں تمہارا کوٹ سی دوں گی۔ مگر تم ایک بات کا خیال رکھنا۔ ادھر دو چار دن بادشاہ کے سامنے نہ جانا۔"

اسی طرح چابی والا چوہا گڑیا کے پاس آیا اور گڑیا سے کہنے لگا کہ وہ اس کی ناک پر پیار کرے۔ بادشاہ نے اس کی ناک پر گھونسہ جڑ دیا تھا۔ ایک سپاہی آیا۔ اس کا ہاتھ سلامی دیتے ہوئے ٹوٹ گیا تھا۔ گڑیا نے چھوٹی سی ڈبیہ سے گوند نکالا اور سپاہی کا ہاتھ پھر سے جوڑ دیا۔ ایک ملاح گڈے نے بتایا کہ "میں بادشاہ کے سامنے اپنی ٹوپی اتارنا بھول گیا تھا۔ اب میرے پاس کوئی ٹوپی نہیں ہے۔ بادشاہ نے میری ٹوپی چوہے کے بل میں ٹھونس رکھی ہے۔"

"میں کاغذ کے ٹکڑے سے تم کو دوسری ٹوپی بنا دوں گی" کالے بالوں والی گڑیا نے کہا۔ اس نے ٹوپی بنا دی جو ملاح گڈے کے سر پر فٹ آ گئی۔

جلدی ہی سب کھلونے اپنے نئے بادشاہ سے اکتا گئے۔ وہ ان سے بہت کام لیتا تھا وہ بار بار جھکتے

جھکتے اور اُلٹا چلتے چلتے تھک گئے تھے۔ وہ بادشاہ کے خاص نوکر نہیں بننا چاہتے تھے۔ وہ رات کو کھیلنا چاہتے تھے۔ ایک ایک کرکے وہ سب بادشاہ کو چھوڑ بیٹھے انھوں نے اِدھر اُدھر اندھیرے کونوں میں کھیلنا شروع کر دیا۔

راجہ گڈّے کو بہت غصّہ آیا اس کو تکلیف بھی ہوئی۔ کتنے عجیب ہیں یہ کھلونے اس کے ایسے اچھے بادشاہ کو بادشاہ نہیں ماننا چاہیے کسی اور کے پاس اس طرح نیلا لبادہ سنہرے کپڑے ہیں؟ تاج ہے؟ تلوار ہے؟

جھکنے والا بھالو بھاگ گیا۔ اب کہیں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ باجے والے ڈبے میں کوئی چابی دینے والا نہیں رہ گیا تھا۔ "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" والی دھن اب نہیں بجتی تھی یہ بہت بُرا تھا۔

راجہ گڈّے نے طے کیا وہ اندھیرے کونوں میں جائے گا۔ وہاں کھلونوں کو ڈرائے گا۔ راجہ گڈّا الماری میں دھیرے دھیرے کونے کی طرف بڑھتا گیا۔ پھر کھلونوں کو ڈرانے کے لیے دھم سے نیچے کودا۔ اس کا خیال تھا کہ کھلونے اسی جگہ کھیل رہے ہوں گے لیکن وہاں تو غضب ہو گیا وہ کھلونوں کے درمیان نہیں گرا۔ اندھیرے میں پانی سے بھری بالٹی میں جا گرا۔ بالٹی دکان کی صفائی کرنے والی عورت نے رکھ چھوڑی تھی صبح فرش صاف کرنے کے لیے۔

بادشاہ پانی میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ اس کی تلوار پانی میں کہیں کھو گئی وہ پانی سے باہر نکلنے لگا تو اس کا تاج زمین پر گر پڑا۔ اس کا لبادہ کسی چیز میں پھنس کر پھٹ گیا۔

وہ بہت دکھی تھا۔ سب کھلونوں نے اس کے چاروں طرف اکٹھا ہو کر کہنا شروع کر دیا "بہت اچھا ہوا۔ اب تم کو ہمارے پیچھے پڑنے کی سزا مل گئی" سیلے ہوئے نے کہا۔

"تم اب بالکل بادشاہ نہیں معلوم ہوتے" چابی والے چوہے نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کا تاج کھو گیا ہے؟" جھکنے والے بھالو نے پوچھا۔ "اور آپ نے تلوار بھی کھو دی؟ آپ بہت بے وقوف بادشاہ نکلے"

کوئی کھلونوں کو ہٹاتے ہوئے آیا۔ یہ کالے بالوں والی گڑیا تھی۔ بادشاہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اس کو چھینک آ گئی۔

"آچھیں"

"ارے میرے دوست کیا آپ پانی میں گر پڑے تھے؟" کالے بالوں والی گڑیا نے کہا "آپ بالکل شرابور ہو گئے ہیں۔ میرے ساتھ چلیے میں آپ کو بستر پر لٹا دوں گی اور آپ کی کل چیزیں سکھاؤں گی۔ جلدی کیجیے جلدی"

راجہ گڈّا کالے بالوں والی گڑیا کی ہمدردی بھری باتیں سن کر اتنا خوش ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے۔ وہ گڑیا کے ساتھ اس کونے کی طرف چل پڑا۔ جہاں وہ رہتی تھی۔ وہاں اس کے پاس گڑیوں والا پلنگ تھا۔

گڑیا نے راجہ گڈّے کو لٹا کر اڑھا دیا۔

"آپ کپڑے اتار دیجیے اور مسہری پر گرم شال اچھی طرح لپیٹ لیجیے

میں آپ کے لیے پینے کی کوئی گرم چیز لاتی ہوں۔ آپ بُری طرح بھیگ گئے ہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں

میں آپ کی دیکھ بھال کروں گی۔"

راجہ گڈّے کو نرم نرم گڑیوں کے بستر اور گرم شال سے بہت آرام ملا۔ گڑیا کی دیکھ بھال اور گرم گرم چائے سے بہت مزا آیا۔

"تم نے چابی والے چوہے کو رات کا سلام لیتے ہوئے جیسے پیار کیا تھا اس طرح کیا مجھے پیار نہ کروگی؟" راجہ گڈّے نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ کس قدر گھمنڈی اور بدمزاج تھا۔ گڑیا نے اس کو پیار کیا اور اسے اچھی طرح سے شال اڑھادی۔

گڑیا نے دوسرے کھلونوں سے کہا "اچھا اب تم لوگ جاؤ۔ چپ چاپ جاکر کھیلو۔ ان کو سونے دو۔ میرے خیال میں ان کو بڑی طرح سردی لگ گئی ہے۔"

کھلونوں نے وہی کیا جو ان سے کہا گیا "کیا کالے بالوں والی گڑیا سب سے اچھی نہیں ہے؟" جھکنے والے بھالو نے چوہے کے کان میں کہا۔ "اب میں اسی کے سامنے جھکوں گا۔"

ننھی گڑیا نے بادشاہ کے کپڑے سکھائے۔ ان کی مرمت کی۔ بادشاہ کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ بادشاہ کو ایسا لگا جیسے اب تک اس نے جو کھلونے دیکھے ان میں وہ گڑیا سب سے اچھی، سب سے زیادہ نیک ہو۔ اس کو یہ سوچ کر شرم آئی کہ وہ خود زبردستی بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے گڑیا سے کہا تھا کہ وہ رانی بننے کے قابل نہیں۔

یوں وہ سچ مچ کی رانی نہیں۔ مگر ہم سب کے دلوں کی رانی تو ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اتنا اچھا بادشاہ نہیں جتنی اچھی یہ رانی ہے۔

جب وہ اچھا ہوکر اٹھا تو اس نے اپنا تاج ڈھونڈ نکالا۔ مگر اس نے یہ تاج پہنا نہیں۔

تم لوگ پوچھو اس نے اس تاج کا کیا کیا۔ وہ کالے بالوں والی گڑیا کو ڈھونڈھنے نکلا اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہوکر کہنے لگا۔

"میں اچھا بادشاہ نہیں ہوں۔ تم بہت اچھی رانی ہو۔ ہمارے دلوں کی رانی، میرے بھی دل کی۔ تم اچھی اور نیک ہو۔ مہربانی کرکے یہ تاج سر پہ رکھ لو۔"

اس بات پر سب کھلونوں نے گڑیا کو مبارک باد دی۔ سپاہیوں نے خوشی میں خوب شور مچایا۔ ننھی گڑیا کا چہرہ مارے شرم کے لال ہوگیا۔

"میرے دوست تاج میرے لیے مناسب نہیں۔" لیکن راجہ گڈّے نے تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ وہ تاج پہن کر بہت پیاری معلوم ہونے لگی۔

"میں اس تاج کو صرف اتوار کو پہنا کروں گی۔ پورے ہفتے میں گڑیا رہوں گی۔ تم سب کی دیکھ بھال کروں گی۔ اتوار اتوار تم سب کی رانی بھی بن جایا کروں گی۔"

اب بھی وہ ننھی گڑیا اسی طرح ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس کو دیکھو وہ سچ مچ بہت بھلی لگتی ہے۔

---

★ زیادہ گوئی خواہ وہ اچھی باتیں ہوں ضعفِ عقل کی دلیل ہے۔ (حکیم ارسطاطالیس)

★ دُنیا کی مصیبتوں کا آدھا حصّہ زبان کی پیداوار ہے اور اس کا ماخذ خود پرخوری اور زیادہ گوئی ہے (حکیم بزرجمہر)

★ عورت کا دل سمندر کی سطح کی مانند ہے۔ بظاہر خاموش لیکن گہرائیوں میں طوفان برپا۔ (حکیم ارسطاطالیس)

بشیرالدین شیرکوٹی

کیفؔ احمد صدیقی ایم۔اے

# اُردو اور ہم

آج اُردو کی جو یہ حالت ہے — اس کا باعث خود اپنی غفلت ہے
اس کو غیروں سے کچھ نہیں شکوہ — صرف اپنوں سے ہی شکایت ہے
باعمل ہو کے کچھ نہیں کرتے — بس زبانی ہمیں محبت ہے
کیا کریں گے یہ کھوکھلے نعرے — ٹھوس اقدام کی ضرورت ہے
چند اشخاص کا ہی ذکر نہیں — قوم کی قوم محوِ غفلت ہے
اس طرح مانگتے ہیں اپنے حقوق — جیسے سب کی زباں میں لکنت ہے
درحقیقت بقائے اُردو کو — ایک تنظیم نو کی حاجت ہے
اس سے بھی فائدہ اُٹھانا ہے — آج سرکار کی جو نیت ہے
اُردو طلبہ وہاں بھی پہنچائیں — جن مدارس میں ان کی قلت ہے
اُردو ٹیچر کا انتظام کریں — جن سکولوں میں ان کی حاجت ہے
کتنی پیاری زبان ہے اپنی — یہ بھی کہنے کی کچھ ضرورت ہے
ساری دنیا کے منتخب الفاظ — خود میں ضم کرنا اس کی فطرت ہے
صرف عربی و فارسی ہی نہیں — سنسکرت سے بھی اس کو رغبت ہے
جس میں ہر رنگ کے کھلے ہیں پھول — یہ وہ گلدستۂ محبت ہے
سچ جو پوچھو تو سارے بھارت میں — ایک جہتی کی یہ علامت ہے
اس کی عظمت سے ہے وقارِ وطن — اس کی ذلت خود اپنی ذلت ہے

وہ بھی اُردو میں بات کرتے ہیں
کیفؔ اُردو سے جن کو نفرت ہے

جناب ناظم میواتی سہسرامی

# شیر نما انسان

دولت خاں بہت بڑا سوداگر تھا۔ وہ بہت بھلا مانس اور نیک آدمی تھا۔ شہر کے چھوٹے بڑے اور رئیس اور حکام بھی اس کی عزّت کرتے تھے۔ اس کی بیوی بہت پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ اُس کے گھر میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ لے دے کے تین لڑکیاں تھیں، سب کی سب ناز و نعمت کی پلی تھیں دو بڑی لڑکیاں تو ہل کر ایک کام بھی کرنا نہیں جانتی تھیں۔ ادھر خاں صاحب نے پکارا۔

"ارے، ہے کوئی گھر میں؟ ذرا ایک گلاس پانی تو لانا۔"

بڑی نے کہا۔

"ارے، او کلوٹی! میں تو اٹھنے سے رہی۔ جاؤ بھئی جاؤ۔ ذرا تم ہی ابّا کو پانی پلا آؤ۔"

اور منجھلی نے سُنا تو چیخ اٹھی۔

"اری او اشرفی! سنتی نہیں کیا؟ ابا کو پانی پلانے بھی میں ہی جاؤں گی تو آخر تو کس دن کے لیے ہے؟ جا، انہیں پانی پلا آ۔"

اور اگر چھوٹی بچی حسن آرا نے کسی کو پانی لے جاتے کہیں دیکھ لیا تو جھٹ پوچھ بیٹھی۔

"اری او بی گلابو! یہ پانی کہاں لے جا رہی ہو؟ ذرا میں بھی تو جانوں۔"

اور جب یہ معلوم ہو جاتا کہ ابا حضور کے لیے ہے تو بس جھپٹ ہی پڑتی۔

"اری، تو لاؤ، گلاس ادھر لاؤ، پانی میں لے جاؤں گی یہ میرا فرض ہے۔ میرے ہوتے تم کیوں ابّا حضور کی کوئی خدمت کرو۔!"

اجی حضرت یہ تو ابّا حضور کی بات ہے نا! یہاں تو اگر کسی ماما کو کام میں ذرا پریشان دیکھتی تو جھٹ اس کے پاس پہنچ جاتی اور کہتی۔

"اری او میدامی! معلوم ہوتا ہے تم بہت تھک گئی ہو، لاؤ تمھارا کام میں کئے دیتی ہوں، تم تھوڑا آرام کر لو۔"

یہ تو رہی سیرت کی بات۔ صورت میں بھی وہ بچّی ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک تھی۔ کوئی دیکھے تو کہے کہ پرستان سے کوئی پری پر کتر واکر آ بیٹھی ہے یا جنت سے کوئی حور اتر آئی ہے۔ اسکی خوبیوں کو دیکھ کر کہنے والے کہتے کہ یہ لڑکی جس گھر میں جائے گی اُسے جنّت بنا دے گی۔ اور بھئی ان دو بڑی لڑکیوں کو دیکھ کر تو لوگ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ان میں نہ تو کوئی سیرت ہے نہ صورت۔ یہ دیو نیاں جس گھر میں جائیں گی اسے اُجاڑ کر رکھ دیں گی یا جہنم بنا دیں گی۔

خدا کی مرضی اور مصلحت! اس میں کسی کا چارہ نہیں ــــ خاں صاحب کی مالی حالت دیکھتے دیکھتے بگڑتی ہی چلی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنے باغ میں ہی کچھ محنت و مشقت کا کام کر کے دن کاٹ لیا کرتے۔ اس شہر میں انھوں نے بڑی شان و شوکت سے

زندگی بسر کی تھی اس لیے یہاں لوگوں کی آنکھوں میں محنت مزدوری کا کام کرنا گوارا نہ تھا ۔ لیکن آخر کرتے بھی تو کیا؟ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

ایک رات خواب میں کسی کو یہ کہتے سنا کہ اگر تم راز نگر جاؤ ۔ تو بہت ممکن ہے کہ کوئی اچھی صورت نکل آئے پھر کیا تھا ۔ صبح سویرے اٹھ کر رات کا خواب لڑکیوں کو سنایا اور سفر کا ارادہ ظاہر کیا ۔

سفر کا سامان ٹھیک کر کے لڑکیوں کی دلجوئی کے لیے ان کی فرمائش کے بارے میں بھی پوچھ لیا تاکہ واپسی میں لیتے آئیں ۔ دو بڑی لڑکیوں نے تو ایک سے ایک قیمتی فرمائش کی لیکن حسن آرا نے صرف ایک گلاب کا پھول مانگا سوچا کہ نہ معلوم سفر میں باپ کے سر کیا کچھ گذر جائے ۔ ایسی فرمائش کیوں کی جائے جس کے حاصل کرنے میں پریشانی اور واپسی میں رکاوٹ ہو ۔ فرمائش معمولی ہو گی تو واپسی بھی جلد ہو گی اور آسان ہو گی

راز نگر پہنچ کر پہلے تو دولت خاں نے محنت مزدوری کی ۔ مگر سوداگری کا چسکا پہلے ہی لگ چکا تھا اس لیے ہاتھ میں کچھ پیسے آتے ہی تجارت میں لگ گئے ۔ محنت اور ایمانداری ان کا شیوہ تھا اس لیے کاروبار میں بھی بہت فائدہ ہوا ۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں کافی سرمایہ پیدا کر لیا ۔ لڑکیوں کا خیال آیا تو ان کی فرمائشیں بھی مہیا کر لیں اور گھر کی راہ لی ۔

خاں صاحب جس راستے سے واپس ہو رہے تھے اس راستے میں بہت گھنا اور خطرناک جنگل پڑتا تھا ۔ چلتے چلتے بے چارے راستہ بھول گئے ۔ ہزار کوشش کی لیکن راہ نظر نہ آئی ۔ ہر طرف دوڑ دھوپ کر کے تھک گئے شام ہو چلی تھی ۔ ایک اونچے درخت کے تنے پر بیٹھ کر رات گذارنے گئے ۔

تھوڑی رات گئے پھننگ پر نظر گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک غیر معمولی روشنی ہے جو ان کی طرف بڑھ رہی ہے ۔ اس روشنی میں انہیں سب کچھ دکھائی دینے لگا ۔ وہ درخت سے اتر آئے روشنی نہ صرف یہ کہ ساتھ ساتھ رہی بلکہ راستہ دکھانے لگی ۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے ۔

کچھ دور جا کر ایک نہایت عالی شان محل دکھائی دیا ۔ اس کا دروازہ کھلا تھا اسی روشنی کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئے سامنے ایک وسیع کمرے میں نہایت ہی عمدہ اور لذیذ قسم کے کھانے میز پر چنے تھے ۔ بھوک زیادہ تھی ۔ برداشت نہ کر سکے ۔ پھر پیٹ کھا لیا ۔ تو ملحق ہی میں ایک کمرہ دکھائی دیا جس میں نہایت آرام دہ بستر لگا تھا ۔ وہاں آرام کرنے بیٹھے تو نیند آ گئی اور ایسا سوئے کہ پھر صبح سویرے ہی آنکھ کھلی ۔

سامنے باغ تھا ٹہلنے گئے تو گلاب کا ایک تختہ یہاں سے وہاں تک لہلہا رہا تھا اسے دیکھتے ہی حسن آرا کی فرمائش یاد آ گئی ۔ دل میں آیا کیوں نہ ایک پھول حسن آرا کے لیے رکھ ہی لوں ۔

ہاتھ بڑھا کر جیوں ہی ایک پھول توڑا گرجتا ہوا ایک شیر نما انسان نمودار ہوا ۔ اس کا سر اور منہ تو شیر کا تھا مگر باقی جسم آدمی کا ـــــ اور وہ یوں حملہ آور ہوا کہ بیچارے دولت خاں ڈر گئے اور تھر تھر کانپنے لگے ۔

انھوں نے اپنی چھوٹی بچی حسن آرا کی فرمائش کا تذکرہ کر کے اپنے دل کی مجبوری بیان کی اور لاکھ معذرت چاہی لیکن اس نے ایک نہ سنی بلکہ معاف کرنے سے صاف انکار کر دیا ۔

ہاں اتنا ضرور کہا کہ اگر تم میری یہ شرط منظور کرو

گھر پہنچ کر سب سے پہلے جس شخص پر تمہاری نظر پڑے
اسے تم اپنے بدلے یہاں لے آؤ گے تو البتہ میں تمہیں
معاف کرنے کی سوچ سکتا ہوں ۔ دولت خاں نے سوچا
کہ چلو اس طرح اپنوں سے ملاقات تو ہو جائے گی لہذا
بادلِ نخواستہ یہ شرط منظور کر لی اور کسی طرح جان لے کر
بیٹیوں سے ملنے کے لیے روانہ ہوئے ۔

ادھر حسن آرا کا یہ حال تھا کہ وہ روزانہ گھنٹوں
دروازے سے لگی باپ کی راہ دیکھا کرتی اتفاق کی بات
جب وہ گھر پہنچے تو سب سے پہلے ان کی نظر جس پر پڑی وہ
حسن آرا تھی۔ حسن آرا ایک فرماں بردار اور نیک سیرت لڑکی
تھی اس لیے وہ اسے جان سے عزیز رکھتے تھے ۔ نہیں
چاہتے تھے کہ اس کی جان جوکھم میں پڑے ۔ اس لیے دل
کی آگ دل میں لیے خاموش رہے ۔

ہمارے تمہارے چاہے کچھ ہونے کا نہیں، وہی ہوتا
ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ۔ ایک دن سفر کے حالات بیان
کرتے کرتے شیر نما انسان کا ذکر بھی چھڑ گیا اور خاں صاحب
کو یہ بھی بتانا پڑا کہ اس سے کیوں کر نجات پا سکے یہ بات
معلوم کر کے حسن آرا نے خود ہی کہہ دیا ۔

" غالباً گھر پہنچ کر آپ کی نظر سب سے پہلے مجھ ہی
پر پڑی ہے ۔"

باپ سے انکار کرتے نہ بنا لیکن اقرار کی بھی ہمت
نہ ہوئی۔ حسن آرا بات سمجھ گئی باپ کا معاہدہ پورا
کرنے کے لیے تیار ہو گئی اس نے باپ سے خود کہا ۔

" آپ اپنا معاہدہ پورا کیجیے ۔ میرے بارے میں
کچھ نہ سوچیے ۔ مجھے میرے خدا کے نام پر چھوڑ دیجیے
میری حفاظت وہی کرے گا ۔ میرے سر جو آفت بھی آئے
گی میں اسے بخوشی جھیل لوں گی ۔ لیکن معاہدہ توڑنے
والے باپ کی بیٹی کہلانا پسند نہ کروں گی ۔"

دولت خاں نے بھی مشیت کے آگے اپنا سر جھکا دیا
اور بادلِ ناخواستہ حسن آرا کو ساتھ لے کر شیر نما انسان
کی خدمت میں پہنچ گئے ۔ وہ باپ بیٹی کو دیکھ کر خوش
ہو گیا ۔ اس نے دونوں کی شرافت اور معاہدہ پرستی
کی تعریف کی ۔

حسن آرا اسے دیکھ کر پہلے تو خوف زدہ ہوئی ۔
لیکن جب شیر نما انسان نے یہ بتایا کہ وہ اس کا دشمن نہیں
دوست ہے بلکہ نگہبان بن کر رہے گا اسے کسی قسم کی تکلیف
نہیں پہنچنے دے گا اور وہ یہاں بہت آرام سے رہے گی
تو اسے اطمینان ہو گیا ۔ چند ہفتہ کے بعد زندگی معمول پر
آ گئی تو اس نے باپ کو بھی رخصت کر دیا

واقعی یہاں حسن آرا کو کوئی تکلیف نہیں تھی عیش و
آرام کا سارا سامان مہیا تھا کسی طرح کی کوئی کمی نہ تھی
ایک دن شیر نما انسان نے حسن آرا سے شادی کی پیش کش
کی ۔ لیکن اس نے اس پیش کش کو بلا خوف ٹھکرا دیا تو پھر
اس نے کبھی بھی اس کا تذکرہ نہ کیا ۔

شیر نما انسان نے حسن آرا کو ایک جادو نما رومال
دے رکھا تھا جس میں وہ وہیں سے بیٹھی بیٹھی جو چاہے
دیکھ سکتی تھی ۔ ایک دن اس نے اس رومال میں اپنے
باپ کو دیکھا کہ وہ سخت بیمار ہیں ۔ وہ گھبرا گئی اور بہت
پریشان ہوئی ۔ اس نے شیر نما انسان سے اپنے باپ
کا حال بیان کر کے گھر جانے کی اجازت مانگی ۔ شیر نما
انسان نے مشکل سے ایک ہفتہ کی اجازت دی اور
کہا کہ " دیکھو وقت پر چلی آنا ورنہ میں مر جاؤں گا"

حسن آرا گھر آئی تو خوشی کا نقارہ بجا ۔ سارا
گھر گلزار ہو گیا ۔ لوگ خوش خوش نظر آنے لگے ۔

دولت خاں بھی بیٹی کو دیکھ کر مارے خوشی کے بہت جلد
اچھے ہو گئے پھر کیا تھا گویا ہر روز روزِ عید اور ہر شب
شبِ برات!

خوشی کے اس ہنگامے میں حسن آرا کو کچھ پتہ بھی
نہ چلا اور ہفتہ بھی گذر گیا۔ شیر نما انسان کا تو خیال تک
نہ آیا۔ اس نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ شیر نما انسان
سخت بیمار ہے۔ آنکھ کھلتے ہی اسے اپنے وعدہ کا خیال
آیا۔ دوسرے روز بادلِ ناخواستہ اپنا وعدہ پورا کرنے
کے لیے شیر نما انسان کے پاس جانے کے لیے روانہ ہو گئی
وہاں پہنچ کر کیا دیکھتی ہے کہ واقعی وہ بے ہوشی کے
عالم میں پڑا ہے۔ اس کے منہ پر پانی چھڑکا تو ہوش
آیا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ جس دن وہ یہاں
سے گئی ہے اسی دن سے اس نے اس کی جدائی کے غم میں
کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ اس کے بغیر زندہ بھی
نہیں رہنا چاہتا۔

حسن آرا کو اس کی محبت اور وفاداری کا اعتبار
ہو گیا۔ خوش ہو کر اس نے شادی کا اقرار کر لیا۔ پھر
کیا تھا۔ اسی دم ایک پری مادرِ مہربان بن کر ظاہر
ہوئی۔ اس نے مبارک باد دی۔ شیر نما انسان پر
ایک چلو طلسماتی پانی چھڑکا اور دیکھتے دیکھتے وہ
شیر نما انسان ایک خوش رو نوجوان ہو گیا۔

کسی نے کہا یہ ہے راز نگر کا شہزادہ۔ جس کے
باپ سے اس پری نے اپنی محبت کا بدلہ لیا۔ تو
بادشاہ اور ملکہ کو ختم کرنے کے علاوہ ساری سلطنت
تہ و بالا کر ڈالا اور شہزادہ کو جادو سے شیر نما
انسان بنا کر اپنے باغ کا پہرہ دار بنا لیا۔

وہ حسن آرا کے حسنِ سیرت سے اس قدر متاثر ہوئی
کر اسے اپنی بیٹی بنا لیا۔ اور حسن آرا نے شہزادے سے
شادی کا اقرار کیا تو شہزادے پر سے بھی اپنا جادو
ختم کر دیا۔

آج بھی راز نگر کی وہی سلطنت ہے۔ لیکن
اس کے تخت پر اب شیر نما انسان کا باپ نہیں
ہے بلکہ اس کا بیٹا اسد اللہ ہے اور اس سلطنت
کی ملکہ حسن آرا ہے۔

---

جناب ڈاکٹر ثروت حسین پی ایچ ڈی

# نمک کی قیمت

ایک دفعہ نوشیرواں عادل کے واسطے شکار کا گوشت
بھونا جا رہا تھا۔ اتفاق سے ان لوگوں کے پاس نمک نہ تھا۔
ایک غلام کو قریب کے گاؤں سے نمک لانے کے لیے بھیجا گیا۔
نوشیرواں نے اس غلام سے کہا "نمک کی قیمت ادا کی جائے
ورنہ اس طرح کی باتوں کا رواج ہو جانے سے یہ گاؤں
تباہ ہو جائے گا۔"

لوگوں نے کہا کہ آخر اتنی چھوٹی بات سے کیا
نقصان ہو سکتا ہے نوشیرواں نے جواب دیا۔

"ابتدا میں ظلم بہت تھوڑا تھا۔ لیکن بعد میں لوگوں
نے اس میں برابر اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ اب حالات اتنے
ابتر ہو گئے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنی کسی رعایا کے باغ
سے ایک سیب کھائے گا تو اس کے غلام پیڑ تک جڑ سے
اکھاڑ دیں گے۔ اگر بادشاہ پانچ انڈے زبردستی حاصل
کرے گا تو اس کی دیکھا دیکھی اس کی فوج کے سپاہی
ایک ہزار مرغوں کا خون کر دیں گے۔

وجیہہ ادیب (بچھراؤں)

# لاسلکی کا باوا آدم

آپ نے مارکونی کا نام تو سنا ہوگا۔ لوگ تو اسے لاسلکی کا باوا آدم کہتے ہیں۔ مارکونی نے ۲۵-اپریل ۱۸۷۴ء کو اٹلی کے ایک چھوٹے قصبے بلونا میں آنکھیں کھولیں۔ اپنے بچپن میں وہ بھی آپ کی طرح حاضر دماغ تھا بڑا نٹ کھٹ تھا۔ اس کا پورا نام "گوگلیمو مارکونی" تھا۔ اس کی تعلیم بھی خانگی طور پر "بلونا فلورنس" اور "لگہارن" میں ہوئی۔ کسی کالج یا اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔

اسے بچپن ہی سے بجلی کی سائنس کا بڑا شوق تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی اس کے دل و دماغ میں یہ بات نہ جانے کیسے جم گئی تھی کہ تار کے بغیر بھی صرف بجلی کی لہروں کے ذریعے آواز دُور تک بھیجی جا سکتی ہے

آپ سوچتے ہوں گے "یہ لاسلکی" آخر ہے کیا بلا؟

ریڈیو تو آپ روز سنتے ہیں۔ ریڈیو میں تقریریں اور گانے کی آوازیں لاسلکی ہی کے ذریعہ سے تو آتی ہیں۔ آپ کے والدین اور خود آپ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے خط و کتابت کرتے ہیں۔ مگر یہ خط ایک جگہ سے دوسری جگہ کافی دنوں میں پہنچ پاتا ہے اگر کوئی ضروری خبر ہو تو اسے کس طرح پہنچایا جائے۔

اس کے لیے ٹیلی گرافی یا تار کا استعمال ہوتا ہے۔ تار کے ذریعہ خبر چند سکنڈوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی

آپ نے مختلف جگہوں پر اور ریل کی لائن کے کنارے کنارے لوہے کے کھمبوں کا لامتناہی سلسلہ دیکھا ہوگا۔ ریل کے سفر میں اکثر انھیں شمار کرتے کرتے آپ تھک جاتے ہیں۔ مگر یہ ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔ ان کھمبوں پر جو تار ہیں وہ اسی تار برقی ہی کے تو ہیں۔ ان تاروں میں بجلی کی لہر دوڑائی جاتی ہے ایک جگہ کی بات دوسرے مقام پر اسی بجلی کی لہر کے ذریعے پہنچتی ہے۔ لوگ اس خبر کو تار برقی اور صرف تار بھی کہا کرتے ہیں اسی طرح بلا تار کی خبر دور دراز مقاموں تک پہنچائی جائے تو اسے لاسلکی کہتے ہیں۔

شاید آپ جانتے ہوں کہ ہمارے گھروں کے اوپر فضا میں بجلی کی بہت سی لہریں موجود ہیں جو قدرتی طور پر تمام ماحول میں ادھر اُدھر آیا جایا کرتی ہیں۔ انھی لہروں کے ذریعے بے تار کی خبریں بھیجی جاتی ہیں۔ اس کی مثال ریڈیو ہے۔ ریڈیو میں بغیر کسی تار کے دُور دُور کے ملکوں کی خبریں اور تقریریں اور طرح طرح کے گانے سنائی دیتے ہیں۔ اسی کو لاسلکی کہتے ہیں اور "مارکونی" اسی کا موجد ہے:-

اب آپ ذرا سوچیے کہ ہمارے اوپر اس کا کتنا احسان ہے آج ہم اس کی بدولت سارے جہان کی خبریں آن کی آن میں معلوم کر لیتے ہیں۔ "لاسلکی" سے ایک فائدہ اور بھی ہے "پہلے تار کے ذریعے خبر بھیجی جاتی تھی۔ تار زمین

پر تانا جاتا تھا۔ یا سمندر میں کوئی مستقل چیز ڈال کر اس میں لگا دیا جاتا تھا۔ لیکن ان چیزوں میں جو متحرک ہیں تار نہیں لگایا جا سکتا جیسے جہاز۔ پہلے اُن جہازوں کی جو سمندر میں دُور دُور سفر کرتے تھے کوئی خبر معلوم نہ ہو سکتی تھی لیکن اب "لاسلکی" کے ذریعہ چلتے جہازوں سے باتیں کی جا سکتی ہیں اور خطرے کے وقت اُن کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔

لوگوں کے دلوں میں پہلے بھی یہ خیال آتا رہا تھا کہ تار کے بغیر صرف بجلی کی لہروں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسرے مقام تک آواز سنائی جا سکتی ہے کچھ سائنس دانوں نے اس کا تھوڑا بہت تجربہ بھی کیا لیکن "مارکونی" سے پہلے اِس ترکیب سے کوئی شخص بھی کام نہ لے سکا تھا۔

۱۸۹۵ء میں اس نے اپنے گھر بے شمار تجربے کئے اور نامکمل بھدے اور معمولی اوزاروں سے ایک میل تک کی آوازیں سننے لگا ابتدا میں اس نے کچھ کھمبے گاڑ کر ان پر چند ٹین کے ڈبے نصب کر دیئے تھے انھی کی مدد سے وہ دن رات نئے نئے تجربے کیا کرتا تھا۔

اس بات کی خبر انگلستان کے محکمہ تار برقی کے چیف انجینیر "مسٹر ولیم پریس" کو ہوئی تو انھوں نے خاص طور پر مارکونی کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔

۱۸۹۶ء میں مارکونی وہاں گیا بڑی شان و شوکت سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکخانے کے بڑے بڑے افسروں کے سامنے اس نے اپنے تجربوں کی نمائش کی۔ ابتدا میں اس نے صرف چھ فٹ اونچائی کے کھمبے لگائے تھے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ کھمبے جتنے اونچے ہوں گے آواز اتنے ہی زیادہ فاصلے پر پہنچائی جا سکتی ہے۔ مگر بہت دور آواز پہنچانے کے لیے اتنے اونچے کھمبے نہیں گاڑے جا سکتے جو آسمان سے باتیں کریں اس کے لیے "مارکونی" نے کافی دنوں "سالسبری" کے میدان میں ایک تجربہ گاہ میں بہت سے تجربے کئے آخر کار وہ اپنی بے لوث کوششوں اور سچی لگن کے سبب اس میں بھی کامیاب ہو گیا۔ یعنی اُس نے یہ معلوم کر لیا کہ تمام فضا میں "ایتھر" بھرا پڑا ہے۔

جس طرح تالاب میں پتھر پھینکنے سے کافی تعداد میں دائرے سے بن جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جب ہم باتیں کرتے ہیں تو مُنہ سے نکلی ہوئی آواز فضا میں بھرے ہوئے "ایتھر" میں لہریں پیدا کر دیتی ہے۔

مارکونی نے سائنس کے ذریعے انھی "ایتھری" لہروں کو دُور تک پھیلانے اور پھر دوسری جگہ ان کو وصول کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح "مارکونی" کے تجربے کامیاب ثابت ہوئے اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں کافی مشہور ہو گیا۔ چنانچہ جب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کو (جو اس وقت ولیعہد تھے) ایک حادثہ پیش آیا اور وہ آب و ہوا بدلنے کے لیے سمندر کے ساحل پر چلے گئے اس وقت ملکہ وکٹوریہ نے حکم دیا کہ مارکونی لاسلکی کے ذریعہ میرے بیٹے کی خبر مجھ تک پہنچانے کا انتظام کرے۔ مارکونی خوشی سے پھولا نہ سمایا اس نے بڑی خوش اسلوبی سے حکم کی تعمیل کی اور کامیاب ہوا۔ اس واقعے کے بعد اس کی شہرت ملکوں ملکوں تک پہنچ گئی۔

شروع شروع میں مارکونی ایک کے بعد دو اور دو کے بعد چار اور پھر نو میل تک کی خبریں لانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن تھک کر کبھی نہ بیٹھا اپنی دھن میں لگا رہا۔

۱۹۰۲ء میں وہ چھ ہزار میل سے خبریں لے آیا۔ اور

باقی ص ۲۹ پر

جناب محمد خلیل الرحمٰن
(باقیات اسکول ویلور)

# ہنر سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی فردوسی کا شاہ نامہ اور سعدی کی گلستاں فارسی ادب کی مشہور کتابیں ہیں۔

حضرت سعدی نے اپنی کتاب گلستاں میں نہایت میٹھی زبان میں بہت پیارے اور نرم لہجے میں، بادشاہوں، وزیروں، درویشوں اور عام لوگوں کی باتیں بیان کی ہیں۔ فارسی جاننے والے بچے اور بوڑھے انھیں پڑھ پڑھ کر مزے لیتے ہیں اور ان حکایتوں سے نصیحت حاصل کرتے ہیں

ہماری خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے آج فنی تعلیم (TECHNICAL EDUCATION) کی اشد ضرورت بیان کی جاتی ہے۔ ہنر سیکھنے کی اہمیت کے پیش نظر سعدی نے ایک دانشمند کی کہانی کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

ایک دانشمند نے اپنے بچوں کو نصیحت کی کہ کوئی ہنر ضرور سیکھیں۔ اپنے مال و دولت پر اعتماد نہ کریں۔ دولت تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ دولت کو اکثر چور اور لٹیرے ہڑپ کر لیتے ہیں یا خود دولت مند ہی دولت کے نشے میں خوب گلچھرے اڑاتے ہیں اور آخر میں پیسے پیسے کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ ہنر ایک بہتا ہوا دھارا ہے جو زندگی کے کھیت کو سیراب کرکے سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔ ہنر ایک پائدار اور مستحکم دولت ہے — ہنرمند غریب بھی ہو جائے تو کچھ افسوس کا مقام نہیں۔ کیونکہ ہنر خود ایک لازوال دولت ہے ہنرمند کی ہر جگہ قدر و منزلت ہوتی ہے۔ مگر بے ہنر کو دولت کی بربادی کے بعد بھیک کا پیالہ لیے ہوئے در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ ★★

ابوالعاصم الملی

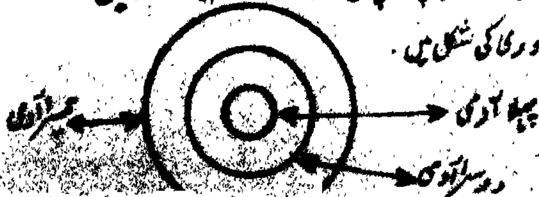
## بوجھو تو جانیں

(۱) ہرا دروازہ لال مکان اس میں بیٹھا کالا پٹھان
(۲) چار پیر چھپک کے بیٹھا؟
(۳) دو نگینے عجب نرالے ایک سفید اور ایک کالے؟
(۴) کٹورے میں کٹورا بیٹا باپ سے بھی گورا؟
(۵) تین آدمی ایک جگہ سے ایک ہی ساتھ سفر کرنا شروع کرتے ہیں اور ایک ساتھ کھاتے پیتے چلے جاتے ہیں تینوں ایک ہی ساتھ ایک جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن پہلا آدمی تین کوس چل کر پہنچا ہے اور دوسرا دو کوس اور تیسرا ایک کوس چل کر پہنچا ہے۔ بتاؤ وہ کس طرح چلے ہیں؟

اگر آپ کو اس کا جواب نہیں آئے تو اس کا جواب دیکھیے۔

جواب

(۱) تربوز (۲) چارپائی (۳) آنکھ (۴) ناریل۔
(۵) دوری کی شکل میں۔



جناب ایم اے۔ صدیقی

# آنکھوں کے کرشمے

کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ مختلف پرندوں کی آنکھوں کے رنگ مختلف کیوں ہوتے ہیں؟

ان کی آنکھوں کی بناوٹ کیوں مختلف ہوتی ہے؟ بلی کی آنکھوں میں تپلیاں گول نہیں ہوتیں لمبی ہوتی ہیں کیوں؟ مچھلیوں کی آنکھوں پر پلکیں کیوں نہیں ہوتیں؟ اسی طرح کے اور بھی بہت سے سوال ذہن میں آتے ہوں گے۔

علم حیوانیات کے ماہروں نے بڑی محنت سے ان سوالوں کے حل نکالے ہیں۔ اُن سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آنکھوں کی ان مختلف بناوٹوں میں کیا کیا مصلحتیں چھپی ہیں اور آپ کو پروردگار عالم کی حکمت کا بھی کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ آنکھیں نہ ہونے یا خراب ہو جانے سے ہم کو کس طرح کا نقصان ہوتا ہے؟

آپ نے سوچا ضرور ہوگا اور جواب شاید یہ ہو کہ آنکھیں نہ ہونے پر ہم یا کوئی آنکھ والا جاندار دیکھ نہیں سکتا۔ ایک طرح سے تو یہ جواب بالکل صحیح ہے مگر یہ بھی سوچیے کہ دکھائی دینا کیوں ضروری ہے۔

دیکھیے قدرت نے ہر چیز کے اندر اس کی بقا یعنی اس کی نسل کے زندہ رہنے کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ زندگی اور موت کی جنگ میں زندگی اس وقت تک ٹکی رہتی ہے جب تک جاندار کے اندر اپنی حفاظت کی پوری صلاحیت موجود رہتی ہے۔ انھی صلاحیتوں میں سب سے مقدم چیز قوت بینائی ہے یعنی دیکھنے کی طاقت۔

دیکھنے کی طاقت سے جاندار اپنی خوراک اور اپنے دشمن کا پتہ لگاتا ہے۔ خوراک سے قریب رہنا اور دشمن سے دور رہنا زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ جس طرح خوراک کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح دشمنوں کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ بیماری کے جراثیم بھی دشمن ہیں اور چور ڈاکو بھی دشمن ہیں۔ خوراک کی کمی یا خرابی بھی زندگی کے چھپے ہوئے دشمن ہیں۔ اور ماحول کی گندگی بھی زندگی کی چھپی ہوئی دشمن ان کے مقابلے میں آگ، اور زہر کھلے دشمن ہیں۔

آنکھ کی ساری قوت جاندار کو دشمن سے دور رکھنے اور خوراک سے قریب رکھنے میں خرچ ہوتی ہے اور بھی انسان کی آنکھیں تو اس طرح کی ہوتی ہیں کہ ان سے وہ ان دو کاموں کے علاوہ ذہنی اور جذباتی مسرت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ اس کے دماغ کی مخصوص بناوٹ ہے۔ آنکھیں براہ راست دماغ کے اندر بنے ہوئے مختلف دفتروں یا انجنوں کے تاروں سے جڑی ہوتی ہیں۔ یہ تار باریک نسوں کے ہوتے ہیں۔ اور جناب، ان کے دماغ تک بذریعہ ٹیلیگرام، پیغام رسانی کا کام ہوتا رہتا ہے۔ آنکھیں اگر بند کر لی جائیں یا نکال دی جائیں تو دماغ کا بہت سا کام اختیار کے لائق نہیں رہتا۔

دنیا میں آپ کو بہت سے ایسے جاندار ملیں گے

جن کے بظاہر (یعنی دیکھنے میں) تو آنکھیں نہیں ہوتیں مگر آنکھوں کا کام دینے والا آلہ اُن کے جسم میں موجود ہوتا ہے۔ قدرت نے تین طرح کی آنکھیں بنائی ہیں۔

(۱) وہ آنکھیں جو صرف روشنی میں دیکھ سکتی ہیں۔

(۲) جو صرف تاریکی (یا اندھیرے) میں دیکھ سکتی ہیں۔

(۳) جو روشنی اور تاریکی دونوں میں دیکھ سکتی ہیں۔

(۱) ایسے تمام جاندار جو اپنی خوراک کو اندھیرے میں حاصل نہیں کر سکتے وہ صرف روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔

(۲) ایسے تمام جاندار جو اپنی خوراک روشنی میں حاصل نہیں کر سکتے وہ صرف اندھیرے میں دیکھ سکتے ہیں۔

(۳) ایسے تمام جاندار جو اپنی خوراک روشنی اور اندھیرے دونوں میں حاصل کر سکتے ہیں اور جنھیں دونوں صورتوں میں اپنے دشمنوں سے خطرہ رہتا ہے وہ روشنی اور اندھیرے دونوں میں کم و بیش دیکھ سکتے ہیں۔

مختلف جانوروں میں روشنی اور اندھیرے کی کمی اور زیادتی ان کی آنکھوں کی بناوٹ کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ آدمی جتنے اندھیرے میں خود اپنی انگلیاں نہیں گن سکتا گھوڑے اتنی تاریکی میں آسانی سے پہاڑی پگڈنڈیوں پر سواری یا سامان لے کر منزلیں طے کرتے ہیں اور جب، جتنی روشنی میں چوہا ایک گز تک دیکھتا ہے بلی اس سے کئی گنا زیادہ دُور تک دیکھ لیتی ہے۔ اسی طرح بہت سے پرندے چاندنی راتوں میں بھی اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے گھونسلوں سے باہر پرواز کرتے ہیں اور بہت سارے چاندنی کی روشنی میں بھی کچھ نہیں دیکھ پاتے۔ جانداروں کی آنکھوں اور ان کی بناوٹ کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ مطالعہ ہے اس سے جانداروں سے متعلق بہت سارے وہم اور غلط خیالات جو دور ہو جاتے ہیں۔

آنکھوں کے سلسلے میں ایک اور بہت اہم بات اور یاد رکھنی چاہیے۔ انھیں چہرے پر کون سی جگہ ملی ہے۔ ہماری آنکھیں ناک کے دائیں اور بائیں ہوتی ہیں اور چوپایوں کی آنکھیں ان کے کانوں کے نیچے اور اس کے دائیں اور بائیں ہوتی ہیں۔ کیوں؟ چوپائے اس کی بدولت اپنے پیچھے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہم نہیں دیکھ سکتے یہی وجہ ہے کہ جانوروں کے گلوں کے چرواہے ہمیشہ جانوروں کے پیچھے چلا کرتے ہیں اور آگے جانے والے جانور اپنے مالک کی ہر حرکت کو بلا پیچھے مڑے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ کو ٹڈی یا تتلی پکڑتے وقت کیا کبھی حیرت نہیں ہوئی آپ تو بہت دبے پاؤں اس کے قریب گئے اور آپنے اپنی چٹکی اس کے پر یا اس کی دم کی جانب بڑھائی لیکن وہ ٹھیک اسی لمحہ اُڑ گئی اور آپ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب وہ پکڑ گئی اس کی وجہ ــــ؟

آپ نے تو یہ سمجھا کہ وہ بڑی چالاک تھی عالانکہ بات کچھ اور ہے۔ آپ نے بلب کی طرح باہر کو نکلی ہوئی اس کی آنکھیں تو دیکھی ہی ہوں گی۔ یہ باہر نکلا ہوا حصہ جو موٹے شیشہ کی طرح کا ہوتا ہے نہ ہی تو آپ کے عکس کو تتلی اور ٹڈی کے سامنے رکھ دیتا ہے اور وہ آپ کو اپنا دشمن سمجھ کر اڑ جاتی ہیں۔

بعض کیڑے مکوڑے یا پتنگے جنھیں آپ آسانی سے پکڑ کر تماشا بنا لیتے ہیں وہ بے چارے اپنی بے وقوفی کی وجہ سے آپ کے ہاتھ نہیں آتے ان بے چاروں کی آنکھیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں آپ کے آنے کی اطلاع نہیں ہو پاتی آپ ان جانوروں یا پرندوں کو ٹارچ کی تیز روشنی میں با آسانی پکڑ سکتے ہیں جنھیں دن میں کم دکھائی دیتا ہے۔ لیکن آپ خود اندھیرے میں چلنے پھرنے سے

ڈرتے ہیں اس لیے آپ کو صرف روشنی میں ہی دکھائی دیتا ہے۔

ہمیں روشنی میں کیوں کر دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے اندھیری رات میں بلی یا بکری یا پھر بلی کی شعلے کی طرح چمکتی آنکھیں ضرور دیکھی ہوں گی۔ ان آنکھوں میں یہ چمک اس چمکیلے مادے کی ہوتی ہے جو آنکھوں کی نچلی سطح پر چپکا ہوتا ہے اس مادے میں بہت چھوٹے چھوٹے سیل ہوتے ہیں یہ سیل بہت معمولی سی روشنی کو کئی گناہ بڑھا دیتے ہیں اور پھر ایسی آنکھیں رکھنے والا جاندار اسی روشنی میں دور تک دیکھ لیتا ہے۔

آج میں آپ کو ایک ایسی بات بتاؤں جو شاید آپ نے کبھی سوچی ہو نہ سنی ہو۔ ہمیں بھی جب یہ بات معلوم ہوئی تو کچھ دیر سوچنا پڑا کہ واقعی حقیقت تو یہی ہے۔ وہ بات کیا ہے؟ دیکھیے آنکھوں سے ہم دنیا کی کوئی چیز نہیں دیکھتے نہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہے نا حیرانی کی بات! اور کتنی کس قدر غلط معلوم ہوتی ہے یہ بات! بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سب چیزیں تو ہیں بلکہ یہ کہنا بالکل درست ہوگا ہم چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتے۔

لیکن میاں وہ پہلی والی بات ہی درست نکلی۔ آپ پوچھیں گے کیسے؟ اور پھر یہ بھی تو پوچھیں گے کہ جب ہم چیزیں نہیں دیکھتے تو پھر کیا دیکھتے ہیں؟ اس کا بہت مختصر جواب تو یہ ہے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ صرف رنگ ہوتا ہے۔ اور یہی رنگوں کی تیزی اور پھیکا پن ایک دوسرے سے ملکر ہمارے سامنے چیزوں کی شکل پیش کرتے ہیں۔

اب ایک بہت پیچیدہ سوال کا حل بھی مِل گیا۔ تم پوچھوگے وہ کون سا سوال ہے!

آپ کو ہوا کیوں نہیں دکھائی دیتی؟ آواز کیوں نہیں دکھائی دیتی؟ آگ دکھائی دیتی ہے گرمی کیوں نہیں دکھائی دیتی؟ برف دکھائی دیتی ہے ٹھنڈک نہیں دکھائی دیتی؟ پھول نظر آتے ہیں خوشبو نظر نہیں آتی؟ کتنے اہم سوال ہیں یہ! مگر ان سب کا جواب تو پہلے ہی مِل چکا ہے۔ یعنی ہم کسی ایسی چیز کو نہیں دیکھ سکتے جس کا کوئی رنگ نہ ہو۔

آسمان کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک بے رنگ وسعت کا نام ہے۔ اس لیے ہم کو آج تک اس کی لمبائی چوڑائی یا اونچائی کا کوئی علم نہیں ہے بالکل اسی طرح پانی کا بھی کوئی رنگ نہیں ہوتا پانی اپنے ماحول کے رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ کسی بے رنگ بوتل میں صاف پانی بھر دیجیے اس کا کاگ بند کر دیجیے۔ پھر دیکھیے آپ کو یہ پتا چلانا ناممکن ہے کہ بوتل خالی ہے یا بھری۔ تو اب یہ راز کی بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ صرف رنگ کی آنکھوں میں بھی جو عکس آتے ہیں وہ صرف ہلکے اور گاڑھے سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں۔

اب غور کیجیے کہ اگر دنیا میں رنگ نہ ہوتا تو کیا ہمارے لیے کوئی چیز دیکھنے کی بھی ہوتی۔ یا اگر آنکھوں میں رنگوں میں فرق کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ مردہ ہو جائے تو پھر آنکھوں والے اور اندھے میں کوئی فرق رہے گا۔

ہماری دنیا میں ایسے بھی جاندار ہیں جو رنگوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ مثلاً بلیاں، کتے اور گھوڑے رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ کچھ جاندار صرف سفید اور کالے کا فرق جانتے ہیں۔ ان کی آنکھیں کیمرے کی آنکھ کی طرح ہوتی ہیں۔ جس طرح کیمرا صرف سفید اور سیاہ رنگوں کو قبول کرتا ہے۔

اسی طرح کچھ چڑیاں، کیڑے مکوڑے، چھپکلیاں، بندر اور کچھ مچھلیاں بھی سفید اور سیاہ رنگوں کا علم رکھتی ہیں۔ جس طرح کیمرا رنگوں کو ان کی تیزی اور ہلکے پن کے حساب سے سیاہی میں بدل دیتا ہے اسی طرح ان جانداروں

اب آپ شاید یہ سوال کر بیٹھیں کہ وہ کون سے جاندار ہیں جو بظاہر آنکھیں نہیں رکھتے مگر آنکھ کا کام کرنے والی دوسری مشین ان کے پاس موجود ہوتی ہیں؟ آپ نے برسات میں زمین پر رینگتے ہوئے کینچوے ضرور دیکھے ہوں گے۔ باورچی خانوں میں اور تاریک گندے گھروں میں لکروچوں کے جھنڈ ضرور دیکھے ہوں گے ان دونوں کے آنکھیں نہیں ہوتیں۔

کینچوے کی جلد کی تہوں میں باریک باریک رنگین نقطے ہوتے ہیں جو اسے صرف روشنی اور اندھیرے کی خبر دیتے ہیں۔ لکروچ کے سر پر لمبی چھڑیاں سی ہوتی ہیں ٹرانسسٹر کے ایریل کی طرح، یہ مہک کی لہروں کو پکڑ کر گرد و پیش کی خبر دیتی ہیں۔ وہ ناپسندیدہ مہک کی خبر پاکر فوراً بھاگنے لگتا ہے۔ جن چیزوں سے بو نہیں آتی وہ ان پر اپنی ان لمبی چھڑیوں کو مار کر برقی رو پیدا کرکے خبر حاصل کرتا ہے۔ اس طرح کے جانداروں کو شکل، رنگ، اور جسامت، کا علم نہیں ہوتا اسی لیے یہ اپنے تحفظ کے لیے یہ تاریک گوشوں میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔

دوڑتے اور اڑنے والے جانداروں میں جو جتنا تیز دوڑتا یا اڑتا ہے اسے اتنا ہی صاف اور دور تک دکھائی دیتا ہے بہت تیز اڑنے والے پتنگے سورج کی کرنوں کی حرکت کو دیکھ لیتے ہیں جب کہ ہم بالکل انھیں نہیں دیکھ پاتے۔ بعض پرندے مثلاً کبوتر سورج کی طرف دیکھ کر وقت کا صحیح اندازہ کر لیتے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ بہت بلندی پر پرواز کرتے ہوئے زمین پر فاصلوں کا بہت صحیح اندازہ کر لیتے ہیں۔ آج بھی دور افتادہ مقامات پر یا دشوار گذار آبادیوں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کبوتروں سے لیا جاتا ہے۔ کبوتر اس کام کو بخوبی انجام دیتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغ میں ایسے کل پرزے ضرور ہیں جو وقت اور فاصلوں کی صحیح پیمائش کر سکتے ہیں۔

بہت سے جاندار پانی کے اندر آدمی سے کہیں زیادہ اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ مثلاً سمندری عقاب اور بلاؤ پن ڈبیاں پانی میں غوطہ لگا کر مچھلیاں پکڑ لاتی ہیں۔ اور جناب ہم ان مچھلیوں کو دیکھ بھی نہیں پاتے۔ بالکل اسی طرح بہت سے جاندار پانی کے اندر سے باہر کی جانب بہت اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ مثلاً ٹراوٹ مچھلی بہت ہلکی روشنی میں بھی پانی کی سطح سے اوپر اڑنے والے پتنگیں کو جست لگا کر ہڑپ کر لیتی ہے۔ تیر انداز مچھلیاں جو نہی پانی کے اوپر اڑتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو دیکھ لیتی ہیں اپنے منہ سے پانی کی ایک تیز دھار پھینک کر انھیں نیچے گرا لیتی ہیں اور پھر انھیں کھا جاتی ہیں۔

جنوبی امریکہ کی کچھ ندیوں میں چار آنکھوں والی مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں ان کی آنکھیں دو حصّوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ نیچے کے آدھے حصّہ سے وہ پانی کے اندر دیکھتی رہتی ہیں اور اوپر کے حصّوں سے پانی سے اوپر کی چیزوں کو دیکھتی ہیں۔

گہرے سمندروں میں رہنے والی بعض مچھلیوں کی آنکھیں ان کے جسمانی تناسب سے کہیں بڑی ہوتی ہیں ان کی مدد سے وہ سمندر کی اتھاہ گہرائی میں (جہاں سورج کی کرنیں کبھی نہیں پہنچتیں) دیکھ لیتی ہیں۔ ان مچھلیوں کے جسم پر چھوٹے چھوٹے بلب لگے ہوتے ہیں ان سے جو روشنی نکلتی ہے وہ خوراک اور ان کے جوڑوں کو ان تک کھینچ لاتی ہے اپنی بڑی آنکھ سے یہ صرف روشنی کی لکیروں کو دیکھ سکتی ہیں۔

دریائے گنگا میں پائی جانے والی ڈالفن مچھلی کے آنکھیں نہیں ہوتیں۔ لیکن اس کی دم کا ابھرا ہوا ایک حصّہ اپنا ندر ریڈیائی نظام پوشیدہ رکھتا ہے جو ریڈیو کی طرح

پانی اور روشنی کی لہروں کے فرق کو مچھلی کے دماغ تک پہنچاتا ہے اور اسی نظام کے ذریعے اسے اپنے دشمنوں اور اپنی خوراک کی خبر ملتی رہتی ہے۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں پائی جانے والی کیورمی (KIWI) چڑیا پرندوں میں سب سے کمزور آنکھیں رکھتی ہے۔ لیکن اس کمی کو اس کی سونگھنے کی قوت پورا کر دیتی ہے۔

ریگستان کے جہاز یعنی اونٹ سے آپ اچھی طرح واقف ہوں گے آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اس کی آنکھوں پر ایک کی جگہ دو پلکیں ہوتی ہیں، اچھا بتائیے ایسا کیوں ہے؟ ایسا قدرت نے اس لیے کیا ہے کہ ریگستان میں تیز و تند ہوائیں چلنے لگتی ہیں تو ہر طرف بالو ہی بالو ہوتا ہے۔ ایسے میں آنکھوں کی حفاظت کے لیے جو پلکیں بنی ہوتی ہیں انھیں اونٹ بند کر لیتا ہے اور آنکھ گرد و غبار سے محفوظ رہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی رہنمائی بھی کرتی رہتی ہے۔

یہ عمل ہم آپ بھی کرتے ہیں۔ جب گرد سے بھری ہوئی بہت تیز ہوا میں چلنا پڑتا ہے تو بچے، بڑے سبھی آنکھوں پر رومال ڈال لیتے ہیں یا کبھی کچھ نہ ہو تو دامن ہی اٹھا کر چہرے پر ڈال لیتے ہیں تاکہ آنکھیں گرد سے محفوظ بھی رہیں اور راستہ بھی دکھائی دیتا رہے

جانور اپنی آنکھوں سے کتنی ہوشیاری سے کام لیتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو اس واقعے سے ہوگا جس کا ذکر میں ابھی کروں گا۔ کوئی ساٹھ سال پہلے جرمنی کے ایک شخص ایڈل برگ نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کا گھوڑا ریاضی کے سوالات حل کر سکتا ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کے سامنے اپنے گھوڑے کا کرتب دکھایا۔ مشکل سے مشکل سوال دیے گئے گھوڑے نے انھیں حل کر دیا۔ لیکن جب ایڈل برگ کمرہ سے باہر چلا گیا تو وہی گھوڑا معمولی سے معمولی سوال بھی حل نہ کر پایا۔ پتہ چلا کہ گھوڑا اپنے مالک کے چہرے پر پیدا ہونے والے آثار یعنی اس کی آنکھوں کی حرکتوں کو دیکھ کر سوالات حل کیا کرتا تھا۔ اس کا مالک جب زور سے سانس لے کر اپنا سینہ پھیلاتا تو گھوڑا (جیسا کہ ایڈل برگ نے اسے سکھا رکھا تھا) اپنا کام شروع کر دیتا اور جب وہ اپنے پیر پٹکتا تو گھوڑا، وہیں رک جاتا۔ لیکن تماشا دیکھنے والے اس عمل سے بالکل بے خبر رہتے اس لیے انھیں اس بات پر سخت حیرت ہوتی تھی۔

بالکل اسی طرح کا ایک تماشا ابھی چند ماہ قبل یہاں اُستادوں کے مدرسے میں ایک شخص نے اپنے کتے کے ذریعے پیش کیا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں کو یہی حیرت تھی کہ جانور ایسا دماغی عمل کیسے کر لیتے ہیں جو آدمی کے لیے بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ذرا یہ بھی تو سوچیے کہ جانور صرف ایک خاص طرح کی آواز پیدا کر پاتا ہے۔ مگر اسی آواز کے ذریعے وہ بہت سی اطلاعات اپنے ہم جنسوں تک پہنچاتا رہتا۔ یہ کام ہمارے لیے ناممکن ہے۔

جانور آواز کے اتار چڑھاؤ کے فرق کو جتنی اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں ہم انسان بالکل نہیں سمجھ پاتے۔ اسی طرح ان کی آنکھیں بھی ایسے باریک اور ہلکے اشاروں کو جو روشنی یا تاریکی میں ہوتے رہتے ہیں با آسانی سمجھتی ہیں۔ سننے اور دیکھنے کی اسی بے پناہ قوت نے بہت سے پرندوں اور چوپایوں کو ان کی نسل کی ابتدا سے آج تک بے پناہ خطروں اور بے شمار دشمنوں کے باوجود باقی رکھا ہے۔ خود انسان کے لیے بھی انھی قوتوں کا ہونا اس کی بقا اور ترقی کی ضمانت ہے

اندھے بہرے کا جو محاورہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی آنکھوں اور کانوں کی حفاظتی عمل کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا گفتگو کے علاوہ شعر و شاعری میں بھی ان قوتوں کا ذکر اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے زندگی کی تمام راحتوں کا دارومدار انھی پر ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

★★

# نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچّوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک جیسا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

۱۔ بالپو (حصّہ اوّل) مصنف: سی نری تاس مترجم: صالحہ عابد حسین
۲۔ بالپو (" دوم) " : " " : " "
۳۔ کشمیر مصنف ملا سنگھ مترجم: خدیجہ بیگم: تصویریں: پیارے نند
۴۔ پرندوں کی دنیا مصنف: جمال آرا مترجم: محمد شفیع الدین نیّر
۵۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر " : بریگیڈیر گیان سنگھ ": محمد ذاکر
۶۔ ہماری ندیوں کی کہانی " : لیلا مجمدار ": رضیہ سجاد ظہیر
۷۔ جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں " : لیلا بھاگوت ": " "
۸۔ رسیلی کہانیاں " : منوج داس ": صغرا مہدی
۹۔ آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل) " : وشنو پربھاکر ": انور کمال حسینی
۱۰۔ ہماری ریلیں " : جگ جیت سنگھ ": عرش ملسیانی
۱۱۔ ہندوستان میں غیر ملکی سیاح " : کے سی کھنہ تصاویر: کرشن کھنہ
۱۲۔ آؤ ناٹک کھیلیں " : اوما نند مترجم: رفیعہ منظور الامین
۱۳۔ خالہ بلی کا خاندان: منوہر داس چترویدی مترجم: محمد شفیع الدین نیّر
۱۴۔ بہت دن ہوئے (حصّہ اوّل) " : جوسی بی ام جوشی ": رضیہ سجاد ظہیر
۱۵۔ بہادروں کی کہانی مصنف: راجندر اوستھی مترجم: انور کمال حسینی
۱۶۔ روہنت و نندیہ " : کرشن چیتنیہ ": " "
۱۷۔ سدا بہار کہانیاں " : شانتا رنگاچاری ": " "
۱۸۔ ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی " : میر نجابت علی ": سیّد احسان
۱۹۔ " " (دوم) " : " " : " "
۲۰۔ بڑا پانی " : لیلا مجمدار ": صالحہ عابد حسین
۲۱۔ مورا " : ملک راج آنند ": انور کمال حسینی
۲۲۔ ہاکی کا کھیل " : سر وِیندر سانیال ": پریتم لال

## ذاکر حسین سیریز

۲۳۔ ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت: ۳/۰
۲۴۔ انوکھی دکان " : قدسیہ زیدی " : ۲/۵۰
۲۵۔ گلابو چوہیا اور پری زاد " : " " : ۲/-
۲۶۔ دنیا کے جانور " : " " : ۲/۵۰
۲۷۔ راجہ موہن رائے " : عرش ملسیانی (زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

جناب محبوب راہی

# قدم بڑھاؤ ساتھیو

قدم بڑھاؤ ساتھیو ، قدم بڑھاؤ ساتھیو
وطن کی عظمتوں کے آج گیت گاؤ ساتھیو... قدم بڑھاؤ ساتھیو

بڑھے گا جس قدر دلوں میں پیار اپنے دیس کا
بڑھے گا اس قدر ہی پھر وقار اپنے دیس کا
دلوں میں سب کے پیار دیس کا جگاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

زمانہ جان لے ہمیں وطن سے کتنا پیار ہے
وطن کے واسطے ہماری جان بھی نثار ہے
وطن کی راہ میں یہ زندگی لٹاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

وطن کی زندگی ہیں ہم، ہمیں وطن کی جان ہیں
وطن کی شان ہم ہمیں وطن کی آن بان ہیں
کبھی یہ بات اپنے دل سے مت بھلاؤ ساتھیو
قدم بڑھاؤ ساتھیو

بتاؤ کیا ہے فائدہ وطن کا اتحاد میں
کہ سب کا ہے مفاد اپنے دیس کی مفاد میں
سبھی کو اتحاد کا سبق سکھاؤ ساتھیو... قدم بڑھاؤ ساتھیو

محبت اور پیار سے زمانے بھر کو جیت لو
دلوں پہ سب کے اک وفاؤں کا تمھارے نقش ہو
سبھی کو اک خلوص سے گلے لگاؤ ساتھیو... قدم بڑھاؤ ساتھیو

جناب جمیل احمد قریشی

ہالینڈ میں چند دن

# امن کا محل

## PEACE PALACE

آپس کے جھگڑے کس طرح طے ہوتے ہیں؟ بچوں میں لڑائی ہوتی ہے تو والدین یا بڑے بھائی بہن صلح کرا دیتے ہیں۔ بڑوں میں لڑائی چھڑتی ہے تو محلے کے بڑے، گاؤں کی پنچایت، شہر کی عدالت، صوبہ کی بڑی عدالت "ہائی کورٹ" فیصلہ کراتے ہیں۔ بڑے جھگڑے ملک کی سب سے بڑی "عدالت سپریم کورٹ" طے کرتی ہے۔ اگر دو ملکوں کے درمیان اختلاف ہو تو کون طے کرتا ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے اس کے لیے بھی ایک باقاعدہ عدالت ہے۔ اس کو "انصاف کی بین الاقوامی عدالت" کہتے ہیں۔ جس عمارت میں یہ واقع ہے اس کو "امن کا محل" یا "امن کا مندر" کہا جاتا ہے آیئے آپ کو اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جنگ عظیم اوّل (پہلی بڑی لڑائی) کے بعد کا ذکر ہے۔ اس لڑائی میں دل ہلا دینے والی تباہی ہوئی تھی۔ چھوٹے بڑے بہت سے ملکوں کا بہت ہی زیادہ نقصان ہوا تھا۔ ایسے بہت سے لوگ تھے جنھوں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ یہ لوگ لڑائی کو بُری چیز سمجھتے تھے انھوں نے لڑائی کو ختم کرنے اور امن قائم کرنے کی کوشش شروع کی۔ انیسویں صدی میں دنیا کے لوگوں کی ایک بہت چھوٹے ملک کے چھوٹے سے شہر پر پڑیں جس کا نام "ہیگ" ہے۔ امن پسند قوموں کا خیال تھا

کہ یہ جگہ بہت مناسب ہے۔ یہ شہر "ہیگ" کسی کی طرف داری نہ کرنے والا دنیا کا دار الخلافہ (راجدھانی) بن سکتا ہے۔ یہاں دُنیا کی قومیں مل جُل کر بیٹھ سکتی ہیں۔ اپنے جھگڑے طے کر سکتی ہیں۔ جنگ ختم کرنے اور صلح کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اس خواب کی تعبیر میں ایک بہت خوبصورت عمارت تعمیر ہوئی جس کو دنیا "امن کے مندر" کے نام سے جانتی ہے۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک گاؤں میں ایک جولاہا رہتا تھا۔ اس کا نام ولیم کارنیگی تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے بڑے کا نام اندریو تھا۔ یہ خاندان پریشانیوں کی وجہ سے امریکہ منتقل ہو گیا تھا۔ بڑے لڑکے اندریو کارنیگی کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت شریف اور محنتی لڑکا تھا اس کو بچپن سے ہی لڑائی سے نفرت تھی بڑا ہو کر وہ امریکہ کا ایک بہت بڑا تاجر بن گیا۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی۔ اس نے لگن سے کام کیا۔ ایمانداری اور انصاف کا برابر خیال رکھتا تھا۔ اندریو کارنیگی کی ایک دلی خواہش تھی کہ:-

"اس دنیا میں رہنے والے انسان امن سے رہیں"

اس نے اس مقصد کے لیے ایک بڑی رقم وقف

کی جس سے یہ امن کا محل بنا جہاں ملکوں کے درمیان جھگڑے
طے کیے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال جب میں ہیگ میں تھا۔
اس وقت اس عدالت میں ہندوستان اور پاکستان کے
درمیان ایک جھگڑا طے ہو رہا تھا۔ وہی جو چند بدمعاش
ہمارے ملک سے ہوائی جہاز اڑا کر پاکستان لے گئے تھے۔

کاریگری کی کثیر رقم کے علاوہ ہالینڈ کی حکومت نے
بھی خاص دلچسپی لی۔ عدالت کے لیے زمین کے علاوہ بہت
سی دوسری چیزیں دیں۔

دنیا کے قریب قریب ہر ملک نے کچھ نہ کچھ تحفہ
اس امن کے مندر، کے لیے پیش کیا۔ مثلاً جرمنی نے
بہت بڑے بڑے خوبصورت لوہے کے دروازے
امریکہ میں ایک مجسمہ جس میں "امن انصاف کے ذریعے"
دکھایا گیا ہے دیا۔ سوئیٹزرلینڈ نے ایک بہت بڑا گھنٹا
ترکی اور حجاز نے حسین قالین۔ چین اور جاپان نے
سجاوٹ کا بہت سا سامان اس کے علاوہ کچھ افراد
اور اداروں نے بھی مدد کی۔ بہت سے لوگوں کی کوشش
سے یہ خوبصورت عمارت بنی اور ۱۹۱۳ء میں ہالینڈ کی
ملکہ نے اس کا افتتاح کیا۔

اسی شہر "ہیگ" میں ۱۸۹۹ء میں روس کے
زار کی تجویز پر ایک امن کانفرنس ---------
منعقد ہوئی تھی ۱۹۰۷ء میں یوروپ کی قوموں کے نمائندے
یہاں سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے جھگڑے
سلجھانے کے لیے۔ جینوا دنیا کا دارالخلافہ "لیگ آف
نیشن" طے ہوا اور ہیگ، دنیائے عالم کی "عدالت عالیہ"
قرار دیا گیا۔

دیکھنے میں واقعی یہ عمارت مندر جیسی، پاک اور
محل جیسی وسیع اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے فن تعمیر
کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ سرخ اینٹوں اور پتھر سے
تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے بڑے اور چھوٹے مینارے،
دونوں طرف جھکی ہوئی ہری ہری چھت دور سے ہی
دکھائی دینے لگتی ہے۔ بڑے مینارے کا گھنٹہ بہت
نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ یہ کئی منزل عمارت کافی بڑے
رقبے میں بنی ہوئی ہے۔ اس کے ایک طرف ایک بہت
سلیقے سے بنایا ہوا خوب صورت باغ ہے۔ جس میں
کثرت سے پودے اور درخت لگے ہوئے ہیں۔ پھولوں
کا بڑا اہتمام ہے۔ ہر موسم کے پھول دار پودے موجود
ہیں۔ گلاب اور لالہ تو یہاں کی خاص چیز ہیں۔ باغ میں
صاف پانی کی نہریں بھی بنی ہوئی ہیں جن میں مختلف
رنگ کے کنول کے پھول تیرتے اچھے لگتے ہیں ---
ہری ہری اور ملائم گھاس کے کئی لان بنے ہوئے ہیں۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی خوبصورت
کیاریوں اور گھاس کے لان کا سلسلہ شروع
ہو جاتا ہے۔

عمارت کے اندر دروازے کے قریب ایک
ڈاکخانہ ہے یہاں اس عمارت کی یاد میں جاری کیے
گئے ٹکٹ ملتے ہیں۔ ہالینڈ کے بڑوں اور بچوں کو
ٹکٹ جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہاں ایک بہت
اچھی اور بڑی لائبریری (کتب خانہ) بھی ہے۔ اس
میں امن سے رہنے سے متعلق بہت سی کتابیں اور
رسالے وغیرہ ہیں۔ پڑھنے کا اچھا ماحول پیدا کیا
گیا ہے۔ گیلری اور دوسری جگہوں پر امن قائم کرنے
والے لوگوں اور امن کے خواہشمند لوگوں کے "اسٹیچو"
تصویریں وغیرہ لگی ہوئی ہیں۔ اس عمارت میں بہت سے
چھوٹے بڑے کمرے ہیں۔ میٹنگ کے کمروں کے علاوہ

مناظر عاشق ہرگانوی

# دُنیا کے عجیب وغریب جانور

(۲)

## اسارلع

اسارلع ایک کیڑا ہے۔ اس کا سر سرخ اور بدن سفید ہوتا ہے۔ یہ ریت (بالو) میں رہتا ہے۔ بعض ماہرین نے لکھا ہے کہ یہ ساگ میں بھی رہتا ہے۔ یہ کینچلی میں پیدا ہوتا ہے اور کینچلی اتار کر اڑ جاتا ہے۔ اسے عورتوں کی انگلیوں سے مشابہت دی جاتی ہے۔ اس کیڑے کو خواب میں دیکھنا، چور آدمی سے تعبیر ہے جو تھوڑا تھوڑا کرکے چوری کرتا ہے

## اصلہ

اصلہ ایک قسم کا سانپ ہے، اس کا سر بڑا، جسم چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ اچھل کر یعنی کود کر کاٹتا ہے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کے ایک پاؤں ہوتا ہے اور یہ پاؤں پر کھڑا ہوکر گھومتا ہے پھر کودتا ہے۔ یہ سانپ جس چیز پر سے گزرتا ہے اسے ختم کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں اس میں چیزوں کو ختم کرنے اور برباد کرنے کی صلاحیت ہے۔ اسی لیے اس کا نام اصلہ ہے۔

## ایکڈنا

ایکڈنا کا جسم موٹا اور ٹانگیں نہایت چھوٹی ہوتی ہیں۔ پنجوں میں مضبوط ناخن ہوتے ہیں۔ چونچ لمبی نلی کی طرح ہوتی ہے۔ زبان لمبی اور پتلی ہوتی ہے اور باہر نکل سکتی ہے۔

یہ شیر خوار جانور ہے۔ لیکن یہ انڈے سے نکل کر دودھ پیتا ہے۔ اس کے جسم پر کانٹے ہوتے ہیں اور یہ زیادہ تر آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے۔

## ایکولیٹا

اس کا رنگ پیلا لیکن اس کے جسم پر کانٹے ہوتے ہیں ان کی نوکیں سیاہ ہوتی ہیں۔ جسم پر موٹے موٹے بال ہوتے ہیں مگر وہ جسم پر کانٹوں کی زیادتی کی وجہ سے نظر نہیں آتے۔ اس میں زمین کھودنے کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ سخت سے سخت زمین کو بھی ریت کی طرح کھود ڈالتا ہے۔ بل کھود کر زمین کے اندر رہتا ہے۔ اس کی خوراک کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں۔ اس کی زبان لمبی ہوتی ہے اور زبان پر ایک قسم کا لعاب ہوتا ہے۔ جب یہ زبان باہر نکالتا ہے تو لعاب پر چیونٹیاں بہت تیزی سے دوڑ آتی ہیں اور اس کی زبان سے چپک جاتی ہیں۔ جب سیکڑوں چیونٹیاں زبان سے چپک جاتی ہیں تو یہ اپنی زبان اندر کر لیتا ہے اور چیونٹیاں اس کی خوراک بن جاتی ہیں۔ خطرے کے وقت یہ خود کو گیند کی طرح گول بنا لیتا ہے اور اپنے کانٹوں کو کھڑا کر لیتا ہے۔

باقی ص ۲۹ پر

جناب اکبر رحمانی جلگانوی

فرانسیسی لوک کہانی

# چالاک چور

فرانس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک لوہار رہتا تھا۔ وہ فرانس کے بادشاہ کی طرح امیر بننا چاہتا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے لوہاری کی جگہ چوری کو اپنا پیشہ بنالیا' راجکماری سے شادی جبھی کرسکتا ہے۔ جب خوب امیر کبیر بن جائے دھیرے دھیرے چوری کرنے میں وہ اتنا ہوشیار ہوگیا کہ اس کا نام ہی چالاک چور پڑگیا۔

اس نے اس بات کا بھی پتہ لگالیا تھا کہ بادشاہ کا خزانہ کہاں رکھا ہے اور جناب اس نے آدھا خزانہ صاف کردیا تھا۔ اب وہ بادشاہ کی طرح امیر بن چکا تھا۔

بادشاہ فکرمند رہنے لگا۔ اُس نے اپنے تینوں صلاح کاروں کو طلب کرکے چور کو پکڑنے کے پلان پر غور کیا۔ صلاح کاروں نے بادشاہ کو تین ترکیبیں بنائیں اور کہا ان میں سے ایک نہ ایک ترکیب کے ذریعے چور ضرور پکڑا جائے گا۔

پہلی ترکیب کے مطابق بادشاہ نے محل میں ناچ گانے کی محفل منعقد کی تمام شہریوں کو دعوت دی گئی ــــ چالاک چور بھی آیا۔ اُسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ بادشاہ کو کنجوس اور بخیل سمجھتا تھا۔ اُسے یہ دیکھ کر اور اُسے حیرت ہوئی کہ فرش پر اِدھر اُدھر سونے کے سکّے بکھرے پڑے ہیں۔ اس نے جوتے کے نیچے کوئی مقناطیسی شے لگائی اور ناچتے ہوئے وہ اُن سکّوں پر چلتا رہا۔ اس طرح ایک ایک کرکے تمام سکّے اس کے جوتوں کے تلے سے چپک گئے۔ کسی کو معلوم بھی ہو سکا کہ سکّے کہاں غائب ہوئے۔ بادشاہ کو اپنے صلاح کاروں پر بہت غصہ آیا۔ پھر صلاح کاروں نے دوسری ترکیب۔

دوسری ترکیب کے مطابق پھر ناچ گانے کی محفل سجائی گئی ............. لیکن اب کی محفل ختم ہوجانے کے بعد تمام مہمانوں کو راج محل میں سونے کے لیے کہا گیا تھوڑا دیر میں سب سوگئے۔ لیکن چالاک چور کو نیند کہاں؟ سب کے سو جانے کے بعد بھی وہ جاگ رہا تھا۔

اُس نے راجکماری کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ راجکماری کی خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے پوچھا "راجکماری کیا تم سوگئی ہو؟" راجکماری لیٹی ہوئی تھی۔ پلنگ پر سے اُٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم کون ہو جس نے میری نیند خراب کرنے ہمّت کی ہے"

"میں آپ کی نیند خراب کررہا ہوں" چور نے جواب دیا۔ "میں آپ کی نیند خراب کرانے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ بہت حسین ہیں" راجکماری نے جب اپنی تعریف سُنی تو خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اس نے کہا۔ آؤ اندر آؤ۔ اس تعریف کے لیے مجھے انعام دینا چاہیئے۔"

چالاک چور راجکماری کے پاس گیا۔ راجکماری نے جب اس کا بوسہ لیا تب اُس کی پیشانی پر کسی رنگ سے ایک نشان بنادیا اس کے بعد راجکماری نے کہا" اس سے پہلے کہ کوئی تمھیں

یہاں دیکھ لے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔" چالاک چور واپس چلا گیا۔ صبح سب سے پہلے وہ بیدار ہوا۔ جب وہ منہ دھونے کے لیے گیا اور آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو اُسے اپنی پیشانی پر کسی رنگ کا نشان دکھائی دیا۔ وہ راجکماری کی چالاکی سمجھ گیا۔ آہستہ سے وہ راجکماری کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ میز پر نیلے رنگ کا ڈبہ رکھا ہے۔ اُس نے خاموشی سے اُس رنگ کے ڈبے کو اٹھالیا۔ اور جتنے بھی مہمان راج محل میں گہری نیند سو رہے تھے۔ اُن کی پیشانیوں پر ویسا ہی نشان بنا دیا۔ جب بادشاہ اٹھا تو وہ بہت خوش تھا کہ آج چور ضرور پکڑا جائے گا۔ لیکن جب اس نے تمام مہمانوں کی پیشانیوں پر نشانات لگے ہوئے دیکھے تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بادشاہ کی دوسری ترکیب بھی فیل ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے تینوں مشیروں کو پھر طلب کیا۔

"حضور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب کی تیسری ترکیب میں چور ضرور پکڑا جائے گا۔" ترکیب یہ ہوگی کہ ..... راجکماری کے کمرے میں تہہ خانہ بنا کر اسے اس طرح ڈھانک دیا جائے کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہاں کوئی تہہ خانہ ہے۔ جیسے ہی چور کمرے میں داخل ہوگا تہہ خانہ میں گر جائے گا۔ اور پھر اس کا باہر نکلنا مشکل ہے۔"

بادشاہ کو یہ ترکیب بہت پسند آئی۔ پھر ایک بار رقص و سرود کی محفل اور دعوت کا پروگرام ہوا۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد تمام مہمانوں سے راج محل ہی میں سونے کو کہا گیا۔ سب سو گئے۔ لیکن چور کو نیند کہاں؟ چالاک چور جیسے ہی راجکماری کے کمرے میں داخل ہوا وہ تہہ خانہ میں گر پڑا۔ اس نے باہر نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ راجکماری جاگ رہی تھی۔ چور کے گرنے کی جیسے ہی آواز ہوئی وہ زور سے چلائی "چور۔ چور..... چور ..." بہت سے مہمان چور پکڑنے کے لیے راجکماری کے کمرے میں داخل ہوئے اور وہ بھی اسی طرح تہہ خانے میں گر پڑے۔ جب بادشاہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تہہ خانے میں اتنے سارے لوگ گرے ہیں یہ پتا لگانا مشکل ہے کہ اُن میں اصل چور کون ہے؟ بادشاہ ترکیب فیل ہوتے دیکھ کر غصّہ سے لال پیلا ہو گیا اور اپنے مشیروں پر برس پڑا "تمہاری سب ترکیبیں ناکام ہو چکی ہیں۔ تم میرے مشیر بننے کے لائق نہیں ہو۔"

پھر راجکماری نے بادشاہ کے کان میں کچھ کہا۔

بادشاہ نے بغور سُنا اور سر ہلا کر 'ہاں' کہا۔ پھر بادشاہ نے تمام مہمانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بھائیو! آپ میں سے ایک چالاک چور ہے اس چور نے میرے تینوں مشیروں سے زیادہ اپنے آپ کو ذہین اور چالاک ثابت کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب وہ میرے خلاف نہ رہے۔ اگر وہ سامنے آجائے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ راجکماری کی شادی اُس سے کر دوں گا۔"

مہمانوں میں سے ۲۰۔ افراد راجکماری سے شادی کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ بادشاہ نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔ "کیا تم اسے پہچان سکتی ہو؟"

راج کماری نے کہا "بے شک! وہ چور ہو سکتا ہے۔ لیکن بات کرتے میں بہت ہوشیار ہے میں اسے روشنی میں نہیں پہچان سکتی ہوں لیکن آنکھ بند کر کے بھی اس کی آواز سن کر اُسے پہچان سکتی ہوں۔" چالاک چور آگے بڑھا۔ اُس نے اپنا سر جھکایا اور کہا۔

"راجکماری! چالاک چور آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔"

"ابا جان! " راجکماری خوشی سے چلائی "یہی وہ آدمی ہے"

"مجھے تمھیں سزا دینی چاہیے" بادشاہ نے کہا "لیکن میں نے وعدہ کیا ہے۔ اس لیے آج سے تم راجکمار ہو۔ میں تمھیں رہنے کے لیے اپنے جیسا محل دوں گا۔ لیکن اس سے پہلے تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم آج سے پھر کبھی چوری نہ کروگے"

"حضور!" چالاک چور نے کہا "میری صرف تین خواہشیں تھیں۔ ایک آپ کی طرح امیر ہوتا۔ دوسرے آپ کے جیسے محل کا مالک ہوتا اور تیسرے راج کماری سے شادی۔ آج میری تینوں خواہشیں پوری ہو چکی ہیں اس لیے اب میں آئندہ چوری نہ کروں گا۔ اور پھر اس نے جو کچھ دولت چرائی تھی وہ سب بادشاہ کو لوٹا دی۔ اس روز کے بعد سے اس نے کبھی چوری نہیں کی۔

راج کماری سے اس کی شادی کردی گئی۔ دونوں اپنے محل میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔ **

## سرکار دو عالم

(محمد حسین حسان ندوی اڈیٹر پیام تعلیم)

اس کتاب کا ذکر پیام تعلیم میں کئی بار آچکا ہے۔ پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ اب شائع ہوگئی ہے اور آسانی سے مل سکتی ہے بہت ہی سادہ اور نکھری ستھری زبان میں لکھی گئی ہے۔ اندازِ بیان بھی غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے۔ مدتوں بہت سے اسلامی مدرسوں کے نصاب میں شامل رہی۔ اس مرتبہ اس کی لکھائی چھپائی اور ظاہری شکل و صورت پر بھی بہت توجہ کی گئی ہے۔ قیمت: ۲/۷۵

جناب مضطر داؤدنگری

# ماں کی یاد میں

زندگی کے لیے ہر عیش و مسرت دے کر
ناتواں جسم کو سہراب سی طاقت دے کر
دلِ ناداں کو تمنّائے شکایت دے کر
چھپ گئی ہائے کہاں دید کی حسرت دے کر

تھپکیاں دے کے کبھی مجھ کو سُلایا تونے
رات میں اُٹھ کے کبھی پانی پلایا تونے
بارِ غم رنج و الم ہائے اٹھایا تونے
میری خاطر کبھی آرام نہ پایا تونے

پیار سے آنکھوں میں جب تونے لگایا کاجل
چھا گیا روئے گلستاں پہ حسیں سا بادل
میرے گریے نے تجھے کر دیا جب جب بیکل
لطف سے تونے مرے سر پہ اُڑھایا آنچل

زخم ہے ماں کی جدائی کا جگر میں ہمدم
بہتا رہتا ہے مری آنکھوں سے آنسو ہر دم
ہے علاج اِس کا نہ دنیا میں نہ کوئی مرہم
اس لیے وقت کی سہتا ہوں مصیبت پیہم

دستِ شفقت تھا کبھی ماں کا ہمارے سر پہ
گلشنِ قلب میں کھلتی تھی کلی شام و سحر
میری نظروں سے بہت دُور ہیں وہ پھر بھی مگر
یادِ مادر میں تڑپتا ہوں برنگِ مضطر

جناب اسرار ندوی

# چند بڑوں کے لطیفے

بھئی، تم نے ماسٹر اور طالب علم، دوکاندار اور گاہک، چور اور حاکم وغیرہ کے لطیفے تو بہت سنے ہوں گے۔ آؤ آج میں تمہیں چند بڑوں کے لطیفے سناؤں۔

"لطیفہ" کس زبان کا لفظ ہے، یہ جانتے ہو؟ یہ عربی زبان کا لفظ ہے "لُطف" سے بنا ہے۔ لطف کے معنی مہربانی، مزہ۔ تو لطیفہ ایسی بات کو کہتے ہیں جس کے سننے سے مزہ آجائے۔ طبیعت پھڑک اُٹھے۔ اسے چٹکلا بھی کہتے ہیں۔ چٹکلا کسی سوال کے جواب سے پیدا ہوتا ہے اس میں حاضر جوابی، ظرافت اور ذہانت کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔

مرزا غالب کو مولانا حالی نے "حیوان ظریف" کہا ہے۔ لو تم بھی ان کی ذہانت ملی ہوئی ظرافت سے لطف اٹھاؤ۔

کسی نے مرزا سے پوچھا: "کیوں صاحب، بچھو جاڑے میں کیوں نہیں نکلتے؟"

مرزا نے کہا "گرمی میں اس کی کون سی عزت ہوتی ہے جو جاڑے میں گھر سے نکلے۔"

(۲)

ایک شاعر صاحب نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا "میں اب شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر"

"مگر کیا۔؟" اسرار الحق مجاز صاحب نے پوچھا۔

"مگر میں کسی بیوہ عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

جناب آپ کسی بھی لڑکی سے شادی کر لیجیے۔ بیوہ تو وہ ہو ہی جائے گی۔

(۳)

ایک مشاعرے میں حاضرین معین احسن جذبی کا کلام سننے کے لیے بے تاب تھے۔ مشاعرہ والوں نے جذبی صاحب سے آکر کہا۔ جذبی صاحب نے فرمایا چلتا ہوں ذرا رائتہ پی لوں۔

اس محفل میں مجاز صاحب بھی تھے۔ ایک دم سے سنجیدہ ہو کر کہنے لگے۔ اس رائتے کو اقبال نظم کرتے تو یوں کرتے۔ حیف! شاہین رائتہ پینے لگا

اور اختر شیرانی یوں کہتے

رائتہ جو رخِ سلمیٰ پہ بکھر جاتا ہے

اور فراق فرماتے۔

ٹھیک رہا ہے ان آنکھوں سے رائتہ کم کم

اور تمہیں یوں کہنا چاہیے تھا۔

ابھی چلتا ہوں۔ ذرا رائتہ پی لوں تو چلوں

(۴)

پڑھنے کے زمانے میں ایک دن مجاز صاحب اور جاں نثار اختر صاحب سائنس کا پریکٹیکل کر رہے تھے۔ پریکٹیکل نہیں بنا تو دونوں شعر و شاعری کرنے لگے۔ ادھر سے ماسٹر صاحب آنکلے تو دونوں کو شعر و شاعری میں مبتلا دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہنے لگے کس گدھے نے تم لوگوں کو سائنس لینے کے کہا تھا۔

مجاز صاحب بھولی صورت بنا کر بولے "سر اکہا تو تھا ابا میاں نے"

(۵)

ایک بار مجاز صاحب اور فراق گورکھپوری میں باتیں ہو رہی تھیں۔ فراق صاحب نے مجاز کو چھیڑنے کے لیے کہا "تم نے کباب بیچنے کیوں بند کردیے؟"

مجاز نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "آپ کے ہاں سے گوشت آنا جو بند ہو گیا۔"

جب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا نام آ گیا ہے تو ان کا بھی ایک لطیفہ سنتے چلو۔

(۶)

فراق گورکھپوری سے ایک صاحب نے کہا اس مصرعے پر اگر آپ گرہ لگا دیں (یعنی دوسرا مصرعہ کہہ دیں) تو میں آپ کو شاعر مان لوں گا۔ مصرعہ ہے:-

مہترانی سے دل لگاتے ہیں

فراق نے برجستہ کہا۔ وہ کا ئی ہے آپ کھاتے ہیں

کنہیا لال کپور اردو کے بڑے طنزیہ لکھنے والوں میں ہیں۔ ایک صاحب اُن سے بحث میں اُلجھ پڑے اور کوئی نازیبا لفظ بول گئے۔ کپور نے کہا۔ صاحب میں آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ اُن صاحب نے بھی اس جملے کو دہرادیا۔ میں بھی آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ کپور صاحب کو موقع مل گیا۔ جھٹ بولے۔ "آپ نے ٹھیک ہی سمجھا غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔"

(۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک لطیفہ سنو۔

کوئی عربی عالم مولانا سے ملنے آئے۔ مولانا نے ان کے لئے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی۔ عربی عالم نے ایک گھونٹ لے کر منہ بناتے ہوئے کہا۔ بہت تلخ ہے:-

مولانا آزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جی ہاں حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔

(۸)

ایک بار انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج پارلیمنٹ میں تقریر کر رہے تھے: ہمیں سوئٹزرلینڈ کی آزادی کے لیے لڑنا ہوگا۔ ہمیں جرمنی کی آزادی کے لیے لڑنا ہوگا۔ ڈنمارک اور ناروے کی آزادی کے لیے لڑنا ہوگا۔ ہمیں.....

"ہمیں جہنم کی آزادی کے لیے لڑنا ہوگا!" مخالف پارٹی کے ایک ممبر نے جھلا کر کہا۔

"ہاں سچ ہے، ہر شخص کو اپنا وطن پیارا ہوتا ہے اور اس کو اس کی فکر ہوتی ہے" جارج نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

(۹)

انگریزی ادب کا ڈرامہ نگار شیریڈن بڑا حاضر جواب تھا۔

ایک دن وہ بازار جا رہا تھا۔ راستے میں اُس کے دو کٹر مخالف مل گئے۔ ان لوگوں نے شیریڈن کو بور کرنا چاہا۔ ایک نے فقرہ پھینکا "تم انتہائی احمق ہو یا بدمعاش!"

شیریڈن لپک کے ان دونوں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میں دونوں کے بیچ میں ہوں جناب!"

(۱۰)

امیر خسروؔ دہلوی بھی بڑے حاضر جواب تھے۔

ایک بار وہ کہیں جا رہے تھے گرمی کے دن تھے۔ انھیں پیاس لگی۔ سامنے ایک کنوئیں پر چار عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔

باقی صد پر

بشیر الدین شیرکوٹی

# آخری ملاقات

۱۴۔جولائی سنیچر کے دن صبح چھ بجے پیام تعلیم کے اڈیٹر حسین حسّان ندوی صاحب ہم سے رخصت ہوگئے ۔ اِنّا لِلّٰہ وِ اِنّا الیہ راجعون

محترم ایک بزرگ تھے ۔ پیام تعلیم کے اڈیٹر بچّوں کے ادیب ۔ مکتبہ جامعہ کے پرانے کارکن جنھوں نے مکتبہ کی ترقی تنزل نہ معلوم کتنے حادثات سے دوچار ہوکر بھی مکتبہ کی خدمت، اس کا درد دل میں رکھتے تھے ۔

بچّوں کے لیے کتابیں لکھیں سلیس، آسان زبان میں جو بہت مقبول ہوئیں ۔

پیام تعلیم سے ایسا رشتہ جوڑا جو حیات میں نہ چھوڑا ۔ بیمار رہے تب بھی پیام تعلیم نکالتے رہے حالات ناسازگار ہوئے تب بھی ہمت اور عزم مستحکم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ کتنے مستقل مزاج تھے ۔ کتنے صابر تھے جو مصائب سے نہ گھبراتے ۔ ایسے انسان شاذ ہی نظر آتے ہیں ۔

۸۔ جولائی کو ملنے کے لیے اور پیام تعلیم کے صفحات کتابت کیے ہوئے کر خدمت میں حاضر ہوا تو مسکراکر فرمانے لگے ۔ میں سوچ رہا تھا آپ آئیں گے ۔ مگر میری دلی خواہش یہ تھی کہ آج آپ نہ آئیں ۔ کیوں کہ رات کو نیند نہ آئی اور دل گھبرایا سا رہا اور سینے پر گرمی اس لیے یہ پرچہ ترتیب نہ دے سکوں گا ۔ کل آپ آجائیں تو بہتر ہے ۔ پھر آپ نے فہرست نکالی اور کچھ اگست کے لیے مضمون دیے ۔ ابھی وہ مضمون دیکھ دیکھ کر دے رہے تھے کہ جنرل مینجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ملنے کے لیے آئے اور مزاج پرسی کے بعد تمسخرانہ لہجے میں فرمانے لگے ۔ اڈیٹر اور کاتب دونوں صاحبان نے ملکر پرچہ لیٹ کیا ۔ اس لیے پیام تعلیم کی کتابت کا بل بشیر صاحب کو نہیں دیا جائے گا اور آپ پر جرمانہ ۔ یہ باتیں سُن کر آپ حسب عادت مسکراتے رہے ۔ شاہد صاحب سے پھر کہنے لگے سنجیدہ ہوکر رات طبیعت بڑی پریشان رہی ۔

شاہد صاحب نے کہا گھبرایئے نہیں ۔ ٹھیک ہوجائے گی اور آپ اپنے دماغ سے یہ نکال دیجیے ۔ کہ پرچہ آج بھی ترتیب نہ دیا جاسکے ۔ پرچہ آج ہی تیار ہوجائے گا ۔ میں ولی صاحب سے کہدوں گا ۔ ولی صاحب ترتیب دیں گے ۔ اور جولائی کا چار کاپیوں کا نکالیں گے اور بغیر ٹائیٹل ۔

آپ چونکے اور شاہد صاحب سے کہنے لگے "ارے بھئی ٹائیٹل نہ ہوگا تو بچے" کیا کہیں گے ،، شاہد صاحب مسکراتے ہوئے بولے ۔ آج کل کاغذ نایاب ہے کسی قیمت پر نہیں مل رہا ۔ کیا کیا جائے ۔ پھر آپ نے کہا پرچہ لیٹ اور وہ بھی بغیر ٹائیٹل کے ۔ ان بزرگوار کی یہ بات شاہد صاحب کو کب گوارا تھی کہ ان کا دل آزدہ ہو ۔ اچھا معہ ٹائیٹل کے ہوگا ۔ اب خوش ہوئے ۔

شاہد صاحب اُٹھنے لگے اور میں نے بھی اجازت چاہی تو فرمانے لگے ۔ ارے بھائی چائے پی کر جایئے اور چلئے

آ گئی۔ ہم چائے پی کر دفتر آ گئے۔ یہ میری آخری ملاقات تھی۔ پرچہ تیار کیا پریس پہنچا دیا۔ پروف بھی آپ نے دیکھے۔ اچانک جمعہ کے دن طبیعت بگڑی۔ شاہد صاحب نے آپ کو اسپتال میں داخل کیا۔ شاہد صاحب سے خوب باتیں کیں اور کہا "آج آپ تھک گئے ہوں گے آج آپ کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اب آپ جاکر آرام کریں۔ میری طبیعت اب ٹھیک ہے۔

شاہد صاحب واپس آ گئے اور مطمئن تھے کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

صبح ۱/۲ ۶ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ آپ نے ریسیور اٹھایا تو اسپتال سے محمد حسین صاحب (ابّو) بھرائی ہوئی آواز میں بولے کہ حسین صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ سُن کر شاہد صاحب پر کیا گزری بیان کی قلم میں طاقت نہیں۔ وہ سکتہ کے عالم میں ریسیور پکڑے رہ گئے۔ بھابی صاحبہ آئیں تو آپ کچھ کہہ نہ سکے۔ کافی دیر کے بعد آپ نے بتایا۔ وہ بھی دم بخود رہ گئیں۔

شاہد صاحب نے ولی صاحب کو اطلاع دی۔ یہ خبر سن کر وہ گھبرائے ہوئے آئے اور ان کو بھی زبردست صدمہ ہوا۔ وہ ان سے دلی محبت رکھتے تھے۔ اور پھر حبیب صاحب۔ وحید خاں صاحب کو مطلع کیا یہ خبر سن کو ایک برق سی گری اور سب آزردہ ہو گئے۔ وحید خاں صاحب نے ٹیلیفون سے تمام عزیزوں دوستوں کو مطلع کیا۔

مکتبہ کے تمام کارکن اس خبر سے پریشان ہو گئے سب کو ان سے عقیدت تھی۔ سب کو وہ پیارے تھے۔ جو آج اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شاہد صاحب ولی صاحب۔ سب کو ہدایتیں دے کر اسپتال ان کی لاش کر لینے کے لیے فوراً کار سے وہاں گئے۔

میں صبح ۱/۲ ۸ بجے ملنے کے لیے گیا تو وحید خاں صاحب ٹیلیفون پر نمبر ملا رہے تھے۔ میں نے معلوم کیا کہ آج دفتر کیوں بند ہے تو بتایا حسین صاحب کا اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ یہ سن کر از حد رنج ہوا۔

۹ بجے شاہد خاں صاحب ولی صاحب ان کے جسد خاکی کو لے کر آئے اپنے ہاتھوں سے گاڑی ایمبولینس سے اتار کر چارپائی پر لٹایا اور گھر میں لے گئے وہ ساعت کتنا دردناک تھا۔ گریہ و زاری بچوں کی اور تڑپنا بچوں کا نہ دیکھا گیا۔ ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا وہاں نہ ٹھہر سکا۔ باہر نکل آیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا یا الٰہی ہم سب کو صبر عطا فرما۔

شاہد صاحب نے حسین صاحب کے لیے کیا نہ کیا آپ کو بڑی عقیدت تھی آپ نے جو ان کے لیے کیا وہ ان کی اس محبت کا نتیجہ تھا جو شاہد صاحب سے ان کو تھی۔ آج شاہد صاحب اپنے کو تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ ذوقی مذاق ختم ہو چکا۔ دفتر میں ان سے مخاطب ہو کر ولی صاحب سے کہتے۔ دیکھیے حسین صاحب کیا کر رہے ہیں۔ کبھی پیام تعلیم کبھی کسی موضوع پر ان سے مذاقاً کچھ کہہ دیتے تو وہ مسکرا دیتے۔ شاہد صاحب خوش ہوتے۔ آج وہ بات نہ رہی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کو جوار رحمت میں جگہ دیں۔

میری ہمدردی مرحوم کے بچوں اور عزیزوں کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ متعلقین کو صبر عطا فرمائیں۔ آمین

★★

بقیہ لاسلکی کا باوا آدم صفحہ ۱۵ سے

آج تو فاصلے کی کوئی حد ہی نہ رہی اسی خدمت کی بدولت ۱۹۰۹ء میں اُسے علم طبیعات میں "نوبل پرائز" ملا جو دنیا کا سب سے بڑا انعام سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جنگِ عظیم میں اور اس کے علاوہ مختلف حیثیتوں سے اپنے وطن اٹلی کی خدمت کرتا رہا۔

۲۰۔ اگست ۱۹۳۷ء کو ریڈیو نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ لاسلکی کا موجد اس دنیا سے اُٹھ گیا اس کی موت کی خبر اس کی ایجاد کے ذریعہ سارے جہاں میں آناً فاناً پھیل گئی۔ کہنے کو وہ مر گیا لیکن اس کا نام دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ یہ نتیجہ ہے۔ دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کا اور سچی لگن سے پوری مستقل مزاجی سے اپنے کام میں لگے رہنے کا۔ ★★

بقیہ امن کا محل صفحہ ۲۹ سے

ایک بڑا ہال کمرہ بھی ہے۔ جہاں ہر ملک کے نمائندے یا سربراہ کے لیے ایک کرسی رکھی ہوئی ہے۔ کرسی پر ملک کا جھنڈا بنا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے ملک کے ترنگے جھنڈے کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جو بیچ کے حصے میں رکھا ہوا تھا۔ ہال کمرہ سلیقہ سے سجا ہوا تھا۔ قالین اور پردے نفاست سے لگے ہوئے تھے۔

دنیا کے لوگ نہ صرف اپنے جھگڑے طے کرانے یہاں آتے ہیں بلکہ اس کو صرف دیکھنے کے لیے بھی آتے رہتے ہیں۔ اس کی شہرت بہت ہے صرف عمارت کی وجہ سے بھی اس شہر ہیگ کی شہرت ہے۔

بقیہ دنیا کے عجیب و غریب جانور صفحہ ۳ سے

**ولارو**

یہ پہاڑوں پر اور پتھریلی جگہوں میں ملتا ہے۔ یہ غاروں اور کھوؤں میں رہتا ہے اس کی دُم اوپر سے نیچے تک ایک سی ہوتی ہے۔ اگلے پنجوں میں پانچ پانچ انگلیاں ہوتی ہیں جن پر ٹیڑھے ٹیڑھے ناخن ہوتے ہیں پچھلے پاؤں کی انگلیوں میں ایک نہایت لمبی، مضبوط اور نکیلی ہوتی ہے اس انگلی کے پاس والی انگلی کسی قدر چھوٹی ہوتی ہے اور اندر کی طرف دو چھوٹی چھوٹی کمزور انگلیاں اور ہوتی ہیں۔ ٹانگ پر اور دُم پر ملائم بال ہوتے ہیں اور باقی کل جسم براؤن ہوتا ہے۔

بقیہ صفحہ ۳۶ سے بڑوں کے لطیفے

امیر خسرو کنوئیں کی طرف بڑھے اور کہا۔ خدا تم سب کا بھلا کرے۔ ہمیں پانی پلا دو۔

عورتیں خسرو کو پہچانتی تھیں آپس میں اُن لوگوں نے کانا پھوسی کی اور پانی کے لیے شرط رکھی کہ ہم لوگ ایک ایک لفظ بولتے ہیں آپ ان سے کبت (شعر) بنا دیجیے۔ امیر خسروؒ نے شرط مان لی۔

ایک نے کہا "کتا" دوسری نے کہا "ڈھول"، تیسری نے کہا "کھیر"، چوتھی نے کہا "چرخا"

امیر خسرو تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے۔ لو سنو

کھیر پکائی جتن[1] سے چرخا دیا جلا
کتا آیا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا
لا، پانی پلا

امیر خسروؒ آواز کو الفاظ میں اسی زیر و بم کے ساتھ تبدیل کر دینے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

[1] جتن: ترکیب

# آدھی ملاقات

تفصیلی طور پر اپنی رائے پھر لکھوں گا۔ سرِدست رسید حاضرِ خدمت ہے یوں نئے سال کے ساتھ ہی کئی صحت مند اور خوش آئند تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ رسالے کے گٹ اَپ سے لے کر ترتیب تک۔ ہر شمارے کا ٹائیٹل خوب ہے۔ تصویروں کا انتخاب اور رنگ ٹھیک ہیں۔ کتابت اور طباعت پہلے سے صاف ستھری ہے۔ البتہ کاتب صاحب کی مہربانیاں بدستور جاری ہیں۔ اس کی طرف کچھ اور توجہ سے رسالے کی معنوی خوبیوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ پیام تعلیم کے لیے ایک اچھے آرٹسٹ کی سخت ضرورت ہے جو رسالہ کو صحیح طور پر تصویر بنا سکے سرخیوں کے ساتھ خاکے تو ہونے چاہیے۔ لیکن جو چند شکلیں بنائی جاتی ہیں ان میں کا ہونا ضروری ہے۔ لگتا ہے میرے مضمون کے ساتھ کے خاکوں کو ٹریس کیا گیا ہے۔ اس کے بجائے ان ہی شکلوں کو اگر آرٹسٹ "اپنی آنکھ" سے دیکھ کر بنائیں تو بہتر ہوتا۔

مزید باتیں چند دنوں بعد۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ رسالے مجھے مل سکے۔ محترم سید احمد ولی صاحب اور محترم شاہد علی خاں کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

خالد سحر خاں

پیام تعلیم اس وقت ہندوستان کا بچوں کا واحد رسالہ ہے جو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ملک کے سربرآوردہ قلمکاروں کی رشحات شایع کرتا ہے پیام تعلیم کی یہ کارگزاری معمولی نہیں بلکہ اسے ہماری تاریخ میں غیرمعمولی عزت حاصل ہے۔ رسالے میں شروع سے آخر تک بچوں کے ذوق کی سیری کے لئے بے حد دلچسپ اور نصیحت آموز مضامین اور نظمیں شامل ہیں۔ مولانا صاحب اور سہیل عظیم آبادی کی رشحات خاص توجہ کی مستحق ہیں نظموں میں محترمہ مسعودہ صاحبہ، محبوب راہی۔ ناوک حمزہ پوری اور خزاں کی نظمیں بڑی دلچسپ ہیں امید ہے کہ آپ کی ادارت میں پیام تعلیم پیامیوں کے لیے اور جامع اور بھرپور مواد مہیا کریں۔ انشاء اللہ۔

محمد ایوب واقف

اس بار کے پیام تعلیم جناب محبوب راہی۔ ناوک حمزہ پوری۔ حمید قیصر اور محترمہ مسعودہ حیات کی نظمیں پسند آئیں۔ اور کہانیوں میں ایماندار لڑکا۔ گیدڑ کا مقدمہ محمد امین، دہلی سے حجاز تک (مولانا عبدالسلام قدوائی) مضمون بہت پسند آئے۔ ڈاکوؤں کا گاؤں ریدرو قا شیدائی کہانی بھی پسند آئی آئی مگر برسوں پہلے اس سے ملتی جلتی ایک فلم (ننھا سا فرشتہ) نکل چکی ہے۔ جناب خلیق انجم صاحب کی مونگے کا جزیرہ تو ایک بہت ہی دلچسپ کہانی ہے بس کہانیوں کی جان ہے۔ رسالے میں تصویروں کی کمی بہت بُری طرح کھٹکتی ہے۔ ہر کہانی تصویروں کے ساتھ ہو تو سونے پر سہاگا ہوگا۔

ظہیرالدین ظہیر [illegible]

PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025.



لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) - پٹودی ہاؤس - دریا گنج - دلی ۶

# پیامِ تعلیم



ماہنامہ

# پیامِ تعلیم

نئی دلی ۲۵

جلد ۱۱ شمارہ ۱۰

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

اکتوبر ۱۹۷۴ء

قیمت ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

# فہرست مضامین





پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر
جامعہ نگر نئی دِلی ۲۵ سے شائع کیا



# بچوں سے باتیں

آج سے ۱۰۵ سال قبل اکتوبر کی دوسری تاریخ کو مہاتما گاندھی پیدا ہوئے تھے۔ اس دن پورے ملک میں ان کا یوم پیدائش منایا جاتا ہے۔ اسے عام طور پر "گاندھی جینتی" کہتے ہیں۔ یہ دن ایک تیوہار کی طرح منایا جاتا ہے۔ لیکن اس تیوہار کو روشنی، پٹاخے، ناچ گانا کچھ نہیں ہوتا۔

گاندھی جی کو دھوم دھڑکا پسند نہیں تھا۔ وہ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اسی لیے گاندھی جینتی بھی بہت سادگی سے منائی جاتی ہے۔ صبح لوگ ان کی سمادھی پر جاتے ہیں۔ پھول چڑھاتے ہیں۔ چرخہ کاتتے ہیں اور بھجن گاتے ہیں۔

گاندھی جی ہماری آزادی کی تحریک کے رہنما تھے۔ بدیشی حکومت کے خلاف اس لڑائی میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ انھوں نے سچائی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا وہ جو کہتے ہیں کہ "عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے"، گاندھی جی اس کے قائل نہیں تھے۔ جو کچھ کرتے تھے، کہہ کر کرتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ اچھے مقصد کو حاصل کرنے کے طریقے بھی اچھے ہی ہونے چاہیے۔ سچ پوچھیے تو اگر ان کے اسی قول پر عمل کیا جائے تو ہندوستان کی حالت سدھر جائے۔

اس شمارے میں جناب کیف احمد صدیقی اور محترمہ مسعودہ حیات کی نظمیں "بابو" اور "اجالے کا سفر" پڑھیے شوکت پردیسی صاحب کی نظم "آزادی کا ترانہ" اور ڈاکٹر امانت کی "پہلی بارش" بھی وقت کی چیزیں ہیں۔ سیدہ عنوان صاحبہ کی "بچے کی دعا" پڑھیے۔ اور آمین کہیے۔

خالد عرفان صاحب کا معلوماتی مضمون "ہوائی سمندر" پڑھیے اور خود تجربہ کیجیے۔ خالد صاحب کو ایسے سائنسی مضامین لکھنے کا ملکہ ہے۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ اس قسم کے مضمون پیام تعلیم کے لیے وقت نکال کر لکھتے رہیں گے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

جناب اجتبا ندوی کا مضمون، مضمون بھی ہے اور کہانی بھی یہ کہانی بالکل سچی ہے۔ یعنی آپ بیتی ہے۔ اس کہانی کا ہیرو اب دنیا میں نہیں ہے مگر اپنے بعد پیامی بھائی بہنوں کو ایسا راستہ دکھا گیا ہے۔ جس پر ہر بچے کو چلنا چاہیے۔ اس راہ پر چل کر ہی بچے ملک اور قوم کا نام اونچا کر سکتے ہیں۔

ہم اجتبا صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ کہانی ہمیں عنایت فرمائی۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کہانی لکھتے وقت ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ ہم بھی ان کے اس غم میں شریک ہیں۔

اس شمارے کی باقی کہانیاں اور مضمون آپ خود پڑھیے اور ہمیں اپنی رائے لکھیے اس عرصے میں پرچے کے متعلق بہت کم خطوط آئے۔ مگر جو آئے ہیں وہ خاصے ہمت افزا ہیں۔

اور ہاں! اس مہینے میں عید الفطر ایسے موقع پر پڑے گی۔ کہ ہم کو پیشگی مبارکباد دینی پڑ رہی ہے۔ نومبر کے پرچے

میں تو یاسی بلکہ نیاسی بھی ہو جائے گی۔ خدا آپ سب کو یہ دن مبارک کرے آمین۔

حسین حسّان نمبر کے لیے کئی مضمون آچکے ہیں کئی حضرات کے وعدے پورے ہونے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اعلان کے مطابق ہم یہ نمبر اگلے مہینے نکالنے میں کامیاب ہو سکیں گے افسوس ہے کہ پیامیوں نے اس نمبر کے لیے ہمیں کچھ نہیں بھیجا۔ جتنے مضامین اب تک آئے ہیں ان میں زیادہ تر مرحوم کے احباب ہی کے ہیں۔

ابھی ہم افسر میرٹھی اور حسین حسّان کے ماتم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بچوں کے ایک اور ادیب داغ مفارقت دے گئے۔ یہ تھے سید محمد ٹونکی مرحوم جن کا انتقال یکم ستمبر کو علی گڑھ میں ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وِ انا الیہ راجعون۔

۲۹۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی ۳۰۔ اکتوبر کو مرحوم ٹونکی صاحب کالج چھوڑ کر جامعہ میں شامل ہو گئے۔ جامعہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں خلافت کا کام بھی کرتے رہے جس کی بنا پر دو مرتبہ قید خانہ بسانا پڑا۔ سنہ ۲۲ء میں آگرہ جیل میں کئی سیاسی لیڈروں کا ساتھ رہا۔

ٹونکی صاحب نے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میں مدرس اور پھر صدر مدرس کی حیثیت سے تقریباً چالیس سال پڑھایا اور پنشن لی۔ طلبا سے انھیں بہت دلچسپی رہی۔ ان کے بیشتر شاگردوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ سب ہی کو ان کی تعریف کرتے سنا ان کے شاگردوں کو ان سے بڑی محبت رہی یہ لوگ ہمیشہ مرحوم کا نام بڑی عزت و احترام سے لیتے سنے گئے۔

لکھنے پڑھنے سے خاص لگاؤ تھا۔ کئی درسی کتابیں لکھیں پیامِ تعلیم میں بھی اکثر لکھتے۔ اس پرچے سے خاص لگاؤ تھا۔ کسی مہینے پرچہ نہ ملے تو فوراً خط لکھ کر طلب کرتے تھے علمی ذوق بہت بلند تھا۔ بڑوں کے لیے بھی کہتے تھے اور کام کی باتیں کہتے تھے۔ تحریر میں خلوص بھی تھا اور شگفتگی بھی۔

سیاسی طور پر کمیونسٹ پارٹی کے رکن رہے۔ مگر مشرقی تہذیب اور وضعداری کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور سیاست سے زیادہ تعلیم سے دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے انتقال سے بھی بچوں کے ادب کو بہت نقصان ہوا۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

جناب کیف احمد صدیقی

# باپو



ہند والوں کی آن تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

مُفلِس و تنگ دست لوگوں پر
دیش کے غمزدہ اچھوتوں پر
کس قدر مہربان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

جو ہمیشہ مصیبتوں میں پلے
پھر کبھی راہ امید سے نہ ٹلے
عزم کی وہ چٹان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

رات دن جور و ظلم سہتے تھے
بات جنتا کے دل کی کہتے تھے
قوم کے ترجمان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

حق و انصاف و آدمیت کے
ملک کی باہمی محبت کے
کس قدر قدردان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

سب کے مذہب کی قدر کرتے تھے
حسنِ انسانیت پہ مرتے تھے
آدمیت کی جان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

ہم سبھی کو دلا کے آزادی
جان دے دی برائے یکجہتی
ایکتا کے نشان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو

جو اہنسا پہ زور دیتے تھے
اور ہر دل کو جیت لیتے تھے
کیفؔ کتنے مہان تھے باپو
سارے بھارت کی شان تھے باپو
ہند والوں کی آن تھے باپو

جناب محمد اجتباء ندوی

# ہونہار بچہ

"ابی! کیا میں بہت گنہگار ہوں کہ مجھے اتنی تکلیف ہو رہی ہے؟"
ایک بچہ نے دہلی کے ہولی فیملی اسپتال میں لیٹے لیٹے بڑی معصومیت سے یہ جملہ ادا کیا، والد نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بڑی محبت و پیار سے جواب دیا: "نہیں بیٹے! تم تو چھوٹے بچے ہو، تمھاری عمر تو صرف نو سال کی ہے، تم گنہگار کیسے ہو سکتے ہو، انشاءاللہ یہ تکلیف جاتی رہے گی"، بچہ یہ سن کر خاموش ہو گیا، اور بڑی ہمت، استقلال اور بہادری کے ساتھ مرض کا مقابلہ کرتا رہا۔

اپنے والدین کا اکیلا لڑکا تھا، اس کے علاوہ اس کی دو بہنیں ہیں، ایک بڑی اور دوسری چھوٹی، دو بچیوں کے بعد اس بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ پہلی لڑکی ایک ماہ آٹھ روز کے بعد خدا کو پیاری ہو گئی تھی، قدرتی طور پر اس کی پیدائش سے والدین بہت خوش تھے۔ بچہ کے ننہیال اور دادھیال کے تمام لوگ مسرور تھے۔ سبھی کی آنکھوں کا نور اور دل کا قرار تھا۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نے "احمد مختار" نام تجویز کیا تھا۔

عالم اسلام کی عظیم درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں اس بچہ کی پرورش شروع ہوئی۔ ابھی ڈیڑھ سال کا تھا کہ اس کے والد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی منتقل ہو گئے بچہ بھی اپنے والدین اور بڑی بہن کے ہمراہ دہلی آ گیا، جامعہ کی دوسری منزل پر اس کے والد کا قیام تھا، اسی منزل پر دار الاقامہ بھی تھا نیچے درسگاہ تھی۔ تعلیمی ماحول اور لکھنے پڑھنے کا چرچہ تھا۔

احمد میاں نے چلنا پھرنا شروع کیا تو اکثر ان کے ہاتھ میں قلم، کاغذ، کتاب اور پنسل نظر آتی، کچھ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے مگر کتاب لیے بیٹھے کچھ گوں گاں کرتے رہتے، کاغذ پر قلم و پنسل پھیرتے رہتے۔ رونا دھونا بہت ہی کم تھا، شرارت کرتے لیکن تکلیف دہ نہ ہوتی، غلطی کرتے تو خاموش رہتے، پوچھنے اور جرح کرنے پر صاف صاف کہہ دیتے کہ ہم نے یہ کام کیا ہے۔ جھوٹ کبھی نہ بولتے، بڑے ہو کر بھی جھوٹ سے سخت نفرت تھی، اگر ان کے سامنے کوئی جھوٹ بولتا تو فوراً ٹوکتے اور شرم دلاتے، اگر کسی وقت ان کے والد تھکے ماندے آتے یا لیٹے ہوتے اور کوئی دروازے پر دستک دیتا، ان سے کہا جاتا کہ کہہ دو سو رہے ہیں، تو خفا ہو کر جواب دیتے: "کیا میں جھوٹ بولوں، غلط بات کہوں، میں نہیں جاؤں گا"

بورڈنگ کے طلبا سے بہت مانوس تھے۔ ان کو بلا لاتے، کھانا پیش کرتے۔ پانی دیتے۔ لڑکے ان کی اس عادت سے لطف لیتے اور خوش ہوتے۔

نیچے کے ایک کمرے میں نماز باجماعت ہوتی تھی، ان کے والد ہی امامت کا فرض انجام دیتے تھے۔ احمد میاں جماعت سے قبل جلدی جلدی الٹا سیدھا وضو کر کے پہنچ جاتے اور امام کے مصلے پر کھڑے ہو جاتے گویا نماز پڑھا رہے ہیں، طلباء ان کی اس معصومانہ ادا سے

لطف لیتے اور انھیں چھیڑتے، اکثر بلا لاتے اور مصلے پر کھڑا کر دیتے، والد اکثر انھیں اپنے قریب کھڑا کر کے نماز پڑھاتے اکثر پوری نماز اطمینان سے ساتھ پڑھتے اور کبھی چھوڑ کر چلے جاتے۔

نیچے ہی فجر کے بعد طلباء کی ورزش ہوتی، احمد میاں اب تین برس کے تھے، اپنے مکان کے چھجے سے طلباء کو ورزش کرتے دیکھتے۔ ان کے استاد کو ایک دو تین کہتے سنتے، بالکل اسی طرح نقل کرتے۔ نرسری جانا شروع کر دیا تھا، راستہ میں ورزش کرتے ہوئے جاتے۔ اور اپنی نرسری میں جو کچھ کھیلتے یا کاغذ پر بناتے گھر آکر اپنے والدین کو دکھاتے، ہر کام میں سنجیدگی اور وقت کی پابندی، صبح سویرے اٹھنا اور سویرے سو جانا یہ ان کا ہمیشہ کا معمول تھا، اور ان کی مختصر او ننھی سی زندگی کے آخری لمحہ تک اس میں فرق نہ آیا۔

احمد میاں جب ۲½ سال کے ہوئے تو ایک بھائی والے ہوگئے۔ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی نے "محمد،، نام تجویز کیا، محمد میاں جب کھیلنے کودنے کی عمر کو پہنچے تو دونوں بھائی ایک ساتھ کھیلتے، کچھ بناتے بگاڑتے رہتے، بڑی بہن سے اکثر کھیل میں لڑائی ہو جاتی، مگر ان دونوں میں بڑی محبت تھی، ہر وقت ساتھ رہتے، گھر سے باہر بہت کم نکلتے۔ جو کھیلنا ہو گھر ہی میں کھیلتے، کبھی کوئی بدتمیزی نہیں، لڑائی نہیں، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں، رونا چلّانا نہیں، والدین دیکھ کر خوش ہوتے۔ والدین کیا پاس پڑوس کے لوگ، آنے جانے والے سب ہی دیکھ کر حیرت کرتے اور کوئی نہ کوئی جملہ کہہ جاتے۔ والدین سہم جاتے اور نظر بد سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگتے۔ دو برس ہنسی خوشی، مسرت اور کھیل کود میں گذر گئے۔ دوسرے برس "محمد میاں،، پر دورہ پڑا۔ عجیب و غریب دورہ! چند دنوں کے بعد ۵۔ فروری ۱۹۷۰ء کی شام کو مغرب کے بعد اچانک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ سب دم بخود، بڑی المناک اور لرزہ خیز موت، والدین کی آنکھوں سے اس ہونہار، ذہین اور سمجھدار بچہ کی جدائی پر جو کچھ آنسو نکل سکے نکلے، مگر" احمد میاں پر سکتہ طاری ہو گیا، شاید وہ کچھ سمجھ نہ سکے، ہوا کیا؟ اس قیامت خیز شام کی صبح کو نیند کھلتے ہی اپنی امی سے کہہ چکے تھے۔" امی! یہاں چبوترے پر میں نے دو خوبصورت بچوں کو دیکھا، بیٹھے تھے پھر چلے گئے،، کہنے لگے شاید خواب دیکھا تھا۔ اسی چبوترے پر شام کو ماں کی گود میں " محمد میاں،، نے آخری ہچکی لی تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط

اب احمد میاں پھر اکیلے ہو گئے۔ اپنی بڑی بہن۔ (ان سے صرف ۱½ برس بڑی تھی) کے ساتھ تھوڑی دیر کھیلتے مگر جلد ہی لڑائی ہو جاتی۔ الگ کھیلنے لگتے۔ ان کا کھیل ہی کیا تھا، کاغذ، کتاب، قلم یا کسی ٹوٹی پھوٹی چیز کا جوڑنا بنانا۔ کاغذ کی ناؤ بنانا۔ پانی میں تیرانا۔ اپنی نرسری میں جو سیکھ کر آتے اس کی نقل کرتا اور کبھی لان یا کھیل کے میدان میں جا کر گیند اچھالنا اور دوڑنا بھاگنا کسی سے لڑائی ہو جاتی تو مار پیٹ نہ کرتے، گالی نہ بکتے اور دیر تک اس کے پاس نہ رہتے، گھر چلے آتے تھے۔

والدین کو اکثر محسوس ہوتا کہ" احمد میاں،، گھر میں رہتے ہیں، اکیلے ہونے سے گھبراتے ہیں۔ مگر گھبراہٹ کا اظہار نہیں کرتے، باہر کھیلنے کے لیے بھیجتے، تنہا کبھی نہ جاتے۔ والد کے ساتھ جانے کی ضد کرتے، والد

خالی وقت میں یا عصر کے بعد گھما پھرا دیا کرتے۔ اب احمد میاں کی صحت پہلی جیسی نہیں رہی تھی، کمزور، لاغر اور دبلے ہونے لگے تھے، والدین کو فکر ہوئی۔ ڈاکٹروں کے پاس اور اسپتالوں میں لیے پھرے۔ چیک اپ کرایا۔ دوائیں اور ٹانک دی گئیں۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ کوئی بیماری نہیں، مگر یہ دُبلاپن کیوں ہے؟ لاغر و کمزور کیوں ہیں؟ ڈاکٹروں کا جواب ہوتا کہ بڑے ہو کر ٹھیک ہو جائیں گے۔

جب ۵ برس کے ہوئے تو دہلی ہی میں مولانا علی میاں صاحب کی تشریف آوری پر ان کی اور ان کی بڑی بہن مریم خدیجہ کی "بسم اللہ" کرائی گئی، مولانا مدظلہ نے "بسم اللہ" کرائی، دعا دی، دونوں بہت خوش ہوئے اور محنت و شوق سے پڑھنے کا وعدہ کیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد احمد میاں جامعہ پرائمری اسکول کے درجہ اوّل میں داخل ہوئے۔ روزانہ صبح بڑے ذوق و شوق کے ساتھ تیار ہوتے اور اوّل وقت مدرسہ پہنچ جاتے، اگر ناشتہ میں دیر ہوتی تو اپنی امی پر خفا ہوتے کہ ہمارا ترانہ چھوٹ جائے گا، پابندی سے حاضری کی وجہ سے ترانہ یاد ہو گیا تھا، گھر میں خوش ہو کر سناتے، والدین کے چہرے مسرت سے چمک اُٹھتے اور دل و زبان سے درازیِ عمر اور صحت و ایمان کے لیے دعا نکلتی۔

درجہ میں جو کچھ پڑھتے، یا گھر کے لیے جو کام ملتا، اس کو ضرور پورا کرتے، اگر کسی وجہ سے اس کی تکمیل نہ کر پاتے تو صبح اُٹھتے ہی رونے لگتے، پوچھا جاتا یہ روتا کیوں ہے؟ بولا اسکول کا کام نہیں کر سکے ہیں، ان کے ابی یا امی جلدی جلدی کام مکمل کرا دیتے، ورنہ اسکول جانے کے لیے تیار نہ ہوتے، ہر ٹسٹ، ششماہی اور سالانہ امتحان میں پاس ہو جاتے، ان کے اساتذہ ان سے بہت خوش رہتے، ان کی سنجیدگی، متانت، خاموشی اور درجہ میں تہذیب و سلیقہ سے بیٹھنے کی تعریف کرتے، والدین کو مسرت و فخر محسوس کرتے۔ مگر بچہ سے کبھی نہ کہتے بلکہ محنت و جد و جہد کی تاکید کرتے تو جواب دیتے کہ "اب اور محنت کروں گا۔ ان شاء اللہ اچھے نمبروں سے پاس ہوں گا"، اپنے اساتذہ اور استانیوں کا بڑا ادب و احترام کرتے کہیں بھی ملاقات ہوتی تو سلام ضرور کرتے اور خیریت پوچھتے۔

جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی فہم و عقل اور سلیقہ مندی آتی گئی۔ کتابیں، کاپیاں بڑے سلیقہ سے رکھتے، والد سے تقاضا کر کے المونیم کی چھوٹی اٹیچی منگوالی تھی۔ اس میں کتابیں کاپیاں وغیرہ رکھتے تھے اور سب چیزیں اسکول لے جاتے۔ اٹیچی وزنی ہوتی تھک جاتے، کمزور تھے، کہا جاتا کم چیزیں لے جایا کرو۔ تو کہتے: ماسٹر صاحب ہر چیز تو مانگتے ہیں؟ اس لیے بڑے اہتمام سے کتابیں، کاپیاں، قلم دوات، پنسل، ربر اور جاذب لے جاتے اور روزانہ ہر چیز کا جائزہ لیتے، اپنی اٹیچی اپنے والد کے کمرے میں رکھتے۔ اگر دوپہر کو والد سوتے ہوتے تو چپکے سے کمرے میں داخل ہو کر اٹیچی کھولتے، اٹیچی کھولنے کی آہٹ ملتی، والد کی نیند کھل جاتی، ڈانٹتے منع کرتے، سب کچھ خاموشی سے سن لیتے اور اٹیچی ٹھیک کر کے چلے جاتے یا والد کے ساتھ ہی لیٹ جاتے۔

اپنے اسکول کا سامان کسی کو چھونے نہ دیتے اگر چھوٹی بہن "فوزیہ"، کوئی چیز اٹھا لیتی تو بہت خفا ہوتے، کبھی سمجھا کر اور کبھی سختی کر کے لے لیتے مگر

اس کے بدلے کوئی دوسری چیز ضرور دیتے۔

تین برس ہوئے احمد میاں کے والدین اپنی قیام گاہ سے کچھ فاصلہ پر ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان میں آکر احمد میاں کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ صحن میں کچھ پھول پودے لگائے، اس کی درستی، سینچائی اور دیکھ بھال بڑے شوق و محنت سے کرتے، صبح کو سب سے پہلے بیدار ہوتے، ہر پودے کو دیکھتے، اس کو سلام کرتے، خیریت پوچھتے، اگر پھول نکلے ہوتے تو توڑ کر والدین کے سرہانے رکھتے پھر ٹہلنے نکل جاتے۔ ٹہل کر آتے منہ دھو کر ناشتہ کرتے اور اسکول روانہ ہو جاتے۔ دوستوں کی تعداد کم تھی مگر ملتے سب سے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ، اس لیے ان کے سب ساتھی اور ہم عمر ان سے خوش رہتے، بظاہر ان کے سب سے گہرے دوست صرف تین تھے، ان کے درجے کے ساتھی لیئق میاں[1] محلہ کے کے پڑوسی آصف میاں[2] اور ان کے تایازاد بھائی سید عمر میاں[3]، عمر میاں سے ان کی ملاقات صرف گرمیوں کی تعطیل میں ہوتی، مگر بڑی محبت و تعلق سے یاد کرتے اور کبھی کبھار خط و کتابت بھی کرتے۔

احمد میاں بڑے خوش اخلاق اور مہمان نواز تھے، چلنے بولنے کے قابل ہوتے ہی لوگوں سے خوش اخلاقی سے بات کرتے، اگر کوئی جان پہچان کا گھر سے قریب گزرتا

---

[1] جناب رفیق شاستری صاحب اور محترمہ عائشہ صاحبہ استانی جامعہ مڈل اسکول کے صاحبزادے۔

[2] جناب ظہیر عباسی صاحب کے صاحبزادے۔

[3] جناب مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب ناظر کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے چھوٹے صاحبزادے۔

یا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اسے گھر بلا لاتے۔ اپنی امی سے چائے بنواتے اور خاطر مدارات کر کے واپس کرتے، گھر پر کوئی مہمان آتا، قیام کرتا تو اس کی بڑی خاطر کرتے۔ خدمت کرتے اور اس کا ہر طرح کا خیال رکھتے

پچھلے نومبر میں ان کے والد سعودی عرب گئے تھے انھیں دنوں مولانا عبدالماجد صاحب ندوی[1] سعودی عرب جانے کے لیے دہلی آئے، خیریت دریافت کرنے کے لیے احمد میاں کے یہاں آئے، مولانا سے بڑے تپاک سے ملے، قیام کے لیے اصرار کیا، خاطر تواضع کی۔ مولانا عبدالماجد صاحب سعودی عرب میں ان کے والد سے کہنے لگے کہ اگر آپ ہوتے تو شاید احمد میاں سے بہتر خاطر نہ کرتے، اس بچہ نے اس کا احساس نہ ہونے دیا کہ صاحب خانہ موجود نہیں ہیں۔

گونڈہ کے ڈی۔ ایم۔ او۔ ڈاکٹر سید عبدالعلیم صاحب ان کے والد کی عدم موجودگی میں آئے احمد میاں نے اس قدر خاطر کی اور مہمان نوازی کا حق ادا کیا کہ وہ اب تک ان کی تعریف کے گن گاتے ہیں۔

امسال احمد میاں کے نانا[2] نانی اور والد کو حج و زیارت کی سعادت حاصل ہوئی، ان لوگوں کی روانگی کے وقت دعاؤں کے لیے کہا اور والد سے عربی لباس کی فرمائش کی۔ روانگی کے وقت والد سے کہا کہ آپ فکر نہ کیجیے گا میں گھر کا خیال رکھوں گا اور امی کو نہیں ستاؤں گا۔

---

[1] جدہ ریڈیو اسٹیشن کے اردو یونٹ میں نیوز ریڈر و اناؤنسر

[2] سید عبدالجبار صاحب ریلوے کنٹرولر گونڈہ

ایک خط میں اپنے پڑھنے اور پروگرام کے بارے میں لکھا۔

"ششماہی امتحان قریب ہے، میرے پاس ہو جانے کے لیے دعا کیجیے"

اب میں وسیم[1] بھائی کے پاس روزانہ پڑھنے جاتا ہوں، ایک مرتبہ میں میچ دیکھنے چلا گیا تھا۔ ڈے اسکالر اور بورڈر میچ تھا، اور دوسری بار بھی لڑکوں اور استاذوں کا میچ ہو رہا تھا اس کو دیکھنے چلا گیا تھا اس لیے دو دن پڑھائی چھوٹ گئی اور آج چھٹی دیدی ہے .... میرے کھیلنے کے لیے جہاز یا موٹر ضرور لیتے آئے گا...."

احمد میاں کے والد نے حج و زیارت کے موقع پر ان کے اور ان کی دونوں بہنوں کے لیے خوب دعائیں کیں لیکن جب بھی احمد میاں کا نام لے کر دعا کی تو بے اختیار آنسو نکل پڑے، جب بھی یاد کیا، تصور کیا، خیال آیا آنسو جاری ہوگئے، وجہ سمجھ میں نہ آئی، سوچا محبت پدری ہے۔

سعودی عرب سے واپسی پر گھر سے باہر سڑک پر احمد میاں نے استقبال کیا، بہت خوش ہوئے، گلے ملے، شیروانی میں ملبوس، ذمہ دارانہ طور پر گھر کے حالات بیان کر ڈالے، بیان میں متانت، سنجیدگی اور واقعیت عیاں تھی۔ جو کچھ منگایا تھا پاکر بڑے خوش ہوئے، اپنے دوستوں ساتھیوں اور عزیزوں کو فخر کے ساتھ بتایا اور دکھایا، مگر افسوس کہ "عربی لباس" صرف دو ہی جمعہ کو پہن سکے۔

[1] جناب سید ضیاء الحسن صاحب ندوی لیکچرار شعبہ عربی جامعہ کالج کے بھانجے اور جامعہ کالج میں سائنس کے طالب علم۔

سالانہ امتحان قریب تھا، احمد میاں نے امتحان کی تیاری شروع کردی، اکثر تیاری کے لیے اپنے چچا ڈاکٹر مرغوب اشرف[1] صاحب کے یہاں جاتے، امتحان شروع ہوا، روزانہ پرچہ کرکے آتے تو تفصیل بتاتے، ۱۴ مئی کو امتحان ختم ہو رہا تھا، بڑی مسرت سے ذکر کرتے امتحان ختم ہوتے ہی گھر جائیں گے لکھنؤ میں بابا جان اور عمیر بھائی سے ملاقات ہوگی گونڈہ میں نانا نانی کے ساتھ رہیں گے، خوب مزہ آئے گا۔

لیکن افسوس کہ ۲۔ مئی کی شام کو بخار آیا، دوا دی گئی، مگر بخار میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ہولی فیملی اسپتال میں داخل کیا گیا وہاں بھی افاقہ کے بجائے ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

مرض کی شدت کے ساتھ ساتھ ایلوپیتھک علاج اپنے تجربات کے ذریعہ مزید تکلیف کا باعث بنا، ہر قسم کے ٹسٹ، انجکشن، ایکسرے، گلوکوز، آکسیجن اور خون چڑھا۔ احمد میاں اپنی بیماری سے زیادہ اس علاج سے تکلیف و کرب کی شکایت کرتے۔ ماں باپ کا دل بھر آتا، سوچتے کہ گھر واپس لے چلیں مگر اس امید پر شاید اسپتال کے علاج سے شفا ہو جائے، خیال بدل دیتے، مولانا محمد علی جوہرؔ کا یہ شعر زبان پر ہوتا ہے

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

کبھی تکلیف بڑھ جاتی، کبھی کچھ کم ہو جاتی، احمد میاں کہتے کہ " جیسے جادو ہو، کبھی طبیعت اچھی رہتی ہے اور کبھی خراب ہو جاتی ہے"

[1] لیکچرر شعبہ کیمسٹری جامعہ کالج۔

اسپتال کے وارڈ میں اور بھی بچے تھے، احمد میاں سب کی خیریت معلوم کرتے، اگر کسی وقت محسوس کرتے کہ کسی بچے کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو اپنی امی یا ابی یا چچازاد بھائیوں[1] میں سے کسی کو جو وہاں موجود ہوتا، بچے کے پاس باصرار بھیج کر حال دریافت کراتے، ان میں سے کسی کو کوئی ضرورت ہوتی تو اس کو پوری کرانے کی کوشش کرتے، لیٹے لیٹے اندازہ لگاتے اور بتاتے تھے کہ کون خوش مزاج ہے کون غصہ ور، اس طرح انھوں نے پورے وارڈ کی توجہ اور ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں اور سب برابر خیریت پوچھتے اور ان کا خیال رکھتے،

دو روز اسپتال کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے بند کر دینا پڑا۔ چند روز کے بعد ڈاکٹروں نے دودھ پینے کی اجازت دی، احمد میاں نے دودھ مانگا اتفاق سے گھر سے دودھ نہیں تھا، کہا گیا کہ اسپتال سے تھوڑا دودھ لے لیتے ہیں، کہنے لگے :-

"ابی! آپ نے اسپتال سے کھانا بند کر دیا ہے تو پھر دودھ کیسے لیں گے؟" مناسب نہیں ہے۔ گھر سے جب دودھ آیا تو پیا۔ یہی قصہ ایک دن اور پیش آیا تو کینٹین سے لاکر پلایا گیا، اسپتال سے لینا پسند نہ کیا۔

اسپتال میں داخل ہوئے کئی روز ہو گئے تھے اور حالت بہتر ہونے کے بجائے بگڑتی گئی تو والدین کی مدد و تعاون کے لیے جناب عبدالحلیم صاحب[1] ندوی اور جناب اقبال احمد[2] نے رات کے قیام کے لیے باری مقرر کر دی اور آخر وقت تک محلہ کے پڑوسی، جامعہ کے اساتذہ، احباب اور مخلصین بڑے اخلاص و محبت کے ساتھ احمد میاں کی تیمارداری اور خبرگیری کرتے رہے۔

مگر خدا تعالیٰ کو احمد میاں کی صحت منظور نہ تھی، یکم جون ۱۹۷۴ء کی صبح ۷½ بجے وہ خدا کو پیارے ہو گئے
انا للہ و انا الیہ راجعون۔

صرف ۹ برس ۲ ماہ ۵ دن کی عمر پائی، ماں، باپ، بہنوں، عزیز و اقارب، اساتذہ احباب کے لیے قیامت کا سماں تھا، جسے پیار و محبت اور ناز سے گودوں میں کھلایا تھا اسے افسوس، رنج و غم اور حسرت کے ساتھ قبر میں اتارا۔

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

---

[1] لکھنؤ سے تین چچازاد بھائی تیمارداری کے لیے آگئے تھے۔ عزیزان عبیداللہ، سعید حسن اور ظفر الحسن سلمہٗ ان کے علاوہ جامعہ برادری کے تمام لوگ تیمارداری اور ہر طرح کی مدد و تعاون کرتے رہے احمد میاں ان لوگوں کی اس محبت و تعلق کا تذکرہ کرتے اور شکر گزار رہتے، سخت تکلیف کے عالم میں بھی تیمارداری اور مزاج پرسی کرنے والوں کو پہچان کر سلام کرتے اور بیٹھنے کو کہتے۔

[1] صدر شعبۂ عربی جامعہ کالج
[2] احمد میاں کے خالو، ریلوے انجینئر دہلی

- ہر انسان ہی اپنی قسمت کا خالق ہے۔ (سالٹ)
- مایوسی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بری چیز نہیں۔ مایوسی موت کا دوسرا نام ہے۔ (لینن)

(بشیر الدین شیر کوٹی)

محترمہ مسعودہ حیات

# اُجالوں کا سفر

شہرت ہے تیری باپو ہر سو مرے وطن میں
تیرا ہی تذکرہ ہے دنیا کی انجمن میں
تو پھول بن کے مہکا کچھ اس طرح چمن میں
خوشبو سما گئی ہے افسردہ جان و تن میں

تو صدرِ انجمن ہے تو نازشِ وطن ہے
تو رنگِ دلبری ہے تو نکہتِ چمن ہے

کلیوں میں تازگی ہے پھولوں میں رنگِ عشرت
شاخوں میں اک لچک ہے پتوں میں سبز رنگت
سارے چمن میں رقصاں ہے آج حسنِ فطرت
تو نے بنا دیا ہے بھارت کو مثلِ جنت

یہ انقلاب آیا تیرے ہی فکر و فن سے
آزاد ہم ہوئے ہیں باپو تری لگن سے

تو ابر بن کے چھایا دنیا پہ آشتی کا
تو مہر بن کے چمکا دنیا پہ سادگی کا
تو نے ہمیں دکھایا اعجاز دوستی کا
تیری نظر نے بخشا آئین زندگی کا

تیرا کرم ہے کتنا بھارت کی سرزمیں پر
عظمت کی روشنی ہے اب ہند کی جبیں پر

تجھ کو تھی مثلِ ایماں اپنے وطن سے الفت
اخلاق سے مٹا دی تو نے بنائے نفرت
مذہب تھا صرف تیرا خلقِ خدا کی خدمت
اے قوم کے مسیحا اے فخرِ آدمیت

تو نغمۂ محبت، تو حسنِ دوستی ہے
تو روحِ آدمیت تو نورِ زندگی ہے

حسنِ عمل سے تو نے وہ کام کر دکھایا
یعنی وطن کو دستِ اغیار سے چھڑایا
تو نے وطن کی خاطر کوہِ الم اٹھایا
لیکن تری زباں پر شکوہ کبھی نہ آیا
تجھ کو خدا نے بخشی حسنِ یقیں کی دولت
صبر و سکون سے یکسر تھی زندگی عبارت

جناب خالد عرفان

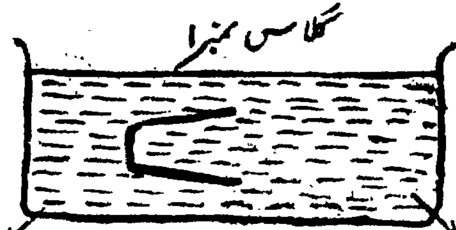
# ہوائی سمندر

مچھلیاں پانی میں رہتی ہیں پانی تالاب کا ہو کہ سمندر کا مچھلیوں کو پانی سے باہر نکال لیجیے تو وہ دم توڑ دیتی ہیں ، مر جاتی ہیں ۔ جس طرح مچھلیاں سمندر میں رہتی ہیں ، اگر میں کہوں کہ آپ اور میں بھی سمندر ہی میں رہتے ہیں تو آپ مسکرانے لگیں گے ۔ شاید سمجھیں کہ میں بے وقوف بنا رہا ہوں ۔ نہیں ۔ نہیں بھئی ، ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں ۔ سمندر کے ساتھ ہی آپ کا ذہن پانی کی طرف جاتا ہے ۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ ساگر صرف پانی ہی کا ہو ۔ آپ اور میں جس سمندر میں رہتے ہیں وہ ہے ہوا کا سمندر ، اگر ہم کو بھی اس ساگر سے باہر لے جایا جائے ۔ جہاں ہوا نہ ہو تو ہمارا دم گھٹ جائے اور ہم مر جائیں ۔ ہو سکتا ہے کہ پانی کے بغیر ہم کچھ دنوں تک گزارہ کرلیں ، لیکن ہوا کے بغیر ... شاید ہی ہم دو چار منٹ تک زندہ رہ سکیں ۔ ہوا کے بغیر ہماری زندگی کا تصور ہی ناممکن ہے ۔ بے کار ہے اچھا اب بتائیے ہوا کے بارے میں آپ کیا کیا جانتے ہیں ؟ پہلی بات تو میں نے بتادی کہ ہوا کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے ۔ ہوا ہمارے ارد گرد ، اوپر نیچے ، ہر طرف پھیلی ہوئی ہے گویا ہم ہوا کے سمندر کی تہہ میں رہ رہے ہیں ۔ سمندر کے ساتھ ہی جب آپ پانی کے بارے میں سوچنے لگیں تو شاید آپ پوچھ بیٹھیں کہ کیا ہوا پانی کی طرح انڈیلی جا سکتی ہے ؟ ہاں بھئی ، ہم اس کو ایک برتن سے دوسرے میں انڈیل سکتے ہیں ۔ بالکل پانی کی طرح ۔ دیکھیے مسکرائیے نہیں ، ایک چھوٹا سا تجربہ کر لیجیے اور خود ہی دیکھ لیجیے ۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھیے ہوا پانی کی طرح نظر نہیں آتی ۔ ویسے آپ اس کو محسوس کر سکتے ہیں ۔ بہتی ہوئی ہوا ہو تو آپ کہیں گے ہوا چل رہی ہے ۔ گرمی کے دنوں میں سورج کی گرمی سے ہوا اس قدر گرم ہو جائے گی کہ دوپہر میں آپ کو گھر سے باہر نکلنا محال ہو جائے گا اور اس گرم ہوا کے جھونکے کو آپ کہیں گے "لو چلنا" اور اگر یہ لو لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں ، شاید ہی جان بچ جائے اور سردیوں کے دنوں میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہوا برف کے مانند سرد بن جاتی ہے ۔ تو بھئی میں کہہ رہا تھا آپ ہوا کو ایک برتن سے دوسرے میں انڈیلیں گے تو سہی لیکن اس نظر نہ آنے والی شے کو آپ اسی چیز کے توسط سے دیکھیں گے جو نظر آتی ہے اور جو آپ کے لیے اجنبی نہیں ہے یعنی پانی ۔

اس تجربے کے لیے صاف شیشے کے ایک ہی سائز کے دو گلاس لے لیجیے اور اپنی امی سے کہہ کر کوئی گہرا بیسن یا ایسا برتن مانگ لیجیے ۔ جو نہ صرف چوڑا ہو بلکہ اس قدر گہرا بھی کہ اس کے اندر کے پانی میں گلاس رکھ دو تو وہ ڈوب جائے ،

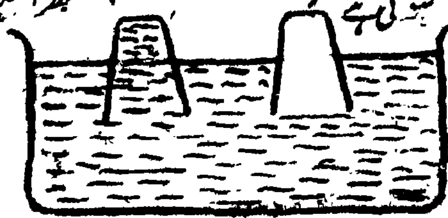
اور پانی سطح سے اوپر ہو؟

اب اس بیسن کو پانی سے بھر لیجیے اور اس میں گلاس نمبر ایک کو اس طرح ڈبویئے کہ اس میں پوری طرح پانی بھر جائے۔




(پانی بھرا ہوا ہے)

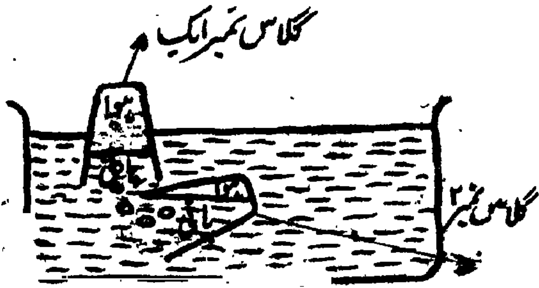
اب اس گلاس کو پیندے کی طرف سے پکڑکر پانی کی سطح سے کچھ اوپر اس طرح اٹھائیے کہ اس کا مُنھ پانی کی سطح کے اندر ہی رہے۔ اس طرح اس میں پانی بھرا ہی رہے گا۔ اب گلاس نمبر ۲ کو لیجیے۔




شکل نمبر۲

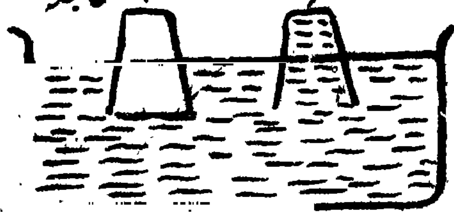
یہ خالی ہے نا! نہیں بھئی، خالی نہیں ہے، بلکہ اس میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ کوئی چیز بھی خالی نہیں ہوتی۔ ہر چیز میں ہوا ہوتی ہے۔ اب اس کو بھی پیندے کی طرف سے ہی پکڑیے اور اسی طرح اس کو پانی میں ڈبویئے کہ اس کا مُنھ بھی پانی کی سطح سے نیچے چلا جائے جیسا کہ شکل نمبر۲ میں دکھایا گیا ہے۔

اب گلاس نمبر دو کے منھ کو گلاس نمبر ایک کے مُنھ کے نیچے لیجائیے اور اس کو آہستہ آہستہ ٹیڑھا کیجیے۔ ارے یہ کیا؟ گلاس نمبر دو سے ہوا نکل کر بلبلوں کی شکل میں گلاس نمبر ایک میں داخل ہو رہی ہے اور گلاس نمبر ایک کا پانی گلاس نمبر ۲ میں داخل ہو رہا ہے۔




شکل نمبر۳

جیسے جیسے آپ گلاس نمبر ۲ کی ہوا کو انڈیلتے رہیں گے ویسے ہی اس میں پانی داخل ہوتا رہے گا یہاں تک کہ گلاس نمبر ایک جو پانی سے پُر تھا۔ اب ہوا سے بھر جائے گا اور گلاس نمبر ۲ جس میں ہوا بھری ہوئی تھی اب پانی سے بھرا ہوگا۔




شکل نمبر۴

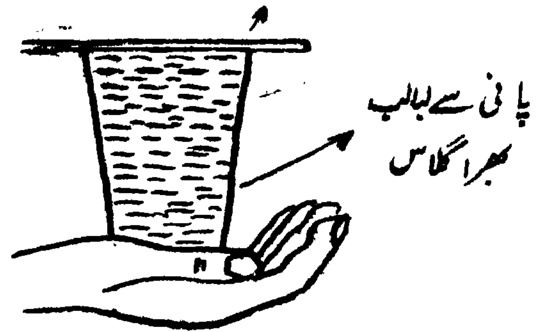
آپ اس طرح ایک گلاس سے دوسرے گلاس میں جتنی مرتبہ چاہے ہوا انڈیل سکتے ہیں۔

اس معمولی سے تجربے سے آپ کو دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اوّل یہ کہ ہوا کو پانی کی طرح انڈ

جا سکتا ہے آپ نے خود اپنی آنکھوں سے ہوا کو پانی
کی جگہ لیتے دیکھا نا! دوسری بات یہ کہ پانی کو انڈیلا
جا سکتا ہے اس لیے کہ ہر وزن دار شے کا اپنا ایک
دباؤ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ اپنا ہاتھ پھیلائیے۔ اس کے
بالکل اوپر ایک بہت ہی اونچا ہوا کا مینار سا چلا گیا
ہے جس کا دباؤ آپ کے ہاتھ پر پڑ رہا ہوتا ہے، لیکن آپ
اس کو نہیں دیکھ سکتے کیونکہ ہوا آپ کو دکھائی نہیں
دیتی۔ بس محسوس کی جا سکتی ہے۔ ویسے اس کا وزن
بھی آپ محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی دباؤ لیکن چلیے
میں آپ کو ایک بالکل ہی معمولی سا تجربہ بتا دوں
جس سے آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

اس تجربہ کے لیے بھی آپ کو کہیں دور جانا ہے
نہ کوئی خاص چیزیں لینی ہیں۔ بس یہاں بھی ایک گلاس
کی ضرورت پڑے گی اور ایک گتّے کے ٹکڑے یا کوئی
اور سخت موم لگے کاغذ کے ٹکڑے کی جو گلاس کے
منھ سے کچھ زیادہ چوڑا ہو۔

گلاس کو لبالب پانی سے بھر دیجیے۔ اور گتّے
کا ٹکڑا اس کے منھ پر رکھ دیجیے۔




شکل نمبر ۵

ذرا بتائیے، گتّے کا ٹکڑا کس کے سہارے
ہے، سامنے کی بات ہے گلاس اس کو سہارا دیئے ہوئے
ہے نا!

اب اس گلاس کو اپنے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ
لیجیے اور گتّے کے ٹکڑے کو بائیں ہاتھ سے تھام لیجیے۔
اور پھر اس کو تیزی کے ساتھ الٹا کر دیجیے۔ خیال رہے
گتّے کا ٹکڑا گلاس کے منھ سے علیحدہ نہ ہونے پائے
اب گتّے کا ٹکڑا کس کے سہارے گلاس سے لگا ہوا ہے؟
شاید آپ کہہ دیں کیا دکھائی نہیں دیتا، میں تو اس کو اپنے
بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے ہوں۔

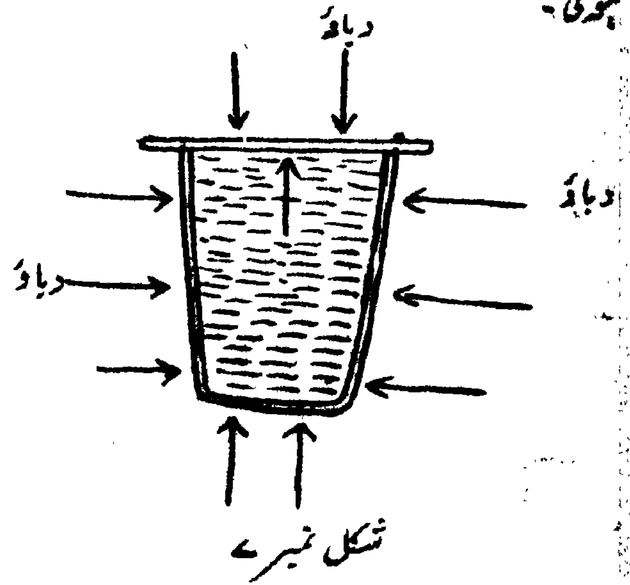


شکل نمبر ۶

ٹھیک ہے بھئی، اس میں خفا ہونے کی کیا بات
ہے۔ اب یوں کیجیے۔ گلاس کو الٹی طرف سے دائیں ہاتھ سے
مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھیے اور آہستہ سے بایاں
ہاتھ گتّے سے ہٹا لیجیے۔ ارے یہ کیا گتّے کا ٹکڑا نیچے
نہیں گرا۔ اب بھلا بتائیے۔ گتّے کا ٹکڑا کس کے سہارے
گلاس سے چپکا ہوا ہے۔ شرمائیے نہیں، میں بتا دوں گا
ہوا کے سہارے، اب اس کو اوپر کی طرف ہوا ہی تو
تھامے ہوئے ہے۔ آخر کیسے؟ وہ ایسے بھائی میرے،
ذرا خیال رہے ایک آدھ منٹ میں گتّے کا ٹکڑا گیلا ہو جائے
گا، پھر وہ گر جائے گا۔ اور اسی کے ساتھ پانی بھی گر جائے گا۔

اس لیے اس تجربے کو کرتے وقت احتیاطاً نیچے ایک چوڑا برتن رکھ لیجیے۔)

ہاں تو میں بتلانے جا رہا تھا کہ ہوا کے سہارے یہ گتے کا ٹکڑا کیسے گلاس کے منھ سے چپکا ہوا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا تاکہ میں نے کہا تھا ہم ہوا کے سمندر میں رہتے بستے ہیں۔ تب تو گلاس چاروں طرف ہوا سے گھرا ہوا ہے۔ اور ہوا اس کو ہر سمت سے دھکیل رہی ہوگی۔



شکل نمبر ۲

یعنی یعنی گلاس سے اوپر کی ہوا کا دباؤ نیچے کی طرف ہوگا۔ بائیں اور دائیں طرف کی ہوا کا دباؤ نیچے کی طرف ہوگا۔ بائیں اور دائیں طرف کی ہوا گلاس کو بائیں اور دائیں طرف سے دھکیل رہی ہوگی اور نیچے کی ہوا اس کو اوپر کی طرف اٹھا رہی ہوگی۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن گلاس تو پانی سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ کیا پانی کا دباؤ نہیں ہوتا؟ کیوں نہیں ہوتا! پانی کا بھی اپنا ایک وزن ہے اور اس لیے اس کا دباؤ بھی۔ اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ پانی کا یہ دباؤ نیچے کی طرف ہونے کے باوجود گلاس کے باہر کی ہوا کا دباؤ۔ اس قدر

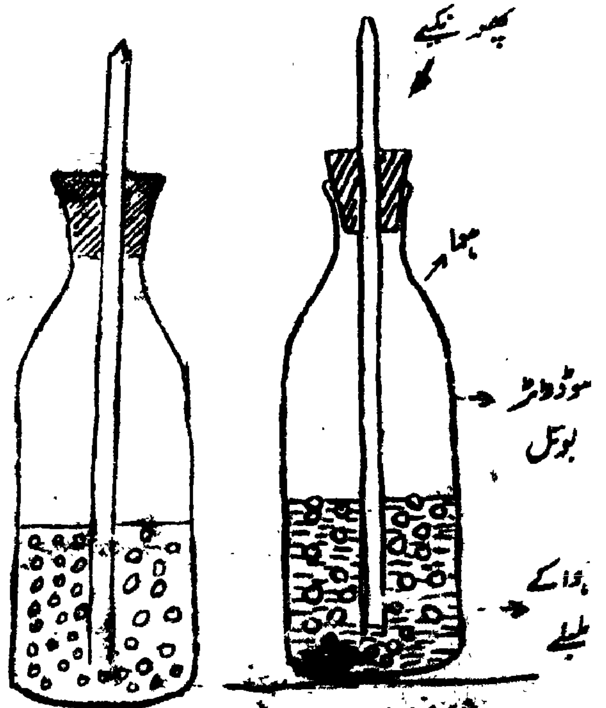
قدر زیادہ ہے کہ گتا گلاس کے منھ سے لگا رہتا ہے۔ آپ شاید پوچھ بیٹھیں۔ گلاس کے الٹنے سے تو پانی کو باہر آنا ہی ہے۔ کیونکہ پانی کو زمین کی کشش بھی تو کھینچ رہی ہوتی ہے۔ صحیح بات ہے۔ کشش ثقل کی وجہ سے بھی تو پانی کو گر جانا چاہیے تھا۔ لیکن ہوا کا دباؤ اس کشش کو بھی مفلوج کر دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گتے کا ٹکڑا گلاس کے منھ سے گوند لگا کر چپکا دیا گیا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے اگر تھوڑی سی ہوا گلاس کے اندر داخل ہو جائے تو کیا ہو؟ آپ خود اپنے ہاتھوں ایسا کر کے دیکھ لیجیے گتے کے ٹکڑے کا ایک کونہ اپنی انگلی سے ہلکا سا اٹھائیے اس طرح کہ کچھ ہوا اندر داخل ہو جائے۔ اس کا اندازہ آپ کو ان بلبلوں سے ہو جائے گا جو اس ہوا کے اندر داخل ہونے سے پیدا ہوں گے، اوہ! یہ کیا ہوا؟ گتے کا ٹکڑا اور پانی دونوں گر پڑے، ہے نا اچنبھے کی بات۔ ہوتا یہ ہے کہ اس طرح گلاس کے باہر کی ہوا کا دباؤ کچھ کم ہو جاتا ہے، اور گلاس کے اندر پانی کے دباؤ کے ساتھ ہوا کا دباؤ بھی شامل ہو جاتا ہے اور پانی گر جاتا ہے۔

ویسے ہوا کا دباؤ چاروں طرف ہوتا ہے۔ دائیں بائیں، اوپر، نیچے، ہر طرف۔ لیکن آپ اس کو محسوس نہیں کرتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ کپڑے پہنے ہوتے ہیں اور آپ کو ان کا روزمرہ کے کاموں میں احساس ہی نہیں ہوتا۔

اچھا، آیئے، اب ایک اور گتھی سلجھائیں: ہوا کا دباؤ آپ کے اردگرد، ادھر ادھر ہر طرف پھیلا ہوا ہے وہ اس قدر زیادہ ہے کہ اس کو اگر ایک ہی جگہ مرکوز کر لیا جائے تو اس کے نیچے آپ ایسے

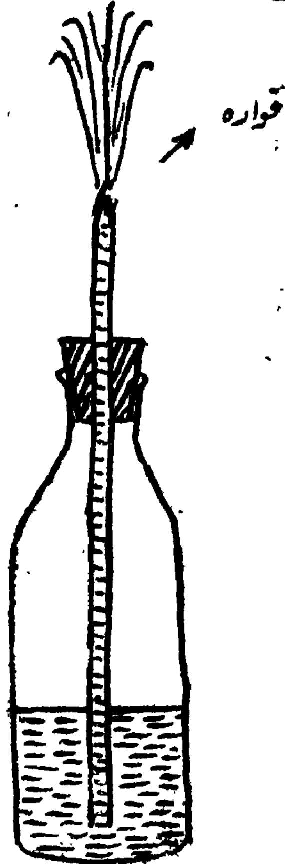
سب دب جائیں۔ اس کو جب ایک جگہ جمع کر لیا جاتا ہے تو اس سے بہت سارے کام لیے جا سکتے ہیں۔ بندوق چلائی جا سکتی ہے۔ لکڑیاں توڑی جا سکتی ہیں وغیرہ۔ اس دباؤ کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے آپ دو ایک معمولی سے تجربے خود سے کر سکتے ہیں۔ لیکن ذرا احتیاط درکار ہے۔ ویسے میں اس سلسلے کے وہ تجربے آپ کو بتا رہا ہوں جو آپ باآسانی کر سکتے ہیں۔ اور جس سے ہوا کے دباؤ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان دونوں تجربوں میں آپ کو سوڈا واٹر کی خالی بوتل استعمال کرنی پڑے گی۔

پہلے تجربہ میں آدھی بوتل میں پانی بھر لیجیے اور اس کو ایک ایسے ربر کے کارک سے بند کیجیے جس کے درمیان سوراخ بنا ہوا ہو۔ اس سوراخ میں سے ایک کانچ کی نلکی گذارنی ہے جس کی لمبائی بوتل کی لمبائی سے تین چار انچ زیادہ ہو اور کارک سے باہر کی طرف نکلنے والا حصہ نوکدار ہو




شکل نمبر ۸

اس نلکی لگے کارک کو مضبوطی سے بوتل کے منھ پر لگا کر نوکدار حصے کی طرف سے خوب زور سے پھونکیے اس طرح کے پانی کے اندر بلبلے سے بننے لگیں اور فوراً ہی ایک طرف ہٹ جائیے، یاد رہے فوراً ہی ورنہ فوارے کی شکل میں جو پانی بوتل سے اڑے گا وہ آپ کی آنکھوں میں ہوگا۔ پانی کتنا اونچا اڑے گا۔ اس کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ آپ نے بوتل کے اندر نلکی سے کتنی زور سے اور کتنی دیر کے لیے پھونک ماری ہے۔




شکل نمبر ۹

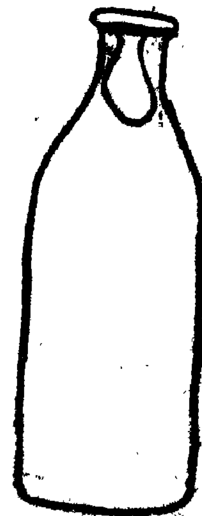
پانی کس لیے فوارہ کی طرح اڑا؟ اس کو آپ باآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ جب آپ نے بوتل کے اندر زور سے پھونکا [illegible]

کہ کس طرح پانی کے اندر سے بلبلے اٹھ اٹھ کر اوپر سطح پر ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ اس طرح آدھی بوتل میں جو ہوا بھری تھی اس کی مقدار اور دباؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جتنی زور سے آپ نے پھونکیں ماریں اسی قدر دباؤ میں اضافہ ہوا تھا۔ اور ادھر آپ نے پھونک مارنا بند کیا ادھر ہوا کے دباؤ نے پانی کو اوپر سے دھکیلا، اور کوئی راہ نہ پاکر پانی نے نلکی کی راہ لی، اور فوارہ کی شکل میں نکلنے لگا۔ جس قدر زیادہ اندر کی ہوا کو آپ دبائیں گے اسی قدر تیزی سے پانی باہر نکلے گا۔

اب آیئے اس بوتل سے ایک مزیدار تجربہ کریں۔

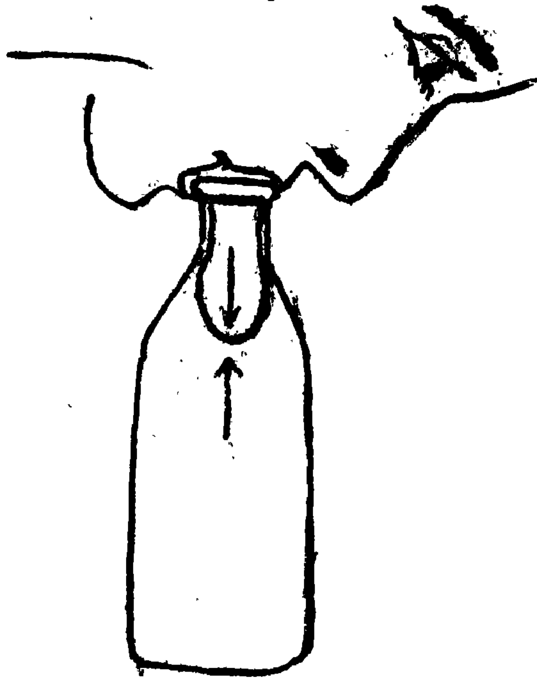
یوں آپ نے غبارے تو بہت سارے پھونکے ہوں گے جو پھول کر کپّا ہو گئے ہوں گے۔ لیکن آپ نے کبھی بوتل کے اندر بھی غبارہ پھونکا ہے؟ شاید آپ مسکرا دیں کہ یہ کون بڑا کام ہے۔ لیکن جب آپ پھونکیں تب پتہ چلے۔

ایک غبارہ لے کر اس کو ایک پنسل کی مدد سے بوتل کے منھ میں داخل کر دیجیے اب غبارے کے منھ کو اس طرح الٹا کر دیجیے کہ وہ بوتل کے منھ کو ڈھانک لے۔



شکل نمبر ۱

اب ذرا اس غبارے کو پھونکنے کی کوشش کیجئے، چاہے آپ کتنے ہی زور سے پھونکیں ماریں لیکن غبارہ جوں کا توں رہے گا۔ بس ہوگا تو اتنا کہ تھوڑا سا پھول کر رہ جائے گا۔



شکل نمبر ۱۱

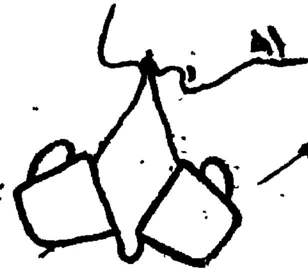
ہوتا یوں ہے کہ بوتل کے اندر جو ہوا ہے اس کا دباؤ غبارے پر پڑتا رہتا ہے۔ آپ جونہی غبارے میں پھونک مارتے ہیں اور غبارہ پھیلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے نیچے بوتل میں بھری ہوئی ہوا جمع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

اس طرح غبارے کے نیچے بھی اسی قدر دباؤ پڑنا شروع ہو جاتا ہے جس قدر کے غبارے کے اندر آپ کی پھونک سے داخل ہونے والی ہوا کا دباؤ ہوتا۔ اس طرح چاہے جس قدر طاقت سے آپ پھونکیں اتنی زیادہ ہوا نیچے جمع ہوگی اور غبارہ نہیں پھیلے گا۔

اگر آپ اس قدر طاقت سے پھونک ماریں کہ شیشہ
ٹوٹ جائے تو پھر غبارے کے پھیلنے میں کوئی دقت
نہ ہوگی یا اب رہی بات اس غبارے کو کیسے پھیلایا
جائے، یہ میں آپ کو اگلے مضمون میں بتاؤں گا۔
جس کے بعد آپ اس ترکیب کو اپنے دوستوں پر آزما
سکیں گے۔

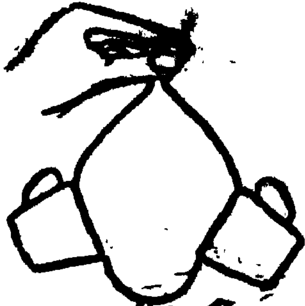
اب آیئے اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک
مزیدار کھیل، نہیں بھئی تجربہ آپ کو بتا دوں۔
اس کھیل یا تجربہ میں آپ کو ایک غبارے اور دو عدد
خالی پیالیوں کی ضرورت پڑے گی۔ اپنی امی سے مانگ
لیجیے، لیکن ایک بات کا خیال رکھیے جو میں نے آخر میں
بتائی ہے۔

اب اپنے دوست کو آواز دیجیے گا۔ وہ آجائیں تو
ان سے کہیے گا کہ ان دونوں پیالیوں کو ان کی ڈنڈیوں کو
پکڑے بغیر صرف غبارے کی مدد سے بہ یک وقت اٹھادیں۔
وہ آپ کا چہرہ دیکھنے لگیں گے۔ آپ بس شانِ بے نیازی
سے مسکراتے رہیے۔ جب وہ ہار مان جائیں تو پیالیوں
کو جس طرح شکل نمبر ۱۲ میں دکھایا گیا ہے غبارے



شکل نمبر ۱۲

کے ساتھ رکھیے۔ پھر غبارے کو پھونکیے، جیسے جیسے غبارے
میں ہوا بھرے گی غبارہ پھولے گا اور پیالیوں کے اندر جانے
لگے گا۔ جس قدر ہوا زیادہ بھری جائے گی اسی قدر وہ اندر
جائے گا اس طرح کہ گویا پیالیاں اس کی دونوں طرف
فٹ (جم گئی) ہوگئی ہیں۔ اب آپ احتیاط سے غبارے
کے منہ کو مضبوطی سے پکڑ کر اٹھائیں گے تو پیالیاں بھی
اس کے ساتھ چلی آئیں گی اور وہ گریں گی نہیں۔



شکل نمبر ۱۳

آپ کے دوست پہلے تو اچنبھے میں پڑیں گے۔
پھر ہنسنے لگیں گے۔ کبھی کبھی —— آپ کی طرف دیکھیں
تو آپ بھی ہنسنے لگ جائیے۔

ایک بات اپنی امی سے کہہ کر اس تجربہ کے لیے
پرانی پیالیاں مانگ لیجیے گا۔ اس لیے کہ خدانخواستہ
پیالیاں گر پڑیں تو ....... کیا ہوگا؟ یہ آپ کے
سمجھنے کی بات ہے!

اب آرام کیجیے۔ آپ نے دیکھا ہوا کو پا
کی طرح ایک برتن سے دوسرے برتن میں انڈ
جا سکتا ہے، ہوا کا وزن ہوتا ہے۔ دباؤ ہو
ہے اور اسی دباؤ سے کئی کام لیے جا سکتے ہیں۔ ا
بار میں اسی ہوا کی کچھ خصوصیتیں بتاؤں گا۔

---

- انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت
کا دامن داغدار ہو جائے۔ اسری حنید
- زندگی کی کامیابی کی کنجی محنت، دیانتدار
اور سچائی پر ہے۔ رما تارا بھانہ

(بشیر الدین شیرکوٹی)

# آزادی کا ترانہ

از شوکت پردیسی

ہم ارضِ وطن کے رکھوالے
ہم گنگ و جمن کے رکھوالے
ہم سارے چمن کے رکھوالے

ہر ایک جگہ آباد ہیں ہم
آزاد ہیں ہم، آزاد ہیں ہم

سچائی ہماری فطرت ہے
انصاف ہماری عادت ہے
ایمان ہماری طاقت ہے

ہر ماں کے لیے شہزاد ہیں ہم
آزاد ہیں ہم، آزاد ہیں ہم

آئی ہے بہارِ ماہ اگست
آزاد چمن کے پھول ہیں مست
باطل کو دی ہے ہم نے شکست

مسرور ہیں ہم، دل شاد ہیں ہم
آزاد ہیں ہم، آزاد ہیں ہم

جاتا نہیں غم آسانی سے
بہتا ہے لہو پیشانی سے
ملتی ہے خوشی قربانی سے

ہر عزم کی اِک بنیاد ہیں ہم
آزاد ہیں ہم، آزاد ہیں ہم

شوکتؔ یہ ہماری آزادی
ہر شے پہ ہے بھاری آزادی
ہے جان سے پیاری آزادی

تاریخ میں قابلِ داد ہیں ہم
آزاد ہیں ہم، آزاد ہیں ہم

شری راجا سُر بجلانے
ترجمہ
جناب: مہر درولوی

# میٹھی نیند کی انوکھی دوا

(مراٹھی کہانی)

بہت پرانے زمانے کی بات ہے کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا جس کا خزانہ ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ اسے اولاد کا بھی سکھ تھا اور دولت کی بھی کمی نہ تھی اور اس کی دلیری اور عقلمندی کی تعریف اس کے دشمن بھی کرتے تھے، وہ عدل و انصاف و رعایا پروری میں بھی مشہور تھا غرض بادشاہ کو ہر طرح کا آرام نصیب تھا۔ اگر اسے کوئی دکھ تھا تو نیند کا۔ اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس کو وہم تھا کہ نیند نہ آنا بھی ایک خطرناک بیماری ہے۔ بادشاہ اس بیماری کے خوف سے پریشان تھا۔ اس نے نیند کی دوا حاصل کرنے کے لیے اور اپنی اس بیماری کے علاج کے لیے کئی حکیموں اور ویدوں سے علاج کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

بس تو بادشاہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا۔ ایک دن صبح سویرے وہ معمولی لباس پہن کر کسی سے کچھ کہے بغیر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل میں صبح کی ٹھنڈی ہوا اور کھلی فضا نے بادشاہ کے دل پر اثر کیا وہ اس ماحول سے بہت خوش ہو گیا۔ اس کی طبیعت میں ایک نئی تازگی اور فرحت پیدا ہو گئی۔ کچھ دور چلنے پر اسے لکڑی کاٹنے کی آواز آئی۔ وہ آواز کی سمت بڑھا۔ اسے ایک لکڑہارا نظر آیا جو ایک درخت کاٹ رہا تھا۔ سخت محنت اور دھوپ کی وجہ سے وہ پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لکڑہارے نے اپنی کلہاڑی ایک طرف رکھ دی اور اپنے میلے کرتے کے دامن سے پسینہ پونچھ کر وہیں زمین پر لیٹ گیا اور لیٹے ہی گہری نیند سو گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے ایک اجنبی کو سامنے کھڑا ہوا پایا۔ اس شخص کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ بادشاہ کو اس پر بڑا ترس آیا اس نے بڑی ہمدردی اور محبت سے کہا۔

"بھائی تم بہت تھک گئے ہو اب دھوپ بھی تیز ہو رہی ذرا دیر اور آرام کر لو۔"

"جناب اس ہمدردی کا شکریہ۔ میں آپ کو دیکھ کر بہت ڈر گیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ آپ میرے ہمدرد نکلے۔ ورنہ......"

"ورنہ کیا....." بادشاہ نے پوچھا۔

"میں سمجھا تھا کہ آپ ٹھیکیدار ہیں اسی لیے گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور جھٹ کھڑا ہو گیا۔" بادشاہ مسکرایا۔

لکڑہارے نے بادشاہ کو غور سے دیکھا اور کہا "شاید آپ محنت کا کام نہیں کرتے، آپ کے ہاتھ کتنے نازک اور نرم معلوم ہوتے ہیں اور آپ کا لباس کتنا صاف ستھرا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ مزدور یا محنتی آدمی نہیں ہیں۔ میرا لباس دیکھیے کتنا میلا ہے" اور یہ ہتھیلیاں درخت کی چھال کی طرح کھردری ہیں۔ شاید آپ درزی ہیں۔" لکڑہارے نے بادشاہ سے سوال کیا۔

"نہیں بھائی میں درزی ورزی کچھ نہیں ہوں بس تمہاری طرح ایک آدمی ہوں۔ ہاں تم مجھے اتنا بتا دو کہ اتنی محنت و مشقت کرنے پر بھی تمہیں آرام کی نیند کیوں کر آتی ہے؟"

لکڑہارا بادشاہ کے اس سوال پر مسکرایا اور بولا۔ "بھائی آپ نہیں جانتے کہ محنت کرنے کے بعد آدمی پر نیند

کسی بھوت کی طرح سوار ہوتی ہے۔ یہ بات آرام پسند لوگوں کو کیا معلوم۔ محنتی آدمی محنت کے بعد ذرا زمین پر لیٹ جائیں تو فوراً خوابوں کی نگری میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"جی ہاں! میں نے اس بات کا مشاہدہ آج خود اپنی آنکھوں سے کیا ہے پھر بھی مجھے تمھاری باتوں کا یقین نہیں آیا۔"

"آپ کو کس بات کا یقین نہیں آتا؟" "نصیحتوں کے سمندر سے تجربوں کی بوند بہتر ہے۔" ہاں تو آپ بتایئے کہ آپ کو میری کس بات کا یقین نہیں آیا۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ اگر مجھے اتنا روپیہ ملے کہ ایک ہفتہ کی روزی کا انتظام ہو جائے تو ایک ہفتہ سکھ کی نیند سوتا رہوں۔ لیکن مجھے اپنا خیال بھی غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ آرام میں مجھے ایسی گہری نیند نصیب نہیں ہو سکتی۔

"خدا غریب آدمی کو ہفتہ بھر کی روزی کے لیے روپے نہیں دیتا اسی لیے اُسے کل کی فکر رہتی ہے اور وہ محنت کرتا ہے اور محنت کی روٹی کھانے سے ہمیشہ اچھی نیند بھی آجاتی ہے۔ اگر وہ محنت و مشقت نہ کرے تو اس کا پیٹ کیسے بھرے اس کے بیوی بچے کیا کھائیں۔" لکڑہارے نے دھیرے سے کہا۔

بادشاہ اس مثال سے جیسے مطمئن ہو گیا اسے اپنے سوال کا بہترین جواب مل گیا۔ اُس نے کہا: "تم سچ کہتے ہو بھائی! کیا تم نے یہ نہیں سُنا کہ تمھارے بادشاہ کو نیند ہی نہیں آتی اور وہ اس بیماری سے بہت پریشان ہیں۔ انھوں نے کئی حکیموں اور ویدوں سے علاج کرایا مگر بے کار! بے فائدہ" بادشاہ نے جواب طلب نظروں سے لکڑہارے کو دیکھا۔

"ہاں سُنا تو ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انہیں میری طرح محنت کے سخت کام تو کرنے نہیں پڑتے سونے کے لیے نرم و گرم بستر تکیے، گدّے وغیرہ سب ہی کچھ ہے۔ پھر نیند کیوں نہیں آتی؟"

بادشاہ خاموش سنتا رہا کچھ بولا نہیں۔ لکڑہارے نے کہا "بھائی معاف کرنا اب میرے پاس زیادہ بولنے کے لیے وقت نہیں ہے اگر میں باتیں کر کے وقت ضائع کروں تو میرے بیوی بچے بھوکے رہ جائیں گے۔ اور پھر مجھے اپنی بیوی کے طعنے بھی سننے پڑیں گے۔" یہ کہہ کر لکڑہارا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ بادشاہ بس تعجب سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں بادشاہ ہوں اور مجھے نیند نہیں آتی مگر یہ ایک معمولی لکڑہارا ہے اسے کیسی گہری میٹھی نیند آجاتی ہے۔ کچھ دیر بعد بادشاہ نے لکڑہارے سے کہا: "بھائی! تم اس درخت کی گھنی چھاؤں میں کچھ دیر آرام کر لو میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمھیں کیسی نیند آتی ہے۔"

"میرے دوست! شام تک مجھے اپنا کام کسی طرح پورا کرنا ہے اب میرے پاس آپ کی باتوں پر عمل کرنے کے لیے وقت نہیں۔"

"اس کی فکر تم نہ کرو، میں تمھارا یہ کام پورا کر دیتا ہوں" یہ کہہ کر بادشاہ نے لکڑہارے سے کلہاڑی مانگ کر درخت کاٹنا شروع کیا۔ لکڑہارا کچھ دیر کھڑا رہا پھر اطمینان سے جاکر اس درخت کے نیچے گھنی چھاؤں میں لیٹ گیا اور لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ بادشاہ لکڑہارے کو اطمینان سے گہری میٹھی نیند سوتے دیکھ کر حیران ہوا۔ دل میں سوچنے لگا۔ کہ خدا کی شان ہے کہ غریب کو پتھر پر بھی نیند آتی ہے۔ تعجب ہے کہ نہ بستر ہے نہ تکیہ نہ چٹائی نہ بوریا تک غریب کو نصیب نہیں پھر بھی کیسے خرّاٹے لے رہا ہے۔ چونکہ لکڑہارے نے بادشاہ پر بھروسہ کیا تھا اور بادشاہ نے لکڑہارے کا کام پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی اس لیے وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا تیز دھوپ

اور سخت محنت کی وجہ سے اسے پسینہ آنے لگا تھا اس لیے اس نے اپنا کرتا اُتارا اور پسینہ پونچھ کر کرتے کو ایک طرف پھینک دیا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا آخر اس نے شام سے پہلے درخت کاٹ کر رکھ دیا۔ اس سخت محنت کی وجہ سے اس کے نرم و نازک ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور اس کی کمر میں درد ہونے لگا وہ کافی تھک گیا تھا اس لیے لکڑہارے کے پاس ہی زمین پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی اسے گہری میٹھی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ شام کے وقت کام کی نگرانی کرنے والا ٹھیکہ دار کا نوکر اس جگہ پہنچا تو اُس نے بادشاہ اور لکڑہارے کو گہری نیند میں پڑا ہوا پایا۔ نوکر بڑا سخت آدمی تھا اس نے لکڑہارے کی پیٹھ پر لات مار کر گرجدار آواز میں کہا۔ "اٹھ شہزادے شام ہو گئی اور تو کام پورا کیے بغیر آرام کی نیند سو رہا ہے۔" کام کا ٹھیکہ کون پورا کرے گا تیرا باپ؟"

اس شور سے بادشاہ کی نیند ٹوٹ گئی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے ایک شخص تن کر کھڑا تھا بادشاہ نے اس ظالم سے کہا۔" وہ بے چارا دن بھر کا تھکا ہوا ابھی سویا ہے تم اسے گالیاں کیوں دے رہے ہو؟"

چپ رہ بدتمیز! تو کون آیا اس کی طرفداری کرنے والا میں اس کا نگراں ہوں تو نہیں جانتا یہ بڑا کام چور آدمی ہے۔ اسے اس کی بے ایمانی کی سزا ملنی ہی چاہیے۔ ٹھیکہ دار کا نوکر مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

بادشاہ کو اس کی ڈھٹائی زبان درازی پر غصہ آیا اس نے ڈپٹ کر کہا۔" خبردار جو تم نے اس کو نیند سے جگایا میں تمھیں اس کلہاڑی سے چیر کر رکھ دوں گا۔"

نگراں سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر بادشاہ کو گھورتے ہوئے بولا۔ اچھا ذرا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں تمھیں اس بدتمیزی اور گستاخی کا مزہ چکھانے۔ اور وہ پیر پٹکتا ہوا چلا گیا۔

صبح سے بادشاہ کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے محل میں اور شہر میں گھبراہٹ پھیل گئی تھی۔ ہر طرف بادشاہ کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ دن بھر ادھر اُدھر تلاش کیا گیا مگر کوئی پتہ نہیں ملا۔

ایک سپاہی جنگل میں بادشاہ کی تلاش میں ٹھیک اس جگہ پہنچا جہاں سے کچھ دوری پر بادشاہ اور لکڑہارا دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

راستے میں اُسے بادشاہ سے ڈانٹ سن کر لوٹتا ہوا ٹھیکہ دار کا نوکر ملا۔ سپاہی نے اس سے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔ نوکر نے کہا میں اس جنگل کا نگراں ہوں۔ اور یہاں مزدوروں کے کام کی نگرانی کر رہا تھا پھر سپاہی نے پوچھا۔۔۔ کیا تم نے یہاں کہیں بادشاہ سلامت کو دیکھا ہے؟

حضور بادشاہ سلامت کو تو نہیں دیکھا۔ یہاں تو صرف لکڑی کاٹنے والے مزدور کام کر رہے ہیں۔ ہاں ایک اجنبی آدمی یہاں اُسی درخت کے نیچے بیٹھا ہوا شیخی بگھار رہا ہے۔ وہ دیکھو اس کاہل مزدور کے ساتھ کھڑا ہے۔

اس سپاہی نے بادشاہ کو پہچان لیا اور اس کے منہ سے خوشی کے عالم میں نکل گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہ سلامت مل گئے۔ اتنے میں دوسرے سپاہی اور سپہ سالار گھوڑے پر سوار وہاں پہنچے۔ انھوں نے جب بادشاہ سلامت کو سادہ معمولی لباس میں دیکھا تو حیران ہوئے پھر قریب جاکر ادب سے جھک کر سلام کیا اور ادب سے کہا۔"خدا کا شکر ہے کہ جہاں پناہ یہاں خیریت سے ہیں ہم صبح سے آپ کی تلاش میں جنگل جنگل مارے مارے

باقی صفحہ ۲۹ پر

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

# دُنیا کے عجیب و غریب جانور

(۳)

## افعی

افعی ایک قسم کے سانپ کی مادہ ہے۔ نر کو افعوان کہتے ہیں۔ افعی کی گردن پتلی ہوتی ہے۔ سر چوڑا ہوتا ہے اور دم چھوٹی ہوتی ہے۔

پُرانا ہونے پر کبھی کبھی اس کے دو سینگ بھی نکل آتے ہیں یہ سانپ ایک ہزار سال تک زندہ رہتا ہے اس کا رنگ سیاہ چمکدار ہوتا ہے۔ گویا ریشمی کپڑا پہنا دیا گیا ہو۔

یہ سانپوں میں سب سے زیادہ خبیث ہے۔ اس کی آنکھ پھوڑ دی جائے تو پھر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ دُم کاٹ دی جائے تو دوبارہ نکل آتی ہے۔ اس کی کچلیاں توڑ دی جائیں تو تین دن کے بعد پھر بدستور نکل آتی ہیں۔ سر کچل دیا جائے یا اسے ذبح کر دیا جائے تو اس کا بدن تیس دن تک حرکت کرتا رہتا ہے۔ جاڑے میں چار مہینوں کے لیے یہ زمین کے اندر چھپ جاتا ہے۔

یہ سانپ بیمار ہوتا ہے تو زیتون کی پتی کھاتا ہے اور ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کا سخت دشمن ہے۔

اس کا زہر بہت تیزی سے اثر کرتا ہے۔ کہا جاتا کہ ایک افعی نے ایک اونٹنی کے ہونٹ میں کاٹ لیا، اس وقت اونٹنی کا بچہ دودھ پی رہا تھا۔ افعی کے کاٹتے ہی پہلے بچہ مرا پھر فوراً ہی اونٹنی مر گئی۔

یہ اپنے واسطے خود بل نہیں بناتا بلکہ دوسرے جانوروں کے بل میں گھس جاتا ہے۔ جس کے بل میں جاتا ہے وہ جانور بل چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اور پھر کبھی پلٹ کر اس بل کی طرف نہیں دیکھتا۔

## انکلیس

یہ ایک مچھلی ہے جو سانپ کی طرح ہوتی ہے اس کو "مار ماہی" بھی کہتے ہیں یہ مکروہ ہے اسی لیے اسے لوگ نہیں کھاتے ہیں اس کے دو پاؤں ہوتے ہیں۔ یہ پاؤں دُم کے قریب ہوتے ہیں۔ ہاتھ نہیں ہوتے ہیں۔ اور یہ بصرہ کی نہروں میں زیادہ ہوتی ہیں۔

## ڈیول ٹاسمانیہ

اس کی شکل صورت کچھ کچھ بھالو سے ملتی ہے۔ بالوں کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ مگر بعض کے جسم پر سفید پھول بھی ہوتے ہیں۔ یہ خون خوار جانور ہے اس کی کھوپڑی اور چہرہ اتنا چوڑا ہوتا ہے کہ اس کی شکل بھیانک معلوم ہوتی ہے۔

اس کے اگلے پنجے میں پانچ پانچ اور پچھلے میں چار چار ناخن ہوتے ہیں۔ اوپری جبڑے میں دونوں طرف چار اور نیچے تین کانٹے دار چھوٹے چھوٹے دانت ہوتے ہیں۔ یہ آسٹریلیا۔ نیوگنی اور تسمانیہ کے جزیروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بھیڑوں کا دشمن ہوتا ہے۔

★

# پہلی بارش

جناب ڈاکٹر امانت

"گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں"[1]
کیوں نہ ہم صحن میں اب شوق سے اُچھلیں کودیں
ختم ہونے کو ہے اب جلد ہی یہ ماہِ مئی
جس کی گرمی سے شب و روز ہوا بند رہی
سمتِ مغرب سے گھٹا جھوم کے اُٹھی، برسی
پھر سے ہونے لگی سیراب پیاسی دھرتی
مہرباں کتنا ہے دنیا کا بنانے والا
سخت گرمی سے زمانے کو بچانے والا
ڈھل گیا سارا جہاں اور چھٹا گرد و غبار
پھر درختوں کے بھی پتوں پہ ہے اک تازہ نکھار
چہچہاتی ہیں، پھدکتی ہیں خوشی سے چڑیاں
کیسے پانی میں نہاتی ہیں خوشی سے چڑیاں!
خوش، پرندے ہیں تو مسرور چرندے سارے
شکرِ معبود بجا لاتے ہیں بندے سارے
کیا سہانی ہے دھنک! کتنا ہے دلکش منظر!
آیئے کھیل کے میدان میں کھیلیں جا کر
کیف میں ڈوبی ہوا ساتھ میں لائی ٹھنڈک
کھیل کا لطف بڑھا، دل نے بھی پائی ٹھنڈک
بھیگتے ہم ہیں تو ہنستے ہیں صغیر اور کبیر
کتنے پُر لطف ہیں بادل سے برستے ہوئے تیر!
کوئی بوچھار، تو کہتا ہے انھیں کوئی پھوار
ہم سمجھتے ہیں ہمارے لیے آئی ہے بہار
ایک نعمت ہے حقیقت میں یہ پہلی بارش

---

[1] یہ مصرعہ قتیل شفائی کا ہے

جناب ولی تنویر

# آنسو کے پھول

انور کی زندگی کا شائد ہی کوئی ایسا واقعہ ہو گا جو مجھ سے چھپا رہا ہو۔ اُس کی زندگی میرے لیے ایک کھلی کتاب تھی۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بڑی ہی سادہ اور دلچسپ زندگی تھی۔ اس نے شہر کے غیر معروف محلے میں ایک کمرہ کرایہ پہ لے رکھا تھا۔ اس میں وہ تنہا رہا کرتا۔ اس کے ماں باپ گاؤں میں رہتے تھے۔ بچپن ہی سے وہ بڑا ذہین لڑکا تھا۔ گاؤں کی وسطانوی درجے کی تعلیم ختم کر لینے کے بعد جب شہر آیا تو رہنے سہنے کا مسئلہ اس کے لیے بہت کٹھن بن گیا۔ شہر میں کسی سے جان پہچان نہ تھی۔ انور کے ماں باپ اس قابل نہ تھے کہ اس کے لیے شہر میں کوئی خاطر خواہ انتظام کروا سکیں۔ انور کے باپ ایک غریب کسان تھے بھلا کس طرح اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلوا سکتے ہے۔ گاؤں کی تعلیم دلوانا ہی ان کے لیے بار تھا۔ لیکن انور نے ان سے کہا "میں آپ پر کسی کا بوجھ نہ بنوں گا۔ اپنا تعلیمی خرچ جیسے تیسے پورا کر لوں گا صرف مجھے شہر جا کر تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دیجیے!" اس کے خیال کی تائید گاؤں کے اور بزرگوں نے بھی کی۔ اس طرح وہ شہر آگیا اور شہر کے ایک فوقانیہ مدرسہ میں داخلہ لے لیا ساتھ ہی شہر کے غیر معروف محلے میں سستے کرایہ والا کمرہ بھی حاصل کر لیا!

اس کی زندگی واقعی قابلِ رحم تھی۔ وہ زندگی کے ایک طویل اور صبر آزما میدان کا تنہا مسافر تھا۔ زمانے کے ناموافق حالات اُس کی زندگی کو بُری طرح ستا رہے تھے۔ لیکن اس نے بہت صبر کے ساتھ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں میں نے ایک چمک دیکھی تھی ایک ایسی چمک جس سے امید بیم کی روشنی جھلکتی تھی۔

ایک دن میں ایک کتاب کی تلاش میں اسکول کے کتب خانہ پہنچا اس دن پہلی بار وہاں انور سے ملاقات ہوئی اور وہ ملاقات رفتہ رفتہ دوستی کے مقدس رشتے میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے دوستی کے اس مقدس رشتے کی صحیح قدر قیمت کا اندازہ ہوا۔

پہلے پہل تو میں اس کی زندگی کو ایک پرسکون اور خاموش زندگی سمجھتا رہا اس دریا کی مانند جس میں کوئی تموج نہیں کوئی ولولہ نہیں! لیکن جب مجھے اس کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس کی زندگی کی کتاب کو غور سے پڑھا تو یہ نتیجہ نکلا کہ انور ایک دن ضرور بہت بڑا آدمی بنے گا۔ ضرور قوم اور ملک کا نام روشن کرے گا۔

وہ صبح سویرے اُٹھ جاتا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر اپنا کھانا خود تیار کرتا۔ پھر اسکول کا کام کرتا اور اسکول کے لیے روانہ ہو جاتا۔ اسکول میں اس کے ملنے جلنے والے بہت کم تھے۔ دن بھر اپنا کام بہت سلیقہ، ہوشیاری اور محنت سے انجام دیتا اور شام میں اپنے کاروبار کے لیے چلا جاتا۔ اس نے ایک چھوٹی موٹی سی تجارت شروع کر دی تھی اسی سے وہ اپنی ضروریات پوری کر رہا تھا۔

ایک دن میں نے اس کی اس نپی تُلی زندگی کے بارے کہا تھا "انور یار تم بڑے اصول پرست آدمی ہو یار! ہر لڑکے کو تمھاری پیروی کرنی چاہیے۔" تب اس نے کسی گہری سوچ سے جاگتے ہوئے کہا تھا "ہاں آصف! مجھے بہت محتاط زندگی گزارنی ہے۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی جسمانی صحت کا بھی قابلِ لحاظ حد تک خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر کسی کام میں ذرا بھی لاپروائی کروں تو مجھے بہت پریشان ہونا پڑے گا۔" قدرے توقف کے بعد جملہ پورا کرتے ہوئے اس نے بہت ہی کام کی بات کہی "آصف میں سمجھتا ہوں انسانی زندگی میں لڑکپن کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جو زندگی کو بہتر یا بدتر بنا سکتا ہے۔ اگر اس زمانے میں کسی آدمی کے قدم لڑکھڑا گئے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ پھر کبھی سنبھل سکے گا۔ اگر ہم اس عمر میں صحیح راستہ اختیار کرلیں، محنت اور جستجو کی عادت ڈالیں تو پھر ہماری منزل بہت قریب کھڑی ہمیں خوش آمدید کہے گی۔ زندگی آرام چین اور سکون سے گذرے گی!!"

"صرف کھانا پینا اور موج اڑانا زندگی کا مقصد نہیں۔ بہت اور بھی مقاصد ہیں اس زندگی کے۔ ہر لڑکے کو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا چاہیے۔"

اکثر وہ اسی طرح بلند حوصلہ باتیں کیا کرتا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس نے اس کم عمری میں کس قدر بہتر منصوبے بنا لیے ہیں اپنی آنے والی زندگی کے!

اس کی دوستی نصیب ہونے کے بعد میری زندگی میں بھی کافی تغیر آگیا تھا۔ میں اس کے بہت قریب رہنے لگا تھا اور اس کی زندگی کی شمعِ فروزاں سے میرا احساس بھی گرم ہونے لگا تھا! ہماری مثالی دوستی کے چرچے سارے مدرسے میں ہونے لگے۔ میں خوش تھا کہ مجھے ایک اچھا دوست مل گیا ہے۔ لیکن ہر اچھی جگہ برائی بھی ہوا کرتی ہے کچھ لڑکوں کو ہمارا ملنا جلنا پسند نہ تھا۔ وہ ہماری دوستی سے جلتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہماری دوستی کسی طرح دشمنی میں تبدیل ہو جائے۔ اور میں ان کے اِن بُرے خیالات سے واقف نہ تھا۔ ادھر وہ لوگ ہم دونوں کے درمیان برابر زہر گھولے جا رہے تھے آخر کار ایک دن وہ زہر اپنا کام کر گیا اور ہم دونوں میں بدگمانی کی ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ اس طرح اُن شیطانوں کا منصوبہ کامیاب ہوا۔ میرے اور انور کے درمیان نفرت، حقارت اور بدگمانی کی ایک موٹی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی!

میں ایک اچھے دوست کی دوستی سے محروم ہو گیا۔ اُس سے دور ہونے کے بعد میری تعلیمی حالت بھی خراب ہونے لگی اور میں امتحان میں بُری طرح ناکام ہو گیا!۔ اس امتحان میں ناکام ہو جانا میرے لیے اپنی زندگی کی پہلی منزل میں ناکام ہونے کے برابر تھا۔ میں اب کہیں کا نہ رہا تھا۔ دوست احباب کے ساتھ ساتھ میرے گھر والے اور عزیز و رشتہ دار بھی مجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ میں اب انور سے بھی آنکھ ملانے کے قابل نہ رہا تھا۔ میری ناکامی کے اسباب مجھے اچھی معلوم تھے۔ شہر کے در و دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ میں بُری طرح بوکھلا ہوا تھا اور بالآخر اس غم کو دور کرنے کے لیے میں نے اس شہر کو چھوڑ دیا اور بہت دور گاؤں میں ایک کھوکھلی اور بے مقصد زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کے بعد انور سے کوئی ملاقات نہ ہوئی!!!

لیکن آج میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی

میرے سامنے آج کا تازہ اخبار پڑا تھا۔ اس میں انور کی تصویر چھپی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز امریکہ جا رہا تھا۔

میں اڑا اڑا سا شہر آیا۔ ہوائی اڈے پر لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔ یہ لوگ انور کو خدا حافظ کہنے آئے تھے انور کے ملنے جلنے والوں میں بہت بڑے بڑے آدمی تھے۔ بہت سے لوگ اس کے گلے میں ہار ڈال رہے تھے میں ایک کونے میں کھڑا اپنی اشک بار آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد انور کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ لوگوں کو چیرتا ہوا میرے قریب آ گیا اور ہم دونوں لپٹ گئے۔ لوگ حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے کہ انور کو یہ اچانک کیا ہو گیا۔ ایک غلیظ گنوار سے کیوں لپٹ گیا۔ لیکن وہ ہمارے رشتے سے ناواقف تھے۔

پھر تھوڑی دیر بعد ایک بڑا طیارہ انور کو لے کر امریکہ کے لیے پرواز کر گیا۔

میری آنکھیں اب بھی پرنم تھیں میں سوچ رہا تھا کہ ان آنسوؤں کو کیا نام دوں !!

---

## لطیفہ

ایک فقیر نے ایک آدمی سے پیسے مانگے۔ آدمی بولا "میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔ پھر فقیر بولا "تو ایک پھٹا پرانا کوٹ دیدو" آدمی بولا "میرے پاس نہیں ہے"

فقیر بولا۔ "تو ایک روٹی ہی دیدو"

آدمی نے کہا "بھئی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے"

فقیر بڑے طنز سے بولا: "یہ کچھ بھی نہیں ہے تو میرے ساتھ چل کر بھیک مانگو۔"

# وہ غریب لڑکا

مدت گزر گئی مگر یہ کہانی رہتی دنیا تک دہرائی جائے گی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ نیک اور بہادر انسان جو اپنی قوم اور وطن کی بے لوث خدمت کرتے ہیں کبھی نہیں مرتے۔

فرانس میں ایک بے حد غریب لڑکا رہتا تھا۔ اس غریبی اور بے کسی کے عالم میں بھی اس کا پڑھائی کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا یہ جذبہ دیکھ کر اس کے دوستوں نے اس کی مدد کرنے کی ٹھانی اور اس کی تعلیم کا بندوبست کر دیا۔

یہ لڑکا جس اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کی عمارت کے کونے پر ایک عورت روزانہ پھل فروخت کیا کرتی تھی سب ہی لڑکے اس سے پھل خریدا کرتے تھے۔ وہ غریب لڑکا بھی کبھی کبھی پیسے اکٹھا کر کے پھل خریدا کرتا تھا۔ جب اس کی جیب پھل خریدنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ تو وہ اس عورت سے ادھار پھل لے لیا کرتا تھا۔

وہ کب تک دوستوں کی مدد پر رہ سکتا تھا۔ آخر اس نے اسکول کو خیرآباد کہا اور اسکول چھوڑنے کے بعد آوارہ گھومنے کی بجائے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہاں بھی اس نے ایمانداری اور شرافت کا دامن نہیں چھوڑا، دن رات محنت اور لگن سے اپنا فرض نبھاتا رہا۔ ایک دن اس کے لیے بے انتہا خوشیوں کا پیغام لایا۔ اس کی محنت اور شرافت رنگ لائی اور وہ معمولی سپاہی سے بادشاہ بن گیا۔

بادشاہ بننے کے بعد بھی وہ بیتے دنوں کے آئینے میں جھانکا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اِدھر اُدھر گھومتا ہوا اس اسکول کے پاس سے گزرا جہاں اس کے تکلیف و مصیبت کے کٹھن دن بیتے تھے۔ ماضی کی ساری باتیں پرچھائیوں کی طرح نظر آنے لگیں وہ یکایک رک گیا وہاں اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ "وہ بڑھیا جو یہاں پھل فروخت کیا کرتی تھی آجکل کہاں ہے؟"

لوگوں نے اس عورت کا پتہ بتا دیا وہاں پہنچ کر اس نے ایک ٹوٹے ہوئے مکان پر رک کر کنڈی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔ جس کے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ اور بال برف کے مانند سفید تھے۔ یہ وہی عورت تھی جو اسکول کے پاس پھل فروخت کیا کرتی تھی۔

اس نے نزدیک جا کر کہا "مجھے پہچانتی ہو؟"

بڑھیا نے حیرت سے کہا۔ "نہیں میں تم کو نہیں جانتی ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے کہا "کوئی غریب لڑکا تم سے پھل خریدا کرتا تھا کبھی کبھی ادھار بھی؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "نہیں! مجھے کچھ بھی خیال نہیں کوئی لیتا ہو گا۔"

باقی صفحہ ۳۹ پر

# نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔
اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی چھپی ہیں ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شائع ہوئی ہیں

(۱) باپو حصّہ اوّل مصنف: سی فرنکاس مترجم: صالحہ عابد حسین
(۲) باپو " دوم " " " : " "
(۳) کشمیر مصنف: مالا شگھو مترجم: خدیجہ بیگم: تصویر: پیمانند
(۴) پہندوؤں کی دُنیا: مصنف: جمال آرا مترجم: محمد شفیع الدین نیر
(۵) ہمالیہ کی چوٹیوں پر " : بریگیڈیر گیان سنگھ ": محمد ذاکر
(۶) ہماری ندیوں کی کہانی " : لیلا مجمدار " : رضیہ سجاد ظہیر
(۷) جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں " : لیلا بھاگوت " : " "
(۸) آزادی کی کہانی (حصّہ اوّل) " : وشنو پربھاکر " : انور کمال حسینی
(۹) رسیلی کہانیاں " : منوج داس " : صغرا مہدی
(۱۰) ہماری ریلیں " : جگجیت سنگھ " : عرش ملسیانی
(۱۱) ہندوستان میں غیر ملکی سیّاح " : کے سی کھنّہ " : تصاویر: کرشن کھنّہ
(۱۲) آؤ ناٹک کھیلیں " : اوما نندا " : رفیعہ منظور الامین
(۱۳) غالب کا خاندان " : منوہر داس چترویدی " : محمد شفیع الدین نیر
(۱۴) بہت دن ہوئے حصّہ اوّل " : چوسی بی ام جوشی " : رضیہ سجاد ظہیر
(۱۵) بہادروں کی کہانیاں : راجندر اوستھی " : انور کمال حسینی
(۱۶) رُتُو ہنت دنندریہ مصنف: کرشن چیتنیہ مترجم: انور کمال حسینی
(۱۷) سدا بہار کہانیاں " : شانتا رنگاچاری " " "
(۱۸) ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (اوّل) " : میر نجابت علی " : سیّد احسان
(۱۹) " " (دوم) " : " " : " "
(۲۰) بڑا پانی " : لیلا مجمدار " : صالحہ عابد حسین
(۲۱) سویرا " : ملک راج آنند " : انور کمال حسینی
(۲۲) ہاکی کا کھیل " : سردیندر سانیال " : پریتم لال

## ذاکر حسین سیریز

| | | قیمت |
|---|---|---|
| (۲۳) ابوخاں کی بکری | مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین | ۳/- |
| (۲۴) انوکھی دکان | " : قدسیہ زیدی | ۲/۵۰ |
| (۲۵) گلابو چوہیا اور پریزاد | " : " | ۲/- |
| (۲۶) دنیا کے جانور | " : " | ۲/۵۰ |
| (۲۷) راجہ رام موہن رائے | " : عرش ملسیانی | (زیرِ طبع) |

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

جناب محمد سلیم الدین حیدرآباد

# خلائی پرواز کی کہانی خود زمانے کی زبانی

ہم لوگ جو اس بیسویں صدی عیسوی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ پرانا خواب بڑی تیزی سے حقیقت بنتا جا رہا ہے۔ یہ خواب بالائی فضا یعنی خلاء میں چھپے ہوئے اسرار کو منکشف کرنے کا ہے۔

۴۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء کے دن اس خبر سے کہ روس مصنوعی سیارہ خلاء میں بھیجنے میں کامیاب ہو گیا ہے، گویا برقی رو دوڑ گئی۔ سب اس بات سے حیران تھے کہ یہ سیارہ زمین کے گرد ایک مدار میں چکر لگائے گا۔ خلائی پرواز کی باقاعدہ ابتدا ۴۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء ہی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی ابتدا دراصل روسی سیارہ سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ ابھی انسان کے پاس راکٹ یا مصنوعی سیارے بھیجنے کے ذرائع بھی نہ تھے کہ اس نے خلا کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

خلائی تحقیق کا کام اسی وقت شروع ہو گیا تھا جب انسان کو معلوم ہوا کہ صرف اِس کا سیارہ (یعنی زمین) ہی خلاء میں نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی اجرام خلاء میں اِدھر اُدھر تیر رہے ہیں۔ اس کا ذکر ہمیں سب سے پہلے "پلوٹارک" (PLOTARK) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔

خلاء کی عملی تحقیق کی طرف پہلا قدم سولھویں صدی عیسوی ۱۶۰۸ء میں دوربین کی ایجاد تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدیوں کے دوران ماہرین نجوم نے اجرام فلکی کے نقشے تیار کیے اور جدید خلائی تحقیق کے لیے بنیادیں تیار کیں۔ ان ماہرین میں کوپرنیکس (COPERNEKUS) اور جونز کیپلر (JOHNS KAPLUR) تھا گیلیلو (GALELU) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خلاء میں پہنچنے سے پہلے ان کو ایسے وسیلوں (ذرائع) کی ضرورت تھی جن کی رُو سے (مدد سے) وہ اپنے آلات کو زمین کی فضا سے آگے پہنچا سکیں اور اس کے لیے ایک ایسی قوت کی ضرورت تھی جسے پیدا کرنے کے لیے ہوا درکار نہ ہو۔

کیونکہ بالائی فضاء یا خلاء میں ہوا یا تو بالکل نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت تھوڑی مقدار میں راکٹ کے انجن کی یہی خصوصیات تھیں۔ اولین خلائی جہاز کے بیرونی فضاء میں بھیجے جانے سے صدیوں پیشتر راکٹ کا وجود تھا۔ لکن یہ راکٹ ابھی ایسی ابتدائی شکل میں تھا کہ اسے خلائی جہاز کے کام میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔

۱۲۳۶ء میں چینیوں کے ہاں راکٹ کا استعمال جنگوں کے لیے تھا۔ یہ راکٹ جنہیں وہ "آتشیں تیر" کہتے تھے۔ حملہ آور منگولوں کے خلاف استعمال کرتے تھے اس کے بعد صدیوں تک یہ راکٹ بطور ہتھیار کے استعمال ہوتے رہے اور آخر کار انیسویں صدی عیسوی ۱۸۵۵ء میں توپ خانے کی ایجاد نے ان کا استعمال ختم کر دیا کیونکہ توپ ان کے مقابلے میں زیادہ صحیح نشانے پر مار سکتی تھی۔

ان سینکڑوں برسوں میں قدیم راکٹوں میں کئی تبدیلیاں ہوئیں لیکن راکٹ یا ہوائیاں تھوڑے فاصلے تک مار کرنے والے ہتھیار آگے نہ بڑھ سکے۔

جناب نجم اقبال

# عقلمند اندھا

کسی شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کو دکھائی دیتا تھا۔ اور ایک تھے اندھے میاں یہ دونوں بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ایک دن اندھے نے کہا:۔

"کیوں نہ ہم لوگ کسی دوسری جگہ چلے جائیں یہاں تو اب کچھ ملتا نہیں" اس کے ساتھی کو بھی یہ بات پسند آئی اور دونوں پردیس چل دیے۔

راستے میں ایک ٹوٹا ہوا سوپ (جس سے اناج پھٹکتے یا چھڑتے ہیں) ملا ساتھی نے کہا "ایک ٹوٹا ہوا سوپ پڑا ہے"، اندھے نے کہا "اٹھا لو پنکھے کا کام دے گا" پھر آگے چلے تو ایک گدھا ملا دونوں نے گدھے کو پکڑ لیا اور اس پر سوار ہو گئے پھر آگے بڑھے تو ایک جگہ ایک ڈھینکلی ملی ساتھی نے کہا "ایک ڈھینکلی پڑی ہے"۔ اندھے نے کہا "اٹھا لو کچھ کام آئے گی۔ پھر اور آگے چلے تو ایک گیدڑ ملا۔ اندھے نے پوچھا "یہ کیا چیز ہے"، ساتھی نے کہا "گیدڑ" ہے۔ اندھا بولا "پکڑ کر اسے باندھ لو"، پھر ایک عورت دہی کا مٹکا لیے جا رہی تھی اندھے نے پوچھا "یہ کون جا رہا ہے"، ساتھی نے کہا "ایک عورت دہی کا مٹکا لیے جا رہی ہے" اندھا بولا دہی چھین لو اس طرح یہ سب سامان لے کر وہ لوگ آگے بڑھے۔

ایک جنگل میں ایک مکان تھا اس کا دروازہ سات منزل کی عمارت کے برابر تھا دونوں اس گھر میں گئے دراصل یہ مکان ایک گوریلے کا تھا تھوڑی دیر میں وہ گوریلا آیا دروازہ بند دیکھ کر وہ بہت غصے میں آ کر بولا۔

"کون ہے جس نے میرے مکان پر قبضہ کیا ہے" اندھے نے اپنے ساتھی سے کہا ذرا دیکھو تو کون آیا اس نے دیکھا تو ڈر کر بے ہوش ہو گیا اندھا سمجھا کہ سو گیا پھر وہ خود گیا اور بولا "کون ہو تم"

گوریلا بولا "میں بن مانس ہوں"

اندھا بولا "تم بن مانس ہو تو میں داس بن مانس ہوں پھر کیا ثبوت ہے کہ تم بن مانس ہو"

گوریلا بولا "تم کون سا ثبوت دے سکتے ہو"

اندھا بولا "ابھی لو"

یہ کہہ کر اس نے سوپ باہر پھینک دیا۔

گوریلا بولا "یہ کیا ہے"

اندھا بولا "میرا ایک کان جو سوکھ گیا تھا"

گوریلا کچھ ڈر گیا اس نے کہا کچھ اور ثبوت

اندھے نے ڈھینکلی باہر پھینک دی اور کہا "میری کمر پر باندھی جاتی ہے"

گوریلا کچھ اور ڈرا اور بولا "کچھ اور"

باقی ص ۳۹ پر

نظم

# بچّے کی دعا

دِل کی پکار سُن لے اے دوجہان والے
حاضر ہیں تیرے در پہ ہم بچّے بھولے بھالے

دل میں چراغ دیں کا جلتا رہے ہمارے
نیکی کا من میں دریا چلتا رہے ہمارے
اب دے ہمیں سہارا اپنا ہمیں بنالے
دل کی پکار سُن لے اے دوجہان والے

دل سے ہو دُور اپنے دنیا کی ہر برائی
ہم سب کے کام آئیں، سب کی کریں بھلائی
اچھا ہمیں بنادے دنیا بنانے والے
دل کی پکار سُن لے اے دوجہان والے

علم و ہنر کی دولت یارب ہمیں عطا کر
ہم چاند بن کے چمکیں، عزّت ہمیں عطا کر
پھر کیسے گر سکیں گے، گر تو ہمیں سنبھالے
دل کی پکار سُن لے، اے دوجہان والے

اچھے ہوں کام اپنے ایسا ہمیں بنادے
جو ہو سکے نہ ممکن تو کرکے وہ دکھادے
ہم تیرے ہو گئے ہیں تو چاہے آزمالے
دل کی پکار سُن لے، اے دوجہان والے

سیّدہ عنوان چشتی

## بچوّں کی کوششیں

لکھّا جو آپ نے مجھے، خط آج مِل گیا
مضمون مجھ سے آپ نے مانگا ہے برملا
ایک عرصہ ہو گیا ہے مجھے کرتے شاعری
مضمون نگاری مجھ سے نہ ہو پائے گی کبھی
گر چاہیے ہے آپ کو مضمون مجھ سے ایک
تو پہلے بھیج دیں مجھے کچھ بسکٹ اور کیک
شاید ہو منگا رام کے بسکٹ میں یہ اثر
لکھوادے مجھ سے ایک ہی مضمون پر اثر
برٹینیا بھی ایک ہے مشہور کمپنی
ممکن اگر ہو بھیج دیں اس کی ورائٹی
ہو سکتا ہے کہ ڈالمیا میں ہو یہ اثر
سنتا ہوں میں کہ اس کے بھی بسکٹ ہیں بیشتر
اب دیکھنا ہے کہ آپ کا کیا ہوگا فیصلہ
بسکٹ جو آئیں سامنے بڑھ جائے حوصلہ
گر آپ بھیج دیں مجھے بسکٹ کا ایک ٹن
تو پھر معاوضہ میں چلے خوب میرا پین

سیّد منور باسط

بچوں کی کوششیں

# انوکھا منتر

بہت دن پہلے کی بات ہے کسی شہر میں ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا رامو۔ باپ کی شہر میں بہت عزت تھی لیکن رامو بالکل آوارہ تھا۔ برے لوگوں کی سنگت میں پڑکر رامو دن رات جوا کھیلنے اور شراب پینے میں گذارتا۔ دولت مند باپ اس کی ان عادتوں کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ اس نے کئی بار رامو کو سمجھایا، دھمکایا، مارا پیٹا لیکن رامو میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ دونوں برائیاں جڑ پکڑ جاتی ہیں تو مشکل سے چھوٹتی ہیں۔

اس شہر میں برگد کا ایک بڑا سا پیڑ تھا۔ ایک بار ایک بزرگ سادھو اس پیڑ کے نیچے آکر ٹھہرے۔ اور کچھ ہی دن بعد سارے شہر میں ان کے علم کی شہرت ہوگئی رامو نے سنا کر برگد والے سادھو کے پاس کوئی ایسا منتر ہے جس پر عمل کرتے ہی انسان کو گڑے ہوئے خزانے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ سنتے ہی رامو للچا اٹھا اور دوڑا ہوا سادھو مہاراج کے پاس پہنچا۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ اور با ادب بیٹھنے کے بعد اس نے منتر سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

سادھو مہاراج مسکرائے اور بولے "منتر تو بہت آسان ہے لیکن اس کا عمل مشکل ہے۔ ہاں پورا ہو جانے پر دولت بھی ملے گی۔ منتر سکھلانے سے پہلے میں تمھارا ایک چھوٹا سا امتحان لوں گا اس امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد ہی تم کچھ سیکھ سکوگے۔ آج شام سے تمھیں نڈر ہوکر دس بار سچ بولنا پڑے گا۔

"یہ کیا مشکل ہے" رامو نے شرط فوراً منظور کرلی۔ بھلا بوڑھے سادھو نے ایسے آسان امتحان کی بات کی وہ دل ہی دل میں کھلا جا رہا تھا۔

بہر حال سادھو کے پاس سے رامو جوا کھیلنے کے اڈے پر پہنچا۔ خوب جوا کھیلا اور جب سب پیسے ختم ہوگئے تو چوری کرنے نکل پڑا۔

اتفاق سے اسی رات شہر کا راجہ بھیس بدل کر اپنی پرجا کا حال جاننے کے لیے شہر میں گھوم رہا تھا۔ اندھیری رات میں رامو کو گھومتے دیکھا تو اس نے کڑک کے پوچھا "کون ہو؟" اتنی رات گئے آوارہ سے کیوں گھوم رہے ہو؟"

"میں رامو چور ہوں اور راج محل میں چوری کرنے جا رہا ہوں" رامو نے نڈر ہوکر جواب دیا۔ سادھو سے منتر سیکھنے کے لیے اس نے پہلا سچ بولا۔

راجہ حیران ہوگیا اسے یقین نہ آیا کہ یہ واقعی چور ہے۔ بھلا کوئی چور اس قدر بے خوفی سے اپنے چور ہونے کا اقبال کر سکتا ہے!

"اچھا بھائی جاؤ" راجہ نے نرمی سے جواب دیا لیکن ایک کام ہمارا بھی کردو۔ جتنا مال چرا کر لاؤ ہمیں اس کی تفصیل بتا دینا۔ ہم یہیں تمھارا انتظار کریں

رامو مان گیا۔ آنکھ بچا کر وہ راج محل میں گھس گیا۔ پہرے دار اونگھتے رہ گئے اور وہ چوری کرکے باہر آگیا باہر راجہ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کہو کامیابی ہوئی؟" اس نے دھیرے سے پوچھا

"ہاں یہ دس ہزار روپے لایا ہوں" راموں نے تھیلی سامنے کردی۔ سچ کی ایک کڑی اور جڑ گئی!

دوسرے دن راج محل میں زبردست شور مچ گیا۔ پہرے دار ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ خزانچی بدحواس ہوکر دوڑا۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے اس نے راجا کو بتایا کہ رات کو شاہی خزانے میں چوری ہوگئی۔ پہرے داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پچاس ہزار روپے اڑالے گیا۔ راجہ نے راموکو پکڑ کر دربار میں بلوایا اور چوری کے لیے پوچھا۔ راموں نے فوراً قبول کرلیا۔ یہ اس کا تیسرا سچ تھا۔

"میں نے رات دس ہزار روپے چرائے تھے پانچ ہزار جوئے میں ہار گیا۔ پانچ ہزار یہ ہیں۔" کہتے ہوئے اس نے دھوتی میں بندھے ہوئے روپے راجہ کے سامنے ڈال دیئے۔

راموکی بات سن کر خزانچی گرج اٹھا۔ "جھوٹے کتے! باقی چالیس ہزار کہاں ہیں۔ سچ سچ بتا ورنہ کوڑوں کی مار سے چمڑی ادھڑوا دوں گا" راموں چپ چاپ کھڑا رہا۔ اسے کیا معلوم باقی روپے کون لے گیا۔

"میں بتاتا ہوں باقی روپیہ کہاں ہے" اچانک راجہ کی بارعب آواز سنائی دی۔ "چالیس ہزار روپیہ تمھارے گھر رکھا ہے۔ جو تم نے چوری کی خبر پاتے ہی غائب کردیے ہوں گے۔ کوڑے اس کی نہیں تمھاری چمڑی ادھیڑیں گے۔"

خزانچی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا سب ہی حیران تھے کہ راجہ کو کیسے علم ہوگیا۔ راجہ نے رات والا واقعہ سب کو سنایا اور راموکی سچائی کی تعریف کی اور فوراً ہی راموکو اپنا نیا خزانچی مقرر کردیا۔

مگر کبھی پھر اس منتر کا کیا ہوا جو اس سادھو نے سکھانے کو کہا تھا۔ ہم نے بھی یہی سوال کیا تھا تو جواب ملا کہ اتنے بڑے راج محل کا خزانچی بننے کے بعد راموکو اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ وہ اپنے دس سچ گنتا اور منتر سیکھنے جاتا۔ یوں بھی سچ بولنے کی اہمیت اسے معلوم ہوگئی تھی اور اب وہ ایک اچھا آدمی بن چکا تھا۔ بہرحال ہم تمھیں بتا سکتے ہیں کہ وہ منتر کیا تھا۔ سادھو جہاراج کا منتر عزت، دولت اور شہرت دینے والا منتر تھا۔

"نڈر ہوکر ہمیشہ سچ بولو"

شبنم مسیح الزماں

---

# سرکار دو عالم

از: محمد حسین حسّان ندوی ایڈیٹر پیام تعلیم

اس کتاب کا ذکر پیام تعلیم میں کئی بار آچکا ہے پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ اب شائع ہوگئی ہے اور آسانی سے مل سکتی ہے۔ بہت ہی سادہ اور نکھری ستھری زبان میں لکھی گئی ہے۔ انداز بیان بھی غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے۔ مدتوں بہت سے اسلامی مدرسوں کے نصاب میں شامل رہی اس مرتبہ اس کی لکھائی چھپائی اور ظاہری شکل و صورت پر بھی بہت توجہ کی گئی ہے۔ قیمت ۲/۷۵

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

جناب محمد عبداللہ شرقی

# دعا

تو ہے یارب قدرت والا
دانا بینا، حکمت والا
تیری قدرت کے ہیں نظارے
یہ سورج، یہ چاند، یہ تارے
پھولوں میں تو رنگ و بو ہے
سب میں ظاہر تو ہی تو ہے
گلشن گلشن، صحرا صحرا
سب میں تیرا جلوہ دیکھا
حمد میں ہلتے پایا لب کو
ترے گن گاتے دیکھا سب کو
تو ہے پالن ہار جگت کا
میرے داتا، میرے آقا
اپنا ہمیں عرفان عطا کر
اپنی ہمیں پہچان عطا کر
ہم کو عطا کر علم کی دولت
ہم کو دے تو درد ملت

ہم کو لائق فاضل کردے
خدمت خلق کے قابل کردے



# دیہاتی کا انٹرویو

ایک آدمی جو کہ فوجی افسر رہ چکے تھے اپنے گاؤں واپس لوٹے۔ ایک دن ایک دیہاتی اُن کے پاس گیا اور بولا "میں فوج میں جانا چاہتا ہوں مجھ سے کیا کیا پوچھا جائے گا؟"

اُنہوں نے جواب دیا: "پہلے تو وہ عمر پوچھیں گے تو کہہ دینا ۲۱ سال پھر پوچھیں گے کہ ملک کی خدمت کتنے سال کی؟ تو کہہ دینا۔ تین سال۔ پھر پوچھیں گے کہ آپ ہندی جانتے ہیں یا انگریزی۔ تو کہہ دینا دونوں۔"

دیہاتی نے سوچا کہ پہلے اکیس پھر تین اور پھر دونوں آئے گا۔ پھر وہ اپنا انٹرویو دینے چلا گیا۔ جب دیہاتی دفتر پہنچ گیا تو اُس سے پوچھا گیا "آپ نے ملک کی خدمت کتنے سال کی؟"

دیہاتی بولا: "اکیس سال"

"آپ کی عمر کیا ہے؟"

دیہاتی بولا! "تین سال"

"آپ پاگل ہیں یا بیوقوف؟"

"دونوں" دیہاتی نے جواب دیا۔ (جناب فرزانہ بخت)

# آدھی ملاقات

آپ کا ۱۷ جولائی کا خط ملا۔ پڑھتے ہی یہ ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گیا۔ چونکہ مجھے ان کی علالت کی پہلے سے کوئی خبر نہیں تھی اس لیے میں اس پُر ملال اور جان فرسا خبر کو سننے کے لیے مطلق تیار نہ تھا ان کی جدائی کا جو صدمہ مجھے پہنچا وہ میں کیوں کر قلمبند کروں۔ آپ سے میرا تعلق تقریباً دس سال پہلے سے تھا۔ آپ میرے محسن اور کرم فرما تھے ان کے دور ادارت میں میری بہت سی تخلیقات پیام تعلیم کے ذریعہ منظر عام پر آئیں آپ نے برابر میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی ہمیشہ ہی پیار بھرے خطوط لکھ کر مجھ جیسے بنگالی آدمی سے اردو کی خدمت کروانے کی کوشش فرماتے رہے آہ! میں ایسے ہمدرد اور ہمدرد انسان کو کیسے بھلا پاؤں؟ مگر قدرت کا قانون اپنی جگہ اٹل ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ مرحوم کی روح کو مغفرت فرمائے اور عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا کرے۔ آمین!

غسان کھگانوی

غیر حاضری میں جو اخبار آئے انھیں دیکھ رہا تھا محب مشفق و مکرم جناب حسان صاحب کی وفات کی خبر ملی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجعون۔ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب اپنے رہنمائے تعلیم کے لیے اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا اور حسان صاحب نے تو ساری زندگی ہی پیام تعلیم کے لیے دیدی۔ موت یقینی ہے لیکن مرنے والے کے بدلے کے لیے ہمیں دیکھنے اور تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔

ایسے خلوص اور لگن سے کام کرنے والے کہاں ملتے ہیں بچوں کے لیے انھوں نے جو کتابیں لکھیں ان کا بھی کوئی شمار نہیں جب سے خبر پڑھی ان کی تصویر نگاہوں کے سامنے سے ہٹتی نہیں۔ میری تعزیت ان کے گھر والوں تک پہنچا دیجیے۔ اس غم میں میں بھی شریک ہوں۔

محمد اکبر الوب (حیدرآباد)

بھائی صاحب حسین حسان صاحب کی رحلت نے دل کو بجھا دیا ہے۔ ابھی یوسف ناظم صاحب بھوپال آئے تھے تو ان سے بھی ذکر رہا اگست کے آخری ہفتہ میں ضرور مضمون ارسال کروں گا مطمئن رہیے مرحوم میرے بڑے کرم فرما تھے۔

پروفیسر آفاق احمد بھوپال

جولائی کا شمارہ ملا اس میں ٹائیٹل پیج پر جناب حسین حسان صاحب کے کالے حاشیے کے ساتھ تصویر دیکھ کر بے انتہا افسوس ہوا۔ مرحوم نے بڑی لگن اور محنت کے ساتھ پیام تعلیم کا کام کیا اور اس کا معیار بلند کیا۔ حقیقتاً ان کی جگہ پر ہونی مشکل ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مسعودہ حیات (دہلی)

موت ناگزیر ہے۔ مگر موت موت میں فرق ہے ایک موت وہ ہوتی ہے جس کا رنج جاننے والوں کو متعلقین اور دوستوں کو ہوتا ہے ایک وہ ہوتی ہے جس کا رنج ملک کے کونے کونے میں ہوتا ہے۔ ہمارے حسین صاحب کی وفات

بھی ہوئی۔ انسان چلا جاتا ہے مگر اس کے کام باقی رہتے ہیں۔ وہ نہیں مرتے۔ کوئی تین سال ہوئے میں ان کے دفتر میں ان سے ملا تھا جس محبت سے وہ ملے اس کا نقش میرے دل پر ہے۔ میری ہمدردی مرحوم کے بچوں کے ساتھ ہیں خدا ان کو صبر دے اور مرحوم کو غریق رحمت کرے۔

غلام ربّانی (حیدرآباد)

آج بمبئی کے اردو روزنامہ "اردو ٹائمز" میں پیام تعلیم کے مدیر عالی جناب، محمد حسین حسان صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر سخت صدمہ پہنچا۔ موصوف کی اچانک وفات سے ادارہ پیام تعلیم میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بمشکل بھر سکے گا۔ بچوں کے ادب کی اشاعت کے سلسلے میں مرحوم کی خدمات اردو والے کبھی نہ بھول سکیں گے۔

میرا دلی ملال مرحوم کے پسماندگان تک پہنچا دیں۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل۔

ظفر گورکھپوری (بمبئی)

چند دن پہلے جناب محمد حسین صاحب مدیر پیام تعلیم کی موت کی خبر ایک اخبار میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میری جانب سے انھیں پرسہ دیجئے گا۔

جناب حسین صاحب کی موت سے بچوں کے ادب اور پیام تعلیم کو ایک بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔

(شاغل ادیب وحید آبادی)

مولوی محمد حسین حسان جامعی کے سانحۂ ارتحال کی خبر پاکر دلی صدمہ ہوا۔ مرحوم کو خدا جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مرحوم نے جنھیں میں اپنا استاد اور مربی جانتا ہوں۔ غالباً فروری ۷۴ء میں لکھا تھا کہ علالت کے باعث وہ خطوط کے جوابات دینے سے قاصر ہیں۔ پھر بھی میری خواہش پر میرے خط کا جواب لکھ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے نام ان کا یہ آخری خط ہوگا۔ علم کی شمع۔ جس نے ہزاروں کو روشنی دی ایک دن یوں بجھ جائے گی۔

مرحوم کے مجھ پر ہمیشہ احسانات رہے وہ ان معنوں میں کہ وہ میرے مسائل اور الجھنوں کو دور کرنے کے لیے پر خلوص مشورے دیا کرتے تھے۔ میری کہانیاں اور مضامین بڑے اہتمام سے شایع کرتے تھے۔ اپریل ۷۴ء کے پرچے میں میرا مضمون "موسم، پیشن گوئیاں" شایع کرتے ہوئے انھوں نے زبردست ہمت افزائی کی تھی۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ ایک مرتبہ میری مالی الجھنوں اور اردو رسائل کی بے التفاتی کے تذکرہ پر مرحوم نے مجھے سرکاری پرچوں اور ہندی میں لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس ماہ ریاستی محکمۂ اطلاعات کے پرچے "آندھرا پردیش" میں میرے مضمون کی اشاعت پر مجھے ۷۵ معاوضہ ملا۔ میں انھیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔ اب وہ نہیں رہے مرحوم کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی براہ کرم مرحوم کے صاحبزادوں اور دیگر افرادِ خاندان کو میرا پرسہ پہنچا دیں میں ان کے غم میں برابر کا شریک مرحوم کی بڑی تمنا تھی کہ "پیام تعلیم" آگے بڑھتا رہے اس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی

ادارہ سے اور بالخصوص آپ کی شخصیت سے مجھے قوی
امید ہے کہ آپ اس شمع کو بجھنے نہ دیں گے۔

محمد شاہد عظیم

جوں ہی پیام تعلیم کا لیبل چاک کیا غلاف توقع
جناب حسین حسان ندوی کی تصویر پر نظر پڑتے ہی دل
دھڑکنے لگا۔ اس دھڑکن میں چھپی ہوئی آواز کی تصدیق
آہ محمد حسین حسان ندوی! کی سرخی نے پوری کر دی۔ اب
اس ہر دلعزیز ایڈیٹر کی یاد ہمیشہ کھٹکتی رہے گی۔ میری اور
میرے مدرسہ کے تمام بچّوں اور اسٹاف کی یہی دعا ہے
کہ خدا مرحوم کو جنّت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان
کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین۔
مرحوم کی ایڈیٹری میں ترتیب دیا ہوا آخری یادگار
پیام تعلیم ہر پیامی کے پاس بہت جتن سے محفوظ
رہے گا۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں مرحوم کی یاد تازہ
رکھیں گی۔

عبدالمجید آنیکل (بنگلور)

---

## بقیہ وہ غریب لڑکا صفحہ ۲۹ سے

اس نے کہا۔ آج میں اپنا سارا قرض دینے آیا ہوں
یہ لو اور اس نے مٹھی بھر اشرفیاں اسے دے دیں۔ تو بڑھیا
نے کہا "جاؤ! میرا کوئی قرض نہیں۔ تم جہاں بھی رہو
خوش رہو یہی میری دعا ہے۔" اس کے چلے جانے کے بعد
لوگ بڑھیا کے پاس آئے "تم جانتی ہو یہ کون ہے"؟
"یہ ایک غریب لڑکا تھا جو پہلے پھل ادھار لیا کرتا تھا"
لوگوں نے کہا "یہ فرانس کا بادشاہ نپولین تھا"۔ ارے
بادشاہ ہو کر یہاں آیا"
بڑھیا کے ہاتھ خود بخود اوپر اٹھ گئے۔ ***

عشرت اعظم خاں

---

## بقیہ عقلمند اندھا صفحہ ۳۲ سے

اس پر اندھے نے دہی کا مٹکا باہر پھینک دیا۔
یہ دیکھ میں نے ایک بار میں کھنکار کر تھوکا ہے۔
گوریلا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔
اندھا بولا کھا کر دیکھ یہ میٹھا ہوگا گوریلے نے
چکھا اور سارا دہی کھا گیا۔
اس کے بعد گوریلا بھاگنے ہی والا تھا کہ اندھے
نے گیدڑ کو اس کے اوپر پھینک کر کہا یہ دیکھ یہ میرے
کی ایک جوں ہے اب تو سمجھ گیا کہ میں داس بن مانس
گوریلا یہ سب دیکھ کر ڈر گیا کہ جس کے سر کی جوں
اتنی بڑی ہے وہ خود کتنا بڑا ہوگا۔
اب اندھے نے کہا۔ ابھی ایک جادو کا گدھا
اور ہے جو چابی لگانے سے بھاگتا ہے۔ اور جس پر وہ
دیا جائے اس کو مار ڈالتا ہے۔ اگر تو نہ گیا تو ابھی چابی
بھرتا ہوں یہ کہہ کر اس نے گدھے کی دم کس کر گھما دی
گدھا زور زور سے ڈھینچوں ڈھینچوں چلانے لگا۔
گوریلا سمجھا کہ اس نے چابی بھرنی شروع کر دی ہے۔ وہ
نو دو گیارہ ہوا پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے بعد دونوں
دوست مزے سے اس گھر میں رہنے لگے۔

---

## بقیہ میٹھی نیند کی انوکھی دوا صفحہ ۲۳ سے

پھر رہے ہیں اور آپ ......
ہاں! ہم یہاں ہیں۔ ہم نیند کی دوا کی تلاش میں یہاں
آئے تھے اور وہ دوا ہمیں مل گئی ہے۔ اس لکڑہارے کو
دربار میں لے چلو اس نے ہمیں وہ دوا دی ہے جس کی بڑی
سے تلاش تھی۔ ہم اس کو انعام و اکرام اور اعزاز دے کر
آج دربار میں اس کا استقبال کریں گے۔

# اِدھر اُدھر سے

## بائیس برس چلے اڑھائی کوس

نئی دہلی ۱۷۔ اگست۔ پریس ایشیا انٹرنیشنل نے خبر دی ہے کہ سرکاری دفتروں کے فائلوں کی لال فیتہ شاہی کا ایک نمونہ سامنے آیا ہے۔

مدھیہ پردیش میں حال ہی میں ایک کلکٹر کے سامنے ایک فائل رکھی گئی۔ ایک سرکاری ملازم نے گھوڑا رکھنے کی اجازت چاہی تھی۔ یہ درخواست ۲۲ سال پہلے آئی تھی۔ بھلا گھوڑا رکھنے کا رواج تو کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ پھر ایسی درخواست کیوں دی گئی۔ کلکٹر نے اس کی وضاحت کے لیے اپنے کلرک کو طلب کیا اور کلرک سے جب اس نے یہ سنا کہ آپ ہی نے ۲۲ سال پہلے اس وقت کے کلکٹر کو یہ درخواست دی تھی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ بات یہ تھی کہ یہ کلکٹر صاحب پٹواری کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے بعد ۲۲ سالوں میں وہ اپنی قابلیت بڑھاتے بڑھاتے نائب تحصیلدار۔ تحصیلدار، ڈپٹی کلکٹر اور اب کلکٹر بن گئے تھے۔ لیکن ان کے فائل پر ان ۲۲ سالوں میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا اور بالآخر خود ان کی درخواست ان کے سامنے آگئی۔

## کچھ پھولوں کے بارے میں

(۱) تاتار میں گلاب کی خوشبو کو ناگوار محسوس کیا جاتا ہے۔ پیاز اور لہسن کو خوشبودار سمجھا جاتا ہے۔ تاتاری عورتیں بناؤ سنگھار کے وقت پیاز کے چھلکے ملتی ہیں۔

(۲) فرانس میں تقریباً (۳۵) ہزار عورتوں کی گزر بسر مصنوعی پھولوں کی تیاری پر ہے۔

(۳) چین میں ایک پھول ہوتا ہے جو دھوپ میں سرخ اور چاندنی میں سفید ہو جاتا ہے۔

(۴) ہندوستان میں تقریباً (۱۵ ہزار) قسم کے پھول ہوتے ہیں۔ یورپ میں (۴۲۰۰) قسم کے پھول ہوتے ہیں۔ ان میں تقریباً ۴۵۰ خوشبودار ہوتے ہیں اور باقی صرف خوبصورت ہوتے ہیں ان میں خوشبو نہیں ہوتی۔

(۵) "میری گولڈ" نامی انگریزی پھول۔ موسم اچھا ہو صبح پانچ بجے کھل جاتا ہے۔ ورنہ بند رہتا ہے۔

(۶) پھول توڑنے کا صحیح وقت صبح کا ہوتا ہے۔ پھولوں کو زیادہ دیر تک تر و تازہ رکھنا ہو تو ڈنڈیوں کو پانی میں ڈبو دینا چاہیے۔

(۷) گلدستوں میں پھولوں کو تازہ رکھنے کے لیے پانی کی جگہ شربت ڈالنا چاہیے یا پانی میں کاربونیٹ ملا کر چھڑکنا چاہیے۔

محمد عبید اللہ شریف حیدر آباد

---

• آپ سیکھنا چاہیں تو آپ کی ہر غلطی آپ کو کوئی نہ کوئی سبق دے سکتی ہے۔ (ڈکنسن)

• گزری ہوئی گھڑیوں پر افسوس نہ کرو۔ وہ واپس آ سکتیں موجودہ وقت سے فائدہ حاصل کرو۔ کیا تمہارے اختیار میں ہے اور تم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہو۔ (ایمرسن) (بشیر الدین)

Regd. No. D.(S)-097

PAYAM-I-TALEEM
NEW DELHI-110025

# بچوں کے لیے نئی اور دلچسپ کتابیں

| کتاب | مصنف | قیمت |
| --- | --- | --- |
| بدنصیب شہزادی | ابرار محسن | 1/- |
| عقل کا سودا | " " | -/۷۰ |
| جنگل کا راجا | " " | 1/- |
| تیس مار خاں | " " | -/۹۰ |
| بندر کا گھر | خضر برنی | -/۷۵ |
| دلی دور ہے | مجیب احمد خاں | [illegible] |
| جب دراب | آصف مجیب | 1/۷۵ |
| تین کوڑیاں | اقبال امروہوی | 1/۲۰ |
| سونے کا پنجرہ | احسان الحق | -/۷۵ |
| چینی کی گڑیا | محمد حسین حسان ندوی | -/۵۰ |
| بہادر سیّاح | " " | -/۷۵ |
| چچا غالب | مرتبہ: محمد حسین حسان ندوی | -/۷۵ |
| بھیڑیے کے بچے | ترجمہ: قرۃ العین حیدر | -/۵۰ |
| ہرن کے بچے | | -/۵۰ |
| میاں ڈھینچو کے بچے | " " | -/۵۰ |
| شیر خاں | " " | -/۵۰ |
| لومڑی کے بچے | | -/ |
| بہادر | " " | [illegible] |

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

لبرٹی آرٹ پریس، پبلشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۵۲۸ پٹودی ہاؤس، دریا گنج، دہلی

# حسین حسّان نمبر



پیدائش ۱۹۰۷ء - وفات ۱۳ر جولائی ۱۹۷۴ء

# پیامِ تعلیم

ماہنامہ

# پیامِ تعلیم

نئی دلی ۲۵

## حسین حسّان نمبر

جلد ۱۱
شمارہ ۱۱

اڈیٹر
ولی شاہجہانپوری

معاون
صفیہ حسّان

نومبر ۱۹۷۴ء

قیمت :- ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ چندہ :- سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد دلی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شایع کیا

## فہرست

# نہرو بال پستکالیہ

ہندوستان کی اہم زبانوں اور انگریزی میں بچوں کے لیے بہترین اور سستی کتابیں شایع کرنے کے لیے کتابوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا گیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بسنے والوں، مختلف زبانوں کے جاننے والوں کے لیے ایک ہی سا ادب پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو سکیں اور اس سے قومی ایکتا مضبوط ہو۔

اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئی ہیں جو اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے (۱/۵۰) ہے یہ سب کتابیں رنگین تصویروں کے ساتھ فوٹو آفسیٹ پر شایع ہوئی ہیں۔

(۱) بابو (حصّہ اوّل) مصنف: سی فری ماس مترجم: صالحہ عابد حسین
(۲) " ( " دوم) " : " " " : " "
(۳) کشمیر " : مالا سنگھ مترجم خدیجہ بیگم: تصویر پرکاش
(۴) پرندوں کی دُنیا " : جمال آرا " : محمد شفیع الدین نیّر
(۵) ہمالیہ کی چوٹیوں پر " : بریگیڈیر گیان سنگھ ": محمد ذاکر
(۶) ہماری ندیوں کی کہانی ": لیلا مجمدار " : رضیہ سجاد ظہیر
(۷) جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں ": لیلا سجاگوت " : " "
(۸) آزادی کی کہانی حصّہ اوّل ": وشنو پربھاکر ": انور کمال حسینی
(۹) رسیلی کہانیاں ": منوج داس ": صغرا مہدی
(۱۰) ہماری ریلیں ": جگجیت سنگھ ": عرش ملسیانی
(۱۱) ہندوستان میں غیر ملکی سیاح ": کے سی کھنّہ تصاویر: کرشن کھنّہ
(۱۲) آؤ ناٹک کھیلیں ": اوما نند مترجم: رفیعہ منظور الامین
(۱۳) خالہ بی کا خاندان ": منوہر داس چترویدی ": محمد شفیع الدین نیّر
(۱۴) بہت دن ہوئے حصّہ اوّل ": چوکسی بی ایم جوشی ": رضیہ سجاد ظہیر
(۱۵) پہاڑوں کی کہانیاں ": راجیندر اوستھی ": انور کمال حسینی
(۱۶) روہنت و نندیہ مصنف: کرشن چیتنیہ مترجم: انور کمال حسینی
(۱۷) سدا بہار کہانیاں ": شانتا رنگاچاری ": " "
(۱۸) ایجادیں جنھوں نے دُنیا بدل ڈالی (اوّل) ": میر نجابت علی ": ستیا احسان
(۱۹) " " (دوم) ": " " : " "
(۲۰) بڑا پانی ": لیلا مجمدار ": صالحہ عابد حسین
(۲۱) مورا ": ملک راج آنند ": انور کمال حسینی
(۲۲) ہاکی کا کھیل ": سروپندر ساتیال ": پریتم لال

## ذاکر حسین سیریز

(۲۳) ابو خاں کی بکری مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت ۳/۰
(۲۴) انوکھی دکان ": قدسیہ زیدی " ۲/۵۰
(۲۵) گلا چھپیا اور پریزاد " : " " ۲/۰
(۲۶) دنیا کے جانور " : " " ۱/۵۰
(۲۷) راجہ رام موہن رائے ": عرش ملسیانی (زیرِ طبع)

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ اردو بازار جامع مسجد دہلی - بمبئی ۳ - علی گڑھ ۲

# بچوں سے باتیں

اس شمارے کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اکتوبر کے پیام تعلیم کے متعلق کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پرچہ تیار ہوگیا تھا اور قاعدے کے مطابق اسے اکتوبر کے پہلے ہفتے میں آپ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اسی اعتبار سے ہم نے عید کی پیشگی مبارک باد پیش کی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ ٹائیٹل کا کاغذ ملنے میں بہت دیر ہوگئی۔ جب یہ ملا تو ڈاکخانے کے قانون نے ہاتھ باندھ دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۹ اکتوبر سے پہلے ڈاکخانے کو نہ بھیجا جا سکا۔ امید ہے کہ اس ماہ کے پہلے ہفتے میں پرچہ مل گیا ہوگا۔

عید کا دن گزر گیا۔ لیکن ابھی یہ مبارک مہینہ باقی ہے اس لیے اس تقریبِ سعید کے گزر جانے پر بھی یہ آرزو کی جا سکتی ہے کہ خدا آپ سب کو اس مبارک دن کی بے شمار برکتوں سے نوازے اور ایسی ہزار عیدیں مقدر کرے۔

اچھا تو لیجیے آپ کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ حسین حسّان نمبر آپ کے ہاتھ میں ہے۔

حسین حسّان نمبر کے ان صفحات میں کیا کچھ ہے، اس کا اندازہ آپ کو پڑھنے کے بعد ہو ہی جائے گا۔ یہ پوچھیے۔ کہ کیا نہیں ہے تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ہمیں افسوس ہوتا ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ پیامی بہن بھائی اس شمارے میں زیادہ سے زیادہ شرکت کریں۔ یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس نمبر کے قریب قریب سب ہی مضمون نگار حضرات وہ ہیں جو مرحوم حسین حسّان صاحب کے احباب کہے جا سکتے ہیں یا وہ ادیب ہیں جن میں سے بعض سے نصف ملاقات رہی یا جو صرف ایک دو بار ملے ہیں۔

پرانے احباب میں مولانا شاہ معین الدین، مولانا عبداللہ قدوائی۔ مولوی محمد حفیظ الدین، پروفیسر محمد عاقل۔ محمد شفیع الدین نیّر صاحب اور محترمہ آصفہ مجیب کے تاثرات پڑھیے آپ کو مرحوم کی بہت سی خوبیوں کا علم ہوگا۔

یوسف ناظم، خالد عرفان، اظہر افسر، وقار خلیل اور عبدالمتین نیاز صاحبان سے صرف ایک ملاقات اور عرصے تک مراسلت رہی۔ چھوٹوں میں خلیق انجم اشرفی اور رشید الوحیدی صاحبان کے مضامین بھی بڑی معلومات رکھتے ہیں اور شوق سے پڑھے جائیں گے۔

مگر ان سب سے اہم مضمون ہے مرحوم کے چھوٹے بھائی حکیم محمد ذہین کا۔ اس سے مرحوم کے بچپن اور لڑکپن کے عبرت دلانے والے حالات کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ تکالیف کا مقابلہ کس ہمت اور استقلال سے کیا ہے مرحوم نے۔

حکیم محمد ذہین کا مضمون پڑھ کر جو سب سے بڑی خوبی سامنے آئی وہ ہے مرحوم کی خودداری اور عالی ظرفی کہ اتنی طویل مدت اور شدید غربت کے باوجود حسین حسّان صاحب نے کبھی اس پر فخر نہیں کیا کہ وہ ایک بڑے زمیندار کے گھر کے چشم و چراغ تھے۔ عموماً لوگ فخر کے ساتھ اپنے اجداد کے کارنامے بیان کر کے اپنے کو بڑا

بقیہ صـ۲ پر

# قطعہ تاریخ وفات جناب محمد حسین حسّان مدیر پیام تعلیم نئی دہلی

| ہادیٔ روشن تحریر | منجانب محب صمیم مفتوںؔ کوٹوی | یا غفار یا مالک |
|---|---|---|
| ۱۳۹۴ھ | ۱۳۹۴ھ | ۱۳۹۴ء |

تھے جو حسّان اس کے اڈیٹر — تھا رسالہ یہ ایک گلدستہ
اس کو پڑھ کر ہوئے خوش و خرم — کئی افسردہ خو و دلخستہ
پائیں بچوں نے تازہ معلومات — کھل گئے ان پہ راز سربستہ
چاہے کتنا ادق سہی مضموں — اس سے سادہ زباں تھی پیوستہ

---

اُن کے اوصاف کا رہا قائل — جو کبھی اُن سے رہا ہے وابستہ
اُن کے سانچے میں ڈھل گیا ہر ایک — قدِ بالا ہو یا قدِ پستہ
کبھی خنجر بہک نہیں سکتا — ٹھیک ہاتھوں میں ہو اگر دستہ
رہا فکر و خیال میں آزاد — رہ کے پابند، قلب وارستہ
جانے والا چلا ہی جاتا ہے — کتنا دشوار ہی سہی رستہ

---

آیا جس دم خیال میں مفتوںؔ — کہیے تاریخِ مرگ برجستہ
دیا ہاتف نے مجھ کو یہ مصرع — یار شائستہ یار شائستہ

۱۹۷۴ء

# برکات

## شاہ معین الدین اپنے رسالہ "معارف" میں رقم طراز ہیں

راقم کے لیے تیسرا حادثہ طالب علمی کے زمانہ کے رفیق مولوی حسین حسان صاحب ندوی اڈیٹر پیام تعلیم کی وفات کا ہے مرحوم درجہ میں مجھ سے دو تین سال پیچھے اور غالباً عمر میں بھی اسی قدر چھوٹے تھے، لیکن ہم دونوں عرصہ تک ایک ہی کمرے میں رہے تھے، اس لیے ان سے دوستانہ تعلقات تھے جو آخر تک قائم رہے، اسی زمانہ سے ان میں مضمون نگاری کا ذوق تھا۔ چنانچہ عشاق عرب کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ جو زمانہ، کانپور کے کئی نمبروں میں چھپا تھا، ندوہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ چلے گئے، اور وہاں تعلیم کے ساتھ مختلف اوقات میں جامعہ کے مختلف شعبوں سے ان کا تعلق رہا۔ بچوں کا ادب لکھنے میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ اس کے وہ صاحب طرز ادیب تھے، برسوں بچوں کے رسالہ پیام تعلیم کے اڈیٹر رہے۔ اور اس کو ان کا بڑا مقبول رسالہ بنا دیا۔ پیام تعلیم کے مضامین کے علاوہ انھوں نے بچوں کے ذوق کی بہت سی کتابیں لکھیں اور بچکانہ ادب کا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا، ان سے تعلقات کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ کبھی کبھی ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ گذشتہ دسمبر میں دلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

## پروفیسر رشید احمد صدیقی

"حسان صاحب مرحوم پر کچھ لکھنے کے لیے عنایت نامہ موصول ہوا مجھے بڑی ندامت محسوس ہوتی ہے کہ صحت اچھی نہ ہو کے سبب سے عزیزوں اور دوستوں کی اس نوع کی فرمائش کے پورا کرنے سے اکثر معذور رہنے لگا ہوں۔ دوسری طرف اس کا سلیقہ نہ جرأت کے بندھے ٹکے فقرے لکھ کر بھیج دوں اور مطمئن ہو جاؤں ایسا کیوں کر کروں جب کسی معذوری کو احساس ذمہ داری پر ترجیح نہ دے سکتا ہوں۔ گو کبھی کبھی اب اس سے انحراف ہونے لگا ہے۔

مرحوم سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کے بارے میں جتنی اور جیسی غمناک اور احساس محرومی سے لبریز تحریریں پیام تعلیم میں نظر سے گذریں ان سے اندازہ ہوا۔ کہ احباب پیام تعلیم اور بچوں کی برادری میں مرحوم کتنے عزیز اور محترم تھے۔ حسان صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جس خلوص و خرمی سے بچوں کے کردار کو سدھارنے سنوارنے کے لیے وقف رکھا اس کو ہم تا دیر شکر گزاری کے ساتھ یاد رکھیں گے۔ کتنا بڑا یہ رول تھا جسے مرحوم نے بڑی خوبی سے ادا کیا اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو مرحوم کی دی ہوئی روایت کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

سوچیں تو معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب کی دلکش اور دلوں کو تسخیر کرنے والی شخصیت بڑی حد تک بچوں کی محبت اور عظمت کی اساس پر قائم تھی اور رہے گی۔ نئی اور بہتر دنیا کی علامت اور بشارت بچے ہی ہوتے ہیں۔ دعا ہے کہ جامعہ ملیہ اور پیام اس گرانقدر روایت کو نباہنے اور بشارت کو پورا کرنے میں ہمیشہ کوشاں اور کامیاب رہیں۔ آمین"

محمد حسین حسان

# حسین حسّان صاحب کی خودنوشت

پیدائش ۱۹۰۷ء وطن پیلی بھیت ۔ والدین کا انتقال
ہوگیا۔ بچپن میں قیام زیادہ تر بریلی میں رہا ہی جلئے
ں ہے ۔ اردو فارسی گھر پہ پڑھی ۔ عربی بریلی کے
مدرسے میں، پھر دارالعلوم ندوۃ العلما میں عربی
ی ۔ ۱۹۲۷ میں جامعہ میں آگیا ۔ انگریزی پڑھی ۔
۳ کانگریس کی تحریک میں شرکت کی وجہ سے تعلیم
لے ختم ہوگیا ۔

دلی کانگریس نے اردو ۔ انگریزی ہندی میں کانگریس
نکالنے کا پروگرام بنایا تھا ۔ اُردو کے انچارج برادر
یق الرحمٰن قدوائی مرحوم تھے ۔ انگریزی کے آنجہانی
وتندن سرن ( بی اے کنٹب ) میں اُردو بلیٹن میں محترم
صاحب کے ساتھ کام کرتا تھا ۔ تقریباً سال بھر یہ
چلتا رہا ۔ پھر شفیق صاحب جیل چلے گئے پھر میری
ئی بہت دنوں تک کوتوالی اور دریا گنج کے تھانوں
ر پھر دلی جیل میں رہا ۔ کافی دنوں رہا ۔ مدّت یاد نہیں ۔
میرے معاملہ کی نوعیت دلچسپ ہے ۔ غالباً اُنھی
پنڈت جواہر لال نہرو آٹھ دن کے لیے پیرول چھٹ کر
تھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ ہندوستان ٹائمس کے
یتاب کوہلی صاحب نے پنڈت جواہر لال کی اس زمانے
ریں شائع کردی تھیں ۔ پرنٹر پبلشر مجھے بنایا تھا اور
گرفتار ہوگئے ۔ پنڈت موتی لال نے اس مقدمہ
ڑنے کی خاص اجازت دی تھی ۔ یہ مقدمہ اس وقت
کے مجسٹریٹ مسٹر السپر کی عدالت میں چلا ۔ عدالت کا اجلاس
جیل ہی میں ہوتا تھا ۔ کئی اجلاس ہوئے میرے اوپر جرم
ثابت نہ ہوسکا ۔ کوہلی صاحب کو غالباً سزا ہوگئی ۔

جیل سے چھوٹنے کے چند دنوں بعد لٹریری اسسٹنٹ
کی حیثیت سے میرا تقرر مکتبہ جامعہ میں ہوگیا ۔ اور
پھر پیام تعلیم میرے سپرد کردیا گیا ۔

مضمون لکھنے کی مشق کا سلسلہ ندوے کی تعلیم
کے دوران بلکہ اس سے پہلے سے جاری تھا ۔ الناظر (لکھنؤ)
نقیب ( بدایوں ) زمانہ ( کان پور ) شمع ( آگرہ اڈیٹر
حسن عابد جعفری آکس ) وغیرہ میں چھپتے رہے ہیں ۔
رسالہ جامعہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا ۔ عربی مضامین
کے ترجمے ، اور ایک طویل مضمون " محمود غزنوی کی
بزم ادب " جو کئی مہینے تک مسلسل جامعہ میں شائع
ہوتا رہا ۔

پیام تعلیم ۱۹۲۶ء میں جامعہ کے کاموں سے عوام
کو باخبر کرنے کے لیے اور نئے نئے تعلیمی مسائل سے مانوس
کرنے کے لیے نکالا گیا تھا ۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم
اور عبدالمجید خواجہ صاحب مرحوم کی ایما کو بھی اس میں دخل تھا ،
ذاکر صاحب مرحوم اور عابد صاحب تو گویا اس کے بانیوں
میں تھے " پیام تعلیم " کے پہلے پرچے میں ان دونوں کے
پیغام بھی ہیں ۔ ایک عرصے تک اس کی ادارت سعید انصاری
صاحب کے سپرد تھی ۔

در جب مجھے یہ کام سونپا گیا تو میں نے آہستہ آہستہ اسے بچوں کا پرچہ بنا دیا۔ محترم ذاکر صاحب مرحوم اور جناب حامد علی خاں صاحب مرحوم کو یہ بات پسند آئی ان دونوں حضرات نے اور جامعہ کے اور چھوٹے بڑے لوگوں نے مدد کی پیام تعلیم بھی آگے بڑھتا رہا۔ بچوں کے مفید پرچوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ اشاعت بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ حیدر آباد، کشمیر وغیرہ میں محکمۂ تعلیم نے اس کی سرپرستی کی اور سرکاری طور پر اس کی خریداری منظور فرمائی۔ ان کے ذاکر صاحب مرحوم، محترم پروفیسر مجیب پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ سید عابد حسین صاحب نے اور اس زمانے کے دوسرے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اس کے لیے مضمون لکھے نظمیں لکھیں خصوصاً شفیع الدین نیر صاحب کی نوازشیں مسلسل جاری رہیں۔ ان کے علاوہ نئے نئے لکھنے والے پیدا ہوئے ان میں مرحوم ابو طاہر صاحب بی اے کا نام سر فہرست ہے۔ اس کے تاسیس نمبر یا سالانہ نمبر بہت شان و اہتمام سے نکلتے تھے اردو دنیا خصوصاً بچوں کی دنیا میں دھوم مچ جاتی تھی۔

پیام تعلیم نے ایک یہی کام نہیں کیا بچوں کے لیے نظم و نثر میں لکھنے والوں کا ایک حلقہ بھی پیدا کر دیا۔ افسوس ہے کہ ۴۷ء کی گڑبڑ نے اس حلقے کو تتر بتر کر دیا۔ کچھ پاکستان کو پیارے ہوئے۔

اس عرصے میں کتابیں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ سب سے پہلی کتاب آں حضرت کی سیرت پر سرکار دو عالم کے نام سے لکھی بہت مقبول ہوئی میسور کی ریاست میں کورس میں بھی شامل ہو گئی۔ سترہ اٹھارہ اڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ دوسری کتاب دنیا کے بچے نئی چیز تھی نئے انداز سے لکھی گئی تھی، اس کے بھی، لگ بھگ بیس بائیس اڈیشن نکل چکے ہیں اور اب تک نکل رہے ہیں۔ تیسری کتاب خاصی محنت سے لکھی گئی تھی قبلہ ذاکر صاحب مرحوم اور سید سلمان ندوی نے چھپنے سے پہلے نظر ثانی فرمائی غالباً ۱۹۴۵ء میں چھپی تھی۔ یہ بہت مقبول ہوئی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے بعد چھپنے کی نوبت آئی اس میں ڈاکٹر اقبال اور مولانا محمد علی تک کا حال ہے اب اس پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔

چوتھی کتاب ہماری زمین ہے اس میں بچوں کے زمین کی عمر تاریخ وغیرہ کا حال ہے موجودہ سائنس کے خیال سے استفادہ کیا گیا ہے۔ انداز کہانی کا یہ بھی دوبارہ دہلی کے ایک پریس میں چھپ رہی تھی فرمے چھپ بھی گئے تھے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں کچھ ضایع ہو گیا اور کتاب ناپید ہے۔

اس زمانے میں مشہور روسی مصنف کی کتاب ایک سوالات" کو اردو میں اپنایا۔ "انوکھا عجائب خانہ" نام رکھا۔ یہ پہلی بار حکومت کشمیر کی مدد سے چھپی مکتبہ جامعہ نے چھاپی۔ کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ زیادہ تر جانوروں کی کہانیاں ان میں سے کچھ چھوٹے بچوں کے لیے تھیں مکتبہ جامعہ چھاپی تھیں۔ اب ان کے نام بھی یاد نہیں ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد رسالہ بند ہو گیا۔ جامعہ کے سے میں نے دوکھلے سے نکالا مگر چل نہ سکا۔ پھر دوبارہ قائم ہوا تو پیام تعلیم بھی نکلا کچھ دنوں میں نے ترتیب دیا۔ مگر پھر میرا تعلق جامعہ کے تعلیم بالغان ادارے (تعلیم و ترقی) سے ہو گیا اردو سیکشن میں تصنیف و اور مسودہ پر نظر ثانی کا کام میرے سپرد تھا۔ بچوں کے آسان اور سادہ زبان لکھنے کی عادت ہو گئی تھی اور

یہ کام میرے سپرد کیا گیا۔

اس سلسلے میں بے شمار مسودوں پر نظر ثانی کی۔ خود بھی کچھ کتابیں لکھیں چند چھپ گئیں ہیں کچھ مسودوں کی صورت میں ہیں (غالباً دیمک کی نظر ہو گئیں) چھپی ہوئی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) الزام کس پر (۲) آستین کا سانپ (۳) الٹی دعا (۴) برف کا گھر (۵) چاند (۶) دیمک کتنی ذہین۔ (۷) تاؤ کے ایڈیشن وغیرہ ہیں۔ چھپی کتابوں میں زمین کی لمبائی ہی اور رامو نے پڑھنا سیکھا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہاں خوب یاد آیا۔ میں نے بچوں کے لیے انڈونیشیا پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اسی زمانے میں برادر محترم شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم یونسکو کی طرف سے انڈونیشیا تشریف لے گئے تھے میں نے یہ مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ وہیں (انڈونیشیا) جاکر پڑھیے گا۔ شفیق صاحب نے واقعی وہاں جاکر اسے عقیدے سے پڑھا اور بہت تعریفی خط لکھا ..... "ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے" یہی نہیں انھوں نے انجمن ترقی اردو کے سکریٹری صاحب سے کتاب چھاپنے کی سفارش بھی کی۔ اس وقت قاضی عبدالغفار صاحب انجمن کے سکریٹری تھے۔ مگر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ ادارہ تعلیم و ترقی نے چند کتابیں ہندی میں چھاپی ہیں۔ مثلاً "ویسا نہیں ہے" وغیرہ

نہ جانے کیوں، ۱۹۶۳ء میں محترم غلام ربانی صاحب تاباں جنرل مینیجر مکتبہ جامعہ اور ان کے رفیقوں (خصوصاً سید احمد ولی صاحب) کو پیام تعلیم دوبارہ نکالنے کا خیال آیا اور قرعہ فال میرے نام پڑا۔ یہ اب تک نکل رہا ہے (۱۹۸۳ء) خدا اسے عمر نوح عطا کرے۔ عام رسالوں کے ساتھ ساتھ اس کے سالنامے بھی بہت شاندار ہوتے ہیں ان

سالناموں کے علاوہ چند خاص نمبر مثلاً بھائی نمبر، نمبر، غالب نمبر، قہقہہ نمبر کہانی نمبر بہت زیادہ پسند کیے گئے۔

مکتبہ جامعہ سے تعلق سے پہلے دو کتابیں محترم تاباں صاحب کی فرمائش پر لکھیں: میر تقی میر اور میر انیس ان کتابوں کے بھی پہلے اڈیشن ختم ہو گئے دونوں کتابیں دوبارہ نہ جانے کب چھپتی ہیں۔

ہمارے نئے جنرل مینیجر شاہد علی خاں صاحب مکتبہ پیام تعلیم کے ماتحت بہت سی کتابیں چھپوائی ہیں ان میں دو کتابیں (چھوٹے بچوں کے لیے) میری بھی ہیں تیسری کتاب چچا غالب بھی ہے۔ اسے میں نے اڈیٹ کیا ہے۔

---

بقیہ صفحہ ۲۹۵ عندلیب را چہ پیش آید،

انجام دیتا ہے وہ دوسروں کے لیے ایک مشعل راہ۔ بچوں کے لیے ان کے دل میں جو سودا اور تڑپ تھی ا وراثت کی شکل میں آ گئے ہم سب اُسے بانٹ لیں او کے چھوڑے ہوئے کام کو انھیں کی لگن کے ساتھ انجام دیں۔ مرحوم کی رُوح کی تشفی کے لیے اس سے بڑا کوئی کام میرے نزدیک نہیں ہے۔

آخر میں ڈاکٹر اقبال کے دو شعر مولانا حسا کی بچوں کے لیے دعا کے طور پر پیش کرتا ہوں خدا کرے ان کی یہ دعا بچوں پر اثر کر جاتے۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے<br>
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے<br>
خدایا آرزو میری یہی ہے<br>
مرا نور بصیرت عام کر دے

جناب حکیم محمد ذہین

# بھائی حسین حسّان صاحب

بچو! آپ کو اپنے پیام تعلیم کے اڈیٹر حسین حسان صاحب مرحوم کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کا ضرور اشتیاق ہوگا۔ میں بھائی حسّان صاحب سے تین سال چھوٹا ہوں مگر میں بھی دائم المریض ہوں بہرحال کوشش کروں گا کہ جو کچھ میرے حافظے میں ہے، وہ سب تحریر میں آجائے اور آپ کے لیے سبق آموز ہو۔

ہمارا پیدائشی وطن پیلی بھیت ہے جہاں ہم تینوں بھائی پیدا ہوئے۔ محمد حسین حسّان، اُن سے چھوٹا میں اور سب سے چھوٹے محمد معین۔ اپنی والدہ سے صرف ہم یہ ہی تین بھائی تھے پہلی والدہ سے دو بھائی دو بہنیں تھیں۔

والد صاحب ۷۔۸ گاؤں کے زمیندار تھے ہمارے سوتیلے بھائی محمد مبین صاحب زمینداری کے کاموں میں زیادہ دخیل تھے۔ والد صاحب بڑے زندہ دل، خوش مزاج، خوش خلاق، ہنس مکھ اور فقیر دوست تھے۔ انھیں فقیری نسخے خوب یاد تھے۔ ایک فقیری نسخوں کی بیاض بھی رکھتے تھے۔

ایک زمانہ میں والد صاحب قبلہ مرض سل میں مبتلا ہو گئے [illegible]فی علاج کیا افاقہ نہ ہوا اور خون پھیپھڑوں سے آنے لگا۔ اس زمانہ میں وہ اپنے گاؤں کریم گنج تشریف لے گئے۔ گاؤں پہنچے تو دیکھا مکان کے باہر الاؤ میں آگ جل رہی ہے صبح کا وقت ہے لوگ لاؤ کے چاروں طرف بیٹھے ہاتھ پیر سینک رہے ہیں۔ جیسے ہی [illegible]الد صاحب ٹہلو سے پہنچے۔ اترے، انھیں الاؤ کے بیٹھنے والوں میں سے ایک آواز آئی۔ "یادرچی پانی پلاؤ" والد صاحب نے ملازم کو آواز دی۔ وہ بزرگ بولے۔ "نہیں تم خود لاؤ" وہ جو تمھارے گھر میں کورے گھڑے بھرے رکھے ہیں ان میں سے پلاؤ" والد صاحب اندر گئے تو واقعی کورے گھڑے پانی سے بھرے رکھے تھے۔ انھوں نے لاکر خود پانی پلایا اور اپنی بیماری کا حال بیان کیا۔ بزرگ نے کہا اچھا۔

قلم دوات لے کر آؤ۔ والد صاحب قلم دوات لیے اندر گئے بزرگ باہر تخت پر نسخہ لکھ کر غائب ہو گئے۔ باہر آکر دیکھا بزرگ غائب، چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ مگر کہیں پتہ نہیں چلا تخت پر نظر پڑی تو دیکھا کر کوئلے سے نسخہ لکھا ہے۔ والد صاحب نے فوراً نسخہ کاغذ پر لکھ لیا۔ دوسرے ہی دن پیلی بھیت واپس جاکر دوا کا استعمال شروع کر دیا۔

ایک ہفتہ کے استعمال سے مرض کا نام و نشان باقی نہیں رہا پھر یہ مرض کبھی نہیں ہوا۔ افسوس کہ فقیری نسخوں کی یہ بیاض ہمارے ہاتھ نہیں لگی ہمارے ایک بزرگ تھے حکیم جلیل اللہ خاں صاحب تھے جن کی عمر سو سال سے تجاوز کر گئی تھی ۱۹۳۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا، میں جب بھی بریلی جاتا ان سے ضرور ملتا۔ وہ ہمارے خاندانی حالات بیان کرتے ایک دن کہا کہ تمھارا خاندانی شجرہ موجود ہے اور ایک فقیری نسخوں کی بیاض بھی۔ میں چاہتا ہوں آپ کی امانت آپ کے حوالے کر دوں۔ لیکن اس کی نوبت نہ آسکی۔

فرمایا کرتے تھے کہ آپ کے دادا کریم جان صاحب کی زندگی
[illegible] ریاست کا نظم و نسق بہت اچھا رہا۔ اُن کے انتقال کے بعد
[illegible]انی اختلافات شروع ہوگئے۔ بہر حال اختلافات کی
[illegible] سے ریاست چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوگئی ریاست
[illegible] زوال شروع ہوگیا۔

میرے والد دو بھائی تھے۔ نبی جان صاحب، آصف جان
صاحب۔ نبی جان صاحب ہمارے والد، آصف جان صاحب
[illegible] تھے اُن ہی کے نام سے محلہ آصف جان موسوم ہے۔ تایا
صاحب نے اچھی عمر پائی تھی۔ مگر خاندانی اور جائیدادی اختلافات
[illegible] ذریعہ بڑھ گئے کہ ان کو قتل کرا دیا گیا قاتل گرفتار ہوگیا اس
[illegible] عمر قید ہوگئی آخر میں وہ پاگل ہوکر مر گیا۔

والد صاحب کے صرف چھ سات گاؤں باقی رہ گئے
[illegible] شہری جائیداد میں محلہ آصف جان تھا جس میں ۸۰ فی صد
[illegible]ن ہمارے تھے ... آخر میں اس محلہ میں خاندان کا ایک
شخص بھی باقی نہیں رہا کچھ انتقال کر گئے کچھ باہر پردیس
چلے گئے پورا محلہ خالی ہوگیا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد وطن جانے کا
اتفاق ہوا۔ اپنے پیدائشی محلہ میں بھی گئے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں
[illegible] محلہ آصف جان کہاں ہے۔ بالکل جغرافیہ ہی بدل گیا۔ پوچھنے
[illegible]یوں نے بتایا۔ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ہر طرف چھوٹے چھوٹے
[illegible] بنے ہوئے ہیں پرانے مکانوں کا نام و نشان نہیں۔ ایک
معمر بزرگ نے بتایا کہ کس طرح مکانوں پر پٹھانوں اور کمہاروں
نے قبضہ کیا۔ لاکھوں کی جائیدادیں مفت لوٹ کر غیروں نے
فائدہ اٹھایا۔

بھائی حسین جان ۸۰ سال کے، میں ۳، ۴ سال
کے تھے۔ بھائی محمد یٰسین ڈیڑھ سال کا تھا کہ والدہ محترمہ
[illegible]

سے قبل ہی ہماری ان دو بہنوں کی شادی ہوچکی تھی۔ بڑے
بھائی محمد یٰسین کی شادی موضع آنگا کے ایک زمیندار کے یہاں
طے پائی تھی۔ آنگا پیلی بھیت سے تقریباً ۱۵۔ ۲۰ میل ہے۔
شادی میں دلچسپ حادثہ پیش آیا۔ براتی مختلف سواریوں رتھ
بہلو وغیرہ پر تھے مگر ہم اپنے چند قریبی عزیزوں کے ساتھ ہاتھی
پر سوار تھے۔ تقریباً ۱۲ بجے بارات رخصت ہوئی۔ ہم جنگل
میں داخل ہوئے سورج غروب ہوچکا تھا۔ جب ہاتھی راستہ
بھٹکنے لگا۔ تب مہاوت نے گھبرا کر کہا کہ ہاتھی کو بخار ہوگیا ہے
آپ لوگ کود جائیے۔ سب لوگ بہت پریشان ہوئے میں
حکیم خلیل اللہ خاں صاحب کی گود میں سو رہا تھا بھائی
حسین جان صاحب اور ایک عزیز کے پاس۔ غرضیکہ خلیل اللہ
خاں صاحب مجھے گود میں لیے ہوئے اور سب بھی یکے بعد
دیگرے کود گئے۔ ہاتھی ایک طرف چل پڑا، مہاوت کسی درخت
کو پکڑ کر نیچے کود گیا۔ اور ہم لوگوں میں آ ملا۔ اس تاریک اور
بھیانک بیابان جنگل میں راستہ ملنا بہت دشوار ہوگیا
فیل بان اس جنگل سے کسی قدر واقف تھا وہ اپنے اندازے
کے مطابق ایک طرف کو چل پڑا اور سب کو اپنے پیچھے آنے کی
ہدایت کی۔

کافی مسافت طے کرنے کے بعد ایک بستی کے آثار نظر آئے
سب لوگوں کی جان میں جان آئی۔ جب گاؤں میں داخل
ہوئے آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تھی کسی طرح گاؤں کے
مکھیا کو جگایا اور اپنی بپتا سنائی بھلا آدمی تھا اور آنگا کے
زمیندار [illegible] اس لیے پہلے تو اس نے اصرار [illegible]

گاؤں میں گذارنے پر اصرار کیا مگر سب نے معذرت چاہی
اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔ مکھیا نے فوراً اپنے آدمی کو
[illegible]

سب سے پہلے ہم دونوں بھائی سوار ہو گئے جب سب اطمینان سے
بیٹھ گئے - مکھیا کو سلام و شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے دوسرے
اتی جو اپنے وقت پر پہنچ چکے تھے سب پریشان بیٹھے تھے والد
احب نے تلاش کرنے کو آدمی دوڑا دیئے - جنگل سے گذرتے
ے ہاتھی کی چنگھاڑ اور گھنٹہ کی آوازوں کی گونج سے ہر شخص
ف و ہراس میں مبتلا تھا - سب کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب ہاتھی
ری گاڑی کی طرف آرہا ہے اس خوف سے مہاوت گاڑی بان
راستہ کے بارے میں ہدایت دیتا رہا - خدا خدا کر کے جنگل
ستہ سے گزر کر میدانی راستہ پر آ گئے جب رہنے اطمینان
سانس لیا - ہمیں ڈھونڈنے والے راستہ میں مل گئے - خدا خدا
کے منزل مقصود پر سنہ اندھیرے پہنچے تب سب کی جان میں
ن آئی - صبح کو ہاتھی کی تلاش میں آدمی روانہ کیئے گئے انھوں
واپس آکر ہاتھی کی موت کی خبر دی اس خبر کو سن کر سب ہی
فسوس ہوا -

بڑی بہن شادی کے چند سال بعد والد کی زندگی ہی میں
ہ ہو گئی تھیں - ان کی گود میں دودھ پیتا ایک لڑکا تھا وہ بھی
بیت والد صاحب کے پاس رہتی تھیں - ہم لوگوں کا بہت
ل رکھتی تھیں - گھر میں تین چار مامائیں تھیں - بہت پرانی
وفادار - ننو کا تو سوائے اس گھر کے اور کوئی گھر نہیں تھا -
لھر میں پل بڑھ کر بوڑھی ہو گئیں گویا گھر کے ممبر کی حیثیت
ا تھیں گھر میں زیادہ کنٹرول ان ہی کا تھا - ہمشیرہ کے
کے بعد گھر کے انتظام اُن کو سونپ دئے تھیں - باہر ڈیوڑھی
ں پرانے ۳-۴ ملازم تھے - جس میں عبدالرزاق صاحب
نہ پرانے بزرگ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے بڑے ہمدرد
اور بزرگ تھے - والد صاحب ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے
تھے - ان کی بڑی عزت کرتے ، والد صاحب کو اُن پر

کی گود میں پلے بڑھے - ایک مولوی صاحب تو ہم لوگوں کو قرآن
اُردو فارسی پڑھانے اور نگران کی حیثیت سے مستقل قیام رکھتے
تھے - ایک ماماں جس کو گھر کے سب ہی لوگ پنجابن کے نام
سے پکارتے تھے انھیں کی گود میں چھوٹا بھائی محمد معین پرورش
پا رہا تھا والد صاحب نے بھائی محمد حسین صاحب کو گورنمنٹ
اسکول میں داخل کرا دیا میں گھر پر ہی مولوی صاحب سے پڑھتا تھا -
حسین صاحب کو ہاکی کھیلنے کا بہت شوق تھا ہمارے
مکان سے ملحق ایک بہت بڑا پائیں باغ تھا جو کبھی کسی وقت
ہمارے گھر کی عورتوں کی تفریح گاہ تھا جس میں پردہ کے لیے
چاروں طرف دیواریں تھیں - کسی وقت یہ باغ بہت خوبصورت
سبز و شاداب رہا ہوگا اب ایک خوبصورت گھاس کا مخملی
میدان تھا جس کو حسین صاحب نے اپنے ہاکی کھیل کے لیے
منتخب کیا - اسکول سے واپسی کے بعد ہم لوگ اسٹکس لے کر
باغ میں پہنچے اور اسکول ، محلہ اور رشتہ داروں کے بچے جمع
ہو گئے اور کھیل شروع ہو گیا - والد صاحب قبلہ کا موسم سرما میں
ہمیشہ یہ دستور رہتا - انڈے کا حلوا - گاجر کا حلوا پنڈیاں وغیرہ
بنوا کر ہر ایک بچہ کو حصہ بقدر ایک ماہ تقسیم کر کے فرماتے اپنی
اپنی الماریوں میں بند کر کے تالا لگا دو ہم لوگ ہاکی کھیل کر واپس
ہوتے تو سیدھے اپنے کمرے میں جاتے اپنی الماریاں کھول کر
حلوا یا پنڈیاں کھانے بیٹھ جاتے اگر کسی کا مہینہ سے پہلے ختم
ہو جاتا تو جس کا باقی ہے اس کے کھانے کے لیے ترکیبیں لڑاتا
کبھی تو خوشامدانہ انداز اختیار کرتا کبھی معصومانہ خفگی کا اظہار کرتا -
اگر والد صاحب کے علم میں آ جاتا تو تھوڑی سی ڈانٹ پھٹکار کے
بعد اپنے حصہ میں سے دے دیا کرتے - حسین صاحب بہت
محتاط تھے اپنا حصہ پورے مہینہ چلاتے - والد صاحب ہم
سب کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتے - انھیں اچار چٹنی اور

صندوق خانہ دار تھا جو کھانے کے وقت کھولا جاتا اور دسترخوان
پر بیٹھنے والوں کو تقسیم ہوتا آخر میں کھانے کے بعد مربہ اناس
سیب وغیرہ تقسیم ہوتا۔ ہمارا مکان بہت بڑا تھا۔ صحن کے آخری
حصہ میں اناج کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔

جب اپنی فصل پر ۷-۸ گاؤں کا اناج آتا تو بیل گاڑیوں
کی لمبی لائن لگ جاتی جب اناج بخاریوں میں ڈالا جاتا تو ہم
بچوں کے لیے ایک دلچسپ کھیل ہوجاتا ہم بخاری کی دیوار پر
چڑھتے اور اناج پر کودتے وہ زمانہ یاد آتا ہے۔ بخاری سے
متصل کھنڈسار تھی جہاں شکر تیار کی جاتی تھی۔ شکر سازی
کا دور والد صاحب کی زندگی تک چلتا رہا غالباً ۱۹۱۸ء میں
والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب حسب معمول آخر
شب میں ۳ بجے بغرض تہجد اٹھتے تھے۔ حقہ ملازم تیار کرکے
بیت الخلاء کی دیوار کے سوراخ میں حقے کی نے داخل کرکے
والد صاحب کو اٹھا دیتا والد صاحب بغرض رفع حاجت تشریف
لے جاتے اس دن بھی اجابت سے فارغ ہوکر باہر آئے صحن
تک پہنچے تھے کہ چکر آیا سنبھل نہ سکے گر کر بیہوش ہوگئے اور
زور زور سے خرخراہٹ شروع ہوگئی گھر کے سب ہی لوگ اٹھ
گئے۔ سب نے مل کر اٹھایا چارپائی پر لٹا دیا تین دن تک مسلسل
کروٹیں بدلتے رہے اور خرخراہٹ بھی جاری رہی ڈاکٹروں
نے ہر ممکن کوشش کرلی مگر کامیابی نہ ہوئی اور انتقال فرما گئے۔

اب یہاں سے ہماری زندگی میں انقلاب شروع ہوتا ہے۔
یہ آزمائشی دور سخت مصائب و شدائد سے شروع ہوتا ہے۔
نانا صاحب، قبلہ اور ماموں صاحب بغرض شرکت تجہیز و تکفین
پیلی بھیت تشریف لائے تھے۔ سوئم کے دن مختصر قریبی عزیز
جمع تھے کہ ہم یتیم و یسیر نابالغ بچوں کا مسئلہ پیش ہوا۔ کہ ان
بچوں کا ولی کس کو بنایا جائے ہمارے بڑے بھائی محمد مبین
صاحب نے اپنی بدفطرت ثانیہ کو دبا کر اپنا مخصوص و مصنوعی
انداز اختیار کیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں بڑا
بھائی ہوں مجھ سے زیادہ ان بچوں کا ہمدرد کون ہوسکتا
ہے۔ اس لیے ولی ہونے کا میں ہی مستحق ہوں۔ اس حد تک
خوشامدانہ انداز اختیار کیا کہ نانا صاحب کو یقین ہوگیا چنانچہ
بھائی مبین صاحب کو ولی بنانا منظور کرلیا۔ جج چونکہ نابالغوں
کا اصلی ولی ہوتا ہے اس کو ہر سال نابالغوں کا حساب دینا
پڑتا ہے۔ اس لیے جج کو جاننا ضروری ہوتا ہے کہ ان بچوں
کا ولی کون ہے۔ چنانچہ جج کی عدالت میں مہر تصدیق حاصل
کرلی۔

سب مہمان اور نانا وغیرہ اپنے گھروں کو واپس ہوگئے
اور ہم لوگ حسب سابق رہتے رہے۔ اور بھائی مبین صاحب
خود کو اور اپنے یتیم و یسیر معصوم بھائیوں اور بہنوں کو برباد
کرنے کے اسباب مہیا کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ہم لوگوں
کو پدرانہ شفقت و محبت سے محرومی کے احساس نے اس
درجہ مایوس کردیا کہ ہم دونوں بھائی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے
کہ اب ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔

بھائی مبین صاحب کے طرز عمل اور سلوک سے یہ
صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم لوگ اس ظالمانہ سلوک کو زیادہ
دن برداشت نہیں کرسکیں گے۔ مثلاً اگر کبھی میں یا بھائی
حسین اتفاق سے یا کھیلتے ہوئے اُن کے کمرے میں چلے
جاتے تو فوراً یہ کہہ کر نکال دیتے "خبردار یہاں آئے تو ٹانگیں
توڑ دوں گا،، کبھی ہم دونوں کے کان پکڑ کر صحن میں تیز تیز
قدموں سے ٹہلنے لگتے۔ یہاں تک کان سرخ ہوجاتے کبھی
بیوہ بہن بول پڑتیں کہ کیوں بلاوجہ بے قصور معصوم بچوں
کو تکلیف پہنچا رہے ہو تو ان سے لڑتے۔

ہاکی کھیلنا چھوٹ گیا۔ فیس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے
ام خارج ہوگیا۔ مولوی صاحب کو ملازمت سے علیحدہ کردیا
ض کر تکلیف پہنچانے کی ہر ممکن کوشش ہوتی رہی، بہر حال کبھی
ی بھائی مبین صاحب نے سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ فطرتاً
نقی القلب مغرور واقع ہوئے تھے۔ صلۂ رحمی، خدا ترسی،
نسانی ہمدردی جیسی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ دوسروں کو
کلیف پہنچا کر اُن کو خوشی ہوتی تھی۔

گاؤں کے نومسلموں کی جھونپڑیاں جلوادیں۔ نتیجہ میں
ن پر سنگین مقدمہ قائم ہوگیا۔ جائیداد رہن اور بیچنے کی نوبت
ئی۔ بیدریغ روپیہ خرچ کیا۔ اسی وقت اتفاق سے چھوٹی
ہن بھی آگئی تھیں۔ بڑی بیوہ بہن تو پہلے ہی سے موجود تھیں
ونوں بہنوں کے سامنے انتہائی معصومانہ ایکٹنگ کرکے
ر مجھے جیل ہو جائے گی جائیداد بھی نکل جائے گی بہنوں
نے متاثر ہوکر اپنے اپنے زیورات حوالے کردیے ہماری چھوٹی
بہن بہت سیدھی اور معصوم تھیں اس کے باوجود شوہر
کی بغیر اجازت دینا نہیں چاہتی تھیں اس لیے شوہر سید امانت حسین
صاحب بڑے مغلوب الغضب آدمی تھے مگر ان کے یقین
دلانے پر کہ سب سے پہلے آپ کے جانے سے قبل آپ کا
زیور چھڑا کر دوں گا۔ وہ باتوں میں آگئیں زیور حوالہ کردیا۔

پندرہ دن گذرے مہینہ ختم مگر بھائی مبین صاحب
کا کہیں پتہ نہ چلا۔ کسی نے کہا کہ وہ سسرال آئیں گے
کوئی کہتا کبھی بمبئی پہنچ گئے غرض کہ ایسے غائب ہوئے
کہ مہینے بیت گئے پر وہ نہ آئے چھوٹی بہن نہایت مغموم
وافسردہ اپنے گھر آگئیں جب تک شوہر سے چھپا سکیں
چھپایا۔ بہر حال پتہ نہ چلا کہ اس معصوم بہن پر کیا گذری۔

میرا اور بھائی حسین حسان کا بچپن تھا۔ البتہ یہ
مزید معلوم ہوا کہ تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہوگئے۔

بیوہ بہن بھی انتظار سے عاجز اور پریشان ہوکر اپنی سسرال
کے مکان آگئیں اور بڑی عسرت و ناداری کی زندگی گذارنے
لگی۔ پریشان ہوکر نانا صاحب کو بھائی حسین حسان صاحب
نے لکھا۔ نانی صاحبہ سن کر پریشان ہوگئیں۔ دوسرے دن
صبح بذریعہ ٹرین نانا صاحب پیلی بھیت پہنچ گئے ہم لوگوں کا
حال زار دیکھ کر اُن کو بہت دکھ ہوا۔ اور شام ہی کی ٹرین سے
ہم تینوں بھائیوں کو بریلی لے آئے۔ ہمیں دیکھ کے نانی صاحبہ
بہت روئیں دھوئیں۔ دوسرے ہم سب کو نہلا دھلا کر کپڑے
بدلے ایک ہفتہ کے بعد حسین حسان اور مجھے عربی مدرسہ
مصباح العلوم میں داخل کرادیا گیا میں چھوٹا تھا اس لیے مجھے
قرآن، اردو، فارسی کلاس میں اور بھائی حسین صاحب کو
عربی کلاس میں داخل کردیا۔ بھائی حسین صاحب نے دوسال
میں اچھی عبارت پیدا کرلی .......... ایک عرب حاجی کلاّ
کے نام سے بریلی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ بریلی کے بازار
چوک میں بہت بڑی لمبی چوڑی دکان جنرل مرچنٹ کی تھی ان
کے یہاں عربی اخبار آتے تھے۔ حاجی کے ایک دوست مولوی
عبدالودود صاحب بانی اسلامیہ اسکول بریلی تھے۔ وہ اکثر
رسالوں میں حسان صاحب کے افسانے پڑھ کر متاثر تھے
کسی تقریب میں ملاقات ہوگئی۔ مولوی عبدالودود صاحب حاجی
صاحب کی دکان سے عربی اخبار لاکر دیتے اور جو مضمون
پسند آتا اردو میں ترجمہ کراتے اور یہ ترجمہ ان کے پاس
پہنچاتا۔ بھائی حسین حسان صاحب کو بہت کم سنی سے ہی
افسانہ نگاری و مضمون نگاری کا شوق رہا ہے۔ رسالہ زمانہ،
شمع، نقیب، معارف وغیرہ میں مضامین شائع ہوتے تھے
اسی زمانے میں نانی صاحبہ بہت سخت بیمار ہوگئیں۔ وہ
ایک دولت مند گھر کی بیٹی تھیں۔ اپنے جہیز میں کئی گاؤں
لائی تھیں جن میں کسی گاؤں میں ۱۲ بسے کسی میں ۵ بسے تھے۔

نانی صاحبہ بھائی حسین سے کہا کرتی تھیں کہ مولوی عبدالقیوم
صاحب کو بلا لا۔ میں اُن کے ذریعہ تمہارے نام یہ جائیداد
کردوں بھائی حسین حسان صاحب ہمیشہ یہ جواب دیا کرتے
کہ جب ہماری اتنی بڑی جائیداد نہ رہی تو اس کو ہم کیا کریں گے۔
ماموں وغیرہ سب مخالف ہو جائیں گے۔ ہمارے بڑے ماموں
سیّد عابد حسین صاحب کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ نانی صاحبہ
نے اپنے سب سے بڑے لڑکے سیّد عابد حسین کی شادی اپنے
بھائی ظہور الدین کی لڑکی سے کی تھی بھائی اچھی خاصی جائیداد
کے مالک تھے اس لیے کہ نرینہ اولاد میں یہ ایک تھے جوانی
میں کسی لالچی عزیز نے زہر دیا تھا۔ ان کے بھی صرف ایک ہی
لڑکی تھی اس لیے بڑی جائیداد کی مالک تھیں۔ ماموں عابد حسین
صاحب نمک کے محکمہ میں مولانا محمد علی کے انڈر میں کام کرتے
تھے۔ شادی کے بعد ملازمت ترک کردی اور جائیداد کا کاروبار
سنبھال لیا۔ جب نانی صاحبہ کا آخری وقت آیا تو اپنے گھر
لے گئے اور وصیت نامہ مرتب کرکے دستخط کرانا چاہا تو
نانی صاحبہ نے فرمایا کہ حسین اور ذہین کا نام ہے بہر حال
ہمارے نام بھی حسب ضابطہ جائیداد میں لکھ دیے گئے۔

ہم لوگ بھی نانی صاحبہ کے پاس ہی تھے ماموں
صاحب کا حکم ہوتا کہ کھانا کھا کر سیدھے گھر جاؤ۔ محض اس
خیال سے کہ ہمارے بچے ان کی صحبت میں بگڑ جائیں گے۔
ماموں صاحب کے بڑے صاحبزادے عابد حسین صاحب بھی
جو بھائی حسین صاحب سے ۳-۴ سال بڑے تھے مدرسہ
مصباح العلوم میں پڑھتے تھے۔ ہمارے مدرسہ نہیں جاتے تھے
بلکہ ملازم پہنچاتا تھا۔

بھائی حسین صاحب قومی تحریک میں حصہ لینے لگے
۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے بدیشی کپڑے کے استعمال کی
مخالفت میں تحریک چلائی بھائی حسان صاحب نے بھی بڑے
جوش و خروش سے ساتھ دیا۔ ٹاؤن ہال کے میدان میں
بہت بڑا اونچا ڈھیر لگا ہوا تھا آگ لگائی جا رہی تھی۔۔۔۔
بھائی حسین صاحب کے برابر میں کھڑا تھا میرے سر پہ مخمل
کی رامپوری ٹوپی تھی وہ میرے سر سے اتار کر آگ میں پھینک
دی ۲۲-۲۳ء میں مسلم لیگ کے والنٹیروں کا بہت بڑا اجتماع
تھا۔ مدرسہ مصباح العلوم میں سب کے کھانے کے انتظام
کیا گیا تھا۔ میں بھی تماشائیوں میں تھا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر
گوروں کا پہرہ تھا والنٹیروں کی آمد کا یہ حال تھا کہ میلوں
تک سفید ٹوپیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ چپہ چپہ پر
پہرہ تھا۔ اس کثیر مجمع میں بھائی حسین حسان صاحب کو
تلاش کر رہے تھے۔ ٹاؤن ہال کی چھت پر مشین گنیں نصب
تھیں ایک مزدور نے اپنے پھاوڑے سے گورے پر حملہ
کر دیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اِدھر مشین گن سے
گولیاں چلنے لگیں ہر طرف ایک شور و غوغا پبلک میں ایسا
جوش و خروش کہ گولیوں کا مقابلہ عورتیں بھی اینٹ پتھر سے
کر رہی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد ایسا کہ اس سے قبل کبھی
نہیں ہوا نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ سرکاری افسران اینٹ
پتھر سے زخمی ہو رہے تھے اور گولیوں سے پبلک مر رہی
تھی۔ ایک قصائی کا نوجوان لڑکا ٹاؤن ہال کی چھت
پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اس نے جاتے ہی مشین گن پر قبضہ
کرنا چاہا۔ جیسے ہی پبلک کو یہ بات معلوم ہوئی تمام نوجوانوں
کا مجمع ٹاؤن ہال کی چھت پر ہو گیا۔ پولیس اور سرکاری
عملہ اتنے بڑے مجمع کو قابو کرنے میں ناکام ہو گیا۔ گولی کھاتے
رہے اور اوپر پہنچتے رہے جو اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے
مشین گن سے گولیاں بند ہو گئیں اوپر کے عملہ میں بھگدڑ
مچ گئی بہر حال کچھ سرکاری عملہ کے لوگ زخمی ہوئے کچھ
مرے۔ پبلک کے لوگ زیادہ مرے۔ کانگریسیوں نے

بہر حال اپنا پروگرام پورا کر لیا۔ ہم بھی بھائی حسین صاحب کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور گھر آ گئے۔

نانی صاحبہ بیمار تو تھیں ایک دن حالت زیادہ خراب ہو گئی یہاں تک کہ جانبر نہ ہو سکیں اور اللہ کو پیاری ہو گئیں ان کے بعد ہماری حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہو گئی یتیم و یسیر ہو ہی چکے مگر نانی صاحبہ کی محبت و پیار ملا تھا اس سے بھی محروم ہو گئے۔

ہمارے تین ماموں اور ایک خالہ تھیں بڑے ماموں سید عابد حسین، منجھلے سید زاہد حسین صاحب سب سے چھوٹے سید ذاکر حسین یہ صاحب بہت غریب بے پڑھے تھے۔

منجھلے ماموں زاہد حسین صاحب گورنمنٹ سروس میں تھے اُن کے تبادلے ہوتے رہتے اس زمانہ میں وہ شاہجہانپور میں تھے ان کے اس وقت کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اس لیے چھوٹے بھائی محمد معین کر لیا تھا۔ فطرتاً مزاجی اعتبار سے بڑے ماموں کے مقابلہ میں غصہ تو بہت تھا مگر محبت، خدا ترسی، صلۂ رحمی کا جذبہ رکھتے تھے بڑے صاف گو۔ عابد زاہد۔ نمود و نمائش ریاکاری نام کو نہ تھی بہر حال معین میاں شاہجہانپور میں پڑھتے میٹرک کر چکے تھے اچانک پلیگ ہو گیا وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اب ہم صرف دو بھائی بڑے ماموں کے یہاں رہ گئے۔ بھائی حسین حسان صاحب کی خط و کتابت ندوہ سے جاری تھی۔ ندوہ والوں نے لکھ دیا کہ آپ آ جائیے اِدھر ماموں صاحب کے توہین آمیز سلوک سے عاجز تھے ہی بھائی حسین نے فوراً لکھنؤ جانے کی تیاری شروع کر دی بھائی حسین حسان نے اپنے تعلیمی سلسلہ میں کسی عزیز و اقارب کا ایک پیسہ کا احسان نہیں لیا بھائی صاحب ندوہ چلے گئے ادھر ناتا صاحب نے ہم

نابالغوں کی طرف سے عذرداری کر رکھی تھی۔

بھائی مبین صاحب کے نام وارنٹ جاری ہو گیا بمبئی میں ان کی گرفتاری ہوئی مختصر یہ کہ ان کو جیل ہو گئی جس سے ہمیں تو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پوری جائیداد تباہ کر چکنے کے بعد سوائے جیل کے اور اُن کو حاصل بھی کیا ہو سکتا تھا چند ماہ جیل میں رہ کر باہر آ گئے داڑھی چھوڑ اور پیری مریدی کا پیشہ اختیار کر لیا اور مستقل بمبئی میں رہنے لگے بیوی بچے پریشان ہونے لگے۔ بیوی کے عزیزوں نے ایک اسکول میں استانی کی حیثیت سے ملازم کرا دیا۔

میں نے بھی چند روز بریلی میں گذار کر بریلی چھوڑ دی بریلی کے قریب ایک قصبہ بہیڑی ہے وہاں اپنے ایک دوست محمد نظر صاحب اورسیر کے پاس چلا گیا وہاں چھوٹے چھوٹے کاموں کی ٹھیکداری کرنے لگا چھ سال وہاں رہا۔ بڑے ٹھیکوں میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ ایک بڑے ٹھیکے میں بڑا نقصان ہو گیا۔ دوستوں کے تبادلے ہو گئے۔ بددل ہو کر یہ جگہ اور کام چھوڑ دیا۔

لیکن میرا قیام ابھی بہیڑی ہی میں تھا کہ ناتا صاحب قبلہ نے بلوا لیا اور فرمایا کہ چند روز میرے پاس رہو میں ان کے حکم کی تعمیل میں رہنے لگا۔ بڑے جلالی سید، پورے محلہ پر ان کا رعب طاری تھا۔ اس لیے ہم بہت ڈرتے تھے۔ ۱۰۰ سال قبل ان کی تعلیم و تربیت ایک انگریز کمشنر جانسن نے کی تھی۔ نانا کے والد میر نادر حسین صاحب سے ان کی دوستی تھی وہ سہسوان کے رئیسوں میں تھے۔ جانسن صاحب نے میر صاحب سے کہا کہ صادق حسین کو میں پڑھاؤں گا۔ میر صاحب نے رضامندی ظاہر کر دی کمشنر صاحب نے کالج میں داخل کرا دیا۔

کمیشنر صاحب نے انھیں بی اے کرایا اور کسی اچھے عہدے پر اُن کا تقرر کر دیا۔ اس زمانہ میں بڑے عہدوں پر انگریز ہی ہوا کرتے تھے۔ ان کا افسر بھی انگریز تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اپنے افسر سے لڑ لیے اور مار پیٹ کر گھر آ گئے اور کمیشنر صاحب کو اطلاع کر دی۔ غرض کہ بہت سے عہدوں پر تقرر ہوا۔ مگر اپنے ہر افسر سے لڑ جھگڑ کر گھر آ جاتے۔ ایک مرتبہ نانا صاحب اپنے ایک عزیز کو کمیشنر صاحب کے پاس لے گئے وہ اتفاق سے کوٹ پتلون میں ملبوس تھے کمیشنر صاحب یہ لباس دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے خوب ڈانٹا تم لوگ نقال ہو۔ تمہارا اپنا کوئی لباس نہیں ہے غرض کہ اس قدر ڈانٹا کہ ان کی یہ جرأت بھی نہ ہوئی کہ سفارش کریں بے نیل و مرام گھر واپس آ گئے۔ نانا صاحب اپنی بد مزاجی کی وجہ سے کسی ملازمت پر نہ لگ سکے حالانکہ اُن کے ساتھی کوئی کلکٹر کوئی ڈپٹی کلکٹر تھے۔

ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نانا کے حکم کی تعمیل میں ہیبٹری میں رہنے لگا مگر ہر لحہ یہ خوف طاری رہتا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جو مزاج و مرضی کے خلاف ہو نانا صاحب اکثر فرماتے کہ جو حسین کو اپنی لڑکی دے گا اس کو اپنی جائیداد لکھ دوں گا۔ یوں خالہ صاحبہ کی لڑکی طے تھی۔ عام اصطلاح میں ٹھیکرے کی مانگ کہتے ہیں وہ غالباً بوقت پیدائش دونوں بہنوں کے مابین طے ہو گیا ہو گا۔ بہر حال میں نانا صاحب کی خدمت میں رہنے لگا اپنی ہی چارپائی پر سلایا کرتے تھے۔ ایک دن عصر کے بعد انگلیوں پر کچھ گن رہے تھے میں نے معلوم کیا آپ کیا گن رہے ہیں فرمایا کچھ نہیں تہجد گزار شب بیدار تھے دلائل الخیرات بہت پابندی سے پڑھا کرتے۔ ایک دن رات کو سوتے ہوئے فرمایا کہ آج تمہاری ضرورت ہو گی اٹھاؤں اٹھ جانا۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے نیند آ گئی سو گئے۔ حسب معمول نصف شب کے بعد اُٹھ گئے۔ لالٹین لے کر جلانے کے لیے اٹھائی ہاتھ سے چھوٹ گئی اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی تو میں اٹھ گیا اور کہا کہ لائیے میں جلا دوں۔ بڑی تیز آواز میں کہا نہیں جب میں اٹھاؤں اس وقت اٹھنا۔ میں یہ سن کر پھر لیٹ رہا خود لالٹین اٹھا کر جلائی اور ڈھیلا اٹھا کر پیشاب کو چلے گئے۔ چند منٹ بعد آواز دی کہ اب تمہاری ضرورت ہے آؤ پیشاب کر چکے تھے۔ کہا مجھے اٹھاؤ میں نے گھٹنے پکڑ کر اٹھانا چاہا بڑے زور سے ڈانٹا ایسے نہیں بغل میں ہاتھ ڈال کر اٹھاؤ بغل میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔ دیوان خانہ کے سامنے ایک کھٹولہ پڑا تھا کہا یہاں بٹھاؤ۔ تھوڑی دیر بیٹھنے پر فرمایا جانماز پر لے چلو میں اُٹھا کر جانماز پر لے گیا۔ سجدہ میں چلے گئے اور کہا پیٹھ سہلاؤ۔ میں پیٹھ سہلانے لگا چند منٹ کے بعد میں نے دریافت کیا۔ کہیے کچھ سکون ہوا مکرر سہ کرر دریافت کرنے پر بھی جواب نہ ملا تب میں بہت پریشان ہوا اور گھبرا کر گھر والوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں سب ہی لوگ آ گئے اس وقت بڑے ماموں کے علاوہ سب ہی اولاد موجود تھی۔ بظاہر کوئی ایسی علامت نہیں تھی کہ جس سے سمجھا جاتا کہ موت واقع ہو جائے گی کسی قسم کی بیماری بھی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی موت کی اطلاع پہلے ہی ہو چکی تھی دن اور وقت سب معلوم تھا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد ہمارے منجھلے ماموں صاحب نے اپنی بڑی صاحبزادی فہمیدہ جو ان کی بہت چہیتی بیٹی تھیں ان کے لیے بھائی حسین حسّان صاحب کو منتخب یہ ماموں صاحب کی پہلی بیوی سے تھیں۔ پہلی بیوی سے صرف تین لڑکیاں تھیں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ان کے انتقال کے

کے ایک عرصہ کے بعد ماموں صاحب کی بڑی بھاوج نے
یہ دوسرا رشتہ ایک غیر خاندان میں تھا۔

ماموں صاحب نے مجھ سے کبھی ذکر کیا میں نے عرض کیا مناسب
ہے ان کی بہن خالا نے بھی اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔ لیکن بھائی
حسین عثمان صاحب کو ان منصوبوں کی کوئی خبر نہیں نہ میں نے
ہی کوئی اطلاع کی ماموں صاحب نے بھائی حسان صاحب کو
بلانے کے لیے ٹیلگرام دے دیا۔ بھائی حسان صاحب نے
جواب میں معذرت چاہی پھر دوسرا ٹیلگرام دیا کہ اس وقت
تمھاری سخت ضرورت ہے۔ فوراً روانہ ہو جاؤ۔ چنانچہ تیسرے
دن صبح میں آ پہنچے .... ماموں صاحب نے تاریخ عقد
تعین کردی۔ بھائی حسین صاحب کو جب معاملہ کی نوعیت
معلوم ہوئی تو بہت گھبرائے بے انتہا پریشان ہو گئے مجھے
بہت ڈانٹا کہ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں کی اور دہلی واپس
جانے کی کوشش کرنے لگے لیکن ان کا سوٹ کیس چھپا دیا
گیا۔ ادھر عقد کی تاریخ بھی آ پہنچی۔ دعوت نامے سب کو
پہنچ چکے مہمان بھی جمع ہو گئے۔ حضرت مولوی لیٰسین صاحب
بھی عقد پڑھانے آ گئے۔ ادھر دولہا صاحب کی تلاش
ہو رہی ہے جب تلاش کرنے والے تھک کر چُور ہو گئے،
ہار کر بیٹھ گئے تلاش کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ ماموں
صاحب کا مارے غصہ کے بُرا حال بے انتہا پریشان ۔
غرضکہ تمام براتی اور مولوی لیٰسین صاحب واپس ہو گئے
تلاش برابر جاری رہی۔ تیسرے دن اپنے دوست
شکور صاحب کے یہاں ملے مگر عقد کے دن سمیع الدین وکیل
کے یہاں رہے بہرحال شکور صاحب سمیع الدین وکیل اور
دوسرے دوستوں نے بہت دیر تک سمجھایا تب بمشکل
تمام راضی ہوئے۔

پھر دوبارہ تاریخ عقد طے ہوئی اور بھائی حسین
با دل نخواستہ دولہا بنے۔ یوں شادی میں اچھا خاصا ہنگامہ
رہا خوب چہل پہل رہی عقد ہوا مہر پر مجھے اعتراض ہوا
تو بڑے ماموں صاحب نے فرمایا۔ ہمارے خاندان میں
۲۵ ہزار کا ہی بندھتا ہے تمھاری ماں کا بھی ۲۵ ہزار
مہر تھا۔ ایک صاحب بولے یہ سب تمھارے بڑے ہیں
تم کیوں دخل دیتے ہو۔ میں نے دیکھا دولہا بھی خاموش
ہے میں بھی خاموش ہو گیا۔ یہ تقریب بہ خیر و خوبی ختم ہو گئی
دوسرے دن دولہا بھی دہلی واپس ہو گئے۔ کچھ دن کے بعد
میں بھی دہلی پہنچ گیا۔ اور طبیہ کالج میں حکیم کبیر الدین صاحب
کی ہمدردی و مہربانی سے داخلہ لے لیا۔ ہم دونوں بھائی
قرول باغ گلی نمبر ۷ میں رہتے تھے۔ پڑوس کی ایک عورت
کھانا پکا دیتی تھی اس طرح ۴۔ ۵ سال گزر گئے۔ [illegible]
سے رخصتی کی تحریک نہ ماموں صاحب کی طرف سے۔ ہر
طرف خاموشی طاری تھی۔ بھائی حسین حسان صاحب سے
اس مسئلے پر کبھی گفتگو بھی نہیں ہوئی۔ یوں بھی بہت کم بات
چیت ہوتی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھیں میرے مستقبل کے
بارے میں کوئی فکر تھی یا نہیں۔ بچپن سے ہی بہت کم
کم سخن واقع ہوئے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی بھی
سے یہ دریافت کیا ہو کہ تمھارا کیا ارادہ ہے، کیا کرنا چاہتے
ہو۔ یا کیا کرو گے۔

ایک روز میں نے کہا کہ آپ بھی خاموش ہیں اور
ماموں صاحب بھی کوئی تحریک نہیں کر رہے ہیں آخر یہ
کیسے منڈھے چڑھے گی۔ بہرحال جو خدا کو منظور تھا ۔
عقد ہو چکا ہے۔ عقد کو بھی ۵۔ ۶ سال گذر چکے اب میں
چاہتا ہوں کہ میں کانپور جا کر بھاوج کو لے آؤں۔ بہت دیر

— پرنسپل عبدالشکور

سوچ و بچار کے بعد کہا تمھاری مرضی کل چلے جاؤ۔ چنانچہ دوسرے دن شام کی ٹرین سے کانپور روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن کانپور پہنچ گیا۔ گھر کے سب ہی لوگ بہت خوش ہو گئے۔

چھوٹی بہنیں مجھ سے بے انتہا محبت کرتیں بالکل اپنے سگے بھائی کی طرح۔ اُن سے خوب ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ رہتی یہ سب سے چھوٹی عائشہ بہت شریر زندہ دل، منجھلی آصفہ بہت ہی پابند شریعت صوم و صلوٰۃ کی پابند۔ ماموں صاحب آفس جا چکے تھے دوپہر کا کھانا کھا کر میں سونے گیا یوں بھی کھانے کے بعد سونے کا عادی تھا۔ سفر کی تکان رات کا جاگا ہوا۔ بڑی غافل نیند سویا۔ اب دونوں بہنوں کو مذاق کا موقع مل گیا۔ میں تقریباً ۵ بجے اٹھا تو دیکھتا ہوں کہ سیدھے ہاتھ میں ایک بیضاوی قسم کا آئینہ میرے ہاتھ پر بندھا ہے میں سمجھ گیا کہ یہ عائشہ کی حرکت ہے اس نے خوب دل کھول کر میرے منہ پر سیاہی لگائی آئینہ ہاتھ پر بندھا اس لیے کہ اٹھتے ہی اپنا چہرہ دیکھ لیں۔ جیسے ہی ان کو معلوم ہوا کہ میں اُٹھ گیا ہوں دونوں چھپ گئیں میں ان کو ہر کمرہ میں ڈھونڈتا رہا۔ اور دوسرے لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چند منٹ تلاش کیا منجھلی آصفہ غریب ہاتھ لگ گئی۔ وہ کہہ رہی منجھلے بھائی بھائی میں نے نہیں کیا۔ ہم آصفہ کی مرمت کر ہی رہے تھے کہ ماموں صاحب آ گئے یہ ہنگامہ دیکھ کر حیران رہ گئے جب میرا چہرہ دیکھا تو ہنسے بغیر وہ بھی نہ رہ سکے۔ کہنے لگے تم نے اس غریب ملانی کو پکڑ لیا کسی نے کہا دھوبی سے بس نہ آئی گدھیا کے کان پکڑے۔ اتنے میں عائشہ بھی آ گئی اور ماموں کی آڑ لے کر بیٹھ گئی میں نے وہیں جا پکڑا اور منہ کالا کر دیا۔ بہر حال اچھا خاصا مذاق رہا۔

شام کو ماموں صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔

ماموں صاحب کی گفتگو میں شکوہ کا انداز بالکل نہیں تھا۔ تین روز کانپور رہ کر چوتھے روز دہلی روانہ ہوئے بھاوج کی خواہش ایک دن اناؤ میں ٹھہرنے کی تھی وہاں ان کی سہیلیاں رہتی تھیں۔ تیسرے دن ہم دہلی پہنچ گئے۔

بھائی صاحب کی امانت ان کے سپرد کی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں حسیب میاں پیدا ہوئے میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا جب حسیب میاں چھ مہینے کے تھے کہ حیدرآباد گورنمنٹ سے بلاوا آگیا۔ نواب میر عثمان علی خاں نے ایک کالج تعمیر کرایا تو حکیم مقصود جنگ بہادر اس کے ڈائرکٹر تھے۔ حکیم کبیر الدین صاحب۔ حکیم فضل الرحمٰن صاحب اور حکیم الیاس خاں صاحب نے اعلیٰ حضرت کی منظوری حاصل کر کے بلوایا میں اناٹمی کے چارٹ واٹر کلر سے تیار کرتا میرا تعارف نواب مقصود جنگ حکیم کبیر الدین صاحب نے کرایا۔ اس لیے مجھے بھی بلوا لیا تھا ہم حیدرآباد روانہ ہو گئے۔ حکیم الیاس خاں صاحب نہیں گئے۔

دس سال کے بعد سنہ ۴۸ء میں دہلی واپس ہوا اس وقت شعیب میاں ۳ سال کے تھے۔

جامعہ کی سلور جوبلی جو اوکھلے میں ہوئی تھی میں اور بیوی شریک تھے۔ کچھ دن دہلی رہ کر ہم لوگ حیدرآباد واپس ہو گئے سنہ ۴۸ء میں حسیب میاں کی والدہ کے انتقال کی خبر حیدرآباد پہنچی۔ انتقال دہلی میں مرض آنتوں کی دق میں ہوا۔ ایک بچہ ایک سال کا چھوڑا محمد متین بہت خوبصورت تھا۔ سنہ ۴۹ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری شادی کب ہوئی اور کیسے ہوئی بھائی حسین صاحب نے اپنے خط کے ذریعہ کبھی کوئی اطلاع نہیں دی۔ بہت عرصے کے بعد حسیب میاں کے خط سے معلوم ہوا۔

ہاں یہ ایک بات تشنہ رہ جاتی اور لوگوں کو تشویش باقی [illegible]

جناب پروفیسر محمد عاقل

# کامریڈ حسین حسّان زندہ باد!

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق استاد اور رسالہ 'جامعہ' کے سابق مدیر محترم پروفیسر محمد عاقل نے جولائی کا پیام تعلیم پڑھ کر فی البدیہہ یہ سطور قلمبند کی ہیں۔ ان سے مرحوم کے کردار کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ (مدیر)

قلندری جامعہ میں کئی طرح کے قلندر تھے۔ غریب قلندر، امیر قلندر، عیّار قلندر اور مکّار قلندر — ان قلندروں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کچھ کہنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ صرف اشارہ ہی کافی ہے۔

یہاں تو اصل میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حسین حسّان صاحب کا تعلق غریب محنت کش، اہلِ قلم کی برادری سے تھا۔ جو عموماً قلندرانہ زندگی گزارتے ہیں، جو آرام و آسائش اور ان کی ترقی اور اضافہ سے بے نیاز ہوکر اپنا مفوّضہ کام، خلوص اور ایمان داری سے کرتے رہتے ہیں اور اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کرتے کہ ان کے عیّار اور مکّار ساتھی دکھاوے اور نمایش کے جگمگاتے کام کرکے کیسا روپیہ بٹور رہے اور گلچھرے اڑا رہے ہیں اور ساتھ ہی نام و نمود بھی کما رہے ہیں۔

حسین حسّان جیسے اول دن جامعہ میں آئے تھے ویسے ہی آخری دن تک جامعہ میں رہے۔ سادہ ترین کپڑے، سادہ ترین گھر، کم سے کم ساز و سامان اور دوسرے لوازمات۔ وہ ملکیت سے محروم جامعہ میں آئے۔۔۔ اور ملکیت سے محروم یہاں سے رخصت ہوئے۔

یوں کہنے کے لیے تو قلندری جامعہ میں سب ہی مزدور اور سب ہی مالک تھے۔ لیکن کچھ مالک بننا جانتے تھے وہ یہاں بھی مالک بن گئے اور کچھ مزدور ہی رہنا چاہتے تھے وہ بے چارے مزدور ہی رہے۔ حسین حسان صاحب صحیح معنی میں پرولتاریہ تھے۔ وہ کبھی مالک و مختار نہیں بن سکتے تھے اور نہیں بنے۔

آدھی پاؤ مزدوری پر کام، بے گار، غلامی فرماں برداری — یہ سب وہ کرنا جانتے تھے۔ یہ سب انھوں نے کیا۔ دوسروں نے مزے اور اطمینان سے یہ سب ان سے کرایا۔ ناجائز فایدہ، انتفاع۔ تقرری، تبادلہ، برطرفی۔ روزگار اور بے روزگاری — ان سب کے وہ شکار بن سکتے تھے۔ بنے۔ دوسروں کو ان کا شکار بنانا ان کو نہیں آتا تھا۔ اس لیے کبھی مالکانہ انداز پیدا نہیں کر سکے۔

ان کو اپنا خراجِ عقیدت، ایک سچا ایمان دار مزدور مان کر پیش کرتا ہوں۔

کامریڈ حسین حسّان زندہ باد۔

---

تمھاری دولت میں غریبوں اور مسکینوں، معذوروں اور مجبوروں کا بھی حق ہے۔

(حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

از بیگم آصفہ مجیب

# حسین حسّان صاحب

آج پیام تعلیم کی بزم سونی اور سوگوار ہے کیونکہ وہ اپنے بڑے سچے محسن اور معمار سے محروم ہے۔ جس نے برسوں اپنے شوق اور محنت سے اس کو رونق اور ترقی بخشی۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، ان کی ذہنی نشو و نما، سیرت اور اخلاق کی تعمیر کا ایک عظیم کام کیا اور آخر دم تک اس لگن سے یہ خدمت انجام دیتے آنکھیں موند لیں۔ میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو دل کو دھکا لگا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۶۴ء میں ایک دن شام کو جامعہ کے اسٹاف کلب میں ایک جلسہ تھا مجیب صاحب کے ساتھ میں بھی وہاں شرکت کے لئے آئی جلسہ ختم ہوا میں جانے لگی تو حسین حسّان صاحب میرے پاس تشریف لائے اور پیام تعلیم کے لیے مجھ سے کوئی مضمون یا کہانی لکھنے کا تقاضا کیا۔ ”میں ذرا سٹپٹائی۔ بہت سال ہوئے ایک دو کہانیاں بچّوں کے لیے لکھ دی تھیں جو مکتبہ جامعہ سے کتابی صورت میں چھپیں۔ پیام تعلیم کے لیے لکھنا ایک نیا تجربہ تھا۔ بچّوں کے لیے لکھنا کچھ آسان نہیں ہے۔ بات بڑی ہو اور ایسے سادہ پیرائے میں پیار سے کہی جائے جو بچّوں کو بھائے ان کے دل میں بیٹھ جائے لیکن ان کے اصرار کو جس میں بچّوں کے لیے اتنی چاہت اور لگن ہے کیسے رد کیا جائے۔ میرے لیے کوئی چارہ نہیں رہا اور پہلی کہانی چڑیا پر ”چارہ گر بھی کیا کرے“ میں نے لکھی۔ بہت خوش ہوئے۔ دسمبر ۱۹۶۴ء کے پیام تعلیم میں چھپی۔ جو ان پڑھا [illegible] انگریزی سے کوئی

قصہ اور کہانی ترجمہ کر کے بھیجتی۔ پیام تعلیم کا پرچہ کبھی خود دے جاتے۔ لکھنے کے سلسلہ میں مشورہ دیتے۔ ”جب اور اب“ میں نے ان ہی کے مشورے سے لکھا۔ جس میں پرانے زمانے کے رسم و رواج اور طور طریقے بتائے ہیں۔ یہ مضامین سلسلہ وار چھپے۔ بعد میں انھوں نے اسے کتابی صورت میں شائع کرایا۔ وہ ایسے دل سے لکھنے کو کہتے کہ انکار کفر معلوم ہوتا۔ طبیعت کچھ اچھی نہ ہوتی جب بھی لکھنے بیٹھ جاتی کہ حسین حسّان صاحب کا تقاضا بھلا کیسے ٹالا جا سکتا ہے جس میں بچّوں کا مفاد ہے۔ اکثر مجھ سے کہتے کہ مجیب صاحب سے بھی لکھوائیے۔ ان کی بے پناہ مصروفیت کو جانتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش کہ اس میں بچوں کا کچھ حصّہ ہو دل سے لگی رہتی۔

بچّے ہی بڑھ کر اپنے خاندان، قوم اور ملک کو بناتے سنوارتے ہیں نام روشن کرتے ہیں۔ خدا ان کی فطرت میں اچھی صلاحیتیں دیتا ہے۔ ان کو سمجھ کر اور سمجھا کر ان کے شوق اور امنگ کو ابھار کر اجاگر کریں کہ اس سے ہر طرف اجالا پھیلے۔ چاند تارے ان کے آگے ماند پڑ جائیں۔ اس پر ان کی نظر رہتی تھی۔ دنیا میں لڑکے لڑکیوں کے اچھے چلن اور عمل سے امن امان اور شانتی ہو۔ سب میں میل جول اور بھائی چارہ ہو۔ یہی ان کا پیام تھا۔ انسان نہیں رہتا مگر کام باقی رہتا ہے۔ اور اس سے اس کا نام اور قدر بھی۔

امید ہے پیام تعلیم اور زیادہ ترقی کی منزلیں طے کرے گا اور نئی نسل کو اپنا پیغام پہنچاتا رہے گا جو حسین حسّان صاحب کا

جناب محمد حفیظ الدین

# آخری تصویر

## مولوی حسین حسّان ندوی جامعی (مرحوم)

پیام تعلیم کے پڑھنے والے بچّوں میں سے اکثر نے اپنے اڈیٹر حسین حسّان صاحب کے انتقال کی خبر کے ساتھ ان کی آخری تصویر دیکھی ہوگی۔ یوں تو ان کی طالب علمی کے زمانے سے بہت سی تصویریں کھنچتی رہی ہیں لیکن وہ نمایش اور شہرت سے بچتے تھے۔ اس لیے انھوں نے کبھی اپنی تصویر پیام تعلیم میں شایع کرنا گوارا نہ کیا۔ آپ نے ان کی جو تصویر دیکھی ہے غالباً اس کے بعد ان کی کوئی اور تصویر کھینچی نہیں۔ یہی آخری تصویر ہے۔ فوٹوگرافر تصویر کھنچوانے کی ترغیب دینے کے لیے اشتہاروں میں یہ جملہ لکھتے ہیں "تصویر بھی ایک اچھی یادگار ہے" ہوگی۔ اس اعتبار سے کہ انسان جو شکل و صورت رکھتا ہے وہ ہو بہو کیمرے میں آجاتی ہے اور ہم اس گوشت پوست کے انسان کو دیکھ لیتے ہیں جو کبھی چلتا پھرتا تھا۔ اب ایک خاموش بے حس و حرکت نقش بن گیا ہے۔ سائنس نے تو چلتی پھرتی، بولتی ہنستی تصویریں بھی بنا ڈالی ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جیسے ہم اصلی تصویر کی حفاظت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ذرا چھینک آئی ڈاکٹر کے پاس دوڑے گئے۔ ذرا کوئی تکلیف ہوئی سارا گھر بے چین ہے۔ صحت کے لیے جو بھی جتن ممکن ہیں کر ڈالے مگر پھر بھی ہم اسے بچا نہیں پاتے۔ ایک نہ ایک دن فنا کے چکر میں آکر رہتی ہے۔

جب ہم جیتی جاگتی تصویروں کو ایک خاص مدت سے زیادہ دیر تک نہیں بچا سکتے تو یہ بے جان نقش و نگار کی حفاظت کیوں کر ممکن ہے اسے بھی زمانہ کسی نہ کسی وقت مٹا کے رہے گا۔

صبح کو طائرانِ خوش الحان
پڑھتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانْ

(صبح کو خوش آواز پرندے کہتے ہیں کہ زمین پر جو کچھ ہے وہ سب فنا ہونے والا ہے)

غالباً حسین حسّان نمبر میں کچھ تصویریں منتظمین کے اہتمام سے مزید فراہم ہوں گی۔ ہونی بھی چاہئیں۔ مگر وہ تصویریں تم کو یہ نہیں بتا سکیں گی کہ حسین صاحب کیسے انسان تھے۔ اپنے ظاہری خستہ اور ٹوٹے ڈھانچے کے اندر کتنا دردمند دل رکھتے تھے وہ اپنا فرض ادا کرنے اور ذمے داری پوری کرنے کے لیے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا لیتے تھے اور کتنی دوڑ دھوپ کرتے تھے۔ یہ کون سی تصویر بتا سکتی ہے کہ پیام تعلیم نکلنے کی تاریخ قریب آرہی ہے۔ کاتب صاحب بیمار ہیں۔ کاغذ کا میسّر آنا دشوار ہے۔ بعض ضروری مضامین جس سے وہ رسالے کی رونق اور دلچسپی بڑھانا چاہتے ہیں موجود نہیں ہیں۔ مکتبے کی مالی حالت ابتر ہے۔ کاپیاں وقت پر پریس نہیں گئیں۔

تو رسالہ دیر سے ملے گا مقررہ تاریخ پر رسالہ ڈاک خانے نہ پہنچا تو ڈاک والے مطلق رعایت نہ کریں گے۔ رات ان پر دیرینہ سانس کے موذی مرض کا دورہ پڑ چکا ہے۔

............ دمے کا مرض خدا دشمن کو نہ دے۔

کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ اب سانس اکھڑی۔ یہ ساری پریشانیاں ایک جانِ ناتواں پر ہیں۔

کبھی دیکھیے تو وہ کاتب صاحب کے ہاں بیٹھے مضمون لکھوا رہے ہیں۔ کبھی جامعہ نگر سے دس میل دور، جامع مسجد پہنچ کر پریس میں پروف پڑھ رہے ہیں۔ کبھی سڑ سڑ چلتے ہوئے جامعہ نگر کے آخری کونے پر ایک صاحب کے ہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس امید پر کہ ان صاحب سے ایک اچھا مضمون ملنے کی توقع ہے۔ وہ جو کلے کوسوں دور ایک صاحب رہتے ہیں ان سے خط کتابت اور نہ جانے کن کن ذریعوں سے تقاضے جاری ہیں۔ کان میں بھنک پڑ گئی ہے کہ فلاں صاحب اثر والے ہیں چند خریدار ان سے مل سکتے ہیں۔ حسین صاحب ہیں کہ طرح طرح سے انھیں رام کرنے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ غرض پیامِ تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے اور اسے زندہ و توانا رکھنے کی کوشش میں ان کی زندگی کا ہر ہر لمحہ صرف ہوتا تھا۔ یہ والہانہ جذبہ۔ یہ بے پناہ لگن۔ فرض اور ذمے داری کا ایسا زبردست احساس آپ کو کون سی تصویر بتا سکتی ہے جب یہ بات ہے تو کیوں نہ ہم ان نیکیوں اور اچھائیوں کو سمیٹ کر آپس میں بانٹ لیں جو ان میں بسی اور رچی ہوئی تھیں۔ جن کو نہ زمانے کی آب و ہوا زنگ لگا سکتی ہے۔ نہ دیمک چاٹ سکتی ہے نہ کیڑے چھلنی کر سکتے ہیں وہ خوبیاں امر ہیں جب تک دنیا قائم ہے [illegible] بتاؤں ان میں کیا کیا خوبیاں تھیں۔

میں ان کا پرانا ساتھی ہوں پھر بھی سب خوبیاں میں نہیں بتا سکوں گا۔ اچھا ہے اس وقت چند اچھائیاں بتا ان کو آپ اپنائیے اور کبھی لوگ ان کی اچھی اچھی باتیں بتائیں گے۔ سب مل کر بہت سی باتیں جمع ہو جائیں گی۔ مجھے بھی توفیق ہوئی تو پیامِ تعلیم میں کبھی کبھی ذکر کرتا رہوں گا۔

حسین کے معنی تو آپ جانتے ہیں نا! خوب صورت کو کہتے ہیں۔ حسین صاحب کی ظاہری شکل و صورت بری نہ تھی تو اتنی نفیس بھی نہ تھی کہ انھیں حسین کہا جا سکے۔ ماں باپ کی نظروں میں اپنا بچہ حسین ہوتا ہے۔ ان کی محبت و شفقت ایسے نام رکھ دیا کرتی ہے۔ انسان کو بناتا اللہ ہے نام بزرگ رکھتے ہیں اس میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جیسا بنا بن گئے۔ جیسا پکارا گیا ویسا نام پڑ گیا۔ نہ وہ بس میں تھا نہ یہ اختیار میں۔ البتہ اس ہڈیوں کے پنجرے کے اندر ایک انسان رہتا ہے اس کو سنوارنا اور بنانا اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں بہت کھکیڑیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ پتا مار کے، عیش آرام کو تج تج کے، لالچی دل کی خواہشوں کو کچل کچل کے اور نہ جانے کیا کیا سہہ کر آدمی انسان بنتا ہے۔ حسین صاحب ایسے انسان بن گئے تھے۔ وہ اندر سے سچ مچ حسین تھے۔

لکھنؤ میں عربی کا ایک بڑا مدرسہ ہے جو ہندوستان اور اس سے باہر بھی مشہور ہے اس کا نام ہے دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ حسین صاحب نے وہاں تعلیم پائی تھی وہاں سے مولوی ہو کر نکلے اور اس دارالعلوم کی نسبت سے ندوی کہلائے۔ وہ ظاہرداریوں سے بیزار تھے۔ اس لیے [illegible]

نہ مولویوں کی سی ظاہری شکل بنائی ۔ ایک عام مسلمان کی
طرح رہتے تھے پر مذہبی عقیدوں میں بہت پختہ تھے ۔ جس طرح
وہ سیاسی خیالات میں پکے تھے کبھی اپنی راہ اور مسلک سے
نہیں ہٹے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ مذہب کے معاملہ
میں سخت تھے جو بات اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے ۔
اس پر عمل کرتے تھے ۔ مذہبی بحثوں میں کبھی اُلجھتے نہ تھے ۔
رسول اللہؐ اور بزرگانِ دین سے ایسی عقیدت تھی کہ کسی
گستاخ سے ادب کے خلاف کوئی بات سنتے تو ان کا چہرہ
تمتما اٹھتا ۔ بہت عرصہ ہوا رسول اللہؐ کی سیرت پر بچوں
کے لیے "سرکارِ دو عالم" کے نام سے ایک کتاب لکھی
تھی بچوں نے بہت پسند کی ۔ اور اب تک برابر چھپتی
رہتی ہے ۔ اسلامی ملکوں اور ان کے معاملات و حالات
سے انھیں بڑا لگاؤ تھا ، کبھی ان ملکوں پر آنچ آتی تھی ۔
تو تڑپ جاتے اور بے چین رہتے ۔ ان کے اچھے حالات
سنتے تو باغ باغ ہو جاتے ۔ مذہب یا کسی معاملے میں
جتنا اپنے سے بن پڑتا کرتے کسی پر اپنے خیالات لادتے
نہ تھے یہاں تک کہ اپنی اولاد پر بھی جبر یا سختی روا نہ
رکھتے تھے ۔

لکھنؤ کے دارالعلوم ندوہ سے طالب علمی کے بعد انگریزی
پڑھنے کے لیے جامعہ میں پھر طالب علم بن گئے اس ناتے سے
جامعی بھی کہلانے لگے اور یہاں اتنی انگریزی پڑھ لی کہ
اخبارات خوب اچھی طرح سمجھ لیتے تھے اور آپ لوگوں کے لیے
انگریزی کتابوں اور رسالوں میں اچھے اچھے مضمون تلاش
کرتے اور ان کا ترجمہ کرتے ۔ انگریزی زبان بہت ترقی کر چکی
ہے ........ کوئی اور زبان اس کا
مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ بچوں کا لٹریچر (ادب) اس میں بہت
ہے اور بہت اچھا ہے ۔ بچوں کے لیے تصویروں والی کتابیں
ان کی بائنڈنگ ، چھپائی ، خوبصورت تصویریں ، عمدہ کاغذ
اچھی معلومات ، دیکھ دیکھ کر حسرت سے کہتے ، ہماری
اُردو کو یہ بات کب نصیب ہوگی " مرنے والے کے
ساتھ نہ جانے ایسی کتنی آرزوئیں دفن ہو گئی ہیں ہمارے
حالات نے ان کے حوصلوں کا ساتھ نہ دیا ۔

ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی ، جو کام بھی اپنے
ذمے لیتے اس کا پورا حق ادا کرتے اور جو اچھی عادتیں
اختیار کرتے ان پر ایسی مضبوطی اور پابندی سے عمل کرتے
کہ گویا وہ اسی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ۔ انھوں نے
اپنی تندرستی کے لیے ٹہلنے کی ورزش ضروری قرار دے
لی تھی ۔ آندھی آئے مینہ برسے ، تڑاقے کی دھوپ
ہو یا کڑاکے کے جاڑے ، ان کے معمول میں فرق نہ
آتا تھا ۔

آزادی سے پہلے ایک مرتبہ ملک پر بہت نازک وقت
آیا تھا ۔ انگریزوں کا راج تھا ۔ کانگریس گاندھی جی کو اگوا
بنا کر بدیسی حکومت سے مانگ کر رہی تھی کہ ہمارا ملک
چھوڑ دو ، ہمیں اپنے ملک کی باگ ڈور خود سنبھالنے دو ۔
کوئی اپنے ہاتھ میں آئی ہوئی چیز آسانی سے کب چھوڑتا
ہے ۔ انگریز اس بات سے چڑ گئے ۔ ایک وائسرائے نے
جل کر کانگریس کو قانون کے خلاف قرار دے دیا ۔ اور آزادی
کے متوالوں پر جو کچھ جور و ظلم کر سکتا تھا کرنے لگا ۔ جس پر
شبہ ہوتا تھا کہ یہ کانگریسی ہے جیل بھیج دیا جاتا ۔ لوگ
بھی نڈر ہو گئے تھے بڑے شوق سے خوشی خوشی جیل
چلے جاتے تھے ۔ سارے جیل بھر گئے ۔ ادھر کام کرنے
والوں کی کمی ہو گئی ۔ دلّی میں راج دھانی ہونے کی وجہ
سے گورنمنٹ کا زور بہت تھا ۔ کانگریس ایک خبرنامہ
نکالتی تھی ۔ اس کا نکالنے والا کوئی نہ رہا حسین حسان صاحب

تو جب معلوم ہوا تو وہ اپنے جامعہ کے ایک ساتھی کو لے کر
سائیکلو اسٹائل مشین پر یہ خبر نامہ نکالنے لگے۔ دلی کے
چپے چپے پر خفیہ پولیس موجود تھی۔ سب میں کھلبلی مچ گئی کہ
یکایک یہ غیبی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ چاروں طرف
ڈھونڈ پڑ گئی۔ مگر حسین صاحب اور ان کے ساتھی
صبح کہیں تھے تو شام کہیں۔ ایک عرصے تک حکومت
کو ہوا نہ لگی۔ سی آئی ڈی کو پتا چلتا کہ ابھی یہاں تھے
دوڑی چلی آتی۔ کھسیانی ہو کر گھر کی ایک ایک چیز
دیکھ ڈالتی نہ جانے ان میں کہاں کی طاقت سما گئی تھی
کہ چھلاوے کی طرح منٹوں میں ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔
حکومت کے تیور بدل گئے۔ عملہ بڑھا دیا گیا۔ تلاش
میں زمین آسمان ایک کر دیے گئے۔ ایک بڑی حکومت
اور دو طالب علموں کا کیا مقابلہ؟ ایک دن پکڑ لیے گئے۔
پولیس اپنی ناکامیوں اور ہار سے جھلائی ہوئی تھی۔ سارا
غصہ بیچارے حسین حسان صاحب پر اتارنا شروع کر دیا۔
اگر ان کا ظلم بیان کیا جائے تو سننے والوں کے رونگٹے
کھڑے ہو جائیں۔ انھوں نے اپنی ناتواں جان پر سب
کچھ جھیل لیا۔ مگر راز کی ایک بات بھی نہ بتائی۔ آخر پولیس
نے تھک ہار کر انھیں جیل بھیج دیا۔ کچھ ہفتوں بعد ثبوت
نہ ملنے کی وجہ سے چھوڑ دینا پڑا۔ ان کی بہت سی ان کہی
باتیں ہیں۔ اگر کہی جائیں تو دنیا آش آش کرنے لگے۔ جانے
کتنی خوبیاں تھیں کہ جانے والا اپنے ساتھ لے گیا۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

آخر میں اس سورج کے ڈوبنے کی کہانی سن لیجیے۔ ان کی
جامعہ کی طالب علمی کے ساتھی، پھر عرصے سے پڑوسی اور
ہر بات ان کے ہر حال میں شریک، جامعہ کے مشہور
استاد حسین صاحب (ابو) آخری سانس تک ان کے
ساتھ تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ دل کا مرض بھی اور
بیماریوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ اس لیے اسپتال
میں ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ صبح کا وقت تھا۔
حسب معمول لیٹے لیٹے اطمینان سے باتیں کر رہے تھے
حسین صاحب (ابو) سن رہے تھے۔
کسی قسم کی پریشانی کے آثار نہ تھے۔ شاید "سرکار
دو عالم" کے لکھنے والے نے اپنے پیارے نبی کی گواہی کی
آواز کسی مسجد کے میناروں سے سنی یکایک دو ہچکیاں
آئیں اور بچوں کی مجلس میں بیٹھا مزے مزے کی باتیں
کرنے والا اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کر چل بسا۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
"ہمیں" سو گئے داستاں کہتے کہتے

جناب مولانا عبدالسلام قدوائی

# صبر و قناعت کا مجسمہ

میں ۱۹۲۲ء میں ندوے میں داخل ہوا۔ تو حسین صاحب مجھ سے تین چار درجے آگے تھے۔ نئے طالب علم ویسے بھی سینیر طالب علموں سے دُور دُور رہتے ہیں۔ پھر میں ڈے اسکالر بھی تھا۔ شاذو نادر ہی بورڈنگ کے اندر جانے کا اتفاق ہوتا پہلا سال اسی طرح گزر گیا۔ دوسرے سال انجمن الاصلاح میں آنے جانے لگا تو انجمن کے قلمی رسالے الاصلاح پر بھی نظر پڑی اور اس کے مدیر حسین حسان کے نام سے واقف ہوا یہ مولوی حفیظ الدین ندوی کی نظامت کا زمانہ تھا۔ ان کے اندر نظم و ضبط کا بڑا سلیقہ تھا۔ ان کی انتظامی صلاحیت نے الاصلاح میں نئی زندگی پیدا کر دی تھی شعبوں کی نئی تنظیم ہوئی، دارالاخبار کی میز اخبارات و رسائل سے بھر گئی اور دارالکتب میں کتابوں کا انبار لگ گیا اور کئی کئی الماریاں خریدی گئیں۔ خطابت و صحافت کے شعبوں میں سرگرمی نظر آنے لگی۔

الاصلاح طلبہ کی علمی اور تہذیبی انجمن تھی تجارتی ... کے لیے ایک دوسری انجمن تھی۔ یہ کتابوں کی ... تھی اس کا انتظام بھی پورے طور پر طلبہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے نفع سے ضرورت مند طلبہ کی مدد کی جاتی تھی اس کا نام المعین تھا حسین صاحب اس کے منیجر تھے ایک دن بلاغت کی کتاب مجموع الادب خریدنے کے لیے میں وہاں گیا یہ میری حسین صاحب سے پہلی ملاقات تھی رسالہ الاصلاح کے ذریعہ نام سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا اب صورت آشنا بھی ہو گیا ایک سال بعد میں بھی الاصلاح کا رکن منتخب ہو گیا۔ اس وقت مولوی حفیظ الدین ندوی جا چکے تھا ان کے دل میں مصر جانے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کے چند اور دوستوں کو بھی اس کی آرزو تھی حفیظ اسی فکر میں گئے تھے لیکن حالات سازگار نہ ہو سکے اور یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہ گئی اس زمانہ میں ندوہ میں ایک بڑے ذی علم اور پُر اثر استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی آگئے تھے۔ یہ ندوہ کے تخیل کی مکمل مثال تھے ان کی ذات میں بلا کی کشش اور گہرائی تھی زندگی نے زیادہ ساتھ نہ دیا مگر گنتی کے تین سال میں ندوہ کے زمین و آسمان بدل گئے طلبہ کے اندر غیر معمولی بیداری پیدا ہو گئی علم کا شوق ذوق ایسا پیدا ہوا کہ لوگ حیرت کرتے تھے مولانا کے فیضِ صحبت سے ان کی صلاحیتیں ابھر آئیں اور چھپے ہوئے جوہر نمایاں ہو گئے حسین صاحب کے اندر مضمون نگاری کی صلاحیت تھی مولانا عبدالرحمٰن کی تشویش اور ہمت افزائی نے ان کو اس راہ میں قدم اٹھانے کی ہمت دی الاصلاح کے قلمی مضامین کے ساتھ انھوں نے اخبارات و رسائل میں بھی لکھنا شروع کیا رفتہ رفتہ ملک کے مشہور رسائل میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے کانپور سے منشی دیا نرائن نگم "زمانہ"

کے نام سے ایک علمی و ادبی رسالہ نکالتے تھے۔ اس رسالہ
میں حسین صاحب نے عشاق عرب کے نام سے ایک سلسلہ
مضامین لکھا جو ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا گیا۔
آگرہ کے رسالے شمع میں بھی بہت عرصے تک قلمی معاون
رہے ان کی اس صلاحیت کی بنا پر مولانا عبدالرحمن مرحوم
نے انھوں نے اہل قلم کا خطاب دیا تھا۔

مولانا عبدالرحمن کے انتقال کا انھیں بہت
صدمہ ہوا۔ ندوہ سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا کسی طرح
ایک سال گزارا اس کے بعد جامعہ آگئے اس زمانہ
میں جامعہ آزاد قومی تعلیم کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا
حسین صاحب کا اٹھان خلافت و کانگریس کی تحریک
کے زمانہ میں ہوا تھا۔

مولانا عبدالرحمن کی صحبت میں جذبۂ حریت میں
اور پختگی پیدا ہوئی۔ یہی حریت پسندی انھیں جامعہ لائی
جامعہ میں عربی مدارس کے طلبہ کی جدید تعلیم کا خاص
اہتمام تھا اور درجۂ خاص کے نام سے ایک مستقل درجہ
قائم تھا۔ حسین صاحب اسی درجہ میں داخل ہوئے بعد
کو ان کے دوسرے ساتھی مولوی حفیظ الدین اور
عبدالجلیل صاحب بھی آگئے اور جامعہ کے اندر ندوہ
کی یاد کے تازہ رکھنے کا سامان بھی ہوگیا۔ ادارہ ان
کا یہ تعلق تا دم مرگ قائم رہا۔ ندوہ کی انجمن
طلبائے قدیم کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے کئی بار
لکھنؤ تک کا سفر بھی کیا مقامی اجتماعات میں پابندی
سے شرکت کرتے لیکن اس تعلق خاطر کے باوجود
وہ محض عقیدت مند نہ تھے بلکہ ناقد بھی تھے۔

ان کے ذہن میں ندوہ کا ایک بلند تصور تھا۔ تعلیم و
تربیت دونوں میں وہ اصلاح کی بڑی ضرورت محسوس
کرتے تھے۔ اُن کی آرزو تھی کہ وہ جدید و قدیم کا ایک مثالی
سنگم بن جائے وہ بڑے پختہ عقیدہ کے مسلمان تھے مگر
ان کی عقیدت عقل کو خیرباد کہنے کے قائل نہ تھی وہ پکے
مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ پکے ہندوستانی بھی تھے۔
نہ ہندوستانیوں میں وہ اپنے اسلام پر پردہ ڈالتے تھے
نہ مسلمانوں میں اپنی ہندوستانیت کو چھپاتے تھے اسلامیت
اور قومیت کو ایک ساتھ نباہنا خاص طور پر اس زمانہ
میں بہت مشکل ہے مگر حسین صاحب زندگی بھر اسے بڑی
ہمت اور سلیقہ کے ساتھ نباہتے رہے۔

جامعہ میں ابھی وہ تعلیم کی منزل پورے طور پر طے
نہیں کر پائے تھے کہ ۱۹۳۰ء میں دار و گیر کا سخت
دور شروع ہوگیا۔ جیل کے دروازے کھل گئے اور قوم
پرور رہنما آہنی سلاخوں کے اندر بند کر دیئے گئے۔
اس وقت آزادی کا نام لینا آسان نہ تھا اور آزادی
کا پیغام سنانا تو دار و رسن کو آواز دینا تھا آزادی کی
تحریک کو جاری رکھنے کے لیے کچھ رہنما انڈر گراؤنڈ ہوگئے
اور ان کی ہدایات خفیہ ذرائع سے باہر پہنچانے کی تدبیر
کی گئی اس نازک گھڑی میں حسین صاحب نے اپنے دوستوں
انور خاں کنک چندر ڈیکا کے ساتھ کانگریس بلیٹن کی
اشاعت کا خطرناک کام اپنے ذمہ لیا اور کئی مہینے بڑی
ہوشیاری کے ساتھ اسے شائع کرتے رہے حکومت
کا محکمہ سراغ رسانی تلاش میں سرگرم رہا مگر حسین صاحب
اپنی مشین کے ساتھ اس پوشیدگی سے جگہ بدلتے رہے
کہ پولیس کی گرفت میں نہ آسکے لیکن تابکے بالآخر گرفتار
ہوئے حوالات میں ان کے ساتھ بڑی سختی کی گئی کہ کسی طرح
راز ظاہر کردیں تاکہ دوسرے کارکنوں اور انڈر گراؤنڈ لیڈر
کو گرفتار کیا جاسکے مگر یہ دبلا پتلا کمزور انسان ساری کڑیاں

جیل گیا مگر پولیس کو ایک حرف نہ بتایا بالآخر مایوس ہو کر انھیں جیل بھیج دیا گیا آخر گاندھی اِروِن پیکٹ کے بعد جب سب قیدی رہا کیے گئے تو انھیں بھی قید سے رہائی ملی۔

رہائی کے بعد وہ پھر جامعہ آگئے، اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے ان کو منیجر مکتبہ جامعہ حامد علی خاں مرحوم کے ساتھ مکتبہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں لگادیا اور رسالہ پیامِ تعلیم کی ادارت سپرد کی اس خدمت کو وہ ۱۹۴۷ء تک انجام دیتے رہے اس اثناء میں پیامِ تعلیم کی اشاعت کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے متعدد کتابیں لکھیں ان کی زبان آسان اور عام فہم ہونے کے ساتھ ادبی چاشنی اور زورِ بیان بھی رکھتی تھی انھیں بچوں سے باتیں کرنے کا خاص سلیقہ تھا یہی وجہ تھی کہ بچوں کے ادب میں انھوں نے جلد ایک خاص مقام حاصل کر لیا اور پیامِ تعلیم نے ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لی۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی تقسیم کے بعد فساد کا ہولناک سلسلہ شروع ہوا تو دہلی بھی اس کی زد میں آگئی۔ مکتبہ جامعہ اس زمانہ میں قرول باغ میں تھا لوٹ مار کے اس اس ہنگامے میں وہ بھی تباہ ہو گیا اور اس کو از سر نو قایم کرنے میں بڑی مدت لگ گئی اس زمانے میں شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے انھیں تعلیم بالغان کے ادارۂ تعلیم و ترقی میں لے لیا اور بالغوں کے لیے عام فہم کتابوں کی تیاری کی خدمت ان کے سپرد کی یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا اور متعدد مفید کتابیں ان کے قلم سے نکلیں لیکن شفیق الرحمٰن مرحوم کے انتقال کے بعد تعلیم و ترقی کو کوئی ایسا سربراہ نہ مل سکا جو اس کو چلا سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ یہ مفید ادارہ کمزور ہوتا گیا اور آخر کار ایک دن اس کے خاتمہ کا اعلان ہو گیا۔ یوں تو یہ اعلان تعلیم و ترقی کے سبھی قدر دانوں کے لیے باعثِ افسوس تھا لیکن اس کے کارکنوں کے لیے تو یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ جس کا جہاں سینگ سمایا نکل گیا لیکن حسین صاحب کے قدر دانوں نے ان کو جامعہ سے باہر نہ جانے دیا اور مکتبہ نے پیامِ تعلیم کو از سر نو جاری کر کے اس کی ادارت ان کے سپرد کی۔

اس کی اکھڑی ہوئی محفل کو پھر سے جمانا آسان نہ تھا لیکن اللہ نے حسین صاحب کو ہمت دی کہ وہ اس جدوجہد میں لگے رہے یا بالآخر ان کی محنت سوارت ہوئی اور پیامِ تعلیم پھر بچوں کا مقبول رسالہ بن گیا۔

صحت ان کی ہمیشہ سے کمزور تھی۔ ضعفِ اعصاب اور دمہ کے مستقل مریض تھے معاشی تنگی اور خانگی افکار نے ان کی صحت کو کبھی سنبھلنے کا موقع نہ دیا ان کی خودداری اپنی پریشان حالی کے اظہار کی اجازت نہ دیتی بس اندر ہی اندر سوچتے، کڑھتے اور گھلتے رہے۔ ایک دن بالکل ہی گھل گئے۔ ناواقفوں کو تعجب ہوا کہ کسی سنگین بیماری کے بغیر اچانک کیسے ختم ہو گئے۔ لیکن جاننے والوں کو حیرت ہے کہ اس پریشان حالی کے ساتھ وہ اتنے دن کیسے جیتے رہے۔

صبر و قناعت کا نام سنا تھا لیکن حسین صاحب کی زندگی میں اس کا نمونہ دیکھا۔ مصائب و مشکلات میں مسکراتے رہنا اور زندگی کی الجھنوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن حسین صاحب کی ہمتِ مردانہ آنسو بہانے کے بجائے ہمیشہ مسکرانے کی کوشش کی اللہ ان کی روح کو خوش رکھے اور ان کے لیے مسرتوں اور شادمانیوں کے دروازے کھول دے۔

★★

جناب مبشّر احمد عرشی

# پھولوں کا رہبر

(محمد حسین حسّان مرحوم)

گلشن میں کلیوں کی خموشی، غم سے یہ مرجھائے پھول
داغِ جدائی گہرا تازہ، چہرۂ گل پر پھیلی دھول
یاد تمھاری جب آتی ہے دل میں چبھ جاتے ہیں ببول
ہر لمحہ تم یاد آؤ گے تم کو کیسے جائیں بھول

نورس غنچوں کے اے رہبر یاد کرے گا ہر اک پھول
"بچوں سے باتیں" وہ پیاری لفظوں کے لافانی پھول

پیاری تحریروں کا جادو ہائے کون جگائے گا!
لفظوں کے پھولوں کا گلشن ہائے کون کھلائے گا!
کس کو پتہ تھا وقتِ سحر اک سورج یوں چھپ جائے گا!
کرنوں سے پھولوں کو جگا کر خود ہی یوں سو جائے گا!

نورس غنچوں کے اے رہبر یاد کرے گا ہر اک پھول
"بچوں سے باتیں" وہ پیاری لفظوں کے لافانی پھول

شبنم ایسا ٹھنڈا لہجہ مرمر سی بے داغ زباں
رنگوں کی وہ گلکاری تھی یا تھا تیرا طرزِ بیاں
سرگوشی کے گھنگھرو تھے یا لفظوں کا تھا آبِ رواں
سج دھج کر بچوں سے ملنے جیسے نکلی اردو زباں

نورس غنچوں کے اے رہبر یاد کرے گا ہر اک پھول
بچوں سے باتیں وہ پیاری لفظوں کے لافانی پھول

جناب محمد شفیع الدین نیرّ

# ایک دیرینہ رفیق کی یاد

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

اسی جون کے مہینے کی کسی رات کا ذکر ہے۔ نو ساڑھے نو بجے ہوں گے۔ میں حسین صاحب کے مکان کے سامنے والی سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں چھڑی لیے آہستہ آہستہ رُک رُک کر جامعہ اسٹور کی طرف جاتے نظر آئے۔ میں تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ اُن کی سانس ایسی چڑھی ہوئی تھی کہ چلنا دشوار تھا معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہومیوپیتھک معالج کے پاس جا رہے ہیں مگر چلا نہیں جاتا۔ کوئی اتنا نہیں کہ ان کی دوا لا دے۔ میں نے یہ خدمت اپنے ذمے لی۔ انھیں گھر پہنچایا۔ معالج کے پاس گیا۔ اُن کا حال بیان کیا۔ دوا لے کر اُن کو پہنچا دی۔

ویسے ہی وہ دھان پان تھے۔ سانس کی بیماری نے ان کو اور بھی بے جان کر دیا تھا۔ مگر یہ گمان نہ تھا کہ اب وہ اتنی جلد اللہ کو پیارے ہونے والے ہیں۔ اس کے بعد میں دوسرے تیسرے دن اُن سے ملنے جاتا رہا۔ اسی اثنا میں میرا دہلی سے باہر جانا نکل آیا۔ روانگی سے قبل اُن سے ملا۔ انھیں بظاہر بہتر پایا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اب جو دس بارہ دن کے بعد ۱۴۔ جولائی کو گھر لوٹا تو اچانک حسین حسّان کی رحلت کی اندوہناک خبر سنی دل دھک سے رہ گیا۔ ایک دن پہلے ۱۳۔ جولائی کو آجاتا۔ تو آخری دیدار سے محروم نہ رہتا لیکن ع

یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کی کیا چلے

اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور ان کے اہل وعیال اور احباب کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ مرنا برحق ہے ع

جو یہاں آیا ہے جانا اس کو ہوگا ایک دن

ہزاروں ہر روز یہ سفر اختیار کرتے ہیں۔ چند قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے سوا کوئی اُن کا نام بھی نہیں جانتا۔ اور کچھ دن کے بعد اُن کے بھی دل سے اُن کی یاد محو ہو جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی زندگی کسی مفید خدمت میں گزارتے ہیں اور جن کی ذات سے خدا کے بندوں کو کسی نہ کسی حد تک نفع پہنچتا ہے۔ اُن کی یاد ایک عرصے تک باقی رہتی ہے۔ مرحوم حسین حسّان ندوی صاحب ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ ان کی یاد ایک مدت تک ہزاروں دلوں میں باقی رہے گی اور بعض تو زندگی بھر اُنھیں فراموش نہ کر سکیں گے۔

اب سے تقریباً چالیس سال قبل حسّان صاحب سے جامعہ کی کسی تقریب میں ملاقات ہوئی۔ پیامِ تعلیم جاری ہو چکا تھا۔ سعید انصاری صاحب کی ادارت کے زمانہ میں

یک دو مضمون بھی میں نے اِس رسالے کے لیے لکھے تھے۔
حسان صاحب کے اڈیٹر ہونے کے بعد یہ رسالہ بچوں کے تعلیمی اور اخلاقی مسائل کے لیے مخصوص ہوگیا۔ اُن کی فرمائش پر میں پیامِ تعلیم میں برابر لکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ ان سے تعلقات بڑھ گئے۔ وہ بھی میرے ہاں آتے میں کبھی اُن کے ہاں جاتا۔ غرض اِس دوران میں اُن سے ملنے کے مواقع میسر آتے رہے۔

وہ ایک عرصے سے بیمار رہنے لگے تھے تنفس کا عارضہ تھا۔ روز بروز توانائی جواب دے رہی تھی۔ یہاں تک کہ مجبوراً وہ پیامِ تعلیم کا کام بھی دفتر کی بجائے اپنے گھر پر ہی کرتے تھے۔

میں ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے جاتا رہتا۔ جب بھی طبیعت ٹھیک ہوتی ان کے چاروں طرف کاغذات بکھرے ہوتے اور میں انھیں بچوں کے مضامین نثر و نظم دیکھنے میں مصروف پاتا۔

وہ اپنا وقت پیامِ تعلیم کے مضامین دیکھنے، ان کی اصلاح کرنے، اور ہر مہینے پرچے کے لیے ابتدائی مختصر نوٹ لکھنے کے علاوہ اخبار رسالے پڑھنے یا بچوں کے لیے کہانیاں اور کتابیں لکھنے میں گزارتے۔

وہ اپنے کام سے کام رکھتے کسی جھگڑے ٹنٹے سے انھیں واسطہ نہیں رہا۔ ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوکر وہ ۱۹۲۶ء میں دہلی آئے اور جامعہ میں چند سال تعلیم پائی لیکن ڈگری حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

۳۱-۱۹۳۰ء کی اس تحریک میں شامل ہوگئے جو گاندھی جی نے برطانوی حکومت کے خلاف حصولِ آزادی کے لیے جاری کر رکھی تھی انھوں نے اس تحریک میں حصہ لیا اور بقول ڈاکٹر سید عابد حسین وہ پولیس کے تشدد کا شکار ہوئے۔

یہ ایک دلچسپ قصہ ہے۔ ہوا یہ کہ حکومت نے کانگریس پر پابندی عائد کر رکھی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کانگریس کے خیالات، تجویزیں، اور ہدایتیں ملک میں نہ پھیلنے پائیں۔ آخر کچھ لوگوں نے یہ طے کیا کہ کانگریس کی خبروں کا ایک بلیٹن سائیکلوسٹائل مشین کے ذریعہ پوشیدہ طور پر چھاپ کر شایع کیا جائے کہتے ہیں کہ اس تجویز کے سربراہوں میں مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی بھی شامل تھے۔ اُن کی نگرانی میں اس تجویز پر عمل کرنے والوں میں ہمارے حسان صاحب بھی تھے۔ جنگل یا پرانی عمارتوں کے ویران کھنڈروں میں کسی تدبیر سے وہ مشین اور کاغذ وغیرہ لے جاتے اور چھاپ چھاپ کر بلیٹن کی کاپیاں تیار کرتے۔ یہ کاپیاں علانیہ شہر میں فروخت ہوتیں اور حکومت کے کارپرداز دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔

مختصر یہ کہ یہ گاڑی بہت دن تک یوں ہی چلتی رہی آخر کہاں تک! خفیہ پولیس نے پتہ لگا ہی لیا۔ حسان صاحب گرفتار ہوئے۔ ان پر کافی سختی کی گئی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے نام بتائیں اور بلیٹن کی اشاعت کی تفصیل ظاہر کریں مگر جاننے والوں کا کہنا ہے کہ باوجود ہر قسم کا تشدد برداشت کرنے کے انھوں نے اس راز کو ظاہر نہ ہونے دیا اور کوتوالی دریا گنج کے تھانے اور جیل میں کچھ عرصے رہ کر آزادی نصیب ہوئی۔

حسین حسان صاحب کی زندگی کا مختصر حال یہ ہے کہ وہ ۱۹۰۷ء بمقام پیلی بھیت (یو۔پی) میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں ان کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا۔ اُن کی اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ پھر بریلی کی ایک درسگاہ میں اپنی عربی کی استعداد بڑھائی

اس کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہاں تعلیم عربی کی تکمیل کی۔

جامعہ آکر انگریزی کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ اور انھوں نے اس زبان پر اتنی دسترس بہم پہنچائی کہ انگریزی اخبار بخوبی سمجھ لیتے اور خاص کر انگریزی کتابوں اور کہانیوں کو پڑھ کر ان کا مضمون بڑی خوبی سے اپنا لیتے۔ اُن کے اندازِ نگارش کا جوہر سلاست اور بے تکلفی تھی۔

جیل سے رہائی پانے کے بعد وہ کچھ عرصے مکتبہ جامعہ میں لٹریری اسسٹنٹ رہے۔ اور اس کے بعد وہ پیام تعلیم کے مدیر ہوگئے۔ ادبی شوق اور تجربے کے بارے میں ان کا اپنا بیان یہ ہے۔

"مضمون لکھنے کی مشق کا سلسلہ ندوہ کی تعلیم کے دوران بلکہ اس سے پہلے سے جاری تھا۔ "الناظر" لکھنؤ، "نقیب" بدایوں "زمانہ" کانپور اور "شیخ" آگرہ جیسے رسالوں میں مضمون چھپتے رہتے تھے۔"

آپ کی کوشش سے تھوڑے ہی عرصے میں پیام تعلیم بچوں اور اُن کے سرپرستوں میں مقبول ہوگیا۔ اشاعت تیزی سے بڑھنے لگی، حیدرآباد اور کشمیر وغیرہ کے تعلیمی محکموں نے اس کی خریداری منظور فرمائی۔

جن اصحاب کو کسی رسالے کی اشاعت کا تجربہ ہے وہ یہ بات جانتے ہیں کہ کسی مخصوص مقصد کے تحت ایک خاص معیار کے مضامین نظم و نثر فراہم کرنا کتنا دشوار ہے حسین صاحب اس کوشش میں کامیاب رہے۔ رسالے کے فائل دیکھنے کے بعد اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیسے کیسے مشہور اصحاب اس پرچے کی سرپرستی فرماتے اور کیسے کیسے دلچسپ اور معلومات افزا مضامین نثر و نظم سے نوازتے رہے۔ ایک خاص علمی و فکری اور اخلاقی معیار جو ابتداء میں قائم ہوگیا تھا۔ اُسے حسین صاحب نے آخر وقت تک قائم رکھا۔

حسین صاحب کی ایک بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ناتجربہ کار مضمون نگاروں کے مضامین کی اصلاح کر کرکے شایع کیے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی بڑی ہمت افزائی ہوئی اور رفتہ رفتہ پیام تعلیم کا اپنا ایک حلقہ پیدا ہوگیا۔

ان کی کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ تین قسم کی ہیں۔

اوّل مذہبی۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی کتاب "سرکارِ دوعالم" کے نام سے آں حضرت کی سیرت پر شایع ہوکر ملک میں اتنی مقبول ہوئی کہ اُس کے متعدد ایڈیشن شایع ہوئے یہ میسور ریاست کے اسلامی مکاتب کے نصاب میں شامل کرلی گئی۔ اب تک اس کتاب کے سترہ اٹھارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اسی نوع کی دوسری کتاب "ناموران اسلام" آپ نے لکھی۔ یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں شایع ہوئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ آزادی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شایع نہ ہوسکا۔ ایسی کتابوں کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر نظرثانی کے بعد یہ کتاب شایع کی جائے تو اس کا خیر مقدم خاص کر مذہبی حلقوں میں اب بھی بڑے جوش سے کیا جائے گا۔

دوسری قسم معلوماتی کتابوں کی ہے "دنیا کے بچے"، اُردو میں ایک نئی چیز تھی۔ اس کے بیس بائیس ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔ اس قسم میں تیسری کتاب "ہماری زمین" اور چوتھی کتاب کسی مصنف کی تصنیف سے فائدہ اٹھا کر لکھی ہے اس کا نام "انوکھا عجائب خانہ" رکھا۔ یہ کتاب حکومت کشمیر کی مدد سے مکتبہ جامعہ نے شایع کی۔

حسان صاحب کا تعلق کچھ عرصے جامعہ کے تعلیم بالغان

کے ایک مرحوم ادارہ "تعلیم و ترقی" سے بھی رہا ہے۔
اس ادارے کے اُردو شعبہ میں تصنیف و تالیف کے
مسودوں پر نظرِ ثانی کی خدمت آپ کے سپرد تھی۔ بہت
سی کتابوں کی عبارت درست کی۔ کچھ کتابیں خود بھی
لکھیں۔ ان میں بعض کتابیں تو بقول حسّان صاحب
دیمک کے نذر ہوگئیں۔ اور جو چھپ کر شایع ہو سکیں
اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) الزام کس پر، (۲) آستین کا سانپ (۳) اُلٹی
دوا، (۴) برف کا گھر (۵) چاند (۶) دیمک کتنی ذہین
ہے (۷) تاؤ کے اُپدیش (۸) کتنی زمین، ٹالستائی کی
مشہور کہانی کا ترجمہ وغیرہ۔

تیسری قسم کی کتابیں وہ کہانیاں ہیں جو آپ نے
دوسری زبانوں خاص کر انگریزی سے لی ہیں اور انھیں
بڑی مہارت سے اپنایا ہے اور ایسے آسان، دلچسپ
اور بے تکلفانہ انداز میں لکھی ہیں کہ یقین ہے بچّے انھیں
شوق سے پڑھیں گے۔ ان کہانیوں کے نام یہ ہیں۔ یہ
سب مکتبہ جامعہ نے شایع کی ہیں۔

"بہادر سیاح"، "جیت کس کی"، "چینی گڑیا"
"تانیس خاں"، "چنبیلی"، "دعوتِ مُلّا جی کی" "انعامی
مقابلہ"

ان میں سے آخری کتاب "انعامی مقابلہ"، چار
چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ آخری عمر میں آپ کو
اس بات سے خوشی ہوئی کہ یوپی اُردو اکادمی نے
۱۹۷۳ء کی بچوں کی اُردو انعامی کتابوں میں اسے
شامل کیا۔ اور پانچ سو روپیہ کی رقم بطورِ انعام
آپ کو ملی۔

آپ کی مرتّب کی ہوئی کتابوں میں ایک قابلِ ذکر
کتاب "چچا غالب" ہے۔ پیامِ تعلیم کے غالب نمبر میں جو
مضمون شایع ہوئے اور آپ کو پسند آئے وہ آپ نے ایک
مناسب ترتیب سے جمع کر دیے ہیں۔ یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ
نے شایع کی۔ میر تقی میر اور میر انیس پر بھی آپ کے دو کتابچے
شایع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ اب نایاب ہیں۔ افسوس کے
میں اُن کے مطالعے سے محروم رہا۔

آپ کے دورِ ادارت میں پیامِ تعلیم کے خاص نمبر اُردو
حلقوں میں بہت پسند کیے گئے۔ ان میں حالی نمبر، ذاکر نمبر،
غالب نمبر، اور قہقہہ نمبر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

سیرت کے لحاظ سے وہ ایک سیدھے سادے مرنجان
مرنج انسان تھے۔ اپنے کام میں یکسوئی سے لگے رہتے تھے،
کوئی کیا کرتا ہے کیا نہیں کرتا۔ اُنھیں اس سے غرض نہ تھی۔
قناعت پسند تھے۔ کثیر العیال اور معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہو
کر بھی کوئی خاص شکایت ان کی زبان سے کبھی نہیں سنی۔
اگرچہ ظاہر میں وہ خاموش طبیعت تھے۔ مگر اپنے مطالعہ
کی وجہ سے ملک اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات سے
بخوبی واقف رہتے تھے۔ اُنھیں شہرت کی پروا کبھی نہیں
تھی۔ پیامِ تعلیم کے اڈیٹر تھے۔ وہ شہرت پسند ہوتے
تو اس تعلق سے کافی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ انھوں نے
خود فروشی کی کوشش کبھی نہیں کی۔ رسالے کے پڑھنے والے
جو تعریفی خط لکھتے تھے عموماً وہ اپنی تعریف کو حذف کر کے
خط شایع کرتے تھے۔ اُنھوں نے دوسروں کی جائز تعریف
میں کبھی بخل نہیں کیا۔

آخری زمانے میں مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی
صاحب کے مدّاح تھے اور حاضر اور غائب ان کی عملی ہمدردی
اور ہمّت افزائی کے شکر گزار رہتے تھے۔

پیامِ تعلیم کسی تجارتی مقصد سے جاری نہیں کیا گیا

علمی خدمت مقصود تھی ۔ اس کی بنیاد بچوں کے ذہنی اور اخلاقی تربیت پر رکھی گئی تھی ۔ حسّان صاحب کی برابر کوشش رہی کہ پرچے کو مالی فائدہ بھلے ہی نہ ہو، مگر یہ روش سے نہ ڈگمگائے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ۔

اگر یہ ٹھیک ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ پیام تعلیم سے کتنے بچے راہ راست پر آئے ہوں گے، کتنے بچوں میں تعلیمی شوق پیدا ہوا اور بڑھا ہوگا، کتنے بچّوں کے اخلاق بہتر ہوئے ہوں گے ۔ کتنے بچے اس مدت میں ادیب بنے ہوں گے ۔ پس ضرور ہے کہ یہ سب حسان صاحب کی بے لوث خدمت کو یاد رکھیں ۔ اور جیساکہ میں نے اپنا مضمون اس شعر سے شروع کیا ہے ۔

اس طرح جی کر بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

حسان صاحب کو "کوئی" محض "گاہ گاہ" ہی یاد نہیں کرے گا بلکہ ہزاروں بچے جواب بڑے ہوگئے ہیں اور اُن کے ہزاروں والدین شکر گزاری کے جذبے سے حسّان صاحب کو زندگی بھر یاد کریں گے اور جب کبھی اور جہاں کہیں اردو میں بچوّں کے ادب کے بارے میں کچھ لکھا جائے گا ۔ تو ان خدمت گزاروں میں سرفہرست جن اصحاب کا نام ہوگا ۔ مرحوم حسین حسّان کا نام بھی ادب واحترام کے ساتھ درج ہوگا ۔ ★★

---

▪ حقیقی سخاوت یہ ہے کہ تو لوگوں کی تکلیف اپنے اوپر لے ۔
▪ اپنے ظاہر و باطن کو یکساں رکھو ۔

(حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

▪ زبان درست ہو جائے تو دل بھی درست ہو جاتا ہے ۔

(حضرت شیخ بغداد جنید رحمۃ اللہ علیہ)

جناب وقار خلیل

# یادِ حسّان

پھول ایسے ذہن
گلاب ایسے دماغ
جس کی تحریریں پڑھ کر مہکتے تھے
وہ جو "پیامیوں" کا مہتاب آرزو تھا
وہ مالی، وہ نگہبان
چپ چاپ سفر پر روانہ ہوگیا؛
پھول اور کلیوں کا مہکتا چمن
اُداس اور نم دیدہ لگتا ہے
اب پودوں کی دیکھ بھال کیسے ہو ؟
ورق ورق اکیلے، سیہ پوش
چہرہ چہرہ شبنم، آنسو
وہ کرن، وہ روشنی اور وہ مالی
تتلی کی تلاش میں خوشبو بن کر
کہیں دور، بہت دُور اُفق پار چلا گیا ہے :
میرے بچّو!
اُسے اپنے آنے والے زمانے میں
کتابوں اور بستے میں تلاش کرو
وہ تمھیں :
مستقبل کی صورت ضوفشاں ملے گا :

جناب یوسف ناظم

# میرے دوست حسّان صاحب

وہ میرے ہم وطن نہیں، اسکول یا کالج کے ساتھی نہیں، ملاقات کا کوئی سلسلہ نہیں، لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ حسّان صاحب بالکل اپنے معلوم ہوتے تھے۔ پچھلے دس بارہ سال سے ان سے خط و کتابت تھی وہ بھی گاہے گاہے۔ لیکن جب بھی ان کا خط آتا کم سے کم دو دن تک ایک نشہ سا طاری رہتا۔ اس محبت اور یگانگت کے ساتھ خط لکھتے کہ ہر ہر لفظ سے اپنائیت اور خلوص کی کرنیں پھوٹی پڑتیں۔ لکھنا پڑھنا تو سبھی کو آتا ہے لیکن لکھوانا ایک الگ ہی فن ہے اور حسان صاحب اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ کیا مجال کہ وہ کہیں اور کوئی ان کی بات ٹال دے۔ کم سے کم میں تو کبھی انکار نہیں کر سکا۔ سچ پوچھیے تو مجھے بچّوں کا ادیب انھوں نے بنایا۔ پیامِ تعلیم میں میرے جتنے بھی مضامین چھپے ان سب پر ان کی محبت بھری فرمایش کی مہر لگی ہوئی ہے۔ پیامِ تعلیم کی دوسری زندگی، انہی کی محنت، ریاضت اور لگن کا پھل ہے۔ اس زمانے میں ایک 'مرحوم' رسالے کو پھر سے شایع کرنا اور چند ہی دن میں اُسے سابقہ معیار پہ لے آنا۔ معمولی بات نہیں۔ یہ عرق ریزی کا نہیں، جاں فشانی کا کام ہے۔ خدا کرے پیامِ تعلیم زندہ رہے۔

کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ پچھلے دو تین سال سے ہم میں خط و کتابت کی کوئی صورت نہیں پیدا ہو ہی۔ میں اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ میں قصوروار ہوں۔ نہ کوئی خط لکھا اور نہ کوئی مضمون بھیجا۔ مئی کے آخر میں میں نے خود ہی انھیں ایک خط لکھا اور اُن سے کہا کہ اس خاموشی کے قصور کو ہم آدھا آدھا تقسیم کر لیں۔ اس خط کا جواب چوتھے ہی دن مل گیا کیسے معلوم تھا کہ یہ ان کا آخری خط ہوگا۔ ان کے خط میں مایوسی کی دبی دبی جھلک ہے۔ لیکن حسّان چونکہ اپنی طرف سے کسی کو رنجیدہ نہیں کرنا چاہتے اس لیے کھل کر انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ یہ ظرف کی بات ہے۔ ان کا خط دیکھیے جو ۳۔جون کو لکھا ہے۔

محبّی۔ وعلیکم السلام

جی نہیں، سارا قصور میرا ہے۔ اتنے دن ہوگئے ایک خط بھی آپ کی خدمت میں نہ بھیج سکا۔ اصل میں کچھ دنوں سے میں سانس کی تکلیف کا اور ریاحی تکلیف کا شکار ہوں۔ اس کی وجہ سے کچھ دماغی الجھن سی رہتی ہے۔ سوچتا ہوں فلاں فلاں صاحب کو خط لکھوں گا۔ پھر یاد نہیں رہتا

مضمون ملا تو حیرت ہوئی اور شرمندگی بھی۔
کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں کہ آپ نے بنا
کسی درخواست کے سرپرستی فرمائی۔ میں
آج کل تو بالکل ہی قرلیش ہوں۔ محترم شاہد
صاحب میرا حال بیان کرسکیں گے۔ آپ کا
مضمون ایک پرچے میں شایع نہ ہوسکے
گا۔ یہ تین قسطوں میں کر دیا ہے۔ پہلی
قسط جولائی میں شایع ہوگی۔ (جولائی کا
پیام تعلیم مرحوم کی زندگی میں شایع
ہی نہ ہوسکا) تصویریں بہت اچھی ہیں —
استعمال کے بعد واپس کردی جائیں گی۔ اطمینان
رکھیے۔ بیگم سے دعا کہیے۔ شاید خانگی مصروفیات
زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا موقعہ نہیں
ملتا۔ محترم ولی صاحب کی طرف سے سلام
شوق۔ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

والسلام - حسین حسّان

دیکھیے اپنی شدید بیماری کے عالم میں بھی محبّت،
اخلاق اور خلوص کی یہ فراوانی۔ حسین حسان صاحب
سے بس ایک ہی مرتبہ ملاقات ہوئی ۱۹۷۰ء میں۔ میں
ان سے ملنے مکتبہ جامعہ پہنچا تو ایسی بے تکلفی اور
محبّت سے ملے کہ ششدر رہ گیا۔ لیکن یہ تھی بھی انہی
کی محبّت جو کشاں کشاں مجھے ان کے آفس لے گئی۔
بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے سب
سے تعارف کرادیا۔ اس طرح جیسے کوئی بڑا اور عظیم ادیب
ان کے ہاں چلا گیا ہو۔ وہ مشرقی تہذیب کا واقعی
نمونہ تھے۔

ان کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ اور جنھوں نے
ان کے کام کرنے کی لگن اور توانائی دیکھی۔ ملازمت
تو سبھی کرتے ہیں۔ لیکن وفاداری سب کے بس کی چیز
نہیں۔ اپنے آپ کو ادارے کا حصّہ بنا دینا۔ اتنا
آسان نہیں جتنا خود کو حصّہ دار بنا دینا۔ حسّان
صاحب ادارے کے حصّہ دار نہیں، حصّہ تھے۔

---

بقیہ صـ۵۴ سے

کوئی کہانی پڑھیے، لگے گا وہ سامنے بیٹھے ہیں اور کہانی
سنا رہے ہیں ایسا سہل اور پیارا اندازِ بیان تو ہم نے
چند ہی کہانی لکھنے والوں میں پایا ہے۔ ان میں سے
ایک تھے الیاس احمد مجیبی اور دوسرے حسین صاحب۔
حسین صاحب کی کہانیوں کی کتابیں چاہے تعلیم
بالغان کے سلسلے کی ہوں کہ بچّوں کی۔ ان سب میں یہی
آسان، سہل اور بچّہ کی توجہ کو فوراً اپنی طرف کرلینے
اور خاتمہ تک کہانی میں جذب رکھنے والا طرزِ بیان و تحریر
پایا جاتا ہے۔ اسی طرح بچوں کے ادب میں حسین حسّان
صاحب کا ایک منفرد مقام ہے۔ چاہے وہ کہانی کار
کی حیثیت سے ہو کہ مضمون نگار کی یا بچّوں کے رسالے
کے مدیر کی حیثیت سے۔
حسین صاحب کی بڑائی اس امر میں پائی جاتی ہے
کہ وہ سراپا نیاز مند بنے رہتے تھے۔ "خواہ نامورانِ
اسلام" کا دیباچہ ہو کہ نجی خط۔ ان کی بڑائی اس
امر میں بھی پائی جاتی ہے کہ وہ بچّوں کے ادیب کے
ساتھ "ادیب ساز" بھی رہے ہیں۔ اردو زبان
کے بچّوں کے ادب اور ادیب سازی میں آپ کی وفات
سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے۔ جو آج کے حالات
میں مشکل سے پُر ہو سکتا ہے۔

جناب اطہر افسر

# حسّان صاحب

جناب ولی صاحب

سلام مسنون، آپ کے خط نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
رات جب سب سو چکے تو ایک بجے لکھنا شروع کیا ہے اور تین بجے تک میں حسان صاحب کے ساتھ رہا ہوں یہ حسان صاحب پر مضمون نہیں ہے وہ دلخراش یادیں ہیں جو حسان صاحب سے وابستہ ہیں اور میرے ذہن سے کبھی نہیں مٹ سکتیں۔ حسّان صاحب مجھ سے جدا ہوئے نہیں نہ آپ سے۔ وہ اب بھی ہمارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔

محمد حسین حسّان صاحب کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے سچ مچ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میری اور اُن کی عمر میں ۲۵، ۳۰ سال کا فرق تھا مگر وہ مجھ سے ہمیشہ اس طرح ملتے رہے جیسے وہ میرے برابر کے رفیق و محسن ہوں، میں بچہ تھا کہ حسّان صاحب کے نام سے واقف ہوا۔ ہمارے گھر ہر ماہ کئی رسالے اور پرچے آتے تھے نیرنگ خیال ہمایوں، عالمگیر اور ساقی والد صاحب اور بڑے بھائی چچا صاحب پڑھتے تھے تو ہم چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے پھول غنچہ اور پیام تعلیم بہت بعد کو میں نے ایک اسکول میں دیکھ کر جاری کروایا اور چونکہ پہلے سے دو بچوں کے پرچے ہمارے گھر آتے تھے اس لیے اس اس پرچے کو جاری کروانے میں مجھے بڑی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لینا پڑا۔ بڑے ردو قدح کے بعد آخر پیام تعلیم ہمارے گھر آنے لگا، پرچے کے آنے سے پہلے سب یہی کہتے تھے کہ پتہ نہیں حکیم کو (یہ بچپن کا عرف ہے) یہ پرچہ کیوں اتنا پسند ہے۔ مگر جب پیام تعلیم جاری ہوا تو سبھی اسے پڑھنے لگے، مجھے اس پرچہ میں حسان صاحب اور آپا جان کی باتیں بڑی پسند آتی تھیں بعد ہی معلوم ہوا کہ آپا جان کوئی جرمن خاتون تھیں۔ پھر ان دنوں پیام تعلیم میں کھیل کود کی باتوں کے علاوہ آخری صفحات پر گتے کے یا کارڈ بورڈ سے مختلف چیزیں بنانے کی ترکیبیں درج ہوتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے پیام تعلیم سے سیکھ کر لیمپ شیڈ اور ابّا کے لیے کیلنڈر بنایا تھا جسے دیکھ کر ابا کے ساتھ سارے گھر والے بے حد خوش

ہوئے تھے میرے بڑے بھائی کے ایک دوست احمد علی نے تو یہاں کہا تھا کہ بھئی ایسی چیزیں زیادہ سے زیادہ بنا کر بازار میں بھیجنی چاہیئے لوگ بے حد پسند کریں گے کھیل کا کھیل ہو جائے گا اور اسٹیشنری کی دکان سے لوگ اسے خریدیں گے بھی، مگر ابا نے منع کر دیا۔

رمضان کے دن ہوتے تھے جاڑوں کی راتیں ہم سب بھائی بہنیں سحری کے بعد لحافوں میں دبکے سرہانے چراغ لگائے پھول پیام تعلیم اور غنچے کے پرچے پڑھا کرتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک بلند آواز سے پرچہ پڑھتا اور سب سنتے تھے۔ ذرا سی دیر بعد نماز کی پکار ہوتی اور ہم سب وضو کرتے اور ابا کے ساتھ نماز پڑھنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کبھی رات کے کھانے کے بعد دیر تک پاس پاس لیٹے ہوئے ہم سب بھائی بہن پیام تعلیم اور دوسرے رسالوں کی کہانیاں پڑھتے رہتے۔

نظم کا حصہ آتا تو ہم میں کوئی ترنم سے نظم پڑھنے لگتا طرز اساسی ہوتی تو سب اس کا ساتھ دیتے ورنہ کوئی ایک نظم سناتا اور سب سنتے رہتے۔ جناب شفیع الدین نیر کی نظموں سے تعارف پیام تعلیم ہی سے ہوا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی نظمیں ہم سب کو بہت پسند آتی تھیں کئی ایک زبانی یاد ہوگئی تھیں۔ میرے ایک چچیرے بھائی محمد علی بیگ نے ان کی ایک نظم اپنے اسکول میں سنا کر انعام بھی حاصل کیا تھا۔

شاید سن ۷۵ میں جامعہ کا جوبلی نمبر شایع ہوا، اس سے ایک ہفتہ پہلے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک مضمون "کجوریاں" جناب حسّان صاحب کو بھیجا، میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب مجھے ان کا خط ملا کہ وہ میری یہ کہانی ۱۹۷۵ء کے سالنامہ میں شایع کر رہے ہیں اور یہ بھی انھوں نے تحریر کیا تھا کہ اس جوبلی نمبر میں سب بڑے بڑے لکھنے والے حصہ لے رہے ہیں صرف آپ ہی ایک نونہال ہیں جن کا مضمون جوبلی نمبر میں شایع ہوگا۔ میری عمر اس وقت کوئی تیرہ برس رہی ہوگی میں حسّان صاحب کا وہ خط (جو پوسٹ کارڈ تھا) چاروں طرف لیے لیے پھرتا تھا اور ہر ایک کو دکھاتا تھا۔ کھانا کھاتا تو اپنے سامنے رکھ لیتا اور بار بار پڑھی ہوئی عبارت کو پھر سے پڑھنے لگتا۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی سی آتی ہے۔ مگر واقعی میں نے ایسا کیا ہے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ میری کہانی جوبلی نمبر میں چھپے گی۔ مگر جب پیام تعلیم کا جوبلی نمبر چھپ کر آیا اور اس میں میری کہانی موجود تھی تو میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ میں خوشی سے ناچنے لگا۔ واقعی اس رسالے میں میرے سوا سبھی لکھنے والے بڑے بڑے ادیب تھے، جناب عابد حسین صاحب جناب مجیب صاحب جناب ذاکر حسین صاحب، عبدالغفار مدہولی صاحب شفیع الدین نیر صاحب اور نہ جانے کون کون سینکڑوں نام تھے۔

ابا نے جب یہ مضمون دیکھا اور پڑھا تو بولے تم نے اپنا مضمون مجھے کیوں نہیں دکھایا تھا۔ میں نے کہا تھا ابا جان سچ سچ مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ میرے مضمون کا مذاق اڑائیں گے کیونکہ کچھ دنوں پہلے آپا جان (میرے بڑے بھائی مظہر) میرا کافی مذاق اڑا چکے ہیں۔ ابا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر شام میں آتے وقت وہ میرے لیے ایک ایسا تحفہ لیتے آئے جو برسوں مجھے عزیز رہا۔ یہ "راجہ"، فونٹن پن تھا جو ان دنوں بہت عمدہ قلم مانا جاتا تھا۔ ابا نے مجھے پاس بلایا اور میرے بڑے بھائی کو بھی اور دوسرے بچوں اور گھر کے لوگوں کو اور کہا آج میں حکیم کے اس مضمون کو پڑھ کر سچ سچ بے حد خوش ہوا ہوں مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ اتنا اچھا بھی لکھ سکتا ہے۔ پھر فونٹن پن کا ڈبہ میرے حوالے کیا اور بولے یہ اس مضمون کا انعام ہے، اس مضمون کے بعد

پیام تعلیم میں میری کئی نظمیں اور کہانیاں چھپیں ۔ میں نے "غنچے"، "دو پھول" کو بھی مضامین بھیجے، "پھول"، کے اڈیٹر صاحب نے بھی بڑے اصرار سے مجھ سے کہانیاں منگوائیں اور شایع کیں مگر جو مزا پیام تعلیم کی اس کہانی میں آیا تھا وہ کسی میں نہ آیا۔ حیدرآباد ریڈیو والوں کو جب میں نے اپنے پرچے دکھائے تو انہوں نے بھی بچوں کے پروگرام کئی بار کہانیاں سنانے کی دعوت دی اور میں نے بڑے دھڑلے سے ان پروگراموں میں کہانیاں سنائیں مگر ہر دفعہ دل میں حسان صاحب کو ضرور یاد کیا۔

شاید آپ حیرت کریں کہ ۵۴ سے خط و کتابت ہونے کے باوجود میں نے حسان صاحب کو ۶۹ء سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا پہلی بار ملاقات صرف ۶۹ء میں ہوئی ہے۔

پیام تعلیم کے جوبلی نمبر ہی کی وجہ سے اخبار میزان جو ان دنوں بڑے سائز پر فل ڈیمی پر تین زبانوں اردو انگریزی اور تلگو میں شایع ہوتا تھا اس روزنامہ کے مالک جناب غلام محمد نے مجھے اردو اسٹاف میں شامل کرلیا اور میں نے "اخبار میزان"، میں ہفتہ وار بچوں کا صفحہ "بچوں کی دنیا" - "بھائی جان" کے نام سے شروع کیا، حسان صاحب کے مشورہ سے بچوں کی ایک انجمن "میزان لیگ"، قائم کی جس کے بڑھتے بڑھتے کوئی چار ہزار بچے ممبر بن گئے۔ آج اسی لیگ کے بے شمار بچے ممتاز عہدوں پر فائز ہیں، ادیب ہیں۔ شاعر ہیں، افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ مصلح الدین احمد، حمید الدین محمود۔ افتخار احمد اقبال، مجتبیٰ محمود، عفت موہانی، وقار خلیل، (یہ پہلے وقار خلیل کوہ سوار شاہپوری کے لمبے نام سے خط اور چھوٹے چھوٹے مضمون لکھا کرتے تھے) ڈاکٹر شمیم انصاری، محمود انصاری، تسیم حسین ایڈوکیٹ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، وغیرہ کی میزان لیگ کے ذریعہ ذہنی تربیت پر بے حد اثر ہے، اگر حسان صاحب [illegible] نہ ہوتا تو میں اتنا کام کبھی نہ کرسکتا۔

سن پچاس کے آخر میں میں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار "بچوں کی دنیا"، نکالا جو اردو دنیا کا بچوں کا پہلا رنگین ہفتہ وار اخبار تھا یہ کئی کئی رنگوں میں چھپتا تھا، چار سال تک یہ بڑی دھوم دھام سے چلتا رہا پھر بند ہوگیا، میں روزنامہ "نیا سنسار"، نکالنے کے چکر میں پھنسا رہا، حسان صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگیا۔

کئی برس گزر گئے ۶۶،۶۷ء میں اچانک حسان صاحب کا ایک پوسٹ کارڈ ملا، "افسر صاحب اب تو آپ بہت بڑے بہت بڑے بہت بڑے ادیب اور ڈرامہ نگار ہوگئے ہیں۔ اب آپ پیام تعلیم کے لیے کیوں کچھ لکھیں گے"

میں بڑا شرمندہ ہوا، میں نے حسان صاحب کو فوراً خط لکھا کہ محترم جو دل آپ کی محبت اور پیام تعلیم کی محبت سے سرشار ہے خدا کے لیے اُسے اس طرح مجروح نہ کیجیے اور پیام تعلیم کے لیے پھر سے لکھنے لگا۔"

۵۹ء میں، میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے منسلک ہوگیا تھا) ۶۹ء میں جب میں سرکاری طور سے ڈرامہ پروڈیوسرس ٹریننگ کے سلسلے میں دِلّی بھیجا گیا تو دِلّی پہنچتے ہی سب سے پہلا کام میں نے مکتبہ جامعہ کو ٹیلیفون کرنا سمجھا اور ٹیلیفون پر جناب احمد ولی صاحب سے بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا آپ خود یہاں آجائیے سب سے ملاقات ہوجائے گی میں نے کہا میں نئی دِلّی کے اس حصے میں ہوں جو مکتبہ جامعہ سے بہت دور ہے اور میں جانتا بھی نہیں کہ مکتبہ جامعہ کس طرف ہے۔ جناب ولی صاحب نے ٹیلیفون ہی پر

سارا پتہ سمجھایا اور کہا کہ میں مکتبہ جامعہ سے بہت پہلے آپ کی راہ دیکھتا ہوا ملوں گا۔ ولی صاحب کے ارشاد پر میں مکتبہ جامعہ روانہ ہوا واقعی ولی صاحب بتائی ہوئی جگہ پر بہت پہلے سے منتظر تھے۔ وہ مجھے مکتبہ جامعہ لے گئے وہاں پہلی بار جناب حسان صاحب سے ملاقات ہوئی اور پتہ چلا کہ جنھیں میں محمد حسین حسان سمجھتا رہا تھا وہ محمد حسین حسان تھے۔ حسین تو وہ قطعاً نہیں تھے کم سے کم جب میں ملا ہوں اس وقت تو وہ حسین نہیں تھے کبھی رہے ہوں گے۔ مگر سیرت کے اعتبار سے وہ نہایت حسین تھے اتنے حسین کہ میں نے بہت کم لوگوں کو زندگی میں اس قدر حسین پایا ہے۔

حسان صاحب جس محبت اور خلوص سے مجھ سے ملے ہیں میں اُسے عمر بھر نہیں بھول سکتا، سارے مکتبہ کی سیر کرائی ہر شخص سے ملایا۔ مٹھائی پھل اور چائے سے تواضع کی۔ آس پاس رہنے والے مخلص احباب کے پاس لے گئے۔ جناب ولی صاحب ساتھ ساتھ تھے میں اپنی پرانی بری عادت کے مطابق وقفہ وقفہ سے بات چیت کے دوران لطیفے سناتا گیا اور وہ دل کھول کر قہقہے لگاتے رہے۔ پیام تعلیم کے لیے کیا کیا چیزیں مجھے لکھنی ہیں................ اس کی فہرست انھوں نے بنا کر میرے حوالے کی اور پرچے کے اگلے نمبروں کے تعلق سے بات ہوئی، ہر ہر بات میں ایسا خلوص اور ایسی مٹھاس تھی کہ وہ سیدھی دل میں اترتی چلی جاتی تھی دو پہر کا گیا گیا سر شام واپس ہوا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسان صاحب سے صرف پندرہ منٹ ملاقات رہی ہے، مہینوں تک حسان صاحب کی ایک ایک بات ذہن میں گھومتی رہی۔

پھر ۷۱ء میں دلی گیا تب بھی حسان صاحب سے ملاقاتیں رہیں مگر اب جو اس مئی ۷۴ء میں دلی گیا ہوں تو کچھ تو دلی کے حالات کے سبب اور کچھ میری ان تھک مصروفیت کی بنا پر میں حسان صاحب سے نہ مل سکا جس کا مجھے زندگی بھر قلق رہے گا۔

اور جب اچانک جناب احمد ولی صاحب کا خط ملا اور اس میں حسان صاحب کی رحلت کی خبر پڑھی تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی میں سناٹے میں آگیا چند ثانیوں کے عرصے میں دنیا بھر کی باتیں نظروں کے سامنے آئیں اور گزر گئیں، یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ جو کچھ خط میں لکھا ہوا ہے صحیح ہے۔ اب بھی مجھے یقین نہیں ہے کہ حسان صاحب دلی میں نہیں ہیں اور اپنے پیارے پیام تعلیم کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ پیام تعلیم کے ساتھ رہیں گے ان بچوں کی تربیت کرتے رہیں گے انھیں پروان چڑھاتے رہیں گے جو پیام تعلیم کے دلدادہ ہیں جو "پیام تعلیم" کے ہیں اور جن کا "پیام تعلیم" ہے۔

حسان صاحب نے "پیام تعلیم" میں بچوں سے مزے مزے کی باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے کئی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر میٹھی آسان اور سہل زبان میں لکھی ہیں کہ یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ حسان صاحب نے اپنی ساری عمر بچوں کی اصلاح اور فلاح و بہبود میں صرف کردی۔ وہ ان بڑے آدمیوں میں سے تھے جو پیدا ہی بچوں کے لیے ہوتے ہیں۔ قدرت نے ان کو ہم سے چھین لیا ہے مگر وہ رہتی دنیا تک بچوں کے پیارے رہیں گے اور پل پل ان احباب کے ساتھ رہیں گے جن سے اُن کے دلی رشتے اور جو انھیں کبھی نہیں بھول سکتے۔ کبھی نہیں۔

عبدالمتین نیاز

# چراغِ راہ

زندگی سے گذر گئے حسّانؔ
خاک بن کر بکھر گئے حسان
ذہن میں ان کی یاد ہے محفوظ
کون کہتا ہے مر گئے حسان

●

عزیز دوست برادرم حسین حسان ندوی مدیر "پیام تعلیم" کی موت پر اظہارِ غم

آج چھلکے ہیں آنکھ سے آنسو
غم سے دل ہوگیا ہے بے قابو
"بزمِ تعلیم" سے گئے حسّان
یعنی اب پھول میں نہیں خوشبو

●

"پیامی" نونہالوں کو یہ غم ہے
جُدا حسّان، بھائی ہو گئے ہیں
چراغِ راہ تھی تعلیم جن کی
وہ منزل سے ہی پہلے کھو گئے ہیں

●

## پگھلتا درد

پیکرِ خلق، ہمدم، ہمراز
یعنی انسان اک شفیق تھا وہ
جس کو حسّان لوگ کہتے تھے
شخصیت کا بڑا عمیق تھا وہ

●

جس کے اوراق پہ لکھا ہے مرے غم کا حساب
جس کا ہر لفظ ہے اخلاص و محبّت کا نصاب
جس کے کھو جانے سے برسوں کی رفاقت کھو لی
جس کے گم ہونے سے ٹوٹا ہے مرے دل پہ عذاب
میرے حسانؔ، مرے دوست، برادر پھر سے
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گذشتہ کی کتاب

●

جناب اطہر پرویز

# ایک دل سوز خط

ہم چاہتے تھے کہ پرویز صاحب علاحدہ سے ایک مضمون لکھیں۔ اپنے بڑے بھائی کے اچانک انتقال کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے۔ ذیل کا خط بھی کسی مضمون سے کم نہیں ہے۔ اسی لیے اسے یہاں شایع کرنا ضروری معلوم ہوا۔

(مدیر)

برادرم شاہد صاحب، السلام علیکم

ابھی "سب ساتھ"، کا تازہ شمارہ ملا۔ پہلا صفحہ ا تھا کہ ایک روح فرسا خبر ملی۔ لیجیے حسین صاحب بھی چلے گئے۔ ابھی چند روز کی بات تھی کہ ان سے دفتر ں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پیام تعلیم میں کچھ لکھنے کی شکایت کی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس بار ی نہ کسی طرح، کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ لیکن میں وعدہ پورا نہ کر سکا اور وہ مزید انتظار نہ کر سکے۔ ں وقت میں خط تو آپ کو لکھ رہا ہوں اور حسین حب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے اور آواز وں میں گونج رہی ہے۔ اب وہ آنکھ کے سامنے چشمہ ہٹا دیں گے، کاغذ کو ایک طرف رکھ دیں گے ر مجھ سے بڑی ہلکی سی آواز میں کچھ کہیں گے۔

حسین صاحب اور پیام تعلیم ایک دوسرے سے بستہ تھے۔ جب ۱۹۵۰ء میں آج سے ۲۴ سال میں نے پیام تعلیم کی ادارتی ذمہ داری قبول کی ، اسی زمانے میں حسین صاحب سے ملاقات ہوئی، پھر یہ تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ حسین صاحب کی تعلیم سے علیحدگی ایک دردناک بات ہے جو ناگفتہ تو بہتر ہے۔ میں نے چھ سات سال تک پیام تعلیم

کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ گرچہ اس بدمزگی کے نتائج سے میں بھی محفوظ نہیں رہا۔ بالآخر جب میں نے علی گڑھ کا رُخ کیا تو مجھے سب سے بڑی خوشی ہوئی کہ حقدار کو اس کا حق ملا۔ حسین صاحب کو تاباں صاحب نے پیام تعلیم کا اڈیٹر مقرر کیا۔ وہ اس کام کو اپنے انداز سے کرتے رہے وہ ضعیفی اور بیماری کے باوجود بڑی محنت سے کام کرتے تھے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ "کام عبادت ہے"۔ حسین صاحب کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر عبادت کا تقدس، یکسوئی اور پاکیزگیِ نفس کا احساس ہوتا ہے۔ اچھے اور نیک لوگ ایسے ہی کام کرتے ہیں۔

شاہد صاحب! آپ نے اُن سے کتابیں لکھوائیں، مبارک ہو۔ یہ کتابیں ہمارے بچّے پڑھیں گے، ان کی صاف ستھری نثر سے لطف اندوز ہوں گے۔ ہم لوگ اُن سے بچّوں کے لیے لکھنے کے طور طریق سیکھیں گے۔ اب ایسی نثر کون لکھے گا!

یہ سال بچّوں کے ادب پر بڑا گزرا۔ ابھی چند روز کی بات ہے، حامد اللہ افسر کا انتقال ہوا۔ آج حسین صاحب کا ماتم ہو رہا ہے۔ دونوں میں کتنی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ دونوں نے بچّوں کے ادب کو بڑا پن عطا کیا۔ دونوں نے کس مپرسی کی زندگی گذاری۔ دونوں سرکاری اعزازات سے محروم

زندہ زبان (زندہ زبان کا لفظ میں خوب سمجھ کر لکھ رہا ہوں) کے ادیب ہوتے تو ان کے مجسمے نصب ہوتے۔ لیکن اوّل تو وہ اُردو کے ادیب تھے اور وہ بھی بچّوں کے ادیب۔ ہمارے ملک میں بچّوں ہی کو کیا اہمیت حاصل ہے جو ان کے ادب کو حاصل ہو۔ اُردو میں بچّوں کے ادیب کو اپنی ادبی اہمیت تسلیم کرانے کے لیے دوسرے فارموں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ محض بچّوں کا ادیب اردو میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہنس کرسچین انڈرسن اگر ہندوستان میں پیدا ہوتا تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا جو حسین حسان کا ہوا یا حامد اللہ افسر کا۔ کسی بڑے اخبار نے ان کی موت کی خبر بھی نہ چھاپی۔ معلوم نہیں حیات اللہ انصاری صاحب ایم۔ پی۔ کو کیسے خیال پیدا ہوا کہ اس خبر کو چھوٹے میں ذرا اہمیت کے ساتھ شایع کر دیں۔

اس لیے کہ ان بے انصافیوں کے پیچھے جہاں حکومت کی سرد مہری ہے وہاں اردو ادب کے برسرِ اقتدار طبقے کی بے نیازی بھی ذمہ دار ہے۔ حامد اللہ افسر اور حسین حسان کی موت سے اردو زبان و ادب کو کتنا عظیم نقصان پہنچا ہے، شاید اس کا اندازہ بھی ہمارے بس کا نہ ہو سکے۔ حسین حسان صاحب گوشہ نشین تھے، چپ چاپ لکھتے پڑھتے تھے۔ انجمنوں اور کانفرنسوں سے بچتے بچاتے چلتے تھے اس کے یہ معنی کہاں ہیں کہ ہم ان کے کارناموں کو نظر انداز کر دیں۔

وہ شہرت سے دور رہے لیکن شہرت کو بھی ان اشتر کے بڑے لوگوں کے اردگرد گھومنے سے کہاں فرصت ہے۔ اس معاملے میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، قدیم اور جدید، سب یکساں طور پر ذمہ دار ہیں۔

شاہد صاحب! میں آپ کو پُرسے کا خط لکھ رہا ہوں۔ پہلے سوچ رہا تھا کہ ان کے بیٹے کو لکھوں۔ لیکن اس کو لکھوں تو کیا لکھوں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کو غالب کا وہ خط نقل کر دوں جو یوسف مرزا کے نام ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ کوئی مجھے پُرسہ دے کوئی مجھے تسلی دے۔ بڑی غربت کا احساس ہو رہا ہے بڑی غربت کا۔ مجھے یقین ہے کہ اس دنیا نے حسین صاحب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ تو کیا اللہ تعالیٰ ان کا حق انھیں ضرور دے گا؟

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

میرا جی تو چاہ رہا ہے اس وقت بہت کچھ لکھوں آج کچھ درد بھی سوا ہے، کھائی میرے؟ اس تلخی کو کم کرنا۔ کیا کروں ابھی خبر پڑھی، آنکھیں نم ہیں، دل بیٹھ رہا ہے جیسے کوئی پاس سے اٹھ کر چلا گیا ہو۔

پیام تعلیم کو زندہ رکھنا۔ یہ حسین صاحب کی بہترین یادگار ہے۔ میری بھی اس سے جذباتی وابستگی ہے۔ خدا تمھارے حوصلوں کو اس سانحے کے بعد بھی کم نہ ہونے دے۔

میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کرنا۔

ولی صاحب، حبیب صاحب اور سب سے کہ کر میں بھی ان کے غم میں شریک ہوں، مجھے اندازہ ہے کہ ان کو کتنی تنہائی کا احساس ہوگا۔

---

بقیہ بچّوں سے باتیں ص۳ سے

ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایک ڈھول سے دی جا سکتی ہے جس سے آواز تو زوردار نکلتی ہے لیکن اندر سے بالکل کھوکھلا ہوتا ہے۔

بہرحال اس نمبر کو کامیاب بنانے کے لیے جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم نے کیا۔ کیا کیا۔ اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے

---

• جس کے پاس تندرستی ہے اس کے پاس امید ہے
جس کے پاس اُمید ہے اس کے پاس سب کچھ۔
(عربی کہاوت)

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

# حسین حسّان صاحب

## ایک یاد

حسین حسّان صاحب کو ہم سے بچھڑے ہوئے ابھی چند ہی مہینے گذرے ہیں۔ اس عرصے میں اُن کے بارے میں مختلف اخباروں اور رسالوں میں خبریں چھپیں اور اُن کی زندگی کی خاص خاص باتوں کا ذکر بار بار آیا۔ ان کی قومی خدمت کو بھی سراہا گیا اور اُن کی لکھی ہوئی بچّوں کی کتابوں کا بھی خوب چرچا ہوا۔ سب سے زیادہ ذکر اس بات کا آیا کہ وہ کتنی مدّت تک اور کتنی خوبی کے ساتھ پیامِ تعلیم کے ایڈیٹر رہے۔ اور اس حیثیت سے ان کا مرتبہ واقعی اونچا ہے۔ لیکن ان کے اندر ایک خوبی وہ بھی تھی جو اچھے لکھنے والوں میں عموماً کم پائی جاتی ہے اور جس سے وہی لوگ واقف بھی ہیں جنھیں اُن کی اس خوبی سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے وہ درسی مضامین کی درستی اور تیاری میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

اُردو کی درسی کتابوں کے میدان میں جامعہ اور مکتبہ جامعہ کا نام بڑا اونچا اور نمایاں ہے۔ اس معاملے میں جامعہ نے نمونے کا کام کیا ہے اور دوسروں کو راستہ دکھایا ہے۔ اب سے پچاس سال پہلے بچّوں کی کتابوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ یہ کتابیں نہ بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کو اچھی طرح پورا کرتی تھیں اور نہ صاف ستھری چھپتی تھیں۔ جامعہ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ بچّوں کے لیے اچھی اچھی کتابیں لکھوائیں اور درسی کتابوں کو بھی صحیح معنوں میں درسی کتابیں بنایا۔ درسی کتابیں ان کتابوں کو کہتے ہیں جو درجہ کے اندر پڑھائی جاتی ہیں درسی کتابیں اچھی اور مفید نہ ہوں تو ساری تعلیم ہی خراب ہو کر رہ جائے۔ اُردو کی درسی کتابیں اگر اپنے مقصد ناکام رہتی ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ زبان ٹھیک پر آ سکتی ہے اور نہ اُس سے لگاؤ پیدا ہو پاتا ہے اتنا ہی نہیں ہوتا بلکہ مادری زبان کی کمزوری دوسرے مضامین کے بھی کمزوری پیدا کر دیتی ہے۔ بلکہ سوچنے اور اپنی سو ہوئی بات کو مناسب طور پر بیان کرنے تک میں دشو رہتی ہے اور ایک بچّہ وہ نہیں بن پاتا جو اُسے ہونا چا تھا۔ اسی لیے تعلیم میں درسی کتابوں کی بڑی اہمیت اور انھیں پوری توجہ اور ذمہ داری کے ساتھ تیار کر کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

پچھلے بیس سال میں مکتبہ جامعہ نے تیس سے ہی اردو کی درسی کتابیں تیار کرکے چھاپی ہوں گی۔ کتابوں کا مجھ سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اور اُن کی ترتیب کی ذمہ داری میں نے نبھائی ہے۔ در کتابوں کی تیاری ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہو اس کی تیاری میں اپنے فن کے ماہر، مضمون نگار

علاوہ کتاب کو لُباب بنانے کے لیے جو باتیں ضروری ہوتی
ہیں اُن کے جاننے والوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ جب
ایسے سب لوگ مل کر کام کرتے ہیں تب ایک اچھی کتاب
مدرسے میں پہنچ پاتی ہے۔ مکتبہ جامعہ نے ہمیشہ ایسے
سب لوگوں کو اکٹھا کر کے درسی کتابیں تیار کرائی ہیں۔
حسین صاحب بلا شبہ بچوں کے مزاج کو سمجھتے تھے اور
اُن کے لیے بڑی خوبی سے مضامین لکھتے تھے۔ پیامیوں
سے بہتر یہ کون جان سکتا ہے۔ وہ تو ہر مہینے ہی اُن سے
پیامِ تعلیم کے صفحوں پر ملتے رہتے تھے۔ لہٰذا جب درسی
کتابوں کے لیے خاص خاص مضامین کی ضرورت پڑتی تو
حسین صاحب اور جامعہ کے دوسرے اچھے لکھنے والوں
سے درخواست کی جاتی۔ حسین صاحب نے شاید ہی کوئی
ایسی درسی کتاب ہو جس کے لیے کچھ نہ کچھ کام نہ کیا ہو۔
ان کے نام سے درسی کتابوں میں مضامین موجود ہیں۔ ان
مضامین میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اُن کی کسی کتاب سے لیے
گئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو خاص طور پر اُس درسی کتاب
کے لیے ہی لکھے گئے ہیں۔ لیکن ایسے مضامین کی تعداد
بھی کچھ کم نہ ہوگی جو بے نام ہیں۔ مگر سب سے زیادہ
تعداد اُن مضامین کی ہوگی جو دوسروں نے لکھے ہیں اور
ان کے نوک پلک حسین صاحب نے درست کیے ہیں۔ جیسا
پہلے بتایا جا چکا ہے کہ درسی کتاب کے تیاری میں فن کے
ماہر کی مدد بھی ضروری ہوتی ہے۔ ایک خاص بات کوئی
واقف کار لکھتا ہے۔ کسی خاص موضوع پر کوئی مضمون
لکھوایا جاتا ہے۔ یہ مضمون اپنی معلومات کے اعتبار سے
اچھا ہوتا ہے۔ لیکن زبان اچھی طرح سجی ہوئی نہیں ہوتی
ہے یا اس کتاب کے پڑھنے والے بچوں کے لیے اس کی
حسین صاحب سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا جاتا
اُن کی خوبی یہ تھی کہ وہ اصل مضمون کو اس طرح سنوار
دیتے کہ نہ اس کا حلیہ بگڑتا اور نہ رُوح پر چوٹ پڑتی
اور پھر بھی وہ نکھر جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کام مضمون
لکھنے سے بھی زائد دشوار ہے۔ اور یہ دشوار کام حسین
صاحب بڑی ذمہ داری اور ہوشیاری کے ساتھ کرتے
اور خوب لُطف کے ساتھ کرتے۔

خدا بخشے اچھے خاص شوخ مزاج تھے۔ بے تکلف
احباب سے بے ساختہ انداز میں گفتگو کرتے۔ جب کبھی
مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اس جگہ انگلی رکھ کر دھیان
دینے کو کہتے اور اگر پھر بھی سمجھ میں نہ آتا تو خود بتاتے
اور کہتے کہ "فوراً کان پکڑو"، پھر ہنستے اور ہنسانے کو
کچھ سُناتے اور مزے کے ساتھ سُناتے۔ ساتھ
ہی ساتھ اگر اُن کی کوئی اپنی بات پکڑ جاتی تو فوراً اپنے کان
پکڑ لیتے اور اس مزے سے اپنی شان میں فرماتے کہ واقعی
مزا آجاتا۔ یہ اُن کی خوش دلی اور مروّت کی بات تھی۔
جیسے اپنے چھوٹوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ ایک خوش مزاج
بڑے بھائی کا تھا۔ خود وہ اپنے میدان کے مرد تھے
ان کے میدان میں ہماری کوئی حیثیت بھی نہیں لیکن
ان کا انداز یہ ہوتا کہ وہ نادان ہیں۔ اپنے تجربے کا لوہا
وہ لیے ہوئے نہیں پھرتے تھے۔ ——— وہ
نہ جتاتے تھے کہ انھوں نے کتنا کچھ کر لیا ہے۔ حقیقت
تو یہ ہے کہ جتنا اور جیسا کچھ وہ لکھ چکے تھے اتنا مجھ جیسے
نے غالباً پڑھا بھی نہ ہوگا۔ لیکن کبھی انھوں نے کسی کو
یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ بچوں کے ایک بڑے ا
چھے ادیب ہیں۔ اور یہ بات تو آج تک تقریباً نامعلوم

ہونے کی حد تک ہی رہی ہے کہ وہ گمنام رہ کر بھی ادبی
دمت کرتے رہے ہیں۔

اُن سے میری آخری ملاقات اُن کی وفات سے چند روز
ا ہوئی۔ وہ کچھ دن کی اچھی خاصی بیماری کے بعد اُٹھے
ھے۔ کمزوری تھی اور طبیعت بھی پورے طور پر ٹھیک
یں ہوئی تھی لیکن پیامِ تعلیم کی محبت نے دفتر کی کرسی پر لاکر
ٹھا دیا تھا۔ میرا خیریت دریافت کرتا تھا کہ کچھ جان سی
رہی ؟ تم سے مطلب۔ دیکھنے نہیں آئے " میں نے آہستہ
ے کہا " دہلی سے باہر گیا ہوا تھا۔ کل ہی واپس آیا
وں " اتنا سنتے ہی جیسے کچھ اور جسم میں لہر دوڑ گئی ہو۔
بو مدلتے ہوئے بولے۔ " اچھا، خطا معاف۔ مضمون
ۓ " یہ ایک وعدے کی یاد دہانی تھی۔ وہ پیامِ تعلیم
خاص نمبر کے لیے مضمون چاہتے تھے۔ اب وہ خود
چل دیے۔ اور اُن کی یاد میں یہ چند سطریں لکھتے وقت
ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب بھی وہ اپنے مضمون کا ہی تقاضا
کر رہے ہیں اور اپنی شان میں کچھ کہتے جا رہے ہیں۔ " یہ کیا
لکھا ہے۔ فضول۔ کان پکڑو "

---

- کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو۔　　(قرآن پاک)
- کسی سے ناپسندیدہ بات نہ کرو　　( " " )
- جس شخص کو یہ پسند آئے کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے رہیں وہ اپنی جگہ دوزخ میں بنالے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- وطن میں محتاج رہنے کی نسبت سفر اختیار کر لینا بہتر ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- جو اپنی قدر نہیں جانتا، دوسرے بھی اُس کی قدر نہیں پہچانتے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

محترمہ سلمیٰ جاوید

# جناب حسین حسّان (مرحوم)

## اپنے خطوں کے آئینے میں

خط لکھنا بھی ایک آرٹ ہے، ایک فن ہے، اور جو شخص بھی اس آرٹ یا فن کو اپنا لیتا ہے اس کے خط میں ایک خاص قسم کا خلوص، اپنائیت، اور اس کی روشنائی میں ایک مخصوص قسم کی چمک آجاتی ہے۔ بقول داداجان (مولانا نثار نوراللہ مرقدہٗ) اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

تیرے خط سے ہوگئی روشن نگاہ
روشنی ہے روشنائی میں تری

تو واقعی فن کار کے خط کو دیکھ کر آنکھوں میں روشنی بڑھتی ہے۔ اور دل میں ایک قسم کی مسرت جاگتی ہے اور سرور انگڑائی لیتا ہے۔ اس کے طرز تحریر (لکھنے کا انداز) سے بے پناہ محبت کا جذبہ پروان چڑھتا ہے اور اپنائیت کے درخت میں برگ و بار آتے ہیں۔ اس کے سواد خط (تحریر کھاوٹ) سے ہوش و گوش کو بہت کچھ سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت ملتی ہے۔ اس کی تحریر کے چند جملوں سے ہی اس کی فراست، دانائی، عقل مندی اور سوجھ بوجھ کا اچھا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے بزرگ یہ کہتے آئے ہیں کہ

---

انسان کی ساری فراست اس کی تحریر میں چھپی رہتی ہے۔ تحریر دیکھیے اور اس کی ساری باتوں کو آئینہ کی طرح اپنے دل و دماغ میں بٹھا لیجیے۔

حسین حسّان صاحب (مرحوم) سے میری خط و کتابت ۱۹۶۸ء سے شروع ہوئی۔ ہوا یہ کہ میں نے پٹنہ سے خواتین کے لیے ایک رسالہ "زیور" کے نام سے نکالا (جو اللہ کے فضل و کرم سے برابر نکل رہا ہے) اس کی کاپی "پیام تعلیم" کو بھی تبادلہ کے لیے جاتی تھی۔ چند ہی دنوں کے بعد مرحوم کا ایک خط مجھے ملا۔ خط نہایت باریک لکھا ہوا طرز تحریر بے حد دل نشیں اور سواد خط انتہائی پیارا، اور جذبات بے انتہا نازک نازک۔ آپ بھی اس کا کچھ اقتباس (حصہ) پڑھیے۔

"آپ کا زیور" ماشاءاللہ خوب نکل رہا ہے۔ عصمت و بنات (جو ادارے سے قبل دلی سے نکلنے والے خواتین کے جریدے) وغیرہ کے ہونے کے بعد کوئی سلیقہ کا پرچہ جو شریف بہو بیٹیوں کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہو اب نکلا ہے۔ ویسے دو ایک پرچے نکل رہے ہیں مگر یہ یا تو خالص مذہبی ہیں یا بہت ترقی یافتہ ہیں۔ خدا آپ کے رسالے

کو استقلال بخشے ۔ آمین ۔

مگر آپ "پیام تعلیم"، کے لیے بھی کچھ لکھ دیا کیجیے ۔ اس پرچے میں بچّوں اور بچیوں کے مطلب کی چیزیں نہیں نکل رہی ہیں ۔ اس کا مجھے بہت احساس ہے ۔ بچیوں کے سلسلے میں آپ میری مدد کرسکیں تو بڑی نوازش ہوگی ۔ ہوم سائنس کے سلسلے میں جو جو باتیں آسکتی ہوں ان بچیوں کی زبان میں آپ لکھ سکتی ہیں ۔ پکانا، ریندھنا، سلائی، کشیدہ کاری، گھر کی چیزیں سلیقے سے رکھنا ۔ گھر کے چھوٹے بڑوں سے اچھا برتاؤ ۔ ادب تہذیب شائستگی ۔ مغرب کی بے ہودہ باتوں سے پرہیز (اجتناب) وغیرہ "

تو یہ تھا پہلا پہلا خط جناب حسین حسّان (مرحوم) کا جس کے ذریعہ سے میری اور ان کی پہلی جان پہچان ہوئی۔ ویسے میں اس بات پر فخر کرتی ہوں کہ میں نے "پیام تعلیم"، ہی کے ذریعے سے لکھنے لکھانے کا سلیقہ اور شعور حاصل کیا اور یہی نہیں بلکہ میرے والد محترم جناب غبار بھٹی نے بھی اپنے بچپن میں اسی پرچے کے وسیلے سے بہت کچھ حاصل کیا تھا ۔ تو گویا ایک حیثیت سے "پیام تعلیم"، میرا خاندانی استاد ہے ۔

جب مجھے (مرحوم) کا حکم ملا تو میں نے سب سے پہلے بہت ہی چھوٹے بچّوں اور بچیوں کے لیے ایک نظم "لوکی"، کے نام سے ان کی خدمت میں ارسال کی ۔ انھوں نے اس نظم کو بہت سراہا اور ان شعروں کو۔

سنی چیتی ، بے بی سے — اک دن کہتی تھیں نانی
دن پہ دن بڑھتی ہو بہت — تم سب بھی تو ہو لوکی،
بات بہت مشہور ہے یہ — لوکی ہوتی ہے لڑکی
تم بھی سب لوکی کی طرح — سکھ دو سب کو رہو سکھی
کڑوا کریلا بن کر تم — بولنا مت کڑوی بولی
بن جاؤ اپنے گھر میں — چھپّر کی میٹھی لوکی

بہت پسند کرتے ہوئے لکھا۔

" عزیزہ ۔ تم نے چھوٹے بچّوں کی حیثیت کو پورے طور پر سمجھ لیا ہے ۔ اور ان کے جذبات کو ایسے سادہ، سہل اور آسان ڈھنگ سے ادا کیا ہے کہ بے اختیار تمہارے لیے دل سے دعا نکلی ہے "،

پھر اس کے بعد ان کے حکم کے مطابق میں نے بہت ترتیب سے "پیام تعلیم"، میں لکھنا شروع کیا اور "گڑیا کی شادی" کے عنوان سے ایک طویل سلسلہ شروع کیا ۔ گو کہ وہ سلسلہ بہت پابندی سے اس لیے نہیں چل سکا کہ "زیور"، کی بہت ساری ذمہ داریاں مجھ پر آگئیں ۔ وہ ذمہ داریاں اب بھی ہیں ۔ گو کہ کام کرنے والے زیادہ ہوگئے ہیں پھر بھی وقت نہیں مل پاتا ہے ۔

"گڑیا دکھائی"، کا حصّہ پڑھنے کے بعد مرحوم نے مجھے جو خط لکھا اس کا اثر خود مجھ پر بھی بے حد ہوا ۔ انھیں اپنی قوم میں پھیلی ہوئی ابتری اور اس کے ساتھ "تاجرانہ لالچ"، کا کتنا گہرا اثر ہوا تھا ۔

...... تمہارے اس مضمون کو پڑھ کر مجھے آج یہ معلوم ہوا کہ ہمارے مسلم گھرانوں میں تلک و جہیز جیسی غیر ضروری رسمیں اتنی گھر کر چکی ہیں ۔ ہزاروں گھر اجڑ جانے لُٹ جانے کے بعد بھی یہ لعنت اور بھی زیادہ گہرائی تک اترتی چلی جا رہی ہے ...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کہیں بھی اس طرح کی کوئی رسم مسلم گھرانے میں

ہوگی۔ یہ تو خون کے آنسو رلانے والی
بات ہے۔"

ہوا یہ تھا کہ ہم نے بہار میں جس طرح سے لڑکوں
کی خرید و فروخت لوگ کرتے ہیں اس کا مکمل خاکہ "گڑیا کی کہانی"
کے وسیلے سے پیش کیا تھا اور اس کا اظہار کیا تھا کہ کس
کس طریقے سے لڑکے والے لڑکی والوں سے مانگ
کرتے ہیں اور کس زور زبردستی سے تلک جہیز کے نام پر
... کی پڑھائی لکھائی سے لے کر بلکہ پیدائش سے
... ادی بیاہ تک جتنا کچھ خرچ ہوتا ہے۔ سب
... پائی انتہائی بے رحمی سے وصول کرتے ہیں۔
ا... ہی خاندان اجڑ گئے اور کتنے ہی برباد
ہو... ان گنت لڑکیاں تلک جہیز نہ ہونے
سے ... کنواری پڑی ہوئی ہیں۔

مر... لکھتے لکھتے ہم لوگ بہکنے لگتے ہیں اور یہ احساس
ہمارے ذہن سے نکل جاتا ہے کہ "ہم یہ مضمون "بچوں"
کے لیے لکھ رہے ہیں اس حالت اور انداز پر وہ کتنے
پیارے لب و لہجہ میں سمجھاتے ہیں اور گتھی کو سلجھاتے ہیں۔

"عزیزہ، مضمون مل گیا۔ دلی شکریہ۔
اس طرح کے مضمونوں میں آپ جس قدر زیادہ
گھریلو بول چال کی زبان استعمال کریں۔ اسی
قدر بچے دلچسپی سے پڑھیں گے جملوں کو ثقیل
یا مشکل لفظوں سے گرانبار کرنے کی کوشش
نہ کیجیے۔ آسان سے آسان لفظوں کی
ٹوہ میں رہیے۔

ہم لوگ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اس بات کا احساس
نہیں رہتا کہ ہمیں "بچوں" کے لیے کتنا لکھنا چاہیے۔ بس
لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے خط

لکھتے ہوئے اس بات کو کس انداز سے ذہن میں اتارا ہے۔

مضمون اچھا ہے۔ طویل ہو گیا ہے
آئندہ ذرا مختصر لکھنے کی کوشش کیجیے۔ بہت
لمبا مضمون ہوگا تو بچے اسے پڑھنے سے
گھبرا جائیں گے۔ وہ تو قصہ کہانی ہی طویل
سے طویل پڑھ سکتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے انتقال
سے متاثر ہو کر ایک نظم "اک چراغ اور بجھا" لکھ کر ان
کی خدمت میں ارسال کی۔ کیوں کہ "پیام تعلیم" نے مرحوم
پر ایک خاص نمبر نکالنے کا اعلان کیا تھا جس کے لیے مجھے
جناب حسین حسان صاحب (مرحوم) نے لکھنے کے لیے
حکم دیا تھا۔

"عزیزہ۔ ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ نظم بھی ملی۔
دلی شکریہ۔ نظم پڑھ کر میں نے یہ بات محسوس کی
آپ نے قافیہ پیمائی نہیں کی ہے ذاکر صاحب کی
موت سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔

یہ طے ہوا ہے کہ جون کے پرچے کو ذاکر صاحب
مرحوم کے لیے وقف کر دیا جائے۔ اس لیے تمام
مضمون جن کی کتابت ہو چکی تھی ملتوی کر دیے
ہیں اور اسی لیے پرچہ کی اشاعت میں شاید
کچھ دیر ہو جائے۔

ہاں بھئی۔ دیکھتے دیکھتے سب چراغ بجھے
جا رہے ہیں اور یہ تاریکی۔ یہ اندھیرا، کچھ
دیرپا نظر آتا ہے۔ خدا کرے میرا خیال غلط ہو۔"
مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت نہیں ہو سکا اور نہ ؟ سے
جھٹلایا جا سکا۔ اکثر ان کے خطوں سے علالت اور صحت کا حال معلوم
ہوتا رہتا تھا۔ مگر جو تاریکی پھیلنی شروع ہو گئی تھی اور جب
[illegible]

جناب خالد عرفان

# بچوں کا ادیب ساز ادیب

محترمی... سلام و رحمت

......اس کے بارے میں عرض ہے، مجھے لگتا ہے۔ یہ مضمون تشنہ ہے کیونکہ حسین صاحب کے فن کا بھرپور جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ اسی کے علاوہ بادی النظر میں اس کے ابتدائی حصّہ کو آپ غیر ضروری قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر میں اپنے آپ سے بھی اور جامعہ کے ساتھ اپنے تعلق سے بھی انصاف نہیں کر رہا ہوں گا۔ اختلاف کی گنجائش کے باوجود میری یہ خواہش رہے گی کہ آپ اس کے بعینہٖ شایع کریں۔ ضرورت پڑنے پر وضاحت و بحث ہو جائیں گے۔

محترم شاہد صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

جولائی کا آخری دن تھا کہ محترم ولی صاحب کا خط آیا "مجھے یہ خبر دیتے ہوئے بڑا دکھ ہو رہا ہے کہ ہمارے قدیم ساتھی اور پیامِ تعلیم کے مدیر محترم محمد حسین حسان ندوی صاحب ۱۳۔ جولائی کو ہم سب کو داغِ مفارقت دے کر اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ط

اس خبر نے مجھے کتنے ہی منٹ تک کے لیے گونگا کر دیا اور میں بیٹھا رہ گیا۔ مجھے ایسا لگا میرا اپنا کوئی قریبی عزیز مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا ہے۔ حسین صاحب عزیز نہیں تھے، پھر نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے تھے۔ آخر کیوں؟ میں سوچنے لگا، میرے ذہن نے پیچھے کی طرف چھلانگیں لگائیں۔ دلی میں ان سے ملاقات سے ہوتے ہوئے میں اُس زمانے کی طرف لوٹ گیا جب میرا پیامِ تعلیم سے پہلے پہل تعارف ہوا تھا۔

میری امی عصمت اور بنات کی خریدار تھیں۔ بنات کی کہانیاں مجھے بہت پسند تھیں۔ ننھے منوں کے رسالوں سے اس طرح میرا تعارف ہو چکا تھا۔ اور جب

میں نے ابا سے میرے نام کسی رسالے کی خریداری کے لیے کہا تو وہ ایک عرصے تک ٹالتے رہے تھے۔ مڈل کی جماعتوں میں لائبریری سے کہانیوں کی کتابیں لے کر پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ ان میں سے بیشتر کتابیں مکتبہ جامعہ کی تھیں اور ان کتابوں کی پشت پر پیام تعلیم کا اشتہار چھپا ہوتا۔ میں اس اشتہار کو جب بھی پڑھتا پیام تعلیم کو حاصل کرنے اور پڑھنے کا شوق بڑھنے لگتا۔ آخر میں نے ابا کو پیام تعلیم کی خریداری کے لیے تیار کر ہی لیا۔

لیجیے صاحب پیام تعلیم کی وی پی آگئی میں نے پہلا رسالہ کیا پایا گویا دولت ہاتھ آگئی۔ اب میں ہر مہینہ ایک تازہ شمارے کے انتظار میں اس قدر بےچین رہتا کہ ڈاکیہ میری صورت دیکھ کر دور ہی سے ہنسنے لگتا۔ لیکن میری ناامیدی دیکھا چاہیے، جب دو مہینوں تک بھی کوئی شمارہ نہیں ملا۔ پھر دفتر کے اور میرے درمیان ایک طویل عرصہ تک خط و کتابت ہوئی۔ دفتر والوں کا کہنا تھا ہم نے تمھارے نام وی پی بھیجی ہی نہیں۔ جب تین مہینوں کی لگاتار خط و کتابت کے بعد دفتر کو یقین ہوگیا تو جواب ملا کہ فلاں فلاں شمارے فلاں فلاں تاریخ کو بھیج دیے گئے ہیں۔ میں حیران رہ گیا۔ پھر جب ایک زوردار خط لکھا تو یہ تمام شمارے "دوبارہ" بھیجے گئے اور مجھے ملے۔ تب تک پیام تعلیم کی اشاعت میں بے قاعدگی در آئی تھی اور وہ مہینے مہینے ناغہ جاتا پھر ایک ساتھ دو تین شمارے ایک ساتھ ملتے۔ اور میں ان رسالوں کے ملتے ہی شروع سے آخر تک چاٹ جاتا۔ میرا شوق دیکھ کر اباجی نے میرے نام دو چار رسالے بھی جاری کرا دیے۔ میں خود بھی نئے نئے رسالوں کی تاک میں رہتا اور نمونہ منگوا کر خریدار بن جاتا۔ اس طرح میرے پاس جموں اور لاہور سے لے کر دہلی تک کے کئی رسالے آنے لگے۔ لیکن مجھے پیام تعلیم سے نہ جانے کیسے ایک ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ اس نے میری ذہنی تربیت پر بلا واسطہ اثر ڈالا۔

جامعہ ملیہ اور پیام برادری کی کارروائیوں کی روداد پڑھ کر میرے اندر ایک "نیا بچہ" ابھر آیا تھا۔ جو خاص طور پر جامعہ ملیہ سے اس قدر متاثر تھا کہ لاشعوری طور پر وہ اپنے آپ کو جامعہ ملیہ کا ایک طالب علم محسوس کرنے لگا تھا۔ "بچوں کا بینک" "بچوں کا کتاب گھر" "بچوں کا ڈاک خانہ" ایسے بے شمار دفاتر کا حال پڑھتا تو میں اپنے آپ کو وہیں پاتا! کاش ایسا ہی ہو پاتا!!

ممکن ہے جامعہ کے طالب علم میں خدمت اور عمل کے جذبے گہرائیوں تک پائے جاتے ہوں۔ اس کے اساتذہ "نمونہ پہلے اور تربیت بعد" کے اصول پر عمل کرتے ہوں۔ ان کی معلمانہ زندگی اور عملی اور سماجی زندگی میں کسی طرح کی دورنگی نہ پائی جاتی ہو لیکن بعض چھوٹے چھوٹے امور سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ بہر طور یہ لوگ بھی، چاہے وہ امیر جامعہ ہی کیوں نہ ہوں، انسان ہی ہیں۔ خیر یہ دوسری بحث ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پیام تعلیم کے مطالعہ نے جہاں مجھ میں، علاوہ اور امور کے، اپنے کام آپ کرنے اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی نیک عادتیں راسخ کیں، استوار کیں، وہیں مجھے لکھنے کا شوق دلایا۔ جیسا کہ پیدا کیا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ حالانکہ میری پہلی کاوش پیام تعلیم ہی میں چھپی۔ لیکن اپنے نام کے بغیر، میں نے ایک پہیلی بھیجی تھی جو بچوں کی کوششوں

کے کالم میں سر فہرست تو چھپی مگر نام نہیں دیا گیا۔ اور نہ اس کا ازالہ کیا گیا حالانکہ دو مرتبہ یاددہانی کرائی گئی۔ اس کے بعد میں نے چند سوال پیام برادری کے مشتاق بھائی سے کئے ان کے جواب بھی بہم یاددہانی کے بعد دیئے گئے۔ لگتا ہے اس زمانے میں جنوب کے پیامیوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا جاتا تھا جس کا بہرطور اعادہ جامعہ کے ذمہ دار افراد سے آج بھی کبھی کبھار ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن اس "خصوصیت" کے مرتکب جناب حسین صاحب اپنے طور پر نہیں ہوسکتے تھے اس کا احساس مجھے اس زمانہ میں ہوا جبکہ میں نے باقاعدگی سے سائنسی مضامین پیام تعلیم کے لیے لکھنا شروع کیا۔ ویسے ایک امر کا احساس مجھے کئی بار ہوا ہے کہ حسین صاحب اپنے طور پر آزادی رائے اور آزادی عمل کے مجاز ہونے کے باوجود مکتبہ کی ملازمت میں تھے اور ایک ملازم پیشہ فرد کے لیے اپنے نظریات اور فیصلوں سے زیادہ اپنے "آقا" کے اصول، نظریات اور ضرورتوں کا خیال لازمی ہوتا ہے۔ بہرطور حسین حسان صاحب سے میرے تعلقات حالانکہ ایک مدیر اور ایک معمولی لکھنے والے کے تھے، لیکن ہم دونوں میں خط و کتابت کے ذریعہ ہی وہ رشتہ قایم ہوچکا تھا جس میں الفاظ سے کہیں زیادہ ان کے پس منظر کے جذبے تعلق بنائے رکھتے ہیں۔

یہ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ میں پہلی بار دلی گیا۔ وہاں میں نے سب سے پہلا اور اہم پروگرام جامعہ کی سیر کا رکھا۔ دلی پہنچتے ہی جامعہ گیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان دنوں جامعہ ملیہ میں چھٹی تھی، اور میں وہاں کا کوئی مدرسہ، کوئی دفتر نہیں دیکھ سکا۔ نہ طالب علم تھے نہ استاد، بلکہ رہائشی طلبا بھی اپنے وطن یا باہر گئے ہوئے تھے، اسی طرح میری ایک بہت ہی دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ ہوسکی۔ لیکن اس کا کچھ ازالہ مکتبہ کے افراد سے مل کر ضرور ہوا۔ اور ان میں عین دو شخصیتوں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا اور جو قریب نہ رہتے ہوئے بھی قریب رہے وہ رہے حسین صاحب اور ولی صاحب۔

باوجود بزرگ ہونے کے وہ اس قدر یگانگت سے ملے تھے، مجھے لگا تھا، میں اپنے خاندان کے کسی فرد سے مل رہا ہوں۔ یہی نہیں، انھوں نے مجھے دوسرے دن دوپہر میں کھانے پر بلایا اور خوب اصرار کر کر کے کھلایا۔ آج سے آٹھ برس پہلے کی اس ملاقات کے تمام تاثرات بعینہٖ تو بیان نہیں کرسکتا۔ لیکن اس وقت حسین صاحب نے جامعہ اور مکتبہ کا جس طرح تعارف کرایا تھا اور پیام تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں جن مشکلات کا ذکر کیا تھا اس سے نہ صرف میرے سامنے جامعہ اور مکتبہ کے صحیح نقوش ابھر آئے تھے بلکہ خود اپنی شخصیت کی ایک تصویر بن گئی تھی۔ حسین صاحب کو میں نے باوجود عمر کی زیادتی کے بہت ہی فعال پایا وہ جوانوں کی طرح مجھے لیے پھرتے رہے جو احباب مل سکے ان سے ملاقات کرائی، اپنے منصوبوں کو بتایا، اور رسالے کی ترتیب اور کتابوں کی اشاعت کے انتظامات اور دفتری کارروائیوں کی جانکاری کرائی۔ مختصر سی دو چار ملاقاتوں میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت ہی پُرخلوص، ملنسار اور مستقل مزاج آدمی ہیں۔ پیام تعلیم اور کتابوں کے ذریعہ بچوں کی صحیح تعلیم اور صالح تربیت ان کی زندگی کا مشن ہے۔ اس کٹھن مقصد کے حصول میں راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں کا ان کو اندازہ رہا ہے اور یہ کہ وہ

ان سب پر قابو پاکر اپنے کام کو آگے بڑھانے کا حوصلہ ہی
نہیں کامل تجربہ رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ تمام شماروں سے نہیں
بلکہ پیام تعلیم کے خاص نمبروں کی اشاعت سے پوری
پوری طرح ہوتا ہے۔ ممکن ہے گٹ اپ اور دوسری ظاہری
اور صوری حیثیت سے وہ بچوں کے ایک آدھ مصور رسالے
ہم پلہ نہ رہا ہو، لیکن معنوی حیثیت سے وہ بچوں
کے کسی بھی ہندوستانی اردو رسالے سے
وقیع اور بلند رہا ہے۔ خاص کر پیام تعلیم کے پچھلے
چند سالوں کے سالنامے، کہانی نمبر، ذاکر وغیرہ آپ کی
ادارتی صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔ یوں محض تفریحی یا تجارتی
نقطۂ نظر سے رسالہ ترتیب دینا کوئی غیر معمولی بات نہیں
ہے، لیکن تعلیم، تربیت، جانکاری، تفریح، اور تجارت،
ان سب کے پیش نظر رسالہ اس طرح ترتیب دینا کہ اس کا
افادی پہلو کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہو۔ غیر معمولی سوجھ
بوجھ، صلاحیت اور تجربہ چاہتا ہے اور یہ تینوں خوبیاں
حسین صاحب میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں ممکن ہے کسی
ایک نمبر کی ترتیب میں کوئی ایک آدھ مضمون تعلقات کی
بنا پر کم تر درجہ کا در آیا ہو۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ ان
کے پیش نظر فن کار سے زیادہ فن اہم رہا ہے۔ انہوں
نے کم تر ہی "کس نے لکھا ہے؟" دیکھا ہے اور ہمیشہ
"کیا لکھا ہے" پر نظر رکھی ہے۔ نئے لکھنے والوں کو
ابھارنے، آگے بڑھانے اور لکھنے کا چسکا دلانے کے لیے
یہ نہایت ہی زریں اصول ہے اور اگر کسی نے "خوب"
لکھا ہے لیکن اس میں وہ "فنی" بات نہیں پائی جاتی
جو اشاعت کے لیے لازمی ہے تو میں نے اپنے دو ایک
عزیزوں کے مضمون سے اندازہ لگایا ہے ان کو اس
طرح ترتیب دیا ہے۔ اصلاح کی ہے اور پھر نجی طور پر
ان کو خط کے ذریعے ہمت بندھائی ہے کہ وہ اور
[illegible] بڑھائے اور اس کا اعزاز [illegible]

کہ تحریر پیام تعلیم کے مدیر کے پاس ہی جائے۔ خود
مجھے اپنے ایک مضمون میں، جو اب سے کوئی سات آٹھ
برس پہلے پیام تعلیم میں شایع ہوا ہے چند ایسی تبدیلیاں
نظر آئی تھیں جن کی اہمیت کا اندازہ مجھے ان دنوں
بالکل نہیں ہوا تھا، میں اس کو محض "مدیرانہ حقوق"
سمجھ کر رہ گیا تھا، لیکن آج میری اپنی تحریر کو سامنے
رکھ کر دیکھتا ہوں تو اس فرق کو شعوری طور پر محسوس
کرتا ہوں جو ان کی اصلاح سے اس مضمون سے پیدا
ہوا تھا اور جس سے مضمون "بچوں کے لیے" بن گیا تھا۔
اس طرح مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ حسین صاحب کے پیش نظر
ہمیشہ "بچے" اور ان کے "ننھے ذہن" رہے ہیں۔
اس امر کی طرف آپ نے میری توجہ بھی مبذول کرائی ہے۔
کہ میں جب بھی مضمون لکھوں (اور وہ مجھ سے سائنسی
مضامین کی خصوصی فرمائش کیا کرتے تھے) ہمیشہ اس
بات کا خیال رکھوں کہ وہ بچوں کے لیے ہو۔
پیام تعلیم بچوں کا رسالہ ہے، وہ اس امر کو کبھی
اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کے
پیش نظر آٹھ سے اسی سال تک کے بچے نہیں
تھے، بلکہ آٹھ سے اٹھارہ برس تک کے ہی بچے رہے
تھے اور یہ ایک بچوں کے رسالے کی مدیرانہ
صلاحیتوں کی ایک خصوصیت ہے جس سے بیشتر
رسالوں کے مدیر یا تو عاری ہیں یا شعوری طور پر
اس ضرورت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، محض تجارتی
کامیابی کی خاطر ایک خط میں میرے ایک مضمون
کی رسید اس طرح بھیجی تھی۔
"بھئی اسی طرح کے مضامین کی تلاش ہے،
جو معلوماتی بھی ہوں، دلچسپ بھی ہوں اور
جن کی بدولت بچوں یا لڑکوں کو [illegible]

کا موقع ملے، خدا کرے اس سلسلے کے جاری
رکھنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ آمین"
اور میں نے ان کی ضرورت کے پیش نظر ہی سائنسی
مضامین کا ایک سلسلہ پیام تعلیم کے لیے شروع کیا
ہوا ہے جس میں آسان اور گھر پر کئے جانے والے
تجربات کے ذریعہ سائنس کے اصول اور بنیادی معلومات
کھیل ہی کھیل میں بتانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

حسین صاحب اپنے اس اصول کو محض دوسرے
کے لیے تجویز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ خود ان کی تمام تحریریں
اسی اصول پر لکھی گئی ہیں وہ پیام تعلیم کا اداریہ ہو
کر ان مضامین، کہانیاں اور کتابیں۔

جس طرح پیام تعلیم وہ پہلا رسالہ تھا جس کے
ذریعہ بچوں کے ادب سے میرا ضابطہ تعلق قائم ہوا تھا
بالکل اسی طرح میرے ہاتھ میں پہلی معلوماتی کتاب
تھی حسین صاحب کی۔ پیام تعلیم جاری ہوئے غالباً
چھ مہینے ہوئے تھے میں اپنے ننھیال گیا ہوا تھا،
ابا آئے ہوئے تھے۔ وہ بازار گئے۔ واپسی میں ان
کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا، ابا نے وہ پیکٹ میری
طرف بڑھا دیا اور کہنے لگے "دیکھو تمہارے لیے
ہم کیا لائے ہیں۔ پیام تعلیم کے دلوانے ہو۔ ذرا دیکھو
ہم تمھارے لیے کیسی اچھی کتاب لے آئے ہیں"
میں نے جھٹ پیکٹ کھولا اور میرے سامنے ایک
مصور کتاب مسکرانے لگی اس کے ٹائیٹل نے مجھے اس
وقت اس قدر مسحور کیا تھا کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا تھا
اور جب کتاب میں نے پڑھنا شروع کیا ہے تو میرے
سامنے ایک نئی دنیا ابھرنے لگی تھی اس کا طرز تحریر
اس قدر سادہ، دل نشیں، جاذب توجہ اور مسحور کن
ہے کہ میں آج اس کو بچوں کے ادب میں ایک
مثالی کتاب قرار دینا چاہتا ہوں۔ باتوں ہی باتوں
میں دنیا کے مختلف حصوں کے جن میں انتہائی مہذب
ملک سے لے کر بے حد پس ماندہ ملک بھی شامل
ہیں، رسوم و رواج، رہنے سہنے کے ڈھنگ،
علاقائی خصوصیات — نہ جانے کیا کچھ جیتا جاگتا
پڑھنے والوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کتاب
کا نام ہے "دنیا کے بچے" اور میں اس کو حسین
صاحب کی کتابوں میں سرفہرست رکھتا ہوں۔
ہر مضمون جغرافیہ، تاریخ، معاشرت، معیشت
کی بے شمار کتابوں کے پڑھنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

بچوں کے لیے لکھی سیرت نبوی کی کتابوں میں
حضرت خواجہ حسن نظامی کی ننھی سی کتاب کا ایک اچھا
مقام ہے۔ لیکن بڑے بچوں کے لیے جو کتابیں لکھی
گئی ہیں۔ ان میں حسین صاحب کی "سرکار دو عالم"
نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ہے یہ کتاب مڈل کی
آخری جماعت میں بحیثیت نان ڈیٹیلڈ ٹکسٹ "
میرے کورس میں لگی ہوئی تھی اور اس کو پڑھانے
والے قابل استاد تھے مولوی عبدالحق صاحب
انھوں نے کتاب کو محض " نان ڈیٹیلڈ ٹکسٹ
بک "، کو جس طرح روانی سے پڑھ کر ختم کیا جاتا ہے
نہیں پڑھایا بلکہ اس کے ایک ایک ذیلی عنوان کو
تفصیل کے ساتھ اس طرح سمجھایا کہ حضور صلعم کی
حیات طیبہ اور سیرت پاک کے گہرے نقوش ہم
بچوں کے ذہن پر مستقلاً ثبت ہو گئے۔ اس کے
علاوہ بھی۔ میں اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں
کہ حضور صلعم کی حیات طیبہ کی اولین کتاب جو پڑھنے

کو ملی وہ اس قدر آسان، مستند، اور بڑی حد تک مفصل رہی۔

اسی آسان اور معلوماتی طرز کی ایک اور کتاب ہے جو سوانحی ادب میں نمایاں مقام کی حامل کہی جا سکتی ہے خصوصاً بچوں کے لیے لکھے گئے سوانحی ادب میں نمایاں مقام کی کہی جا سکتی ہے۔

اور وہ ہے "ناموران اسلام" ہے جس میں کتاب کی اشاعت کے زمانہ تک کے ہر فن کے تقریباً ہر مسلمان صاحبِ فن وکمال کی زندگی کو بالکل مختصر طور پر اس طرح پیش کیا ہے اور اس کے لیے ایسے اہم واقعات کا انتخاب کیا گیا ہے جس سے بچہ میں اپنی زندگی کو بامقصد کارآمد اور باعمل بنانے کا جذبہ یقیناً پیدا ہوتا ہے۔

بچے "کہانیوں کے رسیا ہوتے ہی ہیں ان کے لیے کھیل کود کے بعد تفریح کا کوئی ذریعہ ہوتا ہے تو وہ کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ بچوں کے لیے کہانی کہنے کے فن میں عموماً دادی اماں یا نانی اماں کو خاصی مہارت حاصل ہوتی ہے غالباً اس لیے بھی کہ ان کی عمر کا ایک حصہ بچوں اور ان بچوں کی تربیت میں گذرا ہوا ہوتا ہے، وہ ان کی تربیتی اور ذہنی ضرورتوں کو محسوس کرنے لگتی ہیں اور شاید اس لیے بھی کہ وہ عمر کے اس حصہ کو پہنچی ہوتی ہیں جہاں ان کا ذہن بھی بچہ کے ذہن جیسا لچکدار بن جاتا ہے۔ لیکن کہانی کہنے سے زیادہ لکھنے کا فن مشکل ہے۔ وہ خصوصی ریاضت چاہتا ہے بچوں کے لیے اردو میں بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں ان کا اپنا ایک مقام بھی ہے۔ میری دانست میں بچوں کے لیے کہانی محض ایک

من گھڑت داستان ہوتی ہے۔ کہانی کے کردار انسان ہوں کہ جانور، دیوہوں کہ جن، بھوت ہوں کہ پریاں، ان کے اردگرد محض اچھل کود، لڑائی جھگڑے۔ وعظ اور پند کے تانے بانے بننے کے لیے کہانی تیار نہیں ہو جاتی۔ کہانی کہانی میں کام کی باتیں معلوم ہو جائیں کام کرنے، کام کرانے کی تحریک ملے، زندگی کی نزاکتوں، نازک جذبوں اور بلند خیالیوں کا پتہ چلے۔ جینے کا سلیقہ آ جائے تو کیا کہنے!

آپ حسین صاحب کی کہانیاں پڑھیے، ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی پیام مل جائے گا، کسی نہ کسی جذبہ کا احساس ہو جائے گا کسی نہ کسی عمل کی تحریک ملے گی، لیکن یہ سب کچھ ہوگا لاشعوری طور پر چپکے سے آہستہ سے چاہے کہانی "ننھا چھو" جیسے جنگلی چوہے کی داستان ہو کہ "توتے کی توتا چشمی"، جیسی میاں مٹھو کی کہانی یا "لو بھئی ہم خوب بڑھ رہے ہیں"، جیسی پیاری کہانی۔

کہانی میں مقصدیت بہت زیادہ ابھر کر آ جائے تو وہ پروپگنڈا یا خشک وعظ یا کسی پارٹی مینی فسیٹو بن جاتی ہے۔ حسین صاحب کو اس امر کا احساس تھا کہ اصل پیغام کو بس زیریں رو کی طرح بہتے رہنا چاہیے اور کہانی کا تفریحی مقصد ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آپ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ہے دادی اماں جیسا طرز بیان یعنی جس طرح دادی اماں آپ کے سامنے بیٹھی کہانی کہتی ہیں، ان کو آپ کی عمر، آپ کی سمجھ دونوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ وہی الفاظ استعمال کرتی ہیں جو آپ سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی مشکل لفظ منہ سے نکل گیا تو اس کا مطلب دہرا کر واضح کر دیتی ہیں، زبان بالکل سادہ، واقعات حقیقت آمیز ہوتے ہیں۔ اسی طرح حسین صاحب کی

باقی صفحہ ۲۵ پر

جناب ضیاؔ ہانی

# مدیر پیامِ تعلیم کے نام

(ان کی خدمات سے متاثر ہوکر)

حسّان! ہم سے ہوتے نہ رخصت کچھ اور دن
ملتی ادب کو شانِ فصاحت کچھ اور دن

قسمت ہمیں دکھاتی مسرت کچھ اور دن
پاتا فروغ! ذوقِ طبیعت کچھ اور دن

آتی نہ دردِ ہجر کی نوبت کچھ اور دن
خالی نہ ہوتا دامنِ حسرت کچھ اور دن

پیکِ اجل کو کرنا تھا، کچھ اور انتظار
رستہ تمہارا دیکھتی جنّت کچھ اور دن

بچوں کی رہنمائی و تعلیم کے لیے
حسّان! کی تھی سخت ضرورت کچھ اور دن

اے ضبط! ضبطِ غم کی نہ تلقین کر مجھے
ہے مقتضائے رنج طبیعت کچھ اور دن

آنکھوں میں اشک ختم اگر ہوگئے تو کیا
خونِ جگر ہے حاصلِ رقت کچھ اور دن

مغموم "جامعہ" ہے "پیامی" ہیں دلفگار
رہتی تمہاری کاش رفاقت کچھ اور دن

اے نکتہ دانِ معنی و اسرارِ علم و فن
رہتی جہاں میں تری اقامت کچھ اور دن

اے دردمندِ قوم، اے اطفال کے ادیب
درکار پستیوں کو تھی رفعت کچھ اور دن

اے آرزوئے جامعہ، اے پیکرِ خلوص
اس دور میں تھی تیری ضرورت کچھ اور دن

ماتم ترا دو روزہ نہیں عمر بھر کا ہے
روئیں گے تجھ کو "اہلِ عقیدت" کچھ اور دن

دارِ فنا میں با دلِ ناخواستہ ضیاؔ
سہنا پڑے گا جبرِ مشیّت کچھ اور دن

جناب مفتوں کوٹوی

حسان صاحب مدیر پیام تعلیم نئی دہلی

# یادوں کے جھرمٹ میں

خدا جانے ہماری شخصی و قومی ذہنی ساخت کیسی ہے کہ کوئی سی بھی محترم ہستی جب تک ہمارے درمیان میں رہتی ہے ہم اس کی صلاحیتوں سے کما حقہ استفادہ نہیں کرتے اور اسی لحاظ سے اس کی قدر شناسی میں کوتاہی برتتے ہیں اور جب وہ محترم ہستی ہمارے درمیان سے اٹھ جاتی ہے۔ تو اس کی قدر و ستائش کے طوفانات ہمارے جذبات میں امنڈ آتے ہیں۔

میں اپنے لیے کہتا ہوں اور اپنی اس کوتاہ قسمتی پر اب ندامت محسوس کرتا ہوں کہ مرحوم حسان صاحب سے پیام تعلیم کے قلمی تعاون کے سلسلے میں میری برسوں سے مراسلت تھی۔ پچھلے سال تک ان کے مکاتیب میرے پاس محفوظ تھے۔ کرم فرماؤں اور دوستوں کے خطوں کا بھی کافی ذخیرہ ہو گیا تھا۔ بدقسمتی سے میرے یہاں لائبریری کے لیے جگہ تنگ ہے۔ نئے ادبی سرمایہ کے لیے جگہ کرنے کے سلسلے میں اس ذخیرہ پر بھی نظر پڑی۔ اور مجبوراً یہ "دفتر پارینہ" بیشتر تلف کر دیا گیا۔ مرحوم حسان صاحب کے مکاتیب بھی اس زد میں آگئے جن کے اتلاف کا آج بے حد افسوس ہو رہا ہے، اور ممکن ہے۔ آئندہ دیگر کرم فرماؤں کے مکاتیب کے متعلق بھی ایسا ہی افسوس کرنا پڑے۔ مگر حالات کی مجبوریاں ہیں جن کے سامنے انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ میں نے تلاش کیا تو مرحوم کے صرف دو مکاتیب کی نقلیں مجھے اپنے اس مجموعہ میں محفوظ ملیں۔ جس مجموعہ میں میں نے اپنے قدردانوں، مہربانوں اور مخلصوں کی ایسی تحریریں جمع کر رکھی ہیں جن میں میری ادبی نگارشات پر حوصلہ افزایانہ تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور جنھیں میں اپنی ادبی کاوشوں کے لیے باعثِ افتخار، اپنی قلمی جولانیوں کے لیے سرمایہ وقار و اعتبار سمجھتا ہوں۔

تاہم حسان صاحب کے کئی نقوش محبت میرے دل و دماغ پر مرتسم ہیں ان کی تحریریں کی لکیریں میرے صفحۂ قلب پر نقش ہیں۔ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا، تصویر بھی اب جولائی ۱۹۹۷ء کے شمارۂ پیام تعلیم کے سرورق پر دیکھی ہے، کبھی بالمشافہ گفتگو کا موقع نہیں مل سکا۔ لیکن ان کی فہمائشوں اور درس آموزیوں کی نرمیٔ و گرمیٔ محبت و مروت اور شفقت و عنایت آج بھی محسوس کرتا ہوں، وہ مجھے میری نثری و شعری نگارشات کے متعلق ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اپنی زبان ذرا اور سادہ کروں، کیونکہ پیام تعلیم بچوں کا رسالہ ہے، ایک مرتبہ لکھا کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑوں کے لیے لکھنے کے مقابلہ میں زیادہ مشکل ہے، اسی سلسلے میں لکھا کہ بہت کم ادیب اپنی نگارشات کا

قدرے نیچی سطح پر لانا پسند کرتے ہیں مگر جہاں تک بچوں
کے لیے نگارشات کا معاملہ ہے ہمیں اُن کے درک و شعور
کا لحاظ رکھنا ہی چاہیئے۔

میرا ایک مضمون پیام تعلیم میں شائع ہوا۔ اس میں
اُن کی ترمیم و اصلاح تھی۔ مضمون لکھے ہوئے بہت دن
ہوگئے تھے یا یہ کہ مضمون میرے بھیجنے کے بہت دنوں
بعد شائع ہوا تھا۔ میں نے چھپا ہوا مضمون پڑھا پسند
آتا چلا گیا۔ صرف ایک لفظ کی گرفت پر میں نے اصل مسودہ
سے اُسے ملایا تو ترمیم و اصلاح کا پتہ چلا۔ میں ادیبانہ اور
شاعرانہ حیثیت سے "پر" بمعنی "مگر" متروک سمجھتا
ہوں۔ مرحوم کی اصلاح شدہ عبارت میں "پر" بمعنی "مگر"
موجود تھا۔ میں نے اصلاح کا شکریہ تو ادا کیا لیکن قدرے
سخت لہجہ میں اس اصلاح کا ذکر کیا کہ قارئین "پر" بمعنی
"مگر" کے استعمال سے میری ادیبانہ واقفیت اور شاعرانہ
مہارت پر حرف گیری کر سکتے ہیں۔ مرحوم اپنی مصروفیتوں کے
باعث جواب کے لیے کم مواقع نکال پاتے تھے۔ لیکن اس
خط کا جواب دیا اور سمجھایا کہ آپ کے انداز تحریر سے مترشح
ہوتا ہے کہ آپ نے اصلاح کا بڑا مانا میں برسوں سے
خامہ فرسائی کرتا ہوں لیکن آج تک اپنے آپ کو طالب علم
ہی سمجھتا رہا ہوں اور اس طالب علمانہ رجحان سے ہمیں
بھی محروم نہیں ہونا چاہیے۔ میں انھیں جواب عرض
کرنا چاہتا تھا کہ اپنی واقفیت و آگاہی پر خود اعتمادی جب
تک نہ ہو تحریر میں وثوق و یقین کی لذت پیدا نہیں ہوپاتی۔
اور اسی بنا پر "پر" بمعنی "مگر" پر خاص طور پر میرا
اعتراض تھا۔ لیکن ان کے مکتوب کے خلوص و شعور پر
میں جتنا غور کرتا گیا اس جواب کی جرأت اپنے آپ سے
مفقود پاتا گیا۔ اسی طرح حصول جواب کے سلسلے میں
میری تاکیدوں میں ذرا زیادتی آجاتی تو وہ عدیم الفرصتی
کی معذوری، بڑے مخلصانہ انداز میں بیان کرتے۔
ان کے بیمار رہنے کی کیفیت کبھی مجھے اس ضمن میں
معلوم ہوئی۔ خدا مرحوم کو بخشے۔ بڑی مروّت، عنایت
و شفقت کے بزرگ تھے اور مجھے ان تنک مزاجیوں
کے لیے معاف فرمائے جو کبھی کبھار بہ سلسلہ مراسلت
ظہور پذیر ہو جاتی تھیں۔

میں جولائی ۱۹۴۸ء کے الم انگیز اداریہ میں درج
شدہ ان الفاظ کی بڑے وثوق کے ساتھ تصدیق کروں گا۔
کہ پیام تعلیم میں شائع کیے جانے والے مضامین وہ بڑی
توجہ سے دیکھتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تواریخی
مضمون کے سلسلے میں بہت چوکنا تھے۔ میں نے سلطان
بخش کے متعلق ایک مضمون لکھا تو ایک واقعہ پر انھوں
نے میرے ماخذ اور حوالے دریافت کیے۔ مطمئن ہوجانے
پر ہی اس مضمون کو چھاپا۔

"مولا بخش" ہاتھی کے متعلق میں نے ایک مضمون
بھیجا تھا۔ اس کی ابتدا میں میں نے پرانے زمانے
کے اساتذہ کے "مولا بخش" (ڈنڈا) جس سے پرانے
زمانے کے اساتذہ طالب علموں کو مارتے تھے اور
اس ڈنڈے کو اسی نام سے پکارتے تھے) کا بھی ذکر
کیا تھا۔ کیونکہ مولا بخش کے ان معنوں کے استعمال کا
میں بھی معمول رہ چکا تھا۔ لیکن مرحوم نے وہ مضمون
اس بنا پر نہیں چھاپا کہ مولا بخش ہاتھی کا ذکر معلوماتی
ہے۔ لیکن مولا بخش نام کے ڈنڈے کا ذکر بچوں کی
نفسیات پر غلط اثر ڈالے گا۔ وہ مضمون آخر کسی
اور رسالے میں چھپا۔ پیام تعلیم میں نہیں۔

وہ واقعی بچوں کی نفسیات اور ذہنی کیفیات

خاص نظر رکھتے تھے۔ بڑی چھان پھٹک کے بعد پیام تعلیم
میں وہ نگارشات شامل کیا کرتے تھے۔ ہر شمارہ میں ان کی
"بچوں سے باتیں" بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ جن میں وہ
صاحب نگارش کا تعارف بھی اچھے الفاظ میں کرادیتے تھے
اور مندرجہ نگارش بھی پڑھنے کا شوق پیدا کر دیا کرتے تھے
بچوں سے باتیں بچوں کی زبان ہی میں کرنے کا آرٹ واقعی
انھیں بخوبی معلوم تھا۔ پیام تعلیم میں آج تک ایسی کوئی
نگارش (شعری یا نثری) شائع نہیں ہوئی جس میں ذرا کبھی
غیر مہذبانہ اور سوقیانہ انداز کا شائبہ بھی ہو ـــــ وہ
بچوں کی تیز مزاجی تلخی برداشت کرسکتے تھے لیکن بچوں کی پست
ذہنی اور تیرہ ذوقی گوارا نہ تھی۔

اب میں وہ دو مکاتیب درج کر رہا ہوں جن میں
سے پہلے میں مرحوم کا حوصلہ افزایانہ انداز تحریر ملاحظہ کیجئے۔
دوسرا مکتوب جہاں میرے لیے آج بھی نصیحت انگیز ہے۔
وہاں قارئین کے لیے بھی درس آموز ہے۔ میری عدم توجہی پر
خود ہی ایک وجہ قائم کرکے کتنے بہترین انداز میں طنز لطیف
کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے

(۱) ماہنامہ پیام تعلیم نئی دہلی ۲۰ نومبر ۱۹۶۲ء

محبی مفتوں صاحب۔ وعلیکم السلام

افسوس ہے کہ آپ کی نظم وقت پر مجھے نہیں ملی ـــ
ورنہ نہرو نمبر میں شائع ہوتی۔ اب جنوری کے پرچے کے لیے
کاتب کو بھجوا رہا ہوں۔ یہ پرچہ انشاء اللہ آفسٹ پر چھپے
گا۔ دعا کیجیے تحریر کامیاب ہو۔ آپ کا مضمون (حین پکڑا گیا)
بچوں کے حلقے میں بہت پسند کیا گیا۔ والسلام، مدیر

ماہنامہ پیام تعلیم نئی دہلی
تاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۶۵ء

مکرمی وعلیکم السلام

محبت نامہ ملا۔ مضمون بھی۔ شکریہ۔ آپ کی نظم
چاچا نہرو کتابت شدہ رکھی ہے۔ یہ مئی کے پرچے کے لیے
محفوظ کر لی گئی تھی اور اس میں چھپے گی۔

آپ کی کہانی بہت اچھی ہے۔ میں نے آپ سے پہلے
کسی خط میں اشارہ کیا تھا کہ ہر چہ گیرد مختصر گیرد
عاقل و ولی۔ مگر غالباً آپ بہت مصروف رہتے ہیں
اس لیے میری گذارشات پر توجہ کرنے کا موقع نہ ملا۔ اصل
کوئی چیز لکھنے کے بعد اس پر جتنی بار بھی نظر ثانی ممکن
ہو، کرنی چاہیے کہ برتن کو جتنی بار مانجھیے اس کی چمک
بڑھتی جائے گی۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام، مدیر

آخیر میں ایک قطعہ تاریخ درج کرکے رخصت
چاہتا ہوں۔

قطعہ تاریخ وفات جناب محمد حسین حسان مدیر
پیام تعلیم نئی دہلی۔

(قطعات تاریخ ص۴۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

........................

بقیہ ص۱۸

میں ڈالتی ہے کہ بھائی حسین حسان نے پہلی شادی سے
اسقدر ناراضگی کا اظہار کیوں کیا۔ کہ عین وقت پر روپوش
ہو گئے۔ میں نے بھی کبھی ان سے اس مسئلہ پر کوئی بات
نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ان کے وہم و تصور
میں بھی نہیں تھا کہ بغیر علم اطلاع اور مرضی معلوم کیے یہ واقعہ
اچانک پیش آجائے گا۔ یہ بالکل نفسیاتی بات ہے۔
دوسرے تحریک آزادی میں بڑے جوش و خروش سے
کام کر رہے تھے۔ اگر اس وقت رخصت کرکے لے آتے
آزادی سلب ہو جاتی اور جو کام ان کو سونپا گیا تھا وہ

جناب سلیم تمنائی

# میرے عزیز دوست

ہندی پرچار سبھا کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر ذاکر
حسین مرحوم مدعو تھے۔ راقم بھی شریک اجلاس رہا۔ تعارف
پر پوچھا، "آپ کا شبھ نام" میں نے مسکرا کر عرض کیا۔
"سلیم تمنائی" فرمایا "حضور یہاں کہاں" میں نے کچھ
داستان بیان کی۔ باتیں راز کی تھیں۔ پوچھا "کچھ اردو کا
کام بھی ہو رہا ہے یہاں؟" میں نے تفصیل بتائی۔ کنڑ اور
ہندی کے ذریعے اردو سکھلانے کے اپنے
طریقے بتلائے پھر بھرے اجلاس میں آپ نے فرمایا کہ اردو
والے اگر اس میدان میں آئیں تو وہ ہندی والوں سے
آگے نکل جائیں۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے ایک سوا ایک کام
کے سوال کر ڈالے۔ بڑا آدمی بچوں کے تعلق سے بات کر رہا
تھا تعلیم بالغان کی بات بھی آئی۔ فرمایا "جو کچھ آپ یہاں
کام کر رہے ہیں، مفید ہے اس سے پہلے آپ مجھ سے ملے
کیوں نہیں۔ بچوں سے اتنا گہرا تعلق ہے تو بچوں کے لیے
کچھ ضرور لکھیے۔ پیام تعلیم اسی مقصد کے لیے نکالا گیا ہے۔"

میں نے ہاں کر دی۔ اور سال کے سال پیام تعلیم
کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا اردو ادب میں ڈرامہ ویسے
بھی کم ہے۔ پھر بچوں کے ادب میں تو نہ ہونے کے برابر ہے،
میں نے اسی طرف توجہ دی، نئی کہانی جنگل جاگ رہا ہے،
جنگل کانپ اٹھا۔ بھوت اور کہانیوں میں "بین دن بھر
کیا کرتی رہی۔ چچا غالب کا پوتا وغیرہ چھپیں۔

سالنامے کی تیاری کا جب بھی موقعہ آیا بھائی محمد حسین
حسّان ندوی نے خط لکھ کر فرمائش کر دی کبھی کبھی ڈھیر سارے
کاموں میں میرے لیے لکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کی
بھابی یا بہن (ہماری شریک حیات) ہمارے پیچھے ہاتھ
دھو کے پڑ جاتیں اور انھیں قرار اس وقت آتا جب ہم
کوئی کہانی یا ڈرامہ یا مضمون ان کے ہاتھ میں تھما دیتے اکثر
نقل کر کے وہی بھجوا دیتی تھیں۔ خط و کتابت بھی اکثر انہی
بہن ہی سے تھی۔ یہ خوش تھیں کہ انھیں اتنا اچھا بھائی
جان مل گیا۔ ہم سے اکثر کہتیں کہ انھیں بھی ایک اچھا
سا بھائی جان اللہ میاں نے دے دیا ہے۔ اس کے
پیچھے ایک لطیفہ بھی ہے طلبا و طالبات یہاں تک کہ ان کے
والدین راقم کو بھائی جان ہی سے خطاب کرتے ہیں۔
ایک دن مذاق میں فرمایا "مشکل یہ ہے کہ میں آپ کو
بھائی جان نہیں کہہ سکتی" گویا اس طرح ان کی آرزو
پوری ہو گئی تھی۔

حسّان مرحوم حیدرآباد آئے لیکن میسور نہ آ سکے
ہم دونوں نے شکایت کی تو تحریر فرمایا کہ مزاج اچھے
نہیں تھے اور انھیں کسی نے بلایا بھی نہیں۔ اب کے ادھر
آنا ہوا تو میسور ضرور آئیں گے۔

فاروقیہ ٹریننگ کالج میسور کے لیے کتاب نما اور
کچھ نصابی کتابوں کی ضرورت پڑی تو محترمی وکی شاہجہانپوری

مدیر کتاب نما کو لکھا گیا۔ مدیر محترم نے فوراً جواب سے نوازا
اس میں بھائی حسان مرحوم کا آخری سلام ملا تھا۔

سچ ہے کہ دنیا میں کون رہا ہے۔ لیکن کچھ ہستیاں ایسی ہیں
جن کی موت ہمیں غیر متوقع معلوم ہوتی ہے اور یہ مرکز مر بھائی
ہیں، اور جب بھی ان کی یاد آتی ہے آنکھیں موتی رول ہی
دیتی ہیں۔ آج سیکڑوں بچوں کی آنکھیں نم ہیں۔

بچوں اور بچوں کے ادب کی طرف ہمارا دھیان بہت
کم جاتا ہے۔ مذہب و سیاست کے بعد شاید دولت ہی
کی طرف ہم دیکھتے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنا اتنا آسان بھی
نہیں جس طرح آسان اور سلیس زبان لکھنا مشکل ہے اسی
طرح بچوں کے لیے لکھنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے بہت
کم شاعر و ادیب اس طرف دھیان دیتے ہیں یا لکھنے کی
مشق بچوں کے رسالوں سے شروع کرتے ہیں اور مشاق
ہوکر بڑوں کے رسالوں کو اپنا لیتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہ
ہیں۔ ایک یہ بھی ہے کہ اپنے ہندوستان جنت نشاں میں
بچوں کے ادیب و شاعر کو وہ شہرت نہیں ملتی جو اسے ملنی
چاہیے ——— اور یہ آدمی بھی عجیب مخلوق ہے۔
ادیب و شاعر سے کب الگ رہے۔

ان حالات میں کسی بچوں کے رسالے کے اڈیٹر ہونا
عذاب سے کچھ کم نہیں۔ ایسے لوگ غازی ہیں، حسان مرحوم
نے اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ بچوں کے لیے ان کا من پسند
نظم و نثر کا رنگا رنگ دسترخوان چنتے رہے۔ اچھے
مضامین پڑھنے کا سلیقہ عطا کیا۔ وہ بچوں کے ساتھ انگلی
پکڑ کر کے آگے بڑھتے رہے اور اس قابل بنا دیا کہ انگلی
کے بغیر بھی وہ آگے بڑھ کر اپنی منزل پالیں۔ یہ غازی آخر
شہید ہوا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ان کی
قدر و منزلت ان کی شایانِ شان کر پائیں گے؟ ایک خصوصی
نمبر نکال کر بھول تو نہیں جائیں گے؟

پیام تعلیم کے پڑھنے والے بچے انھیں ضرور یاد
رکھیں گے۔ معصوم دماغ برائی کی طرح اچھائی بھی قبول
کر لیتے ہیں۔ انھیں یاد رکھنے کا ایک اچھا طریقہ یہ ہے
کہ یہ معصوم ان کی کتابیں اپنی اپنی لائبریری کے لیے زینت
بنائیں اور پیام تعلیم کو مرنے نہ دیں بلکہ اس کی عمر دراز کریں
ان کے صحیح جانشیں محترمی ولی شاہ جہاں پوری اور ان کی
صاحبزادی صفیہ حسان کا بھرپور ساتھ دیں، ہاتھ بٹائیں۔

---

### محمد حسین حسان صاحب کی یاد میں

# قطعات

بزمِ اطفال میں رونق نہ رہی تیرے بعد
وہ جو اک چیز ادب میں تھی گئی تیرے بعد
ہم پیامی تجھے مشکل سے بھلائیں کے حسین
تیری تحریر کی وہ مئو ہی مٹی تیرے بعد



جُوہی، چمپا، چاند ستارے
تیری کتابیں یا مہ پارے
جلے ایسے روشن روشن
ظلمت میں آکاش پہ تارے

مومن خاں شوق

جناب رشید الوحیدی

# حسین حسّان صاحب کی یاد

حسین حسان صاحب مرحوم سے میری ملاقات تو برسوں کے بعد جامعہ آکر ہوئی لیکن ان سے عقیدت و محبت بہت بچپن سے تھی جب میں نے اُردو پڑھنی شروع کی تھی۔ اور میرے والد مرحوم نے ہم سب بھائی بہنوں کے لیے پیام تعلیم جاری کروا دیا تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ رشتہ پختہ ہوتا رہا۔ ایک بار اب سے کوئی ۱۵۔۲۰ سال پہلے میں دہلی آیا تو جامعہ ملیہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اپنے ایک عزیز کے ساتھ یہاں آگیا، وہ مجھے ہر ہر چیز دکھاتے رہے اور آخر میں بعض بزرگوں سے ملنے کا نمبر آیا تو ایک ایسی جگہ لے گئے جہاں جامعہ کے دو مکان بالکل قریب قریب تھے انھوں نے کہا۔ اب آپ کو ان دونوں گھروں میں دو بہت بزرگ مگر دلچسپ شخصیتوں سے ملانا ہے۔ اور واقعی میں ان دونوں کا نام سن کر کھل اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا جامعہ کیا دہلی آنا سپھل ہوگیا۔ ان میں سے ایک تھے حسین صاحب اڈیٹر پیام تعلیم دوسرے بچوں کے ادب و شاعری کے بادشاہ شفیع الدین نیّر صاحب۔

سچ تو یہ ہے۔ ان دونوں کے محبت کی چھاپ بچپن ہی سے میرے دل پر جم چکی تھی حسین صاحب "بچوں سے باتیں" جس انداز میں لکھتے تھے اس سے تو اندازہ تھا کہ اپنی ہی عمر کا کوئی دوست نما اڈیٹر ہوگا۔ اس لیے ملنے سے پہلے ان کی عمر اور بزرگی کا کوئی خاص رعب نہ تھا مگر میں نے دیکھا کافی عمر کی دُبلی پتلی مگر ہر دم ہنسنے اور گھل مل جانے والی ایک ذات میرے سامنے ہے اور جب ان سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ صرف اپنی تحریروں ہی میں نہیں دلی طور پر وہ بچوں سے نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ ان کی قدر کرتے ہیں اور ان کے مستقبل کے لیے اچھی تحریر اچھا ادب پیش کرنے کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔

حسین صاحب نے اپنی کوششوں کا میدان ہی وہ اپنا لیا تھا جس میں نونہالوں کی تربیت کا سامان ہو۔ اس لیے جس قدر کتابیں آپ نے لکھیں ان سب میں یہ پہلو نمایاں رہا۔ مشکل سے مشکل موضوع کو آسان زبان و بیان میں پیش کر دینا ہی آپ کا پسندیدہ کام تھا۔ اب سے پہلے دنیا کی بڑی شخصیتوں پر آپ نے ایک کتاب لکھی جن کے بارے میں بڑی کتابیں تو ملتی ہیں۔ مگر سہل زبان میں ان کی زندگی پر کوئی کام نہ ہوا تھا۔ آپ نے "ناموران اسلام" کے نام سے ان سب کو بچوں سے متعارف کرایا اور ایسے ڈھنگ سے لکھ دیا کہ ان کے کارناموں پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی چچا غالبؔ کے نام سے اُردو کے مشہور شاعر مرزا غالب کے حالات لکھے تو وہ بھی اسی پیارے انداز میں۔

بچو! ہمارے تمہارے مرحوم دوست پیام تعلیم کے ایڈیٹر۔ بچوں کے بہت پرانے جانے پہچانے ساتھی محترم حسین حسان صاحب اب سے بہت سال پہلے ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی پیدائش بیلی بھیت میں ہوئی باپ ماں بچپن ہی میں خدا کو پیارے ہوگئے۔ ہمارے حسین صاحب عربی کے بھی عالم تھے اور ہندوستان کے مشہور ادارہ ندوہ کے فاضل تھے۔ حسین صاحب ۱۹۲۷ء میں جامعہ آگئے تھے۔ یعنی جامعہ قائم ہونے کے صرف سات آٹھ سال بعد اور یہاں آئے تو تھے پڑھنے پڑھانے مگر ملک کی غلامی اور اپنے بزرگوں کی قربانیوں سے ایسا متاثر ہوئے کہ اسی پر خار وادی کی طرف چل پڑے۔ پڑھائی تو چھوٹ گئی۔ جواہر لال نہرو۔ موتی لال نہرو۔ ذاکر صاحب۔ شفیق صاحب، عابد صاحب اور دوسرے بزرگوں، ملک کے سپاہیوں کے ساتھ سیاسی میدان میں اتر پڑے۔ ہمارے دبلے پتلے منحنی سے حسین صاحب نے کئی مہینے دہلی کی دریا گنج اور دوسری جیلوں کی ہوا کھائی ہے۔

اس سیاسی ہنگامے سے چھوٹے تو علمی وادبی خدمت کے لیے مکتبہ جامعہ آگئے اور یہاں پیام تعلیم کو ان کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ یہ پیام تعلیم تو آج ہمارا تمہارا بچوں کا دوست ہے شروع میں ایسا نہ تھا۔ یہ تو بڑوں کے لیے ۱۹۲۶ء میں جاری کیا گیا تھا۔ مکتبہ جامعہ سے یہ پرچہ اس لیے نکالا گیا تھا کہ جامعہ ملیہ کے کاموں سے اور یہاں کے تعلیمی معاملات سے لوگوں کو باخبر رکھا جائے مگر حسین صاحب کی بچوں سے محبت نے انہیں مجبور کیا کہ بڑوں کے لیے تو اور دوسرے رسالے ہیں۔ اسے نونہالوں کے لیے خاص کر دیا جائے۔ ان کے بزرگ اور ہندوستان کے مشہور عالموں میں سے حکیم اجمل خاں مرحوم، عبدالمجید خواجہ صاحب ذاکر صاحب اور عابد صاحب وغیرہ نے آپ کی اس رائے کو پسند کیا اور اس طرح حسین صاحب کی کوششوں سے آپ نے دیکھا کہ بچوں کو کیسا پیارا پرچہ مل گیا اور حسین صاحب نے اسے خوبصورت و دلچسپ بنانے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دی۔ اب تو وقت ایسا آگیا ہے کہ دنیا سے ہر چیز غائب ہو رہی ہے نہ کاغذ ملتا ہے نہ لکھائی چھپائی کا دوسرا سامان میسّر ہے۔ ذرا اب سے ۲۵ برس پہلے کا پیام تعلیم اٹھا کر دیکھیں تو طرح طرح کے نہایت دلچسپ، مفید معلوماتی مضامین کے ساتھ خوبصورت چکنے کاغذ پر بہت عمدہ عکسی تصویروں کا ایک گلدستہ نظر آتا ہے اور اس گلدستے کے ہر پھول ہر پنکھڑی میں حسین صاحب کی دن رات کی محنت اور ملک کے بچوں سے محبت صاف جھلکتی ہے۔ یہ انھیں کی ہمت تھی کہ اپنے پیارے پرچے کے لیے ملک کے بڑے بڑے لوگوں مثلاً ذاکر صاحب۔ عابد صاحب۔ مجیب صاحب۔ رشید احمد صدیقی وغیرہ سے مضامین لکھواتے تھے اور بچوں کے علاوہ بڑوں کے حلقے میں اسے پہونچاتے تھے۔ ہمارے محترم شفیع الدین نیّر کی سرپرستی اور ہمدردی پیام تعلیم کے لیے حسین صاحب نے شروع سے حاصل کر لی اور نیر صاحب جیسا پاک دل محبت کرنے والا ساتھی ان کے لیے ہمیشہ ہر کام کے لیے تیار رہتا تھا۔ آج بھی پیام تعلیم کو ان کی توجہ حاصل ہے خدا ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے پیارے بچو پیام تعلیم کو کبھی تو صدمہ ہوگا کہ ان سے محبت کرنے والا دن رات اس کی نگہداشت کرنے والا ہمدرد اسے چھوڑ گیا۔

حسین صاحب ہر وقت اپنے مقصد اور اپنے کام کو سنوارنے اور مکمل کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے ادھر

چند سالوں سے وہ مسلسل بیمار رہتے تھے دبلے پتلے تو خیر وہ تھے ہی ............ مگر بیماری نے کافی کمزور کر دیا تھا اس کے ساتھ ہی وہ اچھی عادتوں اور اپنے اصول کے اس قدر پابند تھے کہ بلا ناغہ صبح و شام جامعہ میں کسی طرف ٹہلنے نکل جاتے۔ جاتے ہوئے یا واپسی میں کبھی راستے میں مل گئے چند منٹ کے لیے ضرور کھڑے ہو جاتے یہ ان کا اخلاق، شرافت اور تعلق کی بات تھی کہ بغیر خیریت پوچھے ہوئے دو چار باتیں کیے ہوئے جانا پسند نہ کرتے تھے اور عام طور پر ایک ہی بات کرتے "ارے میاں رشید صاحب اب کے پیام تعلیم کے لیے کیا لکھ رہے ہو۔ دیکھو کوئی کہانی لکھو تو ذرا نصیحت آمیز اور سبق آموز ہونی چاہیے جو بچوں کو کچھ دے جائے۔"

اور حسین صاحب کی اس مربیانہ۔ ہمدردانہ۔ مخلصانہ حکم کا کچھ ایسا اثر پڑتا کہ واقعی اس دفعہ کے پرچے کے لیے میں ضرور کچھ لکھ دیتا تھا۔ پھر ان کا یہ معاملہ کسی خاص شخص کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ راستے میں جس قدر ملنے والے ملتے جائیں اپنے رسالے ہی کے لیے کچھ نہ کچھ مطالبہ کرتے تھے۔ بچو! بھلا اب تمھیں ایسا دوست اور تمھارے پیام تعلیم کو ایسا اڈیٹر کہاں ملے گا۔

بچو! حسین صاحب میں ایک بات بہت اچھی تھی کہ وہ اپنا کام چاہے جتنی دیر کریں محنت سے اور جی لگا کر کرتے تھے کام کو ٹالتے نہیں تھے اسی لیے نہ صرف ملک کے بچوں کو بلکہ ان کے ساتھیوں کو اور مکتبہ کے جس قدر بڑے بڑے منیجر آئے مثلاً حامد علی صاحب مرحوم تاباں صاحب، شاہد صاحب وغیرہ سب کو ان پر اعتماد تھا۔ حسین صاحب نہ صرف اپنے رسالے کے مضمون جمع کرتے بلکہ ان سب کو پوری توجہ سے پڑھتے جی لگا کر ایک ایک حرف میں اصلاح دیتے اور ان کی کوشش عام طور پر یہی ہوتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو بچے کا مضمون چھپ سکے اور اس کا دل نہ ٹوٹے۔ دوسری طرف یہ بھی خیال رہے کہ پرچے میں کوئی کمزور یا خراب مضمون نہ چھپ جائے اس لیے انھیں بہت محنت کرنی پڑتی تھی پھر پیام تعلیم کے علاوہ بڑوں کی اور بچوں کی کہانیوں کی کتابیں مکتبہ جامعہ سے چھپنے کے لیے آتی تھیں۔ اب یہ کام بھی حسین صاحب کا تھا کہ چاہے جی چاہے یا نہ چاہے، طبیعت ٹھیک ہو یا خراب ہو ایک ایک حرف پوری کتاب پڑھتے اس کی نوک پلک درست کر دیتے۔ اتنی مصروفیت کے باوجود بھی ہر وقت ان کا ذہن بچوں کی تعلیم اور ادب کے لیے سوچتا رہتا تھا اور جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے ان سب کے ساتھ ہی دوستوں سے محبت۔ چھوٹوں پر شفقت اور عام ملنے والوں سے اس قدر مروت طبیعت میں تھی کہ جہاں مل جاتے چاہے کتنا ہی تھکے ہوئے ہوں دو بات ضرور کرتے تھے۔

یوں تو حسین صاحب ساری زندگی لکھتے ہی پڑھتے رہے آپ نے بچوں کے لیے بڑی عجیب عجیب کتابیں لکھی ہیں اور کمال یہ کبھی آپ نے حضورؐ کی زندگی پر قلم اٹھایا تو "سرکار دو عالم" کے نام سے ایک پیاری سی کتاب لکھ دی جو میسور کی ریاست میں بچوں کو کورس میں پڑھائی جاتی تھی پھر سیرت سے تاریخ کی طرف آئے تو اس میں بھی عجیب رنگ اپنایا یعنی دنیا کی تاریخ میں سے آپ نے بچے کو سامنے رکھا اور ایک انوکھی کتاب "دنیا کے بچے" لکھ دی۔ پھر اور اونچے اٹھے بہت اونچے۔ بڑی بڑی علمی کتابوں میں گھس گئے مگر جب ایک کتاب کے کہ ہمارے سامنے آئے تو وہ بھی اپنے ملک کے نونہالوں کے لیے یعنی "نامورانِ اسلام" ذکر تم نے پیچھے پڑھا ہے۔

اور جب حسین صاحب نے آجکل کے مزاج، ذہن اور ڈھنگ کو اپنا کر سائنس کے موضوع کی طرف توجہ کی اس وقت بھی بچوں کی محبت سے دامن نہ چھڑا سکے چناں چہ بچوں ہی کے لیے اپنی اس دھرتی کا حال لکھ دیا زمین کی تاریخ عمر اور دوسری معلومات سے بھرپور ایک اچھی سی کتاب "ہماری زمین" ان کو دیدی اور اس کے علاوہ بے شمار خزانے بچوں کے لیے چھوڑے ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔

"الزام کس پر"، آستین کا سانپ، "برف کا گھر"، "پرند"، "دیمک کتنی ذہین"، وغیرہ وغیرہ۔

اب تو بچوں کو ان کتابوں کے بارے میں حسین صاحب مرحوم کے پیارے دوست اور پیام تعلیم کے ایک اور پرانے ہمدرد ولی شاہجہاں پوری صاحب ہی بتا سکیں گے کہ ان میں سے کون کون سی مل سکیں گی۔ ولی صاحب پیام تعلیم کو دوبارہ زندہ کرنے کے سلسلے میں سب سے آگے ہیں یعنی ۶۳ و ۶۴ء میں غلام ربانی تاباں اور ان کے مشورے پر یہ پرچہ تیسری بار شروع ہوا۔ ورنہ ۴۷ء کے ہنگامے کے بعد یہ بند ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے دور کے اڈیٹر اطہر پرویز صاحب تھے جو ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہیں یہ دور ۴۹ء ۵۰ء تک کا تھا۔ اس کے بعد بھی حسین صاحب اس سے غافل نہیں رہے اسے نکالنے کی کوشش میں رہے پھر جب یہ تیسری بار شروع ہوا تو پھر حسین صاحب نے اپنی خدمت اس کے لیے وقف کر دی اور آج تک اس میں لگے رہے۔ آخر اپنے بچوں کی، نونہالوں کی اس علمی وادبی خدمت میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

بچوں کی زبان و بیان پر حسین صاحب کو بڑا ملکہ پیدا ہو گیا تھا۔ اچھی سے اچھی کتاب پر آپ اصلاح دے کر اندازہ ہوتا کہ واقعی اصلاح سے پہلے اس میں بڑی خامی تھی۔ بہت شریف بڑی محبت اور ہمدردی کرنے والے اپنا کام عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔

خدا مرحوم کی روح کو سکون دے اور ان کے محبوب پرچے کو زندہ و تابندہ رکھے۔ ★★

# سیر پبلشرز کی کتابوں کی نئی قیمتیں

یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء

| کتاب | قیمت |
|---|---|
| بادشاہ کا خواب | ۵۰ پیسے |
| ہاتھی کی فوج | ۵۰ " |
| یاجوج ماجوج | ۵۰ " |
| جادوگر فرشتے | ۵۰ " |
| خاک کا پتلا | ۵۰ " |
| بیٹے کی قربانی | ۵۰ " |
| سبا کی شہزادی | ۵۰ " |
| صبر کا پھل | ۵۰ " |
| چیپ کا روزہ | " |
| نئی کا بیٹا | ۵۰ " |
| خدا کا اونٹنی | ۵۰ " |
| کوّے کی قبر | ۵۰ " |
| آگ کا چمن | ۵۰ " |
| طالوت جالوت | ۵۰ " |
| مچھاں والے نہیں | ۵۰ " |
| سوتے جاگتے کی کہانی | ۵۰ " |
| مرا نام کیا ہے | ۵۰ " |
| جیت کا پھل | ۵۰ " |
| آخری نبی | ۱/۲۰ |
| پیغمبروں کی کہانیاں | ۴/۷۵ |

جناب ظہیر نیازی

# محمد حسین حسّان ندوی

حسین حسان صاحب کو مرحوم کہتے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔
میں نے ان کی تصویر جب تک نہ دیکھی تھی، تب تک انھیں خاصا جوان سمجھتا تھا، اتنی بات تو جانتا تھا کہ وہ ایک عمر رسیدہ شخص ہیں۔ پر اُن کی صحت اتنی بھی خراب ہو گی اس کا گمان نہ تھا۔ ان کا قلم جوان تھا، تو خود انھیں بھی میں جوان ہی تصور کرتا تھا، پر تصویر جب پہلی بار "سب ساتھ" کے ذریعہ میری نظر سے گذری تب کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی!

جن لوگوں سے برسوں کے تعلقات ہوتے ہیں، ان کے بارے میں رائے اپنی جگہ اہم ضرور ہے، پر وہ رائے

. . . . . . .

رائے بھی کم اہم نہیں جو قلیل عرصے کے تعلقات یا مراسم کے بعد بھی دی جائے۔ حسّان ندوی صاحب کو میں مضامین اتنی تعداد میں نہ بھیج سکا جتنی کہ میری خواہش تھی، میرے حالات نے ساتھ نہ دیا ورنہ میں "پیامِ تعلیم" کے لیے مستقلاً لکھتا۔ ایک آدھ مضمون ہی انھیں بھیجا تھا اور ندوی صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، وہ خطوط جو بے پایاں خلوص سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ندوی صاحب کے پر خلوص خطوط میں رازق الخیری صاحب ("مدیر بنات") اور "عصمت" کراچی) کا سا انداز پایا تھا۔ میرے احباب میں شامل کچھ لوگ مستقلاً "پیامِ تعلیم" میں لکھتے تھے، جیسے جناب مناظر عاشق ہرگانوی، ناوک حمزہ پوری! اپنی خواہش کے باوجود اس صحت مند پرچے میں لکھنے نہیں پا رہا تھا، تاہم ندوی صاحب سے خط و کتابت ہی ضروری نہیں کہ اس کے پرچے لکھا یا چھپا بھی جائے!

بہر حال میں "پیامِ تعلیم" میں بھلے برائے نام ہی چھپا، پر ندوی صاحب نے پیامِ تعلیم میں جو کچھ بھی چھاپا وہ ایسا چھاپا جس پر بچوں کا ادب ناز کر سکے! ہند و پاک کے بچوں کے بے شمار پرچے میری نظر سے گذرے پر "پیامِ تعلیم" کی ادا سب سے انوکھی نظر آئی! تڑک بھڑک سے پرے، سادگی و پرکاری ہی ایسی تھی اس کی جسے دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوتا تھا، بڑی خوشی ہوتی تھی، کاش یہ خوشی اب ولی صاحب کے دور میں بھی قائم رہ سکے!

حسین حسان ندوی صاحب کے بارے میں لکھنے کی کافی گنجائش تھی، ایک طویل اور مکمل مضمون، پر کاغذ کے قحط کے زمانے میں یہ ممکن کہاں! ★★

---

● ہر نیکی اور خوبی اپنانے کے قابل ہے، چاہے وہ تمہارے دشمن میں ہو۔ (ماتا ریحانہ)

● عقل دل کے قابو میں ہے اور دل خواہشوں کے بس میں۔ یا نہ خدا کیسے ہو جبکہ ایسے ایسے فساد برپا ہیں۔ (ہندی ادب)
(بشیر الدین بشیر کوٹی)

ب ایوب واقف ایم اے ۔بی ۔ایڈ

# عندلیباں را چہ پیش آید، ہزاراں را چہ شد

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بے تابے

میرے اللہ اردو زبان اور اردو والوں پر مصائب
سلسلہ کہاں ختم ہوگا؟ جن بزرگ اور دانا و توانا شخصیتوں
زیرِ سایہ اُردو مزید ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی ایک
کرکے وہ ناپید عدم ہو رہے ہیں۔ گزشتہ دو تین برسوں
اردو زبان و ادب کے کئی عظیم المرتبت فنکار ہم سے
مڑ گئے ان کے زخم ابھی تازہ ہی تھے کہ مولانا محمد حسین
بان ندوی صاحب اڈیٹر "پیامِ تعلیم" بھی ہم سب
داغِ مفارقت دے گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْنَ ط

مولانا مرحوم اپنی ذات میں ایک علامت اور
ب منارِ نور تھے اور ان کا ہر نقشِ قدم ہماری گزشتہ
وار فع تہذیب کی چمک سے گراں بار تھا۔ ان کے
ہ زبانِ اُردو کی خدمت کا ایک اعلیٰ ترین نصب العین
ھا اور اس کی تکمیل کے لیے خالقِ مطلق نے انھیں
پناہ قوت اور لگن سے بھی نوازا تھا۔ زبان و ادب
خدمات کے سلسلے میں ان کے اجتماعی احسانات ہم
جوانانِ ادب کے لیے نصیحت آموز باب ہیں۔ ان کی
ندگی صحیح معنوں میں ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس
صفحات پر ان کی وسیع ہمدردی، شیرینی و ملائمت،
شاری و انکساری، شریف النفسی، وضع داری اور

قول و کردار کی روشنی آسمان کے تاروں کی طرح جگمگا رہی
تھی۔ ان سے جو ملا ہوگا اسے یقیناً یہ احساس ہوگا کہ
کہ مولانا مرحوم صحیح معنوں میں شہد سے زیادہ میٹھے اور
برگِ گلاب سے زیادہ نرم تھے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مولانا نے قوم کے بچّوں کی ذہنی تربیت میں جو گہری
دلچسپی دکھائی اس کی مثال تلاش کرنے سے بھی نہیں مل
سکتی۔ عرصہ دراز سے وہ پیامِ تعلیم کے ذریعہ اپنے اس
عظیم مشن کی ترویج و اشاعت کا کام انجام دے رہے
تھے اور اسی نیک کام کے فرائض کی ادائیگی ہی میں وہ
جان بحق ہوئے تھے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

وہ خود بھی بچوں کے لیے گراں قدر مضامین
اور چھوٹی چھوٹی کتابیں تحریر کرتے رہے اور ساتھ
ہی ساتھ بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تربیت بھی فرماتے
رہے۔ پیامِ تعلیم کی ادارت کے زمانے میں انھوں نے ایک
دو نہیں بلکہ درجنوں ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی و قلمی
پرورش کی جو اب بچوں کے لیے مستقل پیامِ تعلیم اور دوسر
رسالوں میں لکھ رہے ہیں۔ مولانا مرحوم کا یہ کوئی معمولی
کام نہیں یہ تو ہماری سماجی و تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم
کارنامہ ہے جو مولانا کی شخصیت کو ہمیشہ زندہ
و پائندہ رکھے گا۔

بچوں کے ادیب کی حیثیت سے میں مولانا مرحوم کو اس وقت سے پڑھ رہا ہوں جب میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اور اب جب کہ کالج اور یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکا ہوں اب بھی ان کی کتابوں اور مقالوں کے مطالعہ کا سلسلہ جاری ہے۔ میرے گھر میں صرف میں ہی نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے بچے بچیاں اور عورتیں بھی ان کی اخلاق سے بھری ہوئی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔

"سرکارِ دو عالمؐ" جو موصوف کی "سیرت پاک" پر مشہور و معروف کتاب ہے میرے گھر کی محبوب ترین کتاب ہے یہ چھوٹی سی کتاب انھوں نے محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر بڑی سادہ اور پرکار زبان میں تحریر کی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر بچے بہ حسن و خوبی انسانیت کے سب سے بڑے محسن یعنی رسولِ عربیؐ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور ایک مومن کے گھر میں چھوٹے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے دلوں میں رسول پاک سے جو لگاؤ ہونا چاہیے وہ اس کتاب کے پڑھنے سے بہ ہمہ وجوہ پیدا ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے بچوں کے لیے سیرت پاکؐ پر اتنی آسان اور عام فہم کتاب دوسرے لوگوں نے بہت کم لکھی ہیں۔ جزاک اللہ۔

مولانا کی دیگر چھوٹی چھوٹی تصنیفات میں "دنیا کے بچے"، "چینی کی گڑیا" اور "بہادر سیاح"، وغیرہ تو ایسی دلکش اور دلآویز زبان میں تحریر کی گئی ہیں کہ بچے انھیں ایک بار پڑھ کر بار بار پڑھنا چاہیں گے۔ بچوں کے ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی کامیابی کا یہ ایک بڑا ثبوت ہے۔ سادگی اور صفائی کے علاوہ ان کتابوں میں اخلاق کی درستگی کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا ہے جس سے ان کتابوں کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ حسان مرحوم نے بچوں کے لیے بعض خالص ادبی کتابیں بھی لکھی ہیں ان میں دو کافی اہم ہیں۔ ایک کا نام ہے "چچا غالب" اور دوسری کا نام ہے "میر انیس"۔ "چچا غالب" ان کی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ لیکن ان مضامین کو پڑھ کر بچے "غالب کون تھا؟" کا جواب خوبصورتی کے ساتھ پا سکتے ہیں۔ "میر انیس" ان کی مستقل کتاب ہے۔ میر انیس نے چچا غالب کی طرح بچوں کے لیے نہ تو بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور نہ ہی کوئی نثر کی کتاب لکھی ہے۔ وہ بنیاداً بڑوں کے شاعر ہیں۔ ایسی صورت میں میر انیس کو بچوں کے سامنے اس طرح پیش کرنا کہ وہ انھیں کے فنکار لگیں ایک بڑا ہی مشکل کام ہے لیکن مسرت کا مقام ہے کہ مولانا مرحوم نے اس مشکل کام کو انجام دے کر اپنی فنکارانہ عظمت کا اعتراف کروا لیا ہے۔

گذشتہ سال گرمی کی تعطیلات میں جب میں دہلی گیا ہوا تھا تو علم و ادب کے مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کچھ بزرگوں مثلاً پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب اور مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب وغیرہ کے علاوہ علم و ادب کے اس سدا بہار عاشق کی خدمت میں بھی حاضری دی تھی۔ کیا پتہ تھا کہ میری مولانا محترم سے یہ آخری ملاقات ہوگی۔ بہر حال میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ ان کی زیارت سے میری آنکھیں روشن ہوئیں۔ جہاں تک ان سے میری خط و کتابت کا تعلق ہے تو یہ سلسلہ کبھی جاری رہا اور کبھی بند۔ میں کبھی کبھار پیامِ تعلیم کے لیے کوئی نظم بھیجتا تو ان سے گزارش کرتا کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند سے مجھے مطلع

کریں اور مولانا (خدا انھیں کروٹ کروٹ چین نصیب
کرے) فوراً خط لکھ دیتے۔ اپنے خطوط میں وہ مجھے ضروری
ہدایات فرماتے رہتے تھے۔

گزشتہ سال جب پروفیسر مجیب صاحب جامعہ
کی وائس چانسلری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے
تو مولانا حسان صاحب نے انھیں خراج عقیدت پیش
کرنے کے لیے پیام تعلیم کا "مجیب نمبر" شائع کرنے کا
منصوبہ تیار کیا اور پرستارانِ مجیب کے لیے پیام تعلیم
میں اس کا اشتہار بھی شایع کر دیا۔ میں چونکہ ابتدا ہی سے
مجیب صاحب کا عقیدتمند ہوں ان کی انگریزی اور
اردو کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں اس لیے
ان کی شخصیت کا واضح خاکہ میرے ذہن میں محفوظ ہے
اس بنا پر میں نے حسان مرحوم کو خط لکھا کہ اگر وہ اجازت
دیں تو خاکسار بھی اپنے خیالات کو قلمبند کرے۔ میری اس
گزارش پر انھوں نے فوراً مجھے خط لکھا اور اس ضمن
میں ضروری ہدایات بھی خط میں لکھ دیں۔ ان کا غالباً
میرے نام یہ آخری خط ہے اس لیے تبرکاً اسے یہاں
پیش کرتا ہوں تاکہ لوگ یہ دیکھیں کہ مرحوم نوجوانوں
کی کس گرمجوشی سے حوصلہ افزائی کرتے تھے خط یہ ہے۔

عزیزی! وعلیکم السلام

محترم شاہد صاحب کی معرفت نوازش
نامہ موصول ہوا۔ جی ہاں میں نے اعلان کرنے
کو تو کر دیا۔ مگر کاغذ کی نایابی بلکہ کم یابی نے
پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ بہر حال اب ارادہ
کر لیا ہے تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ
پورا ہوگا۔ آپ نے محترم مجیب صاحب
پر لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے تو ضرور لکھیے۔ مگر
یہ بات ذہن میں رکھیے کہ پیام تعلیم بچوں کا
رسالہ ہے اس کے لیے مضمون ایسا ہونا
چاہیے جو بچوں کے معیار فہم کے مطابق ہو
میں نے بیگم مجیب صاحبہ (آصفہ مجیب) سے
درخواست کی تھی وہ کچھ متامل تھیں میں نے
اصرار کیا ہے کہ ان کی گھریلو باتوں پر ہی لکھیں
اور وہ خوشی راضی ہوگئیں ہیں غرض آپ ان
کی اونچی علمی باتوں پر لکھیں گے تو بچے کچھ
نہ سمجھیں گے اور لکھنے کا مقصد پورا نہ ہوگا
مجھے امید ہے کہ مضمون لکھتے وقت آپ ان
باتوں کو پیش نظر رکھیں گے۔

محترم شاہد کی طرف سے آپ کو سلام شوق

والسلام

محمد حسین حسان ایڈیٹر پیام تعلیم

مرحوم کی ان ہدایات کو سامنے رکھ کر میں نے محترم
مجیب صاحب "پر بچوں کے ساتھی" کے عنوان سے مضمون
لکھ لیا۔ اور پھر منتظر ہوا کہ "خصوصی نمبر" شایع ہونے کی تاریخ
طے پا جائے تو مضمون ارسال کروں مگر افسوس کہ کاغذ کی
قلت سے ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔ مجھے امید ہے
کہ ان کے ادارتی جانشین جناب ولی شاہجہاں پوری صاحب
اور مکتبہ جامعہ کے ہر دل عزیز جنرل منیجر شاہد صاحب
قبلہ ان کی اس دیرینہ خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں
گے۔ اس سے زیادہ مرحوم کے بارے میں کیا کہوں
ان کی زندگی اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالنے کے لیے
تو ایک دفتر درکار ہے۔ مگر یہاں محدود صفحات میں
اس کی گنجائش کہاں۔ مگر آپ اتنا جان لیں کہ انھوں
نے ننی پودوں اور اردو زبان و ادب کی جو خاموش خدمت

باقی عشہ پر

جناب جمیل احمد قریشی

# ایک مشفق بزرگ

میں حسین حسّان صاحب کو پیام تعلیم اور ان کی تصانیف کے ذریعہ جانتا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں جب جامعہ آیا تو محفلوں میں ان کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ ملاقات ہوئی تو دل بہت خوش ہوا۔ گفتگو کے دوران مرحوم میں ایک بزرگ کی شفقت دکھائی دی، خندہ پیشانی، درمیانہ قد چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ، جی چاہا کہ ان سے بار بار ملا جائے۔

ان سے جب بھی ملاقات ہوتی بڑے خلوص سے ملتے۔ خیریت معلوم کرتے۔ پیام تعلیم کے لیے تعاون کرنے کو کہتے، اس رسالہ کے فروغ کے لیے فکر کا اظہار کرتے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ جوبلی کا پروگرام جب طے ہوگیا، توان کو فکر ہوئی 'پیام تعلیم' کا جوبلی نمبر نکالنے کی، خواہش کا اظہار کرنا شروع کیا۔ مجھ سے بھی کہا کہ کچھ لکھیے، میں نے کہا آپ ہی بتائیں کیا لکھوں؟ کہا جامعہ کی لائبریری پر ایک مضمون دیجیے۔ ان کی ہمّت افزائی اور خلوص نے مجبور کیا اور میں نے ایک مضمون دیا، جو ان کو بہت پسند آیا اور 'جوبلی نمبر' میں شامل کیا۔ یہ 'پیام تعلیم' میں میرا پہلا مضمون تھا۔ اس کے بعد وہ برابر لکھتے رہنے کے لیے کہتے رہتے۔ میرا دوسرا مضمون کتب خانے کی کہانی ان ہی کی سرپرستی میں شایع ہوا۔ مضمون دیکھ کر بہت پسندیدگی کا اظہار فرماتے اور کچھ نصیحتیں اور مشورے دیتے تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد مجھے محترم شاہد علی خاں صاحب، منیجر مکتبہ جامعہ کا ایک پرچہ ملا۔

حکومت مہاراشٹر نے پیام تعلیم سے میرا مضمون انتخاب کرکے نصابی کتاب میں شامل کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ جب میں نے حسین حسّان صاحب مرحوم سے اس کا ذکر کیا تو بہت خوش ہوئے، کہا ہم کیا بتائیں۔ ہمارے حالات ایسے نہیں کہ اپنے لکھنے والوں کی ہمّت افزائی کرسکیں۔ لیکن ہم خوش ہوتے ہیں جب اس طرح مختلف جگہوں پر "پیام تعلیم" سے مضامین کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہمارے لکھنے والوں کے مضامین برابر نصابی کتابوں اور جریدوں میں نقل ہوتے رہتے ہیں۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میرا کوئی قریبی عزیز جامعہ میں موجود ہے۔ ویسے تو جامعہ کا ماحول ایک خاندان ہونے کے لیے اس وقت مشہور تھا۔ ہر باہر سے آنے والے کو ایسا لگتا تھا کہ وہ یہاں اجنبی نہیں ہے۔ حسین حسّان صاحب مرحوم اکثر اتوار کی صبح غریب خانہ پر آجایا کرتے تھے۔ کہتے کبھی یوں ہی ٹہلتا ہوا آگیا۔ چلتے وقت بڑے اچھے انداز سے مضمون لکھنے کا تقاضا کرتے ساتھ ہی کوئی ہدایت بھی فرمادیا کرتے تھے۔ میرے گھر والے ان سے کافی مانوس ہوگئے تھے۔

چھوٹی بچی دادا دادا کہہ کر ان سے چمٹ جاتی۔ ان کا اوپر سے ٹوٹا ہوا بیت ہاتھ سے لے کر گھوڑا بنا لیتی۔ موصوف بہت خوش ہوتے اور پیار کرتے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ مضمون لکھ کر چھ سال سے دس بارہ سال کے بچوں کو جمع کر کے سنایا کیجیے اور پھر دیکھا کیجیے کہ ان کو کس حد تک دلچسپی ہوتی ہے۔ کہاں غور سے سنتے ہیں۔ کیا پسند کرتے اور کیا پسند نہیں کرتے ہیں وغیرہ۔

حسین حسان صاحب اور 'پیام تعلیم' کوئی دو علیحدہ چیزیں نہ تھیں۔ ان کا نام لیجیے تو 'پیام تعلیم' ساتھ آتا تھا۔ پیام تعلیم کہیے تو ان کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی تھی۔ اس رسالہ کی اشاعت اور معیار کی طرف سے بہت فکر مند رہتے تھے۔ کہتے کہ بڑوں کے لیے لکھنے والے بہت ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنے والے بہت کم ہیں۔ ہمارے ملک میں خصوصی طور پر اردو زبان میں بچوں کے لیے لکھنے والوں کی کمی اشد ضرورت ہے۔ اگر کوئی 'پیام تعلیم' کا خریدار بنتا یا کسی کو بناتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔ کبھی میں نے اگر کسی اسکول کے لیے اپنی جانب سے 'پیام تعلیم' جاری کرایا تو کہتے تھے، بھئی ولی صاحب سے معلوم کر کے کچھ رعایت کرا دوں گا۔ ہر شخص کا بڑا احترام کرتے۔ اپنے ساتھیوں کا ذکر بڑے ادب سے کرتے، کبھی کسی کی برائی کرتے نہیں سنا، دوستوں اور احباب کی اچھی باتوں کا تذکرہ اکثر کرتے سنا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو دلی لگاؤ تھا۔ جامعہ کے معاملات پر کم بولتے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ چاہتے تھے۔ جامعہ بڑھے، پھلے اور پھولے۔ رہتے تھے کہ اس کو جو ہونا چاہیے وہ نہیں ہو رہا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کے تقرر کے

بعد ایک بار گفتگو ہوئی تو بڑی امیدوں کے ساتھ خوشی کا اظہار فرمایا۔ کہنے لگے بھئی کچھ جامعہ کی درستی اور ترقی ہونی چاہیے۔

معاملات کچھ صاف نہیں معلوم ہوتے۔ ترقی کی رفتار دھیمی ہے۔ میں دریافت کرتا ہوں آپ تو مسعود حسین خاں صاحب سے واقف ہوں گے۔ آپ کی رائے میں کیسے رہیں گے جامعہ کے لیے۔ جواب دیتے بھئی مسعود صاحب شریف اور سیدھے آدمی ہیں۔ لیکن ہاں ہیں پٹھان۔ اور آپ نے کہاوت سنی ہوگی " پٹھان کا پوت گھڑی میں ولی گھڑی میں بھوت"، اور مسکرا دیتے۔

ان کی بیماری کے دوران جب میں عیادت کو جاتا بغیر چائے پلائے نہ آنے دیتے۔ مضمون کا تقاضہ ضرور کرتے، میں اپنے ہالینڈ کے تعلیمی سفر سے واپس آیا تو وہاں سے متعلق مضامین لکھنے کو کہتے رہے۔ ان ہی کی ہمت افزائی کی وجہ سے پانچ چھ مضمون ہالینڈ سے متعلق بھی پیام تعلیم میں شائع ہوئے۔ ایک بار میں علی گڑھ رخصت پر چلے جانے کی وجہ سے بہت دن بعد موصوف سے ملنے گیا۔ آپ کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ بڑے اچھے انداز سے مسکراتے ہوئے شکایت کی " آپ کو بڑے دن بعد میرا خیال آیا"

میں آخری بار جب ان سے ملا تو اپنے صحن میں امرود کے پیڑ کے قریب چارپائی پر لیٹے تھے۔ ابو (حسین صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ اٹھ کر بیٹھنے لگے میں نے مصافحہ کر کے لیٹے رہنے کے لیے اصرار کیا۔ گفتگو کے دوران ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کو صرف بچوں کے ادب اور معاملات ہی سے دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ عالمی سیاست اور

# میرے محترم بزرگ

جناب خلیق انجم اشرفی

پیامی بھائیو اور بہنو! آیئے۔ آپ کے پیارے رسالے
پیام تعلیم کے اڈیٹر محمد حسین حسان صاحب کے بارے میں
کچھ باتیں آپ لوگوں کو بتاؤں۔ آپ کو یقیناً ان کے انتقال
کا غم ہوگا۔ یہ سوچ کر کہ اب کون ہر مہینے آپ سے میٹھی میٹھی
باتیں کرے گا، کون ایسا پیارا، ایسا دل کش پیام تعلیم
ترتیب دے کر آپ کو پیش کرے گا۔ لیکن آپ شاید
اتنا ہی کچھ جانتے ہیں ان کے بارے میں۔ میں آج آپ کو
اُن کے بارے میں کچھ اور باتیں بتاؤں گا، ان کی کچھ اور
خوبیاں گناؤں گا جنھیں جان کر آپ کا غم اور بڑھ جائے
گا۔ دکھ اور گہرا ہو جائے گا کہ افسوس ایسی خوبیوں کے
بزرگ ہم سے بچھڑ گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ
کو ایک سبق بھی حاصل ہوگا۔ بڑا اچھا سبق! اچھے لوگ
دنیا میں کس طرح رہتے ہیں اور ان میں ایسی کیا کیا خوبیاں ہوتی
ہیں جن کی وجہ سے وہ اچھے کہلاتے ہیں۔

حسین حسان صاحب سے میری پہلی ملاقات آج سے
نو سال پہلے نومبر ۱۹۶۵ء میں جامعہ کے میلے کے موقع پر
ہوئی۔ پیام تعلیم کو نئے سرے سے جاری ہوئے سال بھر
سے زیادہ ہو گیا تھا اور تقریباً اتنا ہی عرصہ مجھے اس میں
مضامین اور کہانیاں لکھتے ہو گیا تھا۔ میری عمر اس وقت
یہی کوئی سولہ سال کی رہی ہوگی۔ میں اس وقت دسویں
درجے میں پڑھتا تھا۔ جامعہ ملیہ کی طرف سے ہونے والے
مضمون نگاری کے سالانہ مقابلے میں میں اپنے اسکول (اینگلو
عربک) کی طرف سے شریک ہوا تھا اور پہلا انعام حاصل
کیا تھا۔ انعامات کی تقسیم میلے کے موقع پر ہوئی تھی۔ میں
انعام لینے اوکھلے پہنچا تھا۔ انعام سے زیادہ مجھے حسین
حسان صاحب سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نہ ان کو
پہچانتا تھا۔ نہ گھر اور دفتر کا پتہ جانتا تھا۔ جو صاحب
میرے ساتھ تھے ان سے البتہ کہہ دیا تھا کہ میں حسان
صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں باتیں کرتے
ہوئے میلے میں گھوم رہے تھے کہ اچانک ان صاحب نے
زور سے کہا "دیکھیے وہ رہے حسین حسان صاحب"
میری تو جانیے عید ہو گئی۔ تیزی سے مڑا، دیکھا ایک
دبلے پتلے چھوٹے قد کے بزرگ شیروانی پہنے ہاتھ میں
چھڑی لیے آہستہ آہستہ چلے جا رہے ہیں۔ لپک کر
راستہ روکا اور سلام کر کے اپنا تعارف کرایا۔

بہت خوش ہوئے۔ جب انعام کے بارے میں
بتایا تو فوراً بولے "لیکن مضمون پر تو آپ کا نام کچھ
اور تھا" اس جملے سے جہاں یہ اندازہ ہوا کہ مضامین
انھوں نے ہی دیکھے تھے وہاں ان کی اچھی یادداشت
کا بھی پتہ چل گیا۔ میں نے یہ بتایا کہ مضمون پر تو میرا اصل
نام تھا۔ خلیق انجم اشرفی تو قلمی نام ہے۔ چند باتیں پیام
تعلیم کے بارے میں ہوئیں اور اس کے بعد وہ مبارک
باد اور دوبارہ ملنے کی دعوت دیتے ہوئے رخصت
ہوئے۔

تاثر برسوں میرے ذہن پر رہا۔ آپ خود سوچیے ایک اتنے
مشہور رسالے کا اڈیٹر اور ایک معمولی سے طالب علم سے کس
سادگی، کس محبت سے ملا۔ اس کے بعد ان سے آدھی ملاقات
کا سلسلہ تو جاری رہا لیکن پوری ملاقات کی نوبت ایک
عرصے تک نہیں آئی۔ غالباً ۷۰ء کے آخر یا ۷۱ء کے
شروع میں دفتر ایک مضمون لے کر گیا۔ بہت خوش ہوئے۔
وہیں پہلی بار ولی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی وہ بھی بڑے
تپاک سے ملے۔ ان بزرگوں سے مل کر اتنی خوشی ہوئی کہ کچھ
نہ پوچھیے پھر تو سلسلہ بندھ گیا۔ مہینے کے دوسرے سنیچر کو
میری چھٹی ہوتی تھی اور پیام تعلیم کا دفتر کھلا رہتا تھا اس
لیے میں نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ تقریباً ہر مہینے اس دن دفتر
میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

بار بار کی ان ملاقاتوں سے جہاں اس بات کا صحیح اندازہ
ہوا کہ وہ آپ کے محبوب رسالے کو ترتیب دینے میں کیا کچھ محنت
کرتے ہیں۔ وہاں ان کی نئی نئی خوبیوں کا بھی پتہ چلا۔ مجھے دیکھتے
ہی بیٹھے ہوتے تو کھڑے ہو جاتے جب تک میں نہ بیٹھ جاتا
خود بھی نہ بیٹھتے۔ مجھے ان کے اس سلوک سے بڑی شرمندگی
بھی ہوتی۔ لیکن ان کے خلوص کا پتہ بھی چلتا۔ ولی صاحب
مجھے دیکھتے ہی کسی کو چائے کے لیے اشارہ کر دیتے۔ وہ مجھ
سے باتوں میں مصروف ہوتے اور چند منٹ بعد فرماتے "بھئی
ولی صاحب، خلیق انجم صاحب آئے ہیں۔ ان کو چائے نہیں
پلوائیں گے،" ولی صاحب رجسٹر سے سر اٹھا کر فرماتے
"جی چائے آرہی ہے" میں اس عرصے میں پیام تعلیم
کے لیے آئے مضامین۔ کہانیاں، نظمیں اور خطوط اٹھا کر
پڑھنا شروع کر دیتا۔ چائے کی پیالی آئی تو اصرار کر کے
ہاتھ مجھے دیتے اور پھر بار بار کہتے "بھئی پہلے چائے پی لیجیے

...ہے تھی۔

پیام تعلیم کے لیے آئے ہوئے ایک ایک مضمون،
کہانی اور نظم کو چاہے وہ کسی پیامی کا کارنامہ ہو
یا کسی بہت بڑے ادیب اور شاعر کی تخلیق، وہ بڑے
دھیان سے پڑھتے۔ خاص طور سے اس کی زبان دیکھتے
کہ کہیں اتنی مشکل تو نہیں کہ آپ لوگوں کی سمجھ ہی میں نہ
آئے۔ لال پنسل یا قلم ہاتھ میں ہوتا اور بے تکان
چلتا رہتا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ کئی بہت مشہور
ادیبوں کی کہانیاں اور مضامین انھوں نے اس طرح
کانٹ چھانٹ دیں کہ مضمون اور کہانی کا خیال تو اس ادیب
کا رہا باقی ان کا بن گیا۔ زبان کے معاملے میں وہ ذرا بھی
مروت نہ برتتے اور کسی کی بھی رورعایت نہ کرتے۔ شاعری
کے معاملہ میں ان کا بس نہیں چلتا تھا۔ پیام تعلیم کے لیے
آئی نظمیں کبھی وہ اختر صاحب، کبھی شفیع الدین نیر صاحب
اور کبھی کسی اور کو دکھلاتے لیکن یہ دکھاتا اس نظم کے
بحر اور وزن کے بارے میں ہوتا ان کا انتخاب وہ
خود ہی کرتے اور اس سلسلے میں بھی بنیادی چیز ان کے
نزدیک زبان ہی تھی۔ اتنی احتیاط کے باوجود بعض
دفعہ مصرعے بے وزن رہ جاتے یا اور کوئی کمی رہ جاتی
میں اپنے خلوص میں اس کی طرف اشارہ کرتا۔ ایک بار نیر
صاحب کی ایک نظم کے کسی لفظ پر مجھے اعتراض ہوا میں
نے اپنے خط میں اس کا ذکر کیا تو جواب میں لکھا۔

"نیر صاحب کی نظم کا مسودہ دیکھا۔ اس میں بالکل
یہی لکھا ہے میں شاعر نہیں ہوں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ
لوگ جانیں۔ ممکن ہے بن سے مراد جنگل ہو۔"

وہ کاٹ چھانٹ ضرور کرتے تھے۔ لیکن اس سلسلے
میں انھیں لوگوں کی دل شکنی کا بھی بہت خیال رہتا تھا۔

جس کے مضمون یا کہانی کی زبان بدلتے اس سے اپنے خط میں ضرور معذرت کر لیتے۔ ایک خط میں مجھے لکھا۔

"اپنا مضمون آپ نے پڑھ لیا ہو گا اس میں جو اصلاح و ترمیم کی گئی ہے نہ جانے آپ نے اس کا کیا اثر لیا۔"

ایک اور خط میں تحریر فرمایا۔

"میں نے آپ کے مضمون کی تمہید بدل دی آخر میں بھی کچھ کاٹ چھانٹ کی ہے اس توقع پر کہ اس جرأت کو آپ معاف کریں گے۔"

ایک ادیب صاحب ہیں جو بچوں کے لیے مضامین لکھتے وقت یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ جن کے لیے مضمون لکھا جا رہا ہے وہ کیسی زبان سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا مضمون عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ و محاورات کا "مربہ" بن جاتا ہے۔ حسین حسان صاحب نے ان کا ایک مضمون شائع کرنے سے پہلے اس میں اس طرح کاٹ چھانٹ کر دی۔ وہ سخت ناراض ہوئے اور لکھا کہ وہ مضمون اب اس قابل نہیں رہا کہ اسے وہ اپنی "تخلیق" بتا سکیں اب انھیں اسے دوبارہ لکھ کر کہیں چھپوانا پڑے گا! ان کا خط میں نے بھی پڑھا اور حسان صاحب سے اس سلسلے میں کچھ گفتگو کرنی چاہی تو وہ ہنس کر ٹال گئے۔ کیا مجال جو ایک لفظ ان صاحب کے خلاف نکالا ہو۔

وہ نہ صرف پیام تعلیم کے صفحات میں اس کے لیے لکھنے والوں سے سادہ اور آسان زبان لکھنے کی فرمائش کرتے بلکہ لکھنے والوں کو بھی اکثر اپنے خطوط میں اس کا مشورہ دیتے اس کا ڈھنگ بتلاتے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی اہمیت جتاتے۔ ایک خط میں مجھے لکھا۔

"بچوں والی کہانیاں اپنے گھر کے بچوں کو پڑھ کر سنائیے اور دیکھیے وہ کہاں تک آپ کی زبان سمجھ پاتے ہیں، کہاں تک ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ بہر حال اس ٹیسٹ کے بعد مجھے بھیجیے۔"

مجھے شروع سے عبارت آرائی کا کچھ زیادہ ہی شوق رہا ہے۔ ایک دوسرے خط میں یوں نصیحت کی۔

"مضمون بھی اچھا خاصا ہے۔ مگر آپ تھوڑا سا بہک گئے ہیں۔ عبارت آرائی، انشا و پردازی بہت اچھی چیز ہے مگر بچوں یا لڑکوں کے لیے جو مضمون لکھا جائے اس میں ان کی نفسیات، ان کے معیار فہم کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے "سادگی" میں "پرکاری" پیدا کی جائے جب بات بنتی ہے۔ اس طرح کے مضامین میں آپ بول چال کی زبان سے جس قدر قریب آئیں گے اتنے ہی کامیاب رہیں گے۔"

ایک اور خط میں بچوں کے لیے مضمون لکھنے کا ڈھنگ اس طرح بتلایا۔

"آپ اپنا مضمون جلد بھیج دیجیے۔ زبان مشکل نہ ہو۔ اندازِ بیان زیادہ سے زیادہ سادہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہلکے پھلکے لفظ۔"

میں نے جہاں تک ہو سکا ان کی نصیحتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ خاصا اچھا نکلا۔ عبارت آرائی کا شوق ختم تو نہیں ہوا لیکن بڑی حد تک کم ہو گیا اور زبان میں بڑی حد تک سادگی آگئی۔ میں نے بہت سے سائنسی مضامین بول چال کے انداز اور کہانیوں کی شکل میں لکھے

انھیں انھوں نے بہت پسند کیا۔

بچّوں کے ایک اور مشہور رسالے میں میری جتنی کہانیاں اور مضامین شائع ہوئے سب اتفاق سے مزاحیہ تھے اور پسند بھی کیے گیے۔ میں نے پیام تعلیم کے لیے بھی ایک دو مضمون اسی انداز کے بھیجے۔

ایک مضمون کے بارے میں اس طرح رائے دی۔

"اپریل فول والا مضمون سب سے پہلے دیکھا۔ یہ بھئی بات کچھ بنی نہیں۔ مزاحیہ انداز میں لکھنا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔"

دوسرے مضمون کے بارے میں یوں لکھا۔

"بھئی ہم آپ کو ایک بات بتائیں۔ آپ کا قلم سنجیدہ مضامین کے لیے زیادہ موزوں ہے اس لیے اپنی توجہ اس طرف زیادہ رکھیے۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اچھے مضامین کی تعریف کے معاملے میں بھی کنجوس نہ تھے۔ میرے ایک ڈرامہ کے بارے میں لکھا۔

"ڈراما میں نے بھی پڑھا دوتی صاحب نے بھی پڑھا دونوں کو پسند آیا۔"

ایک مضمون "میلے کی سیر" کے بارے میں تحریر فرمایا۔

"مضمون دلچسپ ہے۔ بچّے شوق سے پڑھیں گے۔"

میرے ترجمہ شدہ ڈرامے "جان جائے وچن نہ جائے" کے بارے میں ان کی رائے دیکھیے۔

"ڈراما ملا۔ بہت اچھا ہے۔ کلائمکس خصوصاً بہت غیر معمولی ہے لیکن اسے ایک عامی اور رسالے میں، کی رائے سمجھیے۔ غالباً آپ نے اس کی نوک پلک درست کی ہے اس لیے یہ اتنا اچھا ہو گیا ہے۔"

وہ ان اڈیٹروں میں نہیں تھے کہ جو بُرا بھلا آئے اسے لے کر چھاپ دیں۔ مضامین کی نوک پلک درست کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے انتخاب اور ترتیب میں بڑی محنت سے، بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ پیام تعلیم کو اسم بامسمّیٰ بنانے کے لیے ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اس کے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی مضمون ایسا ہو جس سے اُردو جاننے والے بچّوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔ ایک خط میں مجھے لکھا۔

"آپ تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اردو جاننے والے بچّوں کو ایسی کیا چیزیں دینی چاہئیں کہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو ان کے ذہن و دماغ کو روشنی ملے"

یہی وجہ تھی کہ اکثر پیام تعلیم میں کہانیوں کی کمی ہوتی جس کی بچّے بڑے بھی شکایت کرتے، اسے روکھا پھیکا بتلاتے انھیں ایسی شکایت کرنے والوں سے یہ شکایت تھی کہ آخر وہ صرف کہانیاں ہی کیوں پڑھنا چاہتے ہیں۔ جن سے معلومات میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کہانیوں کے مخالف تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ رسالے کو صرف کہانیوں کا پلندہ بھی نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ان کی کوشش رہتی کہ پیام تعلیم کے لیے لکھنے والے کہانیوں کے انداز میں معلوماتی مضامین لکھیں اور اپنی اس کوشش میں وہ بہت کامیاب رہے۔ پیام تعلیم کے لیے اس انداز کے سائنسی اور معلوماتی مضامین لکھنے والوں کا ایک خاص

حلقہ بن گیا تھا۔

وہ ان نئے ادیبوں کو بھی نصیحت کرتے رہتے جو چھپنے کے شوق میں بغیر سوچے سمجھے ہر طرح کی کہانیاں اور مضامین لکھتے اور چھپواتے رہتے ہیں ۱۹۸۲ء میں ایک خط میں مجھے لکھا۔

"تمھاری ایک کہانی و..... میں نے دیکھی۔ اس عمر میں ایک دور آتا ہے اور سبھی پر آتا ہے جب نئے لکھنے والے کو لکھنے اور چھپوانے کی ہوس سی ہو جاتی ہے۔ یہ بڑا نازک دور ہوتا ہے۔ بھٹکنے کا بہت اندیشہ رہتا ہے۔ مجھے یہ یہ کہانی ملتی تو بغیر اصلاح و ترمیم کے شایع نہ کرتا۔"

ایک اور مضمون کے سلسلے میں تحریر فرمایا:

"میں نے اس سلسلے میں اس ڈر سے کچھ نہ کہا کہیں آپ کی ہمت شکنی نہ ہو ورنہ میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ اس سے اچھی باتوں کے لیے اپنی انرجی محفوظ رکھیں تو زیادہ مناسب ہو۔"

میں نے اپنے کچھ مضامین کی جنھیں بھیجے عرصہ گزر گیا تھا، اشاعت کے لیے اصرار کیا تو جواب میں لکھا۔

"ہاں ایک بات اس سلسلے میں سن لیجیے لکھنے کے سلسلے میں ابھی اپنے کو طالب علم ہی سمجھیے۔ یہ نہ سمجھیے کہ ہر چیز جو آپ لکھیں وہ ضرور شایع ہو۔ میں ابھی تک اپنے کو طالب علم سمجھتا ہوں۔ لکھنا کیا ہوں گویا مشق کرتا ہوں۔"

میرا ایک عرصے سے معمول تھا کہ پیام تعلیم پڑھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے بھیجتا۔ کتابت کی غلطیاں باقاعدہ حوالے دے کر گنواتا۔ کوئی کہانی، مضمون یا نظم چوری کی ہوئی، یا اس سے پہلے کسی رسالے میں شایع ہو چکی ہوتی تو حوالے دے کر اس کی طرف اشارہ کرتا۔ میری رائے کو ہمیشہ بڑی اہمیت دیتے اور اکثر میرے خطوط "آدھی ملاقات" کے کالم میں شایع فرماتے۔ اس بات کا اظہار کبھی کبھی اپنے خطوط میں بھی کرتے۔ ایک خط میں لکھا۔

"آپ پیام تعلیم کا ہر مضمون بہت غور سے پڑھتے ہیں۔ تنقیدی نگاہ سے پڑھتے ہیں اس لیے آپ کی رائے سے مجھے بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ ایسے ہی بے لاگ تبصرے کیا کریں گے۔"

ایک دوسرے خط میں یوں رقم فرمایا۔

"سالنامے پر بے لاگ تبصرہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔"

آخر میں تو ایسا ہو گیا تھا کہ انھیں میری رائے کا انتظار رہنے لگا تھا۔ خطوط کے ذریعہ یا ملاقات کے وقت تقاضہ کرتے "کہانی نمبر" کے سلسلے میں رائے بھیجنے میں دیر ہوئی۔ ان دنوں دفتر میں کام کی زیادتی سے مجھے بالکل فرصت نہ تھی۔ کچھ دن بعد خط پہنچا۔

"پیام تعلیم کا کہانی نمبر آپ کو کبھی کا مل چکا ہوگا۔ میں آپ کی رائے کا بہت شوق سے انتظار کر رہا ہوں۔"

پیام تعلیم کے لیے لکھنے والوں سے ان کا تعلق صرف اڈیٹر اور لکھنے والے ہی کا نہیں تھا بلکہ وہ اس کے دکھ سکھ دونوں کے شریک تھے۔ جب جب میں نے کسی امتحان میں کامیابی حاصل کی اور انھیں اس کی اطلاع دی انھوں نے فوراً مبارک باد کا خط بھیجا۔ اسی

طرح میری اور گھر والوں کی بیماری کی جب انھیں خبر ہوئی فوراً خیریت دریافت کی اور صحت یابی کی دعاؤں کا تحفہ بھیجا۔ والد صاحب کی بیماری کے سلسلے میں پیام تعلیم کے صفحات تک میں اس کا تذکرہ کیا۔

طالب علموں کی بھلائی کا انھیں بڑا خیال رہتا تھا جب تک میری طالب علمی کا دور رہا وہ امتحانات کے قریب ہمیشہ مجھے مضمون نگاری بند کرنے اور امتحان کی تیاری میں جٹ جانے کی نصیحت کرتے۔ ایک خط میں لکھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ آپ پڑھنے میں دھیان رکھیے کسی اور چیز کی طرف مطلق توجہ نہ کیجیے۔"

دوسرے خط میں یوں نصیحت کی

"جی لگا کر محنت کیجیے انشاء اللہ کامیابی ضرور ہوگی آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ مضمون نگاری کی طرف سے توجہ ہٹالی"

ہر سمجھدار انسان کی طرح انھیں بھی دوسروں کی اچھی اور معقول رائے قبول کرنے میں کوئی جھجک نہ ہوتی۔ الٹے بڑی خوشی محسوس کرتے۔ نمبروں کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ مولانا اسمٰعیل نمبر نکالا جائے۔ میری ناچیز رائے یہ تھی کہ شخصیات پر تابڑ توڑ کئی نمبر نکل چکے ہیں اب کوئی ہلکا پھلکا نمبر مثلاً ڈراما نمبر نکالا جائے۔ میں نے اپنے خط میں اس بات کا اظہار کیا تو جواب میں لکھا۔

"پچھلے مہینے آپ نے بہت اچھی بات کی طرف توجہ دلائی۔ ڈراما نمبر کی طرف۔ تجویز یہ تھی کہ مولانا اسمٰعیل نمبر نکالا جائے پر اب خیال ہے کہ ڈراما نمبر ہی کیوں نہ نکالا جائے۔"

پیام تعلیم کا "غالب نمبر" بہت مقبول ہوا تھا۔ اتنی مانگ تھی کہ دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی۔ لیکن طے یہ ہوا کہ صرف منتخب مضامین کتابی صورت میں شائع کر دیے جائیں۔

حسان صاحب اس کی ترتیب میں مصروف تھے میں بھی اتفاق سے دفتر پہنچ گیا۔ ایک مضمون کے سلسلے میں میں نے رائے دی کہ اس میں لکھی سبھی باتیں پہلے مضامین میں آگئی ہیں۔ فوراً اسے الگ کر دیا۔ ایک دوسرے مضمون کے آخری پیراگراف کے بارے میں میں نے خیال ظاہر کیا کہ یہ غیر ضروری سا لگتا ہے۔ فوراً اسے پڑھا اور فرمایا "آپ ٹھیک کہتے ہیں" اور اسے کاٹ دیا۔

ان باتوں سے صرف ان کی بڑائی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جو ایک دو برس نہیں پورے تینتالیس برسوں سے بچوں کے لیے لکھ رہا ہو اور جس نے چھبیس سال تک بچوں کے ایک رسالے کو ترتیب دیا ہو، اس طرح کی رائے اور مشورہ کا محتاج نہیں ہو سکتا لیکن اسے ان کی عالی ظرفی کے سوا کیا کہا جائے کہ اتنے تجربے اور اہلیت وصلاحیت کے باوجود ان میں کسی طرح کی اکڑفوں اور غرور نہ تھا۔ اس کے برعکس بہت عاجزی تھی بڑا انکسار تھا طبیعت میں۔ میں ان کے خطوط جمع کرتا تھا۔ ایک دستی خط جو مکتبے کی شاخ جامع مسجد کے ذریعہ انھوں نے بھیجا تھا مجھے نہیں ملا۔ میں نے اس کا تقاضہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں آپ کے خطوط جمع کرتا ہوں اس لیے اس خط کے لیے اس قدر بے چینی ہے۔ جواب میں تحریر فرمایا۔

"آپ نے میرے خطوط کی بھی بھلی قدر کی۔ مجھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔"

ایک اور خط میں اس طرح انکساری کا اظہار کیا۔

"میں ابھی تک اپنے کو طالب علم سمجھتا ہوں لکھتا کیا ہوں گویا مشق کرتا ہوں۔"

اتر پردیش کی اُردو اکیڈمی نے ان کی ایک کتاب پر
پانچ سو روپے کا انعام دیا۔ انھوں نے نہ تو ملاقات میں
ہی میں اس کا اظہار کیا اور نہ ہی خط میں یہ بات لکھی۔ مجھے
اس کا علم پیام تعلیم ہی کے ذریعہ ہو سکا اس واقعہ سے
اُن کی کسر نفسی اور فروتنی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سمندر
کی خاموشی ہی اس کی عظمت کی دلیل ہے اسے دریا کی طرح
شور مچا مچا کر اس کے اعلان کی ضرورت نہیں۔

آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ وہ پیام تعلیم کے لیے
مضامین کی فراہمی کے سلسلے میں کتنی زحمتیں برداشت کرتے
تھے۔ ایک ایک آدمی سے تقاضہ کرتے خط پر خط لکھتے تب
کہیں جاکر اتنے اچھے مضامین ان کے ہاتھ آتے تھے۔
ناول "مونگے کا جزیرہ" انھیں کی فرمائش کی تعمیل ہے۔
اور یہ معلوم کر کے شاید آپ کو تعجب ہو کہ اس کی قسطیں
ہمیشہ ان کے پے درپے خطوط سے گھبرا کر ترجمہ کی گئیں۔
میری مصروفیت کا انھیں احساس تھا اور اس کا ذکر
انھوں نے پیام تعلیم کے صفحات اور میرے نام اپنے
خطوط میں کیا لیکن ساتھ ہی ان کی یہ بھی خواہش تھی
کہ یہ سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے اور ناول پایۂ تکمیل کو پہنچ
جائے۔ بیچ میں تین بار ایسا ہوا کہ میں قسط وقت پر
نہ بھیج سکا اور سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کا انھیں بڑا
افسوس رہا۔ بار بار کہتے تھے کہ اس طرح سلسلہ
ٹوٹنے سے پڑھنے والوں کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔
خیر خدا نے ان کی خواہش پوری کر دی اور ان کے
ترتیب دیئے پیام تعلیم کے آخری شمارے میں
اس ناول کی آخری قسط بھی شائع ہو گئی۔

یہ انھیں کا دل گردہ تھا کہ انھوں نے ایسے
ادیبوں اور شاعروں سے بچوں کے لیے مضامین
کہانیاں اور نظمیں لکھوالیں جن کے بارے میں دوسرے یہ
تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ لوگ بھی بچوں کے لیے لکھ سکتے
ہیں یا ان سے بچوں کے لیے لکھنے کی فرمائش کی جا سکتی ہے
چند نام آپ بھی دیکھیے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پروفیسر محمد مجیب
ڈاکٹر سیّد عابد حسین۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ پروفیسر
آل احمد سرور۔ فراق گورکھپوری اور سیّد ابوتمیم فریدآبادی۔

ذاتی زندگی میں بھی وہ اتنے ہی اچھے تھے کبھی کبھی گھر
جاتا تو بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ ممکن نہ تھا
کہ کچھ کھلائے پلائے بغیر آنے دیتے۔ ہمیشہ رخصت کرنے
دروازے تک آتے اور اگر کوئی مضمون یا کہانی لے کر جاتا
تو بار بار اس کے لیے شکریہ ادا کرتے۔ پیام تعلیم ہم دونوں
کا محبوب موضوع گفتگو تھا اور زیادہ تر بات چیت اسی
کے بارے میں ہوتی۔

ایک خاص وصف ان میں میں نے یہ پایا کہ ہر شخص
سے اس کی عمر، مذاق، شوق اور تجربے کے مطابق بات چیت
کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی ان کی صحبت میں کبھی کسی قسم
کی اکتاہٹ یا بیزاری نہیں محسوس کر سکتا تھا۔ میں اپنے ایک
دوست کے ساتھ ان سے ملنے گھر گیا۔ یہ دوست بھوپال
کے رہنے والے تھے اور عربی میں ایم اے کر رہے تھے۔
حسّان صاحب نے یہ معلوم کرنے کے بعد دیر تک ان
سے بھوپال کے قدرتی حسن اور عربی زبان کے بارے
میں بات چیت کی۔ والد صاحب کے ہمراہ میں ان سے
ملا تو دیر تک ان سے سیاسی گفتگو میں مصروف رہے
جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ وہ اگلے وقتوں کے لوگوں
میں سے تھے۔ پرانی تہذیب اور آداب کو بڑی اہمیت
دیتے تھے اور ان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک بار وہ
بیمار تھے۔ میں والد صاحب کے ہمراہ ان کی عیادت کو

جاڑے کا زمانہ تھا۔ گھر سے باہر لان پر ایک آرام کرسی
پر نیم دراز تھے۔ ہمیں دیکھ کر کسی لڑکے کو آواز دے کر
کرسیاں لانے کو کہا۔ پہلی کرسی آئی تو میں نے والد صاحب
سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بولے :۔" یہ تکلف چھوڑو۔
تم ہی بیٹھ جاؤ۔" حسان صاحب فوراً بولے ۔" واہ صاحب
بھلا آپ کی موجودگی میں وہ کیسے پہلے بیٹھ سکتا ہے۔ یہ
ہماری روایات اور تہذیب کے خلاف ہے۔"

یوں تو سنجیدہ رہتے تھے لیکن بعض دفعہ بڑے
مزے کی باتیں کہہ جاتے۔ گھر پر ان سے غالباً دوسری
یا تیسری ملاقات تھی۔ رخصت چاہی تو بس اسٹاپ
تک جو ان کے گھر سے کوئی ایک فرلانگ ہوگا۔ پہنچانے
چلے آئے۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے کہہ بھی
دیا کہ آپ نے ناحق اتنی زحمت کی۔ مسکرا کر بولے۔
" یہ زحمت تو میں نے اس لیے برداشت کی کہ آپ کو
بس میں اپنے سامنے سوار کرادوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
آپ کو بس نہ ملے اور آپ لوٹ کر پھر میرے گھر
پہنچ جائیں۔"

وہ بیمار تھے۔ میں عیادت کو گیا۔ باتوں باتوں
میں فرمایا کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بلڈ پریشر ہے۔ پھر خود ہی
ہنس کر اپنے کمزور اور سوکھے جسم کی طرف اشارہ کر کے
بولے " بھلا بتائیے یہاں بلڈ (خون) ہی نہیں تو پریشر
(دباؤ) کہاں سے ہوگا۔"

اپنے آپ پر ہنس لینے اور دکھ اور تکلیف کو اس
طرح ہنسی میں ٹال جانے کا حوصلہ کم ہی لوگوں میں ہوتا
ہے۔

وضع داری کا یہ عالم تھا کہ والد محترم کی بیماری کے
بارے میں معلوم ہونے کے بعد خود بیمار ہونے کے باوجود
بار بار اس بات پر معذرت کرتے کہ ان کی عیادت کو نہ
آسکے۔ اس بات کا اظہار پیام تعلیم کے صفحات میں بھی
کیا۔ انتقال سے کوئی ایک مہینے پہلے میری ان سے آخری
ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اپنی پریشانیوں اور والد صاحب
کی بیماری کا تفصیل سے حال سنایا تھا۔ بار بار افسوس
اور اپنی مجبوری کا اظہار کرتے تھے۔

دوسروں سے اس کے حالات، اس کی پریشانیاں
اور اس کے دکھ بڑے غور، بڑی ہمدردی اور بڑے صبر
سے سنتے تھے۔ لیکن اپنے بارے میں بہت کم کہتے۔ مجھے
آخر تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انھوں نے جنگ آزادی میں
بھی حصہ لیا تھا۔ اور اس سلسلے میں قید بھی ہوئے تھے۔
اس سے ان کی ایک اور بہت بڑی خوبی سامنے آتی
ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا ایک عام انسانی کمزوری
ہے۔ لیکن ان میں یہ کمزوری نہ تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ
اپنی تعریف سن کر انھیں خوشی نہ ہوتی لیکن وہ اپنے کار
نامے اپنے منہ سے بیان کر کے خوش نہیں ہوتے تھے
اور نہ انھیں خالی خولی تعریف میں مزا آتا تھا۔

چند مہینے تک " آدھی ملاقات " کا کالم " پیام تعلیم "
میں نہیں آیا۔ میں نے وجہ پوچھی۔ جواب میں لکھا۔

" آدھی ملاقات کا سلسلہ اس لیے بند
کرنا پڑا کہ ) پیام تعلیم کے بارے میں لوگ
صحیح رائے نہیں دیتے بس تعریف کر دیتے
ہیں تاکہ اڈیٹر صاحب جلدی سے چھاپ
دیں۔"

"پیام تعلیم" ۱۹۲۶ء میں نکلا تھا۔ شروع میں
یہ بڑوں کا پرچہ تھا اور اس کے اڈیٹر سعید انصاری اور
ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر

ذاکر حسین مرحوم نے اس کی ادارت حسین حسان صاحب
کے سپرد کر دی۔ انھیں شروع ہی سے بچوں کے ادب سے
بہت لگاؤ تھا۔ بڑی دلچسپی تھی۔ ان کے اصرار پر ذاکر
صاحب نے پیام تعلیم کو بچوں کا پرچہ بنانے کی اجازت
دے دی۔ پھر کیا تھا ۱۹۴۷ء تک سولہ سال کے عرصے میں
پیام تعلیم نے دھوم مچادی اور اپنے زمانے کا بچوں کا
سب سے اچھا، کامیاب اور مشہور رسالہ بن گیا۔

۱۹۴۷ء میں یہ بھی ہنگاموں کا شکار ہو گیا چند سال
بعد پھر جاری ہوا۔ اس بار اس کے اڈیٹر الہر پرویز
صاحب بنے۔ کچھ عرصے بعد پرویز صاحب علی گڑھ چلے
گئے اور یہ پھر بند ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء میں جب یہ تیسری
بار نکلا تو پھر حسین حسان صاحب کو اس کی ذمہ داری سونپی
گئی اور آخری دم تک وہی اس کے اڈیٹر رہے۔

پیام تعلیم کے خریدار بنانے کے سلسلے میں ان کی
انتھک کوششوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں
اس رسالے سے کتنی محبت تھی اور وہ اسے پھلتا پھولتا
دیکھنا چاہتے تھے۔ پیام تعلیم میں مسلسل دردمندانہ اپیلوں
کے علاوہ وہ اس کے لیے لکھنے والوں کے نام اپنے خطوط
میں بڑے پراثر انداز میں اس کے خریدار بننے اور بنانے
کی درخواست کرتے۔

مرحوم زندگی میں اکثر پیام تعلیم کے صفحات پر اور
ذاتی گفتگو میں ........
پیام تعلیم کے مستقبل کے بارے میں شبہات کا اظہار
کرتے اور یہ تمنا بھی کہ اب اس کے بند ہونے کی
نوبت نہ آئے۔ ان کی اور تمنائیں پوری ہوئی ہوں
یا نہیں یہ تمنا عزیز اللہ میاں نے پوری کر دی اور پیام
تعلیم اب بھی جاری ہے۔

آپ کا کام یہ ہے کہ ان کی اس یادگار کو قائم
رکھیں اور ان کی اچھی اچھی باتوں کو اختیار کر کے
ان کے نقش قدم پر چل کر ایک اچھے طالب علم،
ایک فرض شناس شہری اور سب سے بڑھ کر ایک
نیک انسان بنیں۔ یہی ان کا وہ مقصد تھا جس
کے لیے وہ پیام تعلیم کے ذریعہ آخری دم تک
کوشش کرتے رہے۔

---

بقیہ صفحہ سے

حالاتِ حاضرہ پر بھی اچھی نگاہ رکھتے تھے۔ بڑی اچھی
یادداشت تھی۔ اپنے زمانے کے واقعات معہ دن اور
تاریخ پوری طرح یاد تھے۔

شام کو ٹہلنا حسین حسان صاحب (مرحوم) کی زندگی
کا ایک حصہ تھا۔ جھکے ہوئے، چھوٹا سا ٹیڑھا ڈنڈا
لیے چلے جاتے تھے۔ چاہے کیسا ہی موسم ہو ان کا
ٹہلنا نہیں ٹلتا تھا۔ اپنے مکان (اسٹاف کوارٹرس)
سے جامعہ کالج تک یا کبھی اس سے بھی آگے چلے جاتے
تھے۔ ہر دوسرے تیسرے روز ان سے ملاقات ہو
جاتی تھی۔ راستہ میں رک کر خیریت معلوم کرنا ان کا معمول
تھا۔ میں کہا کرتا تھا کہ آپ کو ٹہلتا دیکھ کر مجھے اپنے
والد صاحب محترم یاد آجاتے ہیں۔ وہ بھی اپنے
معمولات پر سختی سے عمل کرتے ہیں اور ان کی تندرستی
کا یہی راز ہے۔

اچانک حسین حسان صاحب کے انتقال کی
خبر صبح ملی۔ میرے گھر میں تو ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارا
کوئی بزرگ اور سرپرست ہم سے جدا ہو گیا ہو۔ مرحوم
کو ہم اکثر یاد کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ واقعی دنیا میں
ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ خدا مرحوم کو جنت الفردوس

# عید مبارک

یہ ایک پُر رونق تہوار ہی نہیں، تجدیدِ رفاقت اور تعمیر کے عزمِ نو کا مقدّس دن بھی ہے۔

## آئیے!

اس تقریبِ سعید پر ذاتی رنجش،
مذہبی تعصب اور مقامی یا علاقائی تفرقے
کو بھول کر قومی یکجہتی کو مضبوط بنانے
اور راہِ ترقی پر قدم سے قدم اور کندھے
سے کندھا ملا کر چلنے کا

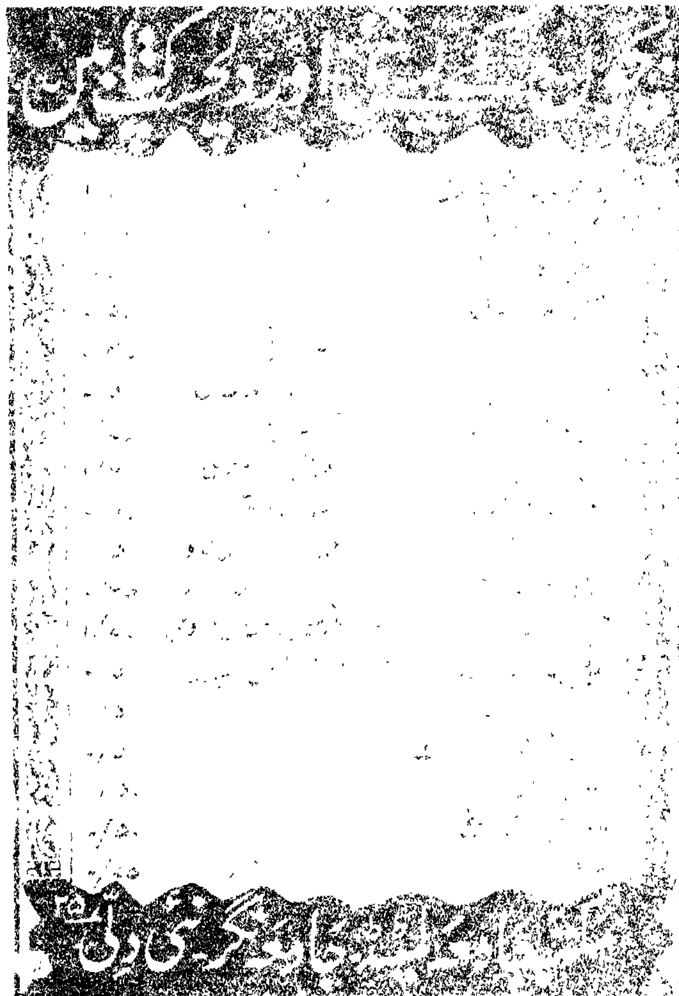
## عہد کریں

No. D.(S)-097

NOVEMBER 1974

# PAYAM-I-TALEEM

NEW DELHI-110025



# پیامِ تعلیم



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

ماہنامہ

# پیامِ تعلیم

نئی دلی ۲۵

جلد ۱۱ شمارہ ۱۲

اڈیٹر

ولی شاہجہانپوری

معاون

صفیہ حسان

~~اکتوبر~~ دسمبر ۱۹۷۴ء

قیمت ۷۰ پیسے

سالانہ چندہ سات روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر
جامعہ نگر نئی دلی ۲۵ سے شائع کیا

## فہرست مضامین

# بچوں کی کتابیں

## مذہب

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| سلام | مولانا اسلم جیراجپوری | 1/60 |
| رت (اردو) | الیاس احمد مجیبی | -/80 |
| ہانیاں (دو حصوں میں) | مقبول احمد سیوہاروی | 3/- |
| | الیاس احمد مجیبی | 2/50 |
| ے اولیاء | خواجہ عبدالحیٔ فاروقی | 2/50 |
| پاک | عبدالواحد سندھی | 2/.. |
| سلام | مولانا اسلم جیراجپوری | -/70 |
| ت بیبیاں | مولانا اعجاز الحق قدوسی | 1/- |
| ے قصے | خواجہ عبدالحیٔ فاروقی | 1/50 |
| رسول | " " | 2/40 |
| ے نبی | سید نواب علی رضوی (اردو) ہندی | |
| دو عالم | محمد حسین حسان ندوی 1/20 | 4/- 3/- |

## معلومات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| ہانی | مشتاق احمد | 2/- |
| عجائب خانہ | محمد حسین حسان (چار حصے) | 2/- |
| ہانی | علی احمد خاں | -/50 |
| کی کہانی | عبدالغفور | -/80 |
| ہند کی کہانیاں (اول) | خجستہ سلطان | 1/- |
| " " (دوم) | ضیاء الرحمٰن | 1/20 |
| " " (سوم) | مشتاق احمد اعظمی | 1/- |
| " " (چہارم) | " " | 1/20 |
| کہانی | محمد امین | 2/- |
| نے کے طریقے | رفیعہ منظور الامین | 1/- |
| سیکھے | محمد حسین حسان ندوی | 1/25 |
| | ڈاکٹر سجاد حسین زیدی | 2/- |

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| چچا غالب | مرتبہ: حسین حسان | 2/- |
| رابندر ناتھ ٹیگور | صفدر حسین | 1/25 |
| سماجی زندگی (اول) | احمد جلیل و غلام ابرار | -/56 |
| " " (دوم) | " " | -/81 |
| " " (سوم) | " " | -/81 |
| سمندر کے کنارے | سلطانہ آصف فیضی | 1/- |
| " " بچے | " " | 2/- |
| قدرت کے کرشمے | ادارہ | -/80 |
| میر انیس | محمد حسین حسان ندوی | 1/25 |
| ہماری پارلیمنٹ | کیلاش چندر | 1/25 |

## کہانیاں، ڈرامے۔ ناول

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| جن حسن عبدالرحمٰن (ناول) دو حصے | | 5/- |
| اس نے کیا کر نہ جانا (کہانیاں) | آصف مجیب | -/37 |
| پریم کی جیت (ڈراما) | اسد اللہ کاظمی | -/37 |
| تانیل خاں (کہانی) | محمد حسین حسان | -/50 |
| ترکوں کی کہانیاں (") | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/55 |
| تیس مار خاں کے کارنامے (ناول) | م۔ ندیم | 1/55 |
| تین اناڑی (") | عصمت چغتائی | 1/50 |
| چقماق کی ڈبیا (کہانی) | برکت علی فراق | -/40 |
| چمپاوت کا آدم خور شیر (سچی کہانی) | محمد معین | -/35 |
| چنبیلی | محمد حسین حسان | -/50 |
| ستاروں کی سیر (ناول) | کرشن چندر | 1/75 |
| کوے دادا (سچا ناول) | مجیب احمد خاں | 2/- |
| لال مرغی (کہانی) | عبدالواحد سندھی | -/50 |
| مزہ چکھائیں گے (") | مرتبہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | -/35 |
| مزہ دار پہیلیاں (پہیلیاں) | محمود علی خاں | -/85 |
| ننھا ٹٹو " " (کہانی) | خورشید سلطان | -/40 |

# بچّوں سے باتیں

حسین حسان نمبر آپ کو بڑی دیر میں ملا۔ اس کا ہمیں افسوس ہے مگر کبھی ایسے نمبر کے لیے اتنے مضمون اکٹھا کرنا بھی تو بڑا کام تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ جامعہ برادری نے اسے پسند کیا ہے۔ محترم شفیع الدین نیرؔ اور عبداللطیف اعظمی صاحب کے تاثرات "آدھی ملاقات" میں پڑھیے اور آپ بھی اپنی رائے دیجیے۔

نومبر کی ۱۴۔ اور ۱۹۔ تاریخ کو ملک کی دو عظیم ہستیوں کی سالگرہ کی تقریبیں منائی گئیں چاچا نہرو کی سالگرہ "یوم اطفال" کے طور پر بڑی دھوم دھام سے پورے ملک میں اور ملک کے باہر بھی منائی جاتی ہے اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔

بڑے باپ کی بڑی بیٹی یعنی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی سالگرہ بڑی سادگی سے منائی جاتی ہے ۱۹۔ نومبر کو ان کی ۵۷ ویں سالگرہ بھی اسی سادگی سے منائی گئی۔

م... لقا احمد کی نظم 'چاچا نہرو'

نومبر کے پرچے میں شامل ہونی چاہیے تھی۔ مگر حسین حسان نمبر میں گنجائش نہیں تھی۔ اس نظم کے ساتھ مسز اندرا گاندھی پر محترمہ مسعودہ حیات کی نظم "ایک حق پرست" اس شمارے میں پڑھیے۔

نظموں میں جاوید احمد خاں کی نظم "امرا... برقی بھارتی کی 'دیوالی' بھی پڑھیے۔

نثری مضامین میں مزے مزے کا کھا... پڑھیے اور ان کی اچھی باتوں کو اپنانے کی کوشش کیجیے۔ عبدالمتین نیازؔ صاحب کا مضـ... خاصا معلوماتی ہے۔ مرحوم حسین حسان صاحب نے بڑے اصرار کے ساتھ ان صوفی بزرگ کے حالات لکھوائے تھے۔ پیر ننھے میاں علم کی لگن اور تعلیم کا شوق، ایسی چیزیں کہ انھیں اپنایا جائے۔

احمد جمال پاشا صاحب نے شاید پہلی... پیام تعلیم کو نوازا ہے۔ ان کا دلچسپ مضمو... آپ کو دعوت دیتا ہے کہ آپ کے ارادے...

پختہ اور عزم مضبوط ہونا چاہیے۔ کامیابی کا راز مستقل مزاجی میں ہے۔ امید ہے کہ آپ کو یہ مضمون پسند آئے گا اور احمد جمال پاشا صاحب پیام تعلیم کو فراموش نہ کریں گے۔

مرحوم حسین حسان صاحب 'پیام تعلیم' کی اشاعت بڑھانے کی اپیل کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مگر ان کی زندگی میں پرچے کے خریدار اتنے نہیں بڑھ سکے جتنے بڑھنے چاہیے تھے۔ رسالے کی اتنی مقبولیت کے باوجود، مرحوم اس سے مطمئن نہیں رہے اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو کرتے رہے

اب کہ پیام تعلیم ان کی یادگار بن گیا ہے ہم پھر پیامیوں سے اپیل کریں گے کہ اس کے خریدار بڑھا کر اس کی اشاعت کو بڑھائیں تاکہ آپ کا یہ رسالہ کاغذ کی گرانی کے باوجود نہ صرف یہ کہ جاری رہے بلکہ ترقی کر سکے۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہوگی کہ ہر پیامی کم سے کم ایک خریدار فراہم کرسکے۔

دسمبر کے مہینے میں جو نئے خریدار بنیں گے، ہم ان کو حسین حسان نمبر تحفے کے طور پر پیش کریں گے۔

جناب مہرؔ وردلوی

# دعوتِ عمل

## جامعہ کا مہِ تاباں ہے پیام تعلیم

سب رسالوں میں نمایاں ہے پیام تعلیم
کتنی خوبی سے درخشاں ہے پیام تعلیم
صرف بچوں کا نہیں پیر و جواں کا محبوب
ایک سرسبز گلستاں ہے پیام تعلیم
یہ رہِ علم کا ساتھی بھی ہے رہبر بھی ہے
خوب تعلیم کا ساماں ہے پیام تعلیم
ماہِ نو کی طرح ہر ماہ نکلتا ہے یہ
جامعہ کا مہ تاباں ہے پیام تعلیم
اس کی نظمیں ہیں دل افروز مضامیں پیارے
کتنا مرغوب دل و جاں ہے پیام تعلیم
صدر[1] جمہوریۂ ہند سے نسبت ہے اسے
ان کے ہی فیض کا عنواں ہے پیام تعلیم
بزم اُردو کے ابھرتے ہوئے فنکاروں کا
اک سنورتا ہوا ایواں ہے پیام تعلیم
قدر دانوں اٹھو کچھ اس کی ضیافت کر لو
علم[2] کے شہر کا مہماں ہے پیام تعلیم
بزم احباب میں توسیع اشاعت کا ابھی
دوستو آپ سے خواہاں ہے پیام تعلیم
مہرؔ میرے لیے اس دورِ پریشانی میں
دل کی تسکین کا ساماں ہے پیام تعلیم

---

[1] صدر جمہوریہ ذاکر حسین [2] جامعہ نگر

جناب جاوید احمد خاں

# اصرار

(ایک بچّے کا اپنی ماں سے اصرار)

اب علم کی دنیا میں اے ماں مجھے جانے دو
اُمید کی کلیوں کو کھِلنے دو کھلانے دو
اب شوق ابھرنے دو، اب ذوق بڑھانے دو
اِس دل کو جگانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

بازو میں بھی طاقت ہے، دل میں نئے ارماں ہیں
رگ رگ میں نئے جذبے اور منزلیں آساں ہیں
قدموں میں روانی ہے، ارماں ہیں کہ طوفاں ہیں
قدموں کو بڑھانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

فطرت نے حسیں منظر ہر سمت بنایا ہے
پھولوں سے بسایا ہے تاروں سے سجایا
غنچوں کو زباں دے کر بھی راز چھپایا ہے
اس راز کو پانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

اے ماں مجھے جانے دو دنیا کی بہاروں میں
کیا رنگ جھلکتا ہے پھولوں میں، شراروں میں
انسان کے سینوں میں اور چاند ستاروں میں
آنکھوں کو اٹھانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

وہ کون سی اک خوبی انسان کے اندر ہے
مٹ جائے تو مٹی ہے، اٹھ جائے تو گوہر ہے
رک جائے تو قطرہ ہے، بڑھ جائے تو ساگر ہے
اس بھید کو پانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

میں سیکھ کے سب باتیں اک روز جب آؤں گا
پھر سب کو زمانے کی ہر چیز بتاؤں گا
اور علم کے پرچم کو دنیا میں اٹھاؤں گا

پہلے مجھے جانے دو
اے ماں مجھے جانے دو

جناب عبدالمتین نیاز

# ایک عظیم انسان —

# حضرت شاہ پیر ننھے میاں صاحبؒ

(یہ مضمون مرحوم حسین حسان صاحب نے بطور خاص لکھوایا تھا۔
ہم نیاز صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے مرحوم کی خواہش کی تکمیل کردی۔ اڈیٹر)

---

عزیز بچو! آؤ آج تمھیں ایک ایسے عظیم انسان سے ملائیں جن کو پیر ننھے میاں کہا جاتا ہے۔ جن کا پورا نام ہے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی[1]ؒ جو ۲۱ر شوال ۱۳۰۳ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کیوں کہ اپنے گھر میں سب سے کم عمر تھے۔ اس لیے ننھے میاں پکارے جانے لگے اور اسی نام سے آپ مشہور ہوئے۔ انھیں ننھے میاں نے بڑے ہوکر اسلامی تعلیمات، اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کو پھیلانے اور اللہ کے بندوں کو اچھے راستے پر چلانے کی تن من دھن سے کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ بھوپال ہی میں نہیں سارے ملک میں مشہور ہوئے۔

پیر ننھے میاں کے بزرگوں میں حضرت امام ربانی حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ تھے جنھوں نے یہاں کے عوام خصوصاً مسلمانوں کو شرک و بدعت کی لعنت سے نجات دلائی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنے، کسی اور سے منتیں مرادیں مانگنے سے چھٹکارا دلایا۔ مجدد صاحبؒ نے دین کو پھیلانے میں بادشاہ وقت کی بھی پرواہ نہیں کی وہ جہانگیر کے آگے نہیں جھکے بلکہ خدائی طاقت نے جہانگیر بادشاہ کو جھکنے پر مجبور کیا۔ آج اگر ہم تم بھی اپنے دل میں اسلام اور دین کی محبت جگالیں اور صرف خدا سے دھیان لگالیں اور اپنے پیارے نبیؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، خدا کے حکم مانیں تو کیسے ممکن ہے کہ خوش نصیبی ہم سے روٹھ جائے اور ہم غیروں کے آگے جھکیں۔

مجددی خاندان کے بزرگوں نے بھارت کی تقریباً سبھی جگہوں میں قرآن کی روشنی

---

[1] تجدید کرنے والا۔ نیا کرنا۔

سے مسلمانوں کے ذہنوں کو جگمگایا۔ وہیں بھوپال بھی ان خوش قسمت ریاستوں میں سے ایک ہے جہاں مجدّد خاندان کے بزرگوں نے اپنے علم اور اچھے کاموں سے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی فایدہ پہنچایا۔ مولانا شاہ محمد یعقوب صاحبؒ بھی مجدّد خاندان کے ایک ایسے بزرگ تھے جو ہمیشہ خدا اور اس کے رسولؐ کے حکموں کے خود پابند رہے اور دوسرے تمام مسلمانوں کو بھی ہدایت فرماتے رہے۔ پیر نھے میاں صاحب دوسرے پیروں سے بالکل الگ تھے۔ انھوں نے اپنے پاس ہر آنے والے حاجت مند سے بار بار یہی کہا کہ کاموں کو پورا کرنے والا صرف اللہ پاک ہے۔ وہی بیمار کو تندرست کرتا ہے، بھوکے کو روٹی دیتا ہے، اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔ میں تمھارے جیسا ہی ایک معمولی انسان ہوں تم بھی اللہ پاک سے دھیان لگاؤ۔ اس کی عبادت کرو۔ وہ تم سے ضرور راضی ہوگا اور تمھارے تمام بگڑے ہوئے کام اپنے آپ بن جائیں گے۔

پیارے بچو! حضرت صاحب میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں ان کو علم حاصل کرنے کا بے انتہا شوق تھا۔ ان کے شوق کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے کہ آپ بارہ سال کی عمر میں علم حاصل کرنے کی خاطر گھر سے اجازت لیے بغیر ندوۃ العلمائے لکھنؤ (جو آج بھی بہت بڑی دینی تعلیمات کا مرکز ہے) پہنچ گئے۔ لیکن ابتدائی تعلیم مکمل نہ ہونے کی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا اور پھر گھر والوں نے واپس بلالیا اس کے بعد آپ کو علم کا شوق حیدرآباد لے گیا اور آپ لگ بھگ ۱۱ سال تک وہاں پڑھتے رہے اور وہاں کے بزرگوں، استادوں کی خدمت بھی کرتے رہے، جہاں جو کچھ اچھی باتیں ملیں سمیٹ لیں۔ حضرت صاحب نے حیدرآباد میں اپنی زندگی سدھارنے میں بڑی پریشانی اٹھائی اور اپنے گھر کے تمام عیش و آرام کے باوجود حیدرآباد ہی میں رہے تاکہ تعلیم مکمل ہوجائے۔ ان کی سادہ مزاجی اور محنت کرنے کے شوق نے دنیاوی چٹخاروں سے ان کو بے فکر کردیا تھا۔ ان کی سادگی کا اندازہ اسی سے لگاؤ اور سبق حاصل کرو کہ وہ بہت ہی کم مقدار میں جوار کی روٹی اور آم کے اچار پر گزارا کرتے تھے۔ حیدرآباد سے کافی عرصے کے بعد بھوپال آئے اور خانقاہ[1] کے دینی وقار کو جوں کا توں قایم رکھا۔ اور بھوپال میں بھی وہ ایک طالب علم کی طرح آخر عمر تک پڑھتے رہے۔ ان کو روزانہ چار استاد مختلف اوقات میں مختلف کتابیں پڑھاتے۔ وہ اپنے ان استادوں کی بہت عزّت کرتے جو ان کو علم کی دولت سے مالا مال کررہے تھے۔

بچو! تمھیں بھی یہی چاہیے کہ پڑھنے لکھنے سے کبھی جی نہ چراؤ۔ کیوں کہ علم ہی تم کو اچھے برُے، کھوٹے کھرے کی تمیز کرنا سکھائے گا۔

پیر نھے میاں صاحب رات دن اللہ کی عبادت اور اس کی مخلوق کو زیادہ سے زیادہ فایدہ پہنچانے

---

[1] بلند پایہ بزرگوں کی عبادت کرنے کی جگہ۔

میں لگے رہتے۔ خانقاہ میں ہر آنے والے کو جہاں
اللہ رسول کی باتیں سکھاتے خود اس کی بھی
باتیں سنتے۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی سب
سے چھپا کر امداد کرتے۔

حضرت صاحب ایک عظیم انسان اور با عمل
عالم تھے۔ ان کا انتقال ۲۰ مئی ۱۹۷۲ء کو ہوا۔
ان کے انتقال سے ہدایت و انکار کا چشمہ خشک
ہو جاتا مگر تم کو یہ جان کر اطمینان ہو گا کہ پیر
ننھے صاحب کے صاحبزادے مولوی سعید میاں
مجددی نقشبندی جو چھوٹے میاں کہلاتے ہیں
وہ اپنے بزرگوں کے طور طریقوں کو قائم رکھے
ہوئے ہیں۔ ہندوستان خصوصاً بھوپال کے
رہنے والوں کو ان سے بڑی محبت ہے۔
اس لیے کہ وہ بھی اپنے علم و عمل کی روشنی
سے سب کو اچھے راستے پر چلنے چلانے کی
دن رات کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

میرے ننھے منے پیامی ساتھیو! حضرت
صاحب کی زندگی تمھارے اور ہمارے لیے
ایک سبق ہے۔ خدا کو یاد کرو۔ اس کے
آگے سر جھکاؤ تمھیں ہر جگہ کامیابی ملے گی۔
خوب علم حاصل کرو، خوب پڑھو کیوں کہ تعلیم
ہی زندگی سنوارتی ہے تم محنت کروگے تو
خدا ضرور اس کا پھل دے گا۔ نیکی، شرافت،
ایمان داری، خوش اخلاقی اپنے وطن سے
محبت اور اپنے بڑوں کا ادب، تم کو دنیا میں
عزت دے گا اور آخرت میں بھی۔

جناب شاغل ادیب، ایم۔ اے

# جواں ارادے

پھول سی دنیا بساتے جائیں گے
خارِ نفرت کے ہٹاتے جائیں گے

بَیر، کینہ، بغض کے ڈھا کر محل
پیار کے ایواں سجاتے جائیں گے

جہل و نفرت کی اندھیری راہ پر
علم کے دیپک جلاتے جائیں گے

سینچ کر دشتِ عمل کو خون سے
رشکِ صد گلشن بناتے جائیں گے

ہم صدا رنج و الم کے موڑ پر
مسکراتے، گیت گاتے جائیں گے

تھام کر دامن ارادوں کا جواں
سینۂ گیتی پہ چھاتے جائیں گے

جناب کیفؔ احمد صدیقی

# چاچا نہرو

ساری دُنیا کی نئی شان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی شان تھے چاچا نہرو

سارے بچّوں کے دلوں میں جو بسا کرتے تھے
ساری دنیا کی نگاہوں میں پھرا کرتے تھے
وہ مچلتے ہوئے ارمان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی سنتان تھے چاچا نہرو

جس نے ہر بحرِ سیاست میں مچادی ہلچل
جس نے ہر سوچ تشدد کو کیا نذرِ اجل
وہ بپھرتا ہوا طوفان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی سنتان تھے چاچا نہرو

سختیِ راہِ طلب کی کبھی پرواہ نہ کی
ظلم پر ظلم سہے اور کبھی آہ نہ کی
ہمّت و عزم کی چٹان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی سنتان تھے چاچا نہرو

خدمتِ قوم کو کہتے تھے وہ اچھا مذہب
آدمیت کو سمجھتے تھے وہ سچا مذہب
اور ہندو نہ مسلمان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی سنتان تھے چاچا نہرو

ان کا پیغام تھا دنیا میں کبھی جنگ نہ ہو
تیسری بار زمانہ میں بڑی جنگ نہ ہو
امن عالم کے نگہبان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی شان تھے چاچا نہرو

مغربی علم و تمدّن پہ بھی کچھ مائل تھے
اپنی تہذیب کے لیکن وہ بہت قائل تھے
عظمتِ ہند کی پہچان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی پہچان تھے چاچا نہرو

کیفؔ یہ سارا زمانہ ہے جہانِ فانی
اس سرائے کی ہر اک چیز ہے آنی جانی
چند دن کے لیے مہمان تھے چاچا نہرو
مادرِ ہند کی سنتان تھے چاچا نہرو

ساری دنیا کی نئی شان تھے چاچا نہرو

محترمہ مسعودہ حیات



# ایک حق پرست

## بڑے باپ کی بڑی بیٹی

قول و عمل کا معجزہ تو نے دکھا دیا
ہر تشنہ کام قوم کو جینا سکھا دیا

جلتا رہے جو بادِ مخالف کے سامنے
ایسا چراغ شوق جہاں میں جلا دیا

دنیا سے جس الم کا مداوا نہ ہو سکا
اس کو تری نگاہِ کرم نے مٹا دیا

مجبوریوں میں چھوڑ گئے تھے جو اپنا گھر
تو نے انھیں عزیز وطن میں بسا دیا

پیشِ نظر رہی ہے حریفوں کی خوش دلی
اُن کو حیاتِ عیش کا نقشہ دکھا دیا

خونریزیِ فضول گوارا نہ تھی تجھے
دورانِ جنگ صلح کا مژدہ سنا دیا

اب تیرے سامنے ہیں جفاکار سرنگوں
دستورِ ہند سارے جہاں کو دکھا دیا

جناب عادل کہلگانوی

# راجہ کی بیماری

ایک تھے راجہ صاحب - ایک بار اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی - ڈاکٹر، وید حکیم اور طبیب جوق در جوق آتے رہے اور واپس جاتے رہے مگر بیماری کا علاج تو دُور کی بات، کوئی یہ بھی نہ کہہ سکا کہ آخر بیماری کیا ہے - درحقیقت انہیں کوئی مرض تو تھا نہیں - وہ صرف اتنا ہی فرماتے کہ بڑی تکلیف ہے لیکن یہ تکلیف کس جگہ تھی، یہ کوئی تلاش نہ کر سکا - کتنی قسموں کی نیلی پیلی گولیاں کھا ڈالیں معجون مرکب، شربت فولاد، سفوف نوشادر و دیگر نسخہ جات کا بھی استعمال کرایا گیا مگر کچھ بھی افاقہ نہ ہوا - سر پر برف رکھی گئی، پیٹ کو سینک لگائی گئی مگر بیماری پھر بھی اپنی جگہ پر ہی اٹل تھی - بلکہ یوں کہیے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی -

اب تو راجہ صاحب آگ بگولہ ہوگئے انہوں نے فرمان جاری کیا - "ان کمینوں کو میری نظروں سے دور کردو اور ان کی طِب کی کتابیں یا جو کچھ ان کے ساتھ ہے سب چھین کر نذر آتش کر ڈالو !"

اس طرح سارے معالجین رخصت ہوئے - مارے دہشت کے اب کوئی بھی راجہ کے گھر کا رُخ تک نہ کرتا تھا - اہلِ دربار کو فکر دامن گیر ہوتی کہ کیا راجہ صاحب علاج کے بغیر ہی جاں بحق ہو جائیں گے ؟

اس نازک وقت میں کہیں سے ایک فقیر نے آکر کہا ---- "اس مرض کو دور کرنے کی ترکیب مجھے معلوم ہے مگر یہ کام سخت مشکل ہے - کیا تم لوگ اس کو انجام دے سکو گے ؟"

وزیر، کوتوال، سپہ سالار، دوست احباب سب نے بیک آواز کہا ---- "کیوں نہیں، ضرور کر سکیں گے - ضرورت ہوگی تو ہم اپنی جان تک کی بازی لگا دیں گے "

پھر فقیر نے کہا ---- "اچھا تو پہلے ایک ایسے شخص کا پتہ لگاؤ جس کو کسی قسم کی فکر نہیں، جس کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی ہو، جو ہر وقت اور ہر حالت میں خوش رہتا ہو "

سب نے پوچھا ---- " پھر اس کے بعد ؟"

فقیر نے کہا ---- اس کے بعد اس شخص کے جسم کے کپڑے اگر راجہ صاحب ایک دن زیب تن فرمائیں اور اس شخص کے توشک یا گدے پر ایک رات سو رہیں تو بیماری خود بخود دور ہو جائے گی "

یہ سن کر سب نے کہا ---- " یہ تو بڑی مبارک بات ہے - !"

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ یہ خبر راجہ کے کانوں تک پہنچی - انہوں نے سن کر کہا ---- " ارے اتنی آسان ترکیب کے باوجود تم لوگ اتنے دنوں تک کہاں جھک مار رہے تھے ؟ اتنی سی بات کسی کے ذہن میں نہیں آئی ! خیر، اب بھی کچھ نہیں

بگڑا۔ جاؤ اور ابھی وقت اس شخص کو (جنہیں کہیں آدھا
٥ پوشاک مع توشک حاضر کرو۔"
چاروں کھونٹ لوگ دوڑائے گئے۔ پوری سلطنت
کے اندر تلاش و جستجو کی مہم جاری ہو گئی مگر ایسے شخص کا کہیں
پتہ نہ چلا۔

ہر شخص واپس آکر یہی سُناتا ——— "رنج و غم
سے آزاد، دنیا و مافیہا سے بے خبر، ہمیشہ خندہ پیشانی سے
ہر وقت خوش مزاج رہتا ہو، ایسا آدمی تو مجھے کہیں بھی نہ
ملا"۔ یہی روز کا قصہ تھا۔

پھر وزیر نے غصے ہو کر کہا ——— "اِن کاہلوں کے
لیے بھلا کوئی کام ہونے کو ہے! ان بے وقوفوں کو تلاش
کرنا ہی نہیں آتا" اتنا کہہ کر وہ خود اُس اجنبی آدمی کی
تلاش میں نکل پڑا۔

بازار کے نزدیک ایک عظیم الشان دالان کے سامنے
انہوں نے لوگوں کا اژدہام دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ایک
وڑے سیٹھ جی ہنستے ہوئے اس بھیڑ کو چاول، دال، کپڑے
در پیسے خیرات کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا ———
اہ یہ شخص تو بہت خوش نظر آ رہا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ
س کے پاس دولت کی بھی فراوانی ہے۔ اِس حالت میں
سے کسی بات کا غم یا کسی قسم کی فکر بھی نہیں ہونی چاہیے۔
ہوں نہ اسی سے ایک عدد کپڑا اور توشک مانگ لیا
ائے ۔ ؟

وزیر ابھی یہ بات سوچ ہی رہے تھے کہ عین اُسی
ت ایک حادثہ رُونما ہو گیا۔ ایک بھکاری جب بھیک
ینے کے بعد سیٹھ جی کو سلام کیے بغیر ہی جانے لگا تو سیٹھ جی
تاؤ آ گیا۔ انہوں نے گالیوں سے تواضع کرتے ہوئے
ں سے بھیک چھین لی۔ پھر اسے دھکّے مار مار کر وہاں سے
بھگا دیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر وزیر نے تھکن میں اپنا سر دھنیا
اور وہاں سے چپ چاپ کھسک پڑا۔

اس کے بعد دریا کے کنارے ایک جگہ اس نے
دیکھا کہ ایک شخص حلیہ بدل بدل کر خوشی میں مست ہو کر
ناچ رہا ہے اور اس کے چاروں طرف ایک بڑی بھیڑ
اس کی عجیب و غریب حرکتوں پر ہنس رہی ہے۔ شور و غل کا
ایک طوفان بپا تھا۔ وزیر صاحب خود اس شخص کے گیت
سن کر اور تماشے دیکھ کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔
انہوں نے دل میں خیال کیا ——— اس قسم کے دلچسپ
آدمی موجود رہتے ہوئے بھی ہمارے آدمی مایوس اور نامراد
واپس لوٹ گئے، یہ افسوس ناک المیہ ہے۔ پھر انہوں
نے ایک شخص سے دریافت کیا ——— "بھائی صاحب
یہ کون ہیں ؟"

اس شخص نے جواب دیا ——— "یہ شخص مجنوں مزاج
ہے۔ ابھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنا خوش ہے لیکن شام
ہوتے ہوتے اس کا دیوانہ پن، شور و غل اور دھما چوکڑی
شروع ہو جاتی ہے۔ محلّے کے سارے لوگ اس کی
حرکتوں سے نالاں ہیں۔ اس نے اُن کی نیندیں تک حرام
کر رکھی ہیں۔"

یہ سن کر وزیر صاحب پھر ایک بار سنجیدہ ہو گئے۔
اور اپنی مہم پر آگے بڑھ گئے۔ سارا دن تلاش کرتے
کرتے شام کو وہ گھر لوٹے لیکن اُس شخص کا کہیں سراغ نہ ملا۔
اسی طرح یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا۔

اب جب کہ ان کا حوصلہ تقریباً پست ہو چلا تھا،
امید کی ایک ہلکی سی جھلک انہیں نظر آ گئی۔ اچانک ایک
درخت کے نیچے قلاش قسم کے ایک ضعیف سے ان کی ملاقات
ہو گئی۔ سر پر لمبے لمبے بال، داڑھی بڑھی ہوئی، جسم سوکھ کر

کاشا ہو چکا تھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

وزیر نے اُس سے پوچھا ——— "تم اس قدر ہنس کیوں رہے ہو ؟"

اُس نے جواب دیا ——— "کیسے نہ ہنسوں! یہ زمین گردش کر رہی ہے، درخت سے پتے گر رہے ہیں، میدانوں میں سبزے اُگ رہے ہیں۔ دھوپ نکل رہی ہے، پرندے درختوں پر آ کر بیٹھ رہے ہیں اور پھر اڑ کر جانے لگتے ہیں۔ یہی سب کچھ نظروں کے سامنے آتے رہتے ہیں اور مجھے ہنسی آ رہی ہے۔"

وزیر نے کہا ——— "وہ تو میں سمجھا، لیکن بیٹھے بٹھائے صرف ہنسنے ہی سے تو انسان کا گزارہ نہیں ہوتا۔ کیا اس کے علاوہ اور تمہارے پاس کوئی کام نہیں ؟"

جواب ملا ——— "ہاں کیوں نہیں ؟ کام اور بھی ہیں۔ بہت سے کام ہیں۔ صبح سویرے ندی پر جاتا ہوں۔ وہاں سے غسل سے فارغ ہو کر، لوگوں کی آمد و رفت اور ان کی گفتگو و دیگر تماشے دیکھ کر پھر درخت کے نیچے آ بیٹھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد، جس دن کھانے کو ملتا ہے کھا لیتا ہوں، نہیں ملتا تو نہیں کھاتا۔ جب ٹہلنے کی خواہش ہوتی ہے ٹہلتا ہوں اور جب نیند لگتی ہے سو جاتا ہوں۔ کسی طرح کی فکر یا اندیشہ نہیں اور کوئی ہنگامہ بھی نہیں۔ مزے سے دن کاٹ رہا ہوں۔"

وزیر نے سر کھجلاتے ہوئے پوچھا ——— "جس دن کھانے کو نہیں ملتا اُس دن کیا کرتے ہو ؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا ——— "اس دن تو کوئی بکھیڑا ہی نہیں۔ بس چپ چاپ پڑا رہتا ہوں۔ اور یہی تماشہ دیکھتا رہتا ہوں۔ بلکہ جس دن کھانے کو مل جاتا ہے اسی دن بہت سارے جھمیلے پیدا ہو جاتے ہیں یعنی بھات کو ہاتھ سے سنوارو، نوالہ بناؤ، منہ میں ڈالو، چباؤ، نگلو، پھر پانی پیو، ڈکار لو، ہاتھ منہ دھوؤ، اور انہیں پونچھو۔ دیکھا آپ نے ؟ کتنے سارے جھمیلے ہوتے ہیں!"

وزیر نے سمجھا ——— "مدت کی تلاش و جستجو کے بعد صحیح آدمی ہاتھ لگا ہے۔ اب ہمارا راجہ ہرگز نہیں مر سکتا۔" انہوں نے عرض کیا ——— "کیا تم اپنے جسم کے ایک آدھ کپڑے عنایت کر سکتے ہو ؟ اس کے عوض تم جتنی رقم طلب کرو، ہم لوگ دینے کو تیار ہیں۔"

یہ سن کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور پھر کہنے لگا۔ "میں اور کپڑے ؟ کپڑوں کا کیا کام ؟ ہاں اس دن ایک شخص نے مجھے ایک شال دی تھی وہ بھی تو میں نے ایک بھکاری کو خیرات کر دی۔ میں نے کبھی کپڑوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔" وزیر کے سامنے پھر ایک زبردست مشکل کھڑی تھی۔ سخت جانفشانی اور عرق ریزی کے بعد اگر صحیح آدمی مل بھی گیا تو اب اس کے کپڑے ہی نہیں۔

انہوں نے سوال کیا ——— "اچھا تو تم اپنا توشک ہی دے دو۔ بولو کیا قیمت لوگے ؟ کہو تو میں روپے کی بارش کر دوں۔"

اب کی بار وہ بوڑھا کنگال ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ کسی صورت اس کی ہنسی تھمنے کو نہیں آتی تھی۔ پھر بڑی دیر کے بعد ہنسی پر قابو پا کر وہ کہنے لگا ——— "چالیس سال تک تو بستر کا منہ ہی نہ دیکھا۔ اور آپ توشک اور گدیلے کی بات کر رہے ہیں ——— ؟"

وزیر نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا ——— "تن ڈھانکنے کو کپڑے نہیں، نہ رضائی نہ کمبل، نہ توشک نہ تکیہ، تو کیا تمہیں کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں لگ جاتی ؟"

کنگال نے جواب دیا ـــــ "بیماری بھلا کس بات
کی؟ بیماری آزاری پر میں یقین نہیں رکھتا۔ جو لوگ بیماری
کی بات سوچتے ہیں ان ہی کو بیماری لگتی ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے پھر اپنی پیٹھ درخت سے لگا کر دونوں
ٹانگیں سیدھی کر دیں اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

وزیر صاحب آج بھی محروم و نامراد واپس لوٹے۔
راجہ کے پاس خبر پہنچی، انھوں نے وزیر کو طلب کیا۔
ان کی زبان سے سارا ماجرا سُنا اور پھر نہایت آزردہ خاطر
انہیں رخصت کیا۔

سارے درباری اب پھر سوچ میں پڑ گئے کہ اب
کیا ہوگا؟ کتنی مشکل سے ایک ترکیب ہاتھ بھی آئی تو وہ
بھی کسی کام نہ آسکی۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔
اور سرد آہیں بھرنے لگے۔ کسی نے کہا ـــ "نہیں، اب
راجہ صاحب کو بچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب
ہم انہیں کسی قیمت پر نہیں بچا سکتے۔ اب ان کی موت
یقینی ہے۔"

اُدھر راجہ صاحب نے بھی نئے انداز سے سوچنا
شروع کر دیا ـــــ عالی شان محل میں رہتے ہیں،
صحت بخش غذا کھاتے ہیں، کسی چیز کی کمی نہیں، نوکر چاکر
ہر لمحہ ہر آن خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ پھر بیماری کی کیا
وجہ ہو سکتی ہے؟ اور وہ قسمت کا مارا کنگال جس کے پاس
نہ کھانے کو ایک دانہ ہے، نہ سر چھپانے کو گھر، نہ تن پر کپڑے
تک نہیں، سونے کے لیے بستر نہیں۔ درختوں کے نیچے
زندگی بسر کرتا ہے، جو کچھ ملتا ہے کھا لیتا ہے۔ سُنا ہے
کہ وہ بیماری کا نام تک نہیں جانتا۔ وہ ایک بھیک منگا
ہو کر بیماری کو بھگانے میں کامیاب ہو گیا اور میں خود ایک
راجہ ہو کر بھی کامیاب نہ ہو سکا ـــ آخر کیوں؟

دوسرے روز علی الصبح راجہ نے محل دربار
کو حاضر کیا اور کہا ـــــ "بدنصیب نادانو! تم سب
میری نظروں کے سامنے سے ہٹ جاؤ اور اپنے اپنے
کام دیکھو۔ افسوس کہ تم میں سے کوئی بھی میرے
نہ آسکا۔ میں نے اپنے مرض کا علاج خود کر لیا ہے
میں تو بہ صحت ہوں۔ اعلان کر دو کہ آج سے میں پھر
کرنے جا رہا ہوں۔ اور کان کھول کر سن لو کہ اگر تم سب
سے کسی نے "چوں" تک کی آواز نکالی تو اس کی گردن
ناپ لی جائے گی۔

---

بقیہ مولا کا بندہ صفحہ ۳۶ پر

کرنے کے لیے کچھ لوگوں نے گاڑیوں کا پیچھا کیا، مگر بارش
کے جنگل میں گاڑیاں گم ہو گئیں۔ کوئی بھی انہیں نہیں
پا سکا۔

ملّو کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ گاؤں والوں
نے اپنا چندہ بھی دہیز میں دے دیا۔ اس کے کچھ دن
مولا بخش کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب مولا بخش
نے اپنا گھر اور بھینس دونوں ہی فروخت کر دیے۔ لوگوں
نے سمجھا کہ یہ گاڑی وان کا قرض چکانے کے لیے کر رہا
مگر ایسا نہ ہوا۔ مولا بخش نے ساری رقم گاؤں کی ایک
بہت ہی غریب بیوہ کو دے دی اور خود کندھے پر لوٹا
ڈور ڈال کر چل پڑا۔

"کہاں چلے مولا بخش؟" کسی نے پوچھا۔
"مولا کے پاس"۔ جواب ملا۔

اس کے بعد مولا بخش کو کسی نے نہیں دیکھا
گاؤں والوں نے اس کو بہت ڈھونڈا مگر وہ سچ مچ
اپنے مولا کے پاس چلا گیا تھا۔

ـــــ مہرالدین خاں متعلم بی۔اے

جناب بزمی بھارتی

# دیوالی



آدھے کاتک دیوالی آئی ہے
اک انوکھی بہار لائی ہے

سرسراہٹ ہے پھلجھڑی کی کہیں
مسکراتی ہے گل دوپہری کہیں

گنگناہٹ کہیں اناروں کی
ہر طرف دھوم ہے پٹاخوں کی

سج رہی ہے مٹھائیوں کی دکاں
دل لبھاتی ہے برتنوں کی دکاں

ہر طرف کھانڈ کے کھلونے ہیں
چاٹ کے چٹ پٹے سے دونے ہیں

یوں سجا ہے ہر ایک گھر آنگن
جیسے کوئی نئی نویلی دلھن

دیپ مٹی کے جل رہے ہیں کہیں
روشنی بلب اگل رہے ہیں کہیں

ہیں کہیں موم بتیاں روشن
حسب مقدور ہر مکاں روشن

جگمگانے لگے در و دیوار
مینا بازار بن گیا بازار

روشنی میں نہا رہی ہے رات
اپنا جوبن دکھا رہی ہے رات

ہار پھولوں کے دے رہے ہیں بہار
لکشمی جی کا ہو رہا ہے سنگھار

دھوم یوں مچ رہی ہے ہر گھر میں
جیسے شادی رچی ہے ہر گھر میں

کوڑتے پھر رہے ہیں یوں بچے
عید کی چاند رات ہو جیسے

یوں کھنکتا ہے ہر گلی کوچہ
رقص کرتی ہے جیسے رقاصہ

الغرض جس کو دیکھیے ہے مگن
کھل رہا ہے ہر ایک دل کا چمن

میرے بھارت کا یہ حسیں تیوہار
کاش سینوں میں سب کے بھر دے پیار

جشن دیپاولی منائیں سب
پیار کے گیت مل کے گائیں سب

جناب اسد جمال پاشا

# ڈھل مل بھائی ......

ڈھل مل بھائی، بالکل ڈھل مل یقین ہیں۔ جب وہ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے تو انھوں نے دسویں درجے کے امتحان کی بڑے زوروں سے تیاری کی۔ سب کو پکا یقین تھا کہ ضرور فرسٹ آئیں گے۔ لیکن جب امتحان دینے گئے تو وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ امتحان دے کر ان کے یہاں پہنچا تو دیکھا بے خبر سو رہے ہیں۔ جگایا تو بڑی ہی مشکل سے اُٹھے۔ امتحان کے بارے میں پوچھا تو بولے۔ "امتحان دینے سے فایدہ؟ آرٹس میں رکھا کیا ہے؟ یہ دنیا اور زمانہ سائنس کا ہے۔ سمجھ لو، آج تک میں نے جو کچھ پڑھا، وہ گدھے پر لاد دیا۔ اب میں پوری تیاری کرکے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دوں گا۔"

یہ سن کر ہم نے سر پیٹ لیا، مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ اپنے ارادے پر چٹان کی طرح جمے رہے اور برابر ثابت کرتے رہے کہ "مجھے ڈاکٹر یا انجینیر بننا ہے اس لیے سائنس میرے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی آدمی کو زندہ رکھنے کے لیے پانی اور ہوا۔"

چونکہ مجھے اگلے پرچے کی تیاری کرلی تھی اس لیے انھیں ہوا کھاتا چھوڑ کر چلا آیا۔

انھوں نے اگلے سال سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے امتحان دیا اور فرسٹ آئے۔ اب ہم کو بالکل یقین تھا کہ وہ دن دور نہیں جب ڈھل مل بھائی ڈاکٹر، انجینیر یا سائنس داں بن کر اپنی قابلیت کی دھوم مچادیں گے۔ لیکن جب ہم کالج پہنچے تو یہ دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ وہ داخلے کا فارم لیے دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں اور کامرس میں نام لکھانا چاہتے ہیں۔

ہمیں کچھ پوچھنے کا موقع نہ دیتے ہوئے بولے ــــــ "یہ عہد بھائی صاحب تجارت کا ہے۔ آج کل بزنس میں بڑی ترقی ہے۔ اس لیے میں کامرس پڑھوں گا۔" چونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ حضرت بلا کے اڑیل ہیں۔ اس لیے ہماری ہمت انھیں کامرس پڑھ کر ترقی کرنے سے روکنے کی نہ ہوئی۔ انھوں نے دن رات ایک کرکے کام پورا کرلیا۔ اس کے بعد وہ ایک دن ہمیں یہ بتانے آئے کہ "میرا ارادہ اب وکالت یا بیرسٹری کا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ تو بزنس میں دلچسپی

رکھتے تھے ؟" بولے۔ "دل چسپی ختم ہو چکی ہے۔ بڑے سے بڑا بزنس مین بھی وکیلوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ جب وکالت ہی کرنا ہے تو بی کام سے فائدہ ؟ کیوں نہ بی۔اے کریں۔ ایک تو بی کام میں کوئی سوشل لائف نہیں۔ دوسرے بی کام کریں پھر ایم کام کریں، پھر کہیں سے پچاس ہزار روپیہ لاکر لگائیں تو بزنس شروع ہو۔ پھر اس میں بھی آپ جانیے۔ ہزاروں خطرے۔ بے پناہ کمپی ٹیشن، چلی چلی، نہ چلی، دیوالیہ ہونے کی صورت میں سوائے خودکشی کے چارہ نہیں۔ اس لیے بس بی۔اے کریں۔ ایل ایل بی کریں اور کھٹ سے وکالت چمکالیں۔" ہم نے عادتاً ہاں میں ہاں ملائی اور کلاس میں واپس چلے گئے۔ بی۔اے کا امتحان شروع ہوا۔ تو معلوم ہوا کہ ڈھل مل بھائی نے امتحان سے ڈراپ کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے۔ "حاضری کم ہے اس لیے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ مل سکے گی۔" ہم نے پوچھا۔ "کتنی کم ہے ؟" بولے "سینٹ پرسنٹ"۔ ہم نے کہا "کیا آپ ایک دن بھی کلاس میں تشریف نہیں لے گئے ؟" بولے۔ "سوشل اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ یونی ورسٹی تو پابندی سے ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا۔ مگر یار دوست، جلسے جلوس، پارٹی پالیٹکس اور کینٹین کی بیٹھک بازی میں ایسا لگ جاتا کہ کلاس تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آتی ـــ" یہ سن کر ہم خاموش ہو گئے۔

پھر ہم نے سنا کہ وہ پرائیویٹ امتحان دے رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

ایک دن ان سے ملنے گئے تو دیکھا کہ پڑھائی میں غرق ہیں۔ بڑی بے رخی سے بولے "امتحان بعد آئیے گا۔" اس کے بعد انھوں نے پھر رٹائی شروع کر دی۔ مجبوراً ہم اٹھ کر چلے آئے۔

کچھ دن بعد نتیجہ نکلا۔ وہ پھر فرسٹ آ گئے۔ مبارک باد دینے گئے۔ باتوں باتوں میں پوچھا "شاید اب آپ ایل ایل بی جوائن کریں ؟" بولے۔ "وکالت میں کیا دھرا ہے ؟ اب میرا ارادہ کھیتی کرنے کا ہو رہا ہے۔ آپ نے سنا نہیں ـــ

اتم کھیتی، مدھم بان
نکھد چاکری، بھیک ندان ـــ"

ڈھل مل بھائی نے کھیتی کے لیے زمین کا انتظام کیا۔ ابھی وہ زمین جوتنے کے انتظامات مکمل نہیں کر پائے تھے کہ ایک رات اچانک آ گئے اور مجھے سوتے سے جگا کر مارے خوشی کے خود بخود اچھل پڑے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا ؟" بولے ـــ "خزانہ مل گیا۔ خزانہ ـــ" خزانے کا نام سن کر میرے دونوں کان کھڑے ہو گئے اور ایک دم سے سوالیہ نشان بن کر پوچھا۔ "کیا کھیت جوتنے میں کچھ نکل آیا ؟" بولے ـــ "کھیت ؟ اوہو، اماں تم بھی مہابھارت سے پہلے کی باتیں کر رہے ہو۔ کھیتی ویتی سب بیکار، اب میں مچھلیاں پالوں گا۔

مچھلیاں، اور چند دن میں لکھ پتی بن جاؤں گا
تم سے موٹر پہ ملنے آیا کروں گا۔ سمجھے موٹر پر!"
پھر خود ہی چمک کر بولے — "اِس وقت جلدی
میں ہوں۔ کسی دن میرے تال پر آؤ۔ عالم باغ
میں بالکل لب سڑک ہے۔ بس اسٹینڈ کے
سامنے والی کاٹیج میں مل جاؤں گا۔" یہ کہہ کر
وہ ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئے۔ اور ہم
پھر سو گئے۔

کئی دن بعد ہمیں بھی ڈھل مل بھائی کا
خزانہ دیکھنے کا شوق چرایا۔ بس سے عالم باغ
پہنچے۔ دیکھا وہ کاٹیج میں لنگوٹ باندھے جھاڑو
لیے صفائی میں مصروف تھے۔ اِن کے چاروں
طرف مرغوں کے ٹاپے، ڈربے اور جالیاں
تھیں۔ جن سے کٹ کٹ کٹاک، ککڑوں کوں
اور چوں چوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے
انھیں اُس حلیے میں دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کا خزانہ
اور موٹر کہاں ہے۔ اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا
ہے؟" ہنس کر بولے — "اب یہی میرا خزانہ
ہے۔ اِسی میں سے موٹر برآمد ہو گی۔ مچھلیوں
کے کاروبار میں سب سے بڑا خطرہ، مچھلیوں
کے مر جانے کا ہوتا ہے۔ پھر اِس میں تو ہر
طرح کا فایدہ ہی فایدہ ہے۔" انھوں نے
چلتے وقت ایک درجن انڈے بھی ہمارے ساتھ
کر دیے اور گھر آنے کا وعدہ لے لیا۔ دوسرے
دن ہم اِن کے گھر گئے، تو دیکھا کہ مکان پر
انھوں نے سفیدے اور تارکول سے خوش نما
حروف میں "مرغ ہاؤس" لکھوا رکھا ہے۔
جس کے دونوں طرف بطور ٹریڈ مارک دو اصیل
مرغ اپنی چھب دکھا رہے ہیں۔

ڈھل مل بھائی ہم سے بہت دیر تک
یورپ اور امریکا میں مرغ بانی کے جدید ترین
رجحانات پر بات چیت کرتے رہے۔ اس
کے بعد ہم چلے آئے۔

کچھ دن بعد ہم اُن کے پولٹری فارم پر
گئے تو ایک اینگلو انڈین صاحب بیٹھے تھے۔
انھوں نے بتایا کہ "ڈھل مل بھائی نے فارم
اِن کے ہاتھ بیچ دیا۔ اب ڈھل مل بھائی اِدھر
نہیں آتا!" یہ سن کر ہم سیدھے اُن کے گھر
پہنچے۔ اور اُن سے پوچھا۔ "یہ جما جمایا کاروبار
کیوں ختم کر دیا؟" ہنس کر بولے — "پولٹری
میں کیا رکھا ہے میرے بھائی؟ سائیکل کے
دھندے میں بڑا نفع ہے۔ سوچتا ہوں
ٹائر ٹیوب کی ایجنسی لے لوں۔ یوں کئی کام
ایک ساتھ ذہن میں ہیں۔ بھٹے کے کام میں
بھی اندھا دھند نفع ہے۔ اگر آپ کہیں سے
سیمنٹ اور لوہا لنگڑ لے آئیں۔ اور آپ کے پاس
زمین خالی پڑی ہو تو مفت میں کوٹھی کھڑی
ہو سکتی ہے کیوں کہ اینٹ اور مزدور تو بھٹے
کے ہوں گے اور نفع گھاتے کا —" ہم سمجھ گئے
کہ اب یہ سائیکل کی ایجنسی اور بھٹے کا کاروبار
کئی ہفتے تک کرتے رہیں گے۔

اُس وقت تو ہم چلے آئے۔ لیکن دو چار
دن بعد انھیں سمجھانے کے لیے جب اِن کے
گھر پہنچے تو دیکھا کہ پورا گھر ورکشاپ ہو رہا ہے۔

ہرطرف سے گھرر گھرر اور کھٹ کھٹ کی آوازیں آرہی ہیں۔ جا بجا بڑھئی لگے ہوئے تھے۔ لٹھوں اور تختوں کے چھتے لگے تھے۔ ڈھل مُل بھائی کان میں پنسل لگائے نیکر پہنے ایک تختے پر دونوں ہاتھ رکھے مستری کو آفس ٹیبل کی نئی ڈیزائن سمجھا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور بولے "انسان کو پیدائش سے موت تک ہر قدم پر بڑھئی کی ضرورت پالنے سے قبر کے تختوں تک پڑتی ہے۔" اس بار انھوں نے ہمیں یقین دلایا کہ "اس کام سے بہتر دنیا میں کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ نفع کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ پھر میرا دل پسند کام ہے۔" اور میں اس بات پر زور دیتا رہا کہ "بھائی کم از کم اسی پر جمے رہیے!"

کچھ دن بعد آفس سے لوٹتے میں ایک صاحب کے ساتھ ایک ریستوران میں گھسے تو دیکھا ڈھل مُل بھائی ہوٹل کے کاؤنٹر پر جمے کیش میمو کاٹ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "خیریت؟" ہنستے ہوئے بولے — "آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ بڑھئی خانے سے چائے خانے تک کیسے پہنچے؟ بات بالکل صاف ہے۔ جو نفع اور ٹھاٹھ ہوٹل بزنس میں ہے۔ اُن کاؤڈ ورکس میں سرے سے سوال نہیں۔" تھوڑی دیر بیٹھ کر میں گھر چلا آیا۔

کچھ دن بعد میرا شملہ جانا ہوا۔ ہوٹل سے نکل رہا تھا۔ دیکھا سامنے سے ڈھل مُل بھائی چلے آرہے ہیں۔ سوٹ پہنے، بو لگائے۔ پائپ کے دھوئیں اُڑاتے بڑے نقشے سے ملے اور انگریزی میں خیریت پوچھی۔ پھر کچھ وقت اکٹھا گزارنے کی درخواست کی۔ ہم لوگ ہوٹل کے لان میں جم گئے۔ کافی کا دور چلا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ "ہوٹل کے دھندے میں دھوئیں اور گندگی کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے۔ اس لیے انھوں نے دواؤں کی ایک بہت بڑی فرم جوائن کرلی۔ اس کے وہ چیف ریپریزنٹیٹو[1] ہیں۔ طے پایا کہ شام کو پھر ملا جائے۔ اور سینما دیکھا جائے۔ مگر حسبِ عادت وہ وقت پر نہیں آئے۔ مجبوراً اکیلا سینما چلا گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ انھوں نے عین وقت پر فیصلہ کیا کہ "اس وقت سینما دیکھنے سے زیادہ لطف اسکیٹنگ[2] میں آئے گا۔" جب رنگ پر پہنچے تو بلیرڈ کھیلنے میں ایسا محو ہوئے کہ اسکیٹنگ کرنے اور مجھ سے فون پر معذرت کرنے کا بھی ہوش نہ رہا۔ دوسرے دن جب میں ان سے شکایت کرنے گیا تو وہ بیرے سے مشورہ لے رہے تھے کہ "اس وقت کھانا کھایا جائے یا ناشتہ کیا جائے؟" میں نے کہا۔ "ناشتے کا وقت ہے اس لیے میں ناشتہ کروں گا۔ رہا آپ کا معاملہ، تو ٹاس کر لیجیے۔" لیکن "سِن پتلی" سے بھی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کیوں کہ سکّہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے میرے لیے ناشتہ منگایا اور خود نہانے چلے گئے۔ کیونکہ ابھی تک فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ ناشتہ کریں یا کھانا کھائیں۔

---

[1] خاص نمایندے۔ [2] برف پر پھسلنا۔

کچھ دن بعد میں شملہ سے لوٹ آیا۔ ایک دن حضرت گنج سے گزر رہا تھا — دیکھا کہ ڈھل مل بھائی کھڑے ایک عالی شان عمارت نیلام کرا رہے ہیں۔ پیشے کے ساتھ ساتھ ان کے حلیے، لباس اور شخصیت میں بھی انقلاب آچکا تھا۔ مگر مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔ انھوں نے رُکنے کا اشارہ کیا — میں ٹھہر گیا۔ نیلام ختم کرنے کے بعد بولے — "بھائی آپ سے ایک بہت اہم مشورہ کرنا ہے۔" میں نے کہا "فرمایئے!" انھوں نے کتّوں کا فارم کرنے اور اعلیٰ نسل کے پِلّے سپلائی کرنے کے کام کے سلسلے میں مجھ سے بہت دیر تک صلاح مشورہ کیا۔ میں نے جل کر کہا —

"کباڑ اور موٹر کے کام میں بھی بہت نفع ہے۔" جلدی سے بولے "ہاں ہاں! ان دونوں کاموں کے بارے میں، میں بھی بہت دنوں سے غور کر رہا ہوں مگر فی الحال تو کتّوں کا کام نفع بخش نظر آتا ہے۔"

غرض ڈھل مل بھائی سے جب بھی ہماری ملاقات ہوئی تو وہ ہمیں کسی بالکل نئے کاروبار میں اُلجھے یا اچھے خاصے کام کو مٹّی میں ملاتے نظر آئے۔ وہ کتّوں کے بارے میں مشورہ لے کر گئے اور بکریاں چراتے نظر آئے۔ بکریوں کی توقع میں تھے تو بچّہ گاڑیاں بناتے ملے۔ غرض ان کا کوئی ٹھیک نہیں کہ وہ کب کون سا کام ختم یا شروع کر دیں۔

●●

کھگیندر پرساد ٹھاکر
ترجمہ: مہرور دلوی

# جنگلوں کی اہمیت

بھارتی تہذیب پر آرین تہذیب کا کافی اثر پڑا ہے اور آرین تہذیب جنگل کی تہذیب ہے یعنی ہماری آرین۔ تہذیب جنگل سے شروع ہوئی ہے۔ یہ بن میں پیدا ہوئی، بن میں پلی اور بن میں ہی پھولی پھلی ہے۔ زمانۂ قدیم سے بھارتی سماج کا آدرش بن کی زمین پر ہی بستا تھا۔ اس وقت ہماری تہذیب جنگلات سے متاثر تھی۔ سکھ اور شانتی کا نواس بن کی ہری بھومی ہی تھی۔ ہمارے رشیوں کی تپسیا کا مقام جنگل ہی تو تھا۔ جنگل سے ہمیں بہت سے فائدے ہیں۔

اب تک تو میں نے بنوں کی تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالی لیکن ہماری روزمرہ کی زندگی میں جنگلوں کا کیا مقام ہے یہ بھی جاننا ضروری ہے۔ جنگلوں کی اہمیت سے ہم انکار نہیں کرسکتے۔ زمانۂ قدیم میں آدمی نے جنگل جنگل گھومنے کے بعد ہی جنگلی پودوں سے اپنی خوراک پیدا کرنا سیکھا تھا، اور اس کے بعد اپنی دوڑ دھوپ ختم کرکے گاؤں میں بسنا شروع کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو بن میں گھومتے گھومتے ہی ایک جگہ جم کر رہنے بسنے کا احساس ہوا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام انسانی زندگی جنگل کی چیزوں کی محتاج ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تب ہی سے اسے جنگلی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پیدائش کے بعد بچہ جس سوپ پر سلایا جاتا ہے وہ بانس کا ہوتا ہے اور بانس بن کی ہی اُپج ہے۔ بانس کی اہمیت پر تو ایک علیحدہ مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ مرلی منوہر شام کے ہاتھوں میں بانس ہی کی بنسری رہتی تھی۔ اسی بانس کے بارے میں مہاکوی سور داس نے لکھا ہے

بلہاری وا بانس بنس کی بنسی سی مسکاری
سدا رہت جو کرج سیام کے نیک ہو موت منیاری

پیدا ہونے کے بعد جوں جوں آدمی بڑھتا ہے توں توں جنگل کی چیزوں سے مدد لینا جاتا ہے۔ جنم کے وقت سے تو بچہ سوپ پر سوتا ہے لیکن بڑھنے پر وہ پالنے میں جھولتا ہے اور وہ بھی لکڑی کا ہی بنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کھاٹ یا پلنگ پر سوتا ہے وہ بھی لکڑی کا بنا ہوتا ہے اس میں لگی رسی کا بھی تعلق بن سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آدمی کی زندگی سے وابستہ بہت سی ضروری چیزیں میز کرسیاں، چوکی، پلنگ، الماری وغیرہ سامان لکڑی کے ہی بنتے ہیں۔ ریل گاڑی کے ڈبے بنانے میں، ناؤ بنانے میں، جہاز موٹر اور دیگر ضروری چیزیں بنانے میں لکڑی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ صرف زندگی ہی میں انسان کو جنگل کی ضرورت نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی آدمی کو لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لکڑی ایندھن کے کام آتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مالی اعتبار سے جنگل کی بڑی اہمیت ہے مگر یہاں مالی اہمیت کا ذکر نہیں کرنا ہے بلکہ صرف جنگل کی انسانی زندگی کی ہی اہمیت بتانا ہے۔

••

جناب عزیز مرادآبادی

# دوستی کا تقاضا

نوید اور رمیش میں چھٹی جماعت ہی سے گہری دوستی تھی۔ دونوں نیک اور خوش اخلاق لڑکے تھے۔ بیکار کے کاموں میں اپنا وقت کبھی ضایع نہ کرتے تھے۔ محنت اور لگن کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دسویں کلاس تک پہنچتے ہوئے انھوں نے کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ دونوں کی دوستی کے بیچ غریبی اور امیری کبھی آڑے نہیں آئی تھی۔ نوید مالدار تھا اور رمیش غریب — ! دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک تھے۔

نوید کو صرف نمایش دیکھنے، وہاں سے سائنسی اور معلوماتی چیزیں اور کتابیں خریدنے کا شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ سال بھر اپنے جیب خرچ کو جمع کر کر کے روپے فراہم کیا کرتا تھا۔ اس لیے اس کا یہ شوق گھر والوں کے لیے گراں نہ تھا۔

---

ایک دن رمیش بہت اداس تھا۔ نوید اس کی اداسی کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اس نے رمیش سے اداسی کی وجہ معلوم کی تو رمیش کی آنکھوں نے آنسوؤں سے جواب دیا۔ دیکھ کر نوید کی بے قراری اور بھی بڑھ گئی۔

"دوست رمیش! آخر کیا بات ہے؟ اس سے پہلے میں نے تمھیں کبھی اتنا اداس نہیں دیکھا؟" نوید نے رمیش کے کاندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کیا بتاؤں دوست؟" رمیش نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے جواب دیا۔

"وہی سب کچھ بتا دو جس کی وجہ سے اتنے دکھی ہو!"

"بات یہ ہے کہ مجھے تم سے بچھڑنے کا ڈر ہے۔ اب میں اور تم الگ ہو جائیں گے یعنی میری پڑھائی کا سلسلہ ختم ہی سمجھو۔"

"لیکن کیوں —؟" نوید نے زور دے کر پوچھا۔

"وجہ ظاہر ہے، میری غریبی! پتا جی بس کا نہیں رہا کہ وہ مجھے آگے پڑھا سکیں۔ ہائی اسکول کے امتحان کی فیس دینا ان کے بس سے باہر ہے۔ گرانی نے انھیں پہلے ہی بہت مقروض بنا دیا ہے۔ اس لیے ان کی خواہش ہے کہ میں کوئی کام سیکھ لوں ا

کمانا شروع کر دوں.....!" کہتے کہتے رمیش کا گلا رُندھ گیا۔

"بس اتنی سی بات ہے؟ ارے بھئی! تمھاری ٹیوشن فیس تو معاف ہی ہے نا۔ امتحان کی فیس جمع نہ کرا کے پڑھائی چھوڑ دینے کی بات تو کچھ اچھی نہیں لگتی!" یہ کہہ کر نوید ہنسنے لگا۔

"بھائی نوید ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے!" رمیش کو نوید کا ہنسنا شاید کچھ اچھا نہ لگا تھا۔

"اچھا بس رہنے دو اس ناٹک کو۔ مذاق کا نشانہ بنانے کے لیے بھی میں ہی رہ گیا ہوں!" نوید نے ہلکا سا قہقہہ بکھیر کر کہا۔

"کمال کرتے ہو یار! میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں؛ یقین نہ آئے تو اسکول جا کر کل نوٹس بورڈ پر دیکھ لینا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر فیس جمع نہ کرانے پر امتحان سے رُکنے والوں میں میرا بھی نام ہے یا نہیں؟" رمیش نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ کل دیکھا جائے گا تمھارے مذاق اور حقیقت کو!" نوید نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

---

اگلے دن رمیش اور نوید وعدے کے مطابق اسکول میں نوٹس بورڈ پر نظریں جمائے ہوئے کھڑے تھے۔

"کمال ہے، پرسوں تک تو میرا نام اس فہرست میں شامل تھا۔ لگتا ہے اُستاد تم نے یہ حرکت کی ہے، میرا نام کاٹ دیا ہے۔" رمیش نے نوید کو گھورتے ہوئے، شک ظاہر کیا۔

"جواب نہیں یار رمیش تمھارا بھی! میں تمھارا نام کاٹ کر مصیبت کیوں مول لیتا؟ کیا بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو؟" نوید نے رمیش کا بازو پکڑ کر آفس کی طرف لے جاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر مزید کہا۔ "الزام دینے سے پہلے دفتر میں معلومات تو کر لیجیے شریمان جی!"

رمیش دفتر کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دفتر کے اندر سے باہر آیا جہاں نوید اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ رمیش کو دیکھتے ہی اس نے کھل کر پوچھا۔ "کہو دوست! کیا رہا؟"

"بھئی کمال ہے۔ کل پتاجی پوری فیس جمع کرا گئے ہیں۔ رات ہی تو وہ مجھ سے پڑھائی چھوڑنے کی بات کر رہے تھے۔ عجیب بات ہے؟! معمہ بن گیا ہے میرے لیے تو!" رمیش نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے پُر لہجے میں کہا۔

"اچھا اب باتیں مت بناؤ۔ میں نے تو چھٹی کے وقت کل ہی دیکھ لیا تھا کہ تمھاری فیس جمع ہو چکی ہے۔" نوید نے اپنی فتح پر قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا۔

"بھئی سچ مانو مجھے بالکل بھی نہیں پتہ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں پتاجی سے جا کر معلوم کروں گا۔" رمیش نے ندامت سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تمھارے پتاجی ہائی اسکول کے امتحان سے پہلے تمھارا امتحان لینا چاہتے تھے کہ تمھارا دل پڑھنے میں لگتا بھی ہے یا بے سمجھے بوجھے تعلیم حاصل کر رہے ہو؟" نوید نے معقول سی بات کہی۔

---

دوسرے دن رمیش نے نوید کو آگاہ کیا

"بھئی! پتاجی تو اب بھی منع کر رہے ہیں کہ انھوں نے فیس جمع نہیں کرائی ہے۔ میں نے کل والی بات انھیں بتائی تو وہ بھی الجھن میں پڑ کر رہ گئے تھے۔ عجیب پہیلی ہے یار؟"

نوید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے اسکول کے نئے فیس کلرک نے اُسے ٹوک دیا۔ "مسٹر نوید! کم از کم اپنے اُس خوش قسمت دوست کو تو دکھا دو جس کی امتحان کی فیس تم نے پرسوں اس کے فادر کی طرف سے جمع کرائی تھی!"

"لیکن آپ سے یہ کس نے بتایا ہے کہ فیس میں نے اپنی جیب سے جمع کرائی تھی اور رمیش کے پتاجی نے نہیں؟" نوید نے سنجیدہ ہو کر معلوم کیا۔

"ابھی فیس جمع کرانے سے کچھ پہلے ہی رمیش کے پتاجی ہیڈ کلرک صاحب سے فیس جمع کرانے کے لیے منع کر گئے تھے۔ سمجھ گئے نا آپ؟" رمیش حیرت میں ڈوبا فیس کلرک اور نوید کے چہرے کو باری باری تکے جا رہا تھا۔

"اچھا یہ بات ہے تو میں شام کو اپنے عزیز دوست سے ملاؤں گا، لیکن یہ بات آپ اپنے ہی تک رکھیے گا۔ لیک آؤٹ (ظاہر) نہ ہونے پائے!" نوید ہنستا ہوا رمیش کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

"تم نے مجھ پر یہ احسان چوری چھپے کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟" رمیش نے بجھ کر کہا۔

"اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے میرے دوست! خدا نے مجھے اپنے دوست کی مدد کرنے کے قابل بنا دیا تھا سو میں نے تمھاری مدد کر دی۔ یہ میرا فرض بھی تھا۔ خدا ہمیں سارے انسانوں سے محبت کرنے اور آڑے وقت پر کام آنے کی تعلیم دیتا ہے، خواہ وہ انسان کوئی بھی ہو۔ خدا کی نظر میں دنیا کے سارے انسان برابر ہیں۔" رمیش نے سنجیدہ ہو کر بتایا۔

"کاش! بھارت کا ہر بچہ تم جیسا ہوتا۔" رمیش کے دل کی گہرائی سے آواز نکلی اور وہ نوید کو مارے خوشی کے چمٹ گیا۔ ●●

---

بقیہ:۔ نقل سے پہلے ص۲۷ سے

بنائے ہوئے پرچے سے حل کر کے اور ان حل کیے پرچوں کو اپنے پاس چھپائے ہوئے تھے۔ حساب کا پرچہ اس کے مطابق نہ تھا کیوں کہ پرویز کے والد نے پچھلے سال کا حساب کا پرچہ سامنے رکھ کر ہی اس سال کا پرچہ بنایا تھا تاکہ پچھلے سال دیے گئے سوالوں میں سے کوئی سوال اس پرچے میں نہ رکھا جائے۔

جناب ایم اسحاق

# نقل سے پہلے

گہری خاموشی تھی —— کمرے میں مکمل سناٹا تھا۔

رات کے بارہ بجے تھے۔ اطہر اور پرویز کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ شام کا دُھندلکا چھاتے ہی وہ اسٹڈی کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ کل اُن کا حساب کا پرچہ تھا۔

"اِن سوالوں کو دوبارہ حل کر لیتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر ہمارا داغ ساتھ نہ دے اور کوئی سوال غلط ہو جائے۔" پرویز نے اُونگھتے ہوئے کہا اور وہ پاس والی میز سے پانی کا جگ اُٹھا کر منہ پر چھینٹے مارنے لگا تاکہ نیند کا خمار ختم ہو جائے۔

"نہیں پرویز! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں۔ ہمارے سب سوال ٹھیک ہوں گے۔ حساب کا پورا پرچہ ہمارے سامنے ہے اور ہم نے سب سوالوں کو ٹھیک طرح سے حل بھی کر لیا ہے۔" اطہر نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ اور اُس نے بھی اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔

"پھر بھی ہم اور مشق کر لیتے ہیں۔ سوال صرف دس ہی تو ہیں۔" پرویز نے تولیے سے ہاتھ اور منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

اور پھر دونوں سوالوں کو حل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اچانک اطہر کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمک اٹھیں۔ وہ قلم کاپی پر رکھتے ہوئے بولا: "میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے جس سے اندیشے والی بات ہی ختم ہو جائے گی —— !"

"کیا؟ ذرا میں بھی تو سنوں!" پرویز نے اُچھلتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہ ہم یہ تمام سوال ایک کاغذ پر حل کر لیں۔ امتحان کے ہال میں اسی پرچے کی نقل کاپی پر اُتار دیں گے۔"

"خوب —— بہت خوب۔ یہ ترکیب بہت بڑھیا ہے آسان بھی۔ لیکن ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔"

"ارے تم نے مجھے بالکل بدّھو سمجھ رکھا ہے۔ نگرانی کرنے والوں کو ایسا چکمہ دوں گا کہ اُن کے فرشتے بھی نہ دیکھ پائیں گے مجھے نقل کرتے ہوئے!"

اور دونوں سوالوں کے حل باریک قلم سے کاغذ پر اُتارنے لگے۔

اطہر اور پرویز دونوں آٹھویں جماعت کے
طالب علم تھے۔ اسکول میں دونوں کی دوستی مشہور
تھی۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کے
شریک تھے۔ ان کا زیادہ وقت ایک دوسرے کے
ساتھ ہی گزرتا۔

پرویز کے والد اسی اسکول میں حساب کے
استاد تھے۔ وہ پرویز کی کافی نگرانی کرتے۔ خود
گھر میں بھی اُسے پڑھاتے۔ مگر پرویز کو لکھنے
پڑھنے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اُس کا دل
کھیل کود اور سیر و تفریح میں زیادہ لگتا تھا۔
پڑھنے لکھنے میں اپنے ہم جماعتوں میں وہ سب سے
پیچھے تھا۔ نیچے کے درجوں میں وہ کسی نہ کسی طرح
اپنے والد کے استاد ہونے کے سبب سے رعایتی
نمبروں سے پاس ہوجایا کرتا تھا۔ سچ پوچھیے تو
یہی بات اس کی کامیابی کی ترقی میں رکاوٹ بن
گئی تھی۔

بس یہی حال اطہر کا تھا۔ وہ ایک مال دار
باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ کتابوں کو ایک نظر اٹھا
کر نہ دیکھتا۔ البتہ پرویز کے ساتھ اپنا قیمتی
وقت نت نئی شرارتوں کی نذر کر دیتا۔

یوں تو دونوں تقریباً سبھی مضمونوں میں کمزور
تھے۔ حساب خاص طور پر اُن کے لیے بڑا ہوّا تھا۔
وقتاً فوقتاً ہر ایک استاد اُنھیں تاکید کرتا رہتا
کہ کڑی محنت کی ضرورت ہے۔ محنت اور کوشش
کے بغیر کسی کام میں کامیابی ممکن نہیں۔

لیکن اطہر اور پرویز استادوں کی ان
نصیحتوں پر بالکل کان نہ دھرتے۔ نئی نئی
شرارتیں، تفریحی مشغلے اور دوسروں کو اپنی خرافات
کے جال میں پھنسا کر بے وقوف بنانا جیسے ان
کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔

یہ دونوں نعیم سے بہت جلتے تھے۔ بے چارہ
ان کی شرارتوں کا شکار رہتا تھا۔ وہ ہر سال
امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔ بہت ذہین
تھا۔ محنتی تھا۔ ساتھ ساتھ بہت سعادت مند
بھی۔ اپنے بڑوں کی عزت کرتا تھا۔ اُن کی
بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتا تھا۔ اطہر اور پرویز
کو نہ جانے نعیم سے کیوں خدا واسطے کا بیر تھا۔ غالباً
وہ اُس کی کامیابی سے جل کر اس کے ساتھ
ایسا برتاؤ کرتے تھے۔

ایک دن تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ
کہ اسکول کی فیس دی جا رہی تھی جیسے ہی
نعیم کا نمبر آیا وہ فیس جمع کرنے کے لیے اپنی سیٹ
سے اٹھ کر کلاس ٹیچر کی میز کے پاس گیا۔ ادھر
اطہر کی آنکھوں میں ایک نئی شرارت ناچ اٹھی۔
اُس نے چپکے سے نعیم کا ڈیسک کھولا۔ دس روپے
کا ایک نوٹ کتابوں کے اوپر رکھا ہوا تھا اور
نوٹ کے ساتھ ہی بجلی کا بل بھی تھا۔ اطہر نے
ایک لمحے کے لیے سوچا کہ نعیم کا دس کا نوٹ پار
کردوں مگر فوراً ہی اُسے خیال آیا کہ اس طرح
بھانڈا پھوٹ جائے گا اور وہ کلاس میں چور
کہلایا جائے گا۔ اُس کے دماغ میں ایک نئی
ترکیب آئی اور اُس نے نوٹ چھوڑ کر بجلی کا بل
صاف کر دیا۔

نعیم فیس جمع کرا کے اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔

اور حساب کے سوال حل کرنے میں مشغول ہو گیا تھا۔ اطہر کچھ دیر تو خاموش رہا لیکن پھر موقع دیکھ کر اور رونی صورت بنا کر کلاس ٹیچر سے کہنے لگا۔ "سر کسی نے میرا دس روپے کا نوٹ نکال لیا ہے۔" بات تازہ جان کر کلاس ٹیچر نے کلاس کے دونوں دروازے بند کرا دیے اور ہر ایک لڑکے کی تلاشی لی جانے لگی۔ لیکن دس روپے کا نوٹ کسی کے پاس نہ نکلا۔ اب نعیم کا نمبر آیا۔ اور دس روپے کا نوٹ اس کے پاس سے نکل آیا۔ پھر کیا تھا۔ کلاس میں ایک شور مچ گیا۔ لمحہ بھر کو تو کلاس ٹیچر بھی چکرائے پھر انھوں نے نعیم کو بہت پھٹکارا۔ اپنی صفائی میں نعیم صرف اتنا کہہ سکا۔ "سر! دس کا نوٹ میں بجلی کا بل ادا کرنے کے لیے لایا ہوں۔"

"اچھا نکالو کہاں ہے تمھارا بجلی کا بل!"

نعیم نے تمام جیبوں کو ٹٹولا، کتابوں کاپیوں کی ورق گردانی کر ڈالی لیکن کہیں بل نہ ملا۔ آخر ملتا بھی کیسے وہ تو اطہر نے موڑ کر اپنے موزے کے اندر چھپا لیا تھا۔

نعیم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ لیکن اب وہ پوری کلاس میں چور ثابت ہو چکا تھا۔ اس کی تمام عزت خاک میں مل گئی۔ کلاس ٹیچر نے بہت برا بھلا کہا۔ "نعیم تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ ایک تو تم نے چوری کی اور دوسرے اوپر سے جھوٹ بھی بولا۔ شرم سے تمہیں کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔"

اطہر نعیم کی اس بے عزتی سے بہت خوش ہوا۔ اس نے بہت چالاکی سے کام لیا تھا۔ بجلی کا بل پار کرتے وقت اس نے نعیم کے نوٹ کا نمبر بھی اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ اور اس نمبر والے نوٹ کے ملتے ہی نعیم پر چوری ثابت ہو گئی تھی۔

نعیم چھٹی کے بعد گھر پہنچا تو بہت اداس تھا۔ باپ نے وجہ پوچھی تو اس نے ساری کہانی سنائی۔ وہ کپڑے پہن سیدھے ہیڈ ماسٹر کے گھر پہنچے۔ انھیں اصل بات بتائی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ان دونوں کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ دوسرے دن اسکول کے وقت اطہر کو بلایا اور بہت سختی سے پیش آئے۔ آخر مجبور ہو کر اطہر کو سچی بات بتانی پڑی۔ نوٹ واپس کرنا پڑا ہیڈ ماسٹر نے اطہر کو سخت سزا دی اور یوں نعیم کو سرخ روئی حاصل ہوئی۔

---

ہاں تو آج حساب کا پرچہ تھا۔ اطہر اور پرویز امتحان کے کمرے میں بہت خوش نظر آ رہے تھے پرچے میں جو سوال آنے والے تھے وہ انھوں نے پہلے ہی حل کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے۔ دونوں نے ایسی جگہ پرچے رکھے تھے کہ کسی طرح بھی تلاشی لیے جانے پر کسی کے ہاتھ نہیں لگ سکتے تھے۔

آخر گھنٹہ بجا اور لڑکوں کو حساب کا پرچہ ملا۔ اطہر اور پرویز نے بڑی شان کے ساتھ پرچہ لیا۔ لیکن یہ کیا ——؟ ایک بار نہیں، دو بار پڑھ لیا مگر حساب کا پرچہ ایک دم بدلا ہوا تھا۔ جو سوال وہ امتحان کے (باقی صفحہ ۲۲ پر)

# لمبا چوکیدار اور بونا کلرک

پاکستان کے ضلع گوجرانوالہ کے اللہ دتا کو اب تک پاکستان کا طویل ترین انسان سمجھا جاتا ہے مگر سیہون شریف میں اس سے بھی چار انچ لمبا نوجوان دریافت ہوا ہے۔ اس نوجوان کا نام محمد عالم ہے۔ اللہ دتا کا قد سات فٹ پانچ انچ ہے جب کہ محمد عالم کا قد سات فٹ نو انچ ہے۔ وہ آج کل کراچی آیا ہوا ہے جہاں اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کراچی شہر دیکھنے کے شوق میں وہ خود تماشا بن گیا ہے۔ وہ کراچی اس لیے نہیں دیکھ سکتا کہ کسی رکشے یا ٹیکسی میں پورا نہیں آسکتا۔ کسی بھی ٹیکسی یا رکشے کی چھت اتنی اونچی نہیں ہے جس کے نیچے وہ سما سکے۔ اس مشکل کی بنا پر وہ کسی جگہ جا نہیں سکتا اور اس کا شہر دیکھنے کا شوق تشنہ رہ گیا ہے۔

محمد عالم سیہون شریف میں واپڈا سپلائی کے محکمے میں چوکیدار ہے۔ اس کا وزن ساڑھے تین من ہے۔ اس کی شلوار چودہ گز کپڑے سے بنتی ہے۔ اس کا پاؤں ڈیڑھ فٹ، ہتھیلی ایک فٹ اور ہاتھوں کی انگلیاں چھ چھ انچ کی ہیں۔ اسے آرڈر دے کر جوتا اور چارپائی بنوانی پڑتی ہے۔ ایک وقت کے کھانے میں وہ بارہ روٹیاں اور ڈھیر سارا سالن کھا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے قد میں مزید اضافے کا امکان ہے۔ اس وقت اس کی عمر ۲۱ سال ہے۔ وہ ایک سال تک دنیا کا طویل ترین انسان بن جائے گا۔ اس کے والدین عام قد و قامت کے ہیں۔

یہ تو ہوئی ایک لمبو چوکیدار کی بات۔ اب آپ ایک بونے کلرک کا بھی حال سن لیجیے۔ یہ ہیں محمد پریل سولنگی۔ عمر بیس سال اور قد صرف دو فٹ چھ انچ۔ جی ہاں صرف اتنے سے ہی بس یہ سمجھیے کہ اگر آپ کے پیام تعلیم کی تین کاپیاں کھڑی کر کے ایک ساتھ اوپر نیچے رکھ دی جائیں تو محمد پریل سولنگی صاحب صرف ایک یا ڈیڑھ انچ بڑے رہیں گے۔

ان بے چاروں کو اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے اکثر شرمندگی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ بھی پاکستان ہی کے ایک قصبہ "دادو" کی میونسپلٹی میں جسے وہاں 'واپڈا' کہا جاتا ہے، کلرک ہیں۔ جب یہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہیں تو بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نٹ کھٹ لڑکا دفتر کے بابو کو غیر حاضر پا کر ان کی کرسی پر آ بیٹھا ہے اور اسی لیے جب کوئی اجنبی ان سے پوچھ بیٹھتا ہے کہ صاحبزادے! بابو جی کہاں گئے اور تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ تو مارے شرم اور غصے کے ان کا برا حال ہو جاتا ہے۔ خود سولنگی صاحب کا کہنا ہے کہ انھیں اپنے چھوٹے قد کا اس وقت بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے جب وہ صاحب کے پاس سرکاری کاغذات پر دستخط کرانے یا احکامات لینے جاتے ہیں اور اپنے بس بھر پنجوں پر کھڑے ہونے اور اچھلنے اچکنے کے باوجود وہ میز پر رکھے ہوئے کاغذات نہیں دیکھ پاتے یا جب افسر [illegible] پوچھتا ہے کہ [illegible] کسی کی پرواہ [illegible]۔

جناب مشرف عالم ذوقی آروی

# انعام

ہر سال اسکولوں میں گرمی کی چھٹیاں ہوا کرتی ہیں مگر جب اس سال چھٹی ہوئی تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے سبھی لڑکوں کو بُلایا اور کہا "دیکھو! جب اسکول کھلے گا تو تم سب کو ایک مضمون سُنانا ہوگا جس میں تمھیں یہ بتانا ہوگا کہ تم نے اس چھٹی میں کون سا اچھا کام کیا۔ جس لڑکے کا مضمون سب سے اچھا ہوگا اُسے انعام دیا جائے گا۔"

خیر سے گرمی کی چھٹی بیت گئی۔ اسکول کھُل گئے۔ آج انعامی مقابلہ تھا اس لیے اسکول میں خوب چہل پہل تھی۔ ہر شخص اسی مقابلے کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سبھی آج حد سے زیادہ مسرور نظر آ رہے تھے۔ مگر اُن سب میں ایک لڑکا ایسا بھی تھا جو ایک کونے میں کھڑا غمگین، پتھر کی مورت بنا آنسو بہا رہا تھا۔ یہ لڑکا احمد ہے جو ایک غریب باپ کا بیٹا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہیڈ ماسٹر صاحب آتے ہیں۔ اپنی اونچی آواز میں بولے۔

"میرے پیارے بچو!

آج تمھیں اپنا مضمون سُنانا ہے۔ اسی واسطے مجھے آج بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ میرے بچے کچھ کہیں گے۔ مگر سُنانے میں تم ہڑبڑی نہ کرنا کیوں کہ ہڑبڑی میں ہمیشہ گڑبڑی ہوا کرتی ہے۔"

اتنا کہہ کر ہیڈ ماسٹر صاحب خاموش ہو گئے، ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔

"خاموش! خاموش!" ہیڈ ماسٹر صاحب کی آواز پھر گونجی۔

اب سبھی لڑکے باری باری سے بُلائے جا رہے ہیں۔ سب سے پہلے محمد اشرف کی باری آتی ہے۔ یہ اسکول کے تیز لڑکوں میں گنے جاتے ہیں۔

سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک لڑکا آگے بڑھتا ہے۔ یہی محمد اشرف ہے۔ وہ بولنا شروع کرتا ہے۔۔۔

"جب گرمی کی چھٹی ہوئی تو میں دوسرے گاؤں میں اپنے والد کے ساتھ چلا گیا۔ کچھ دنوں میں ہی میں نے پورا گاؤں دیکھ ڈالا۔ ایک دن ایک بھولا بھالا بچہ کہیں روتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ بچہ اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے اس پر رحم آ گیا۔ میں نے اس سے رونے کی وجہ دریافت

کی تو وہ بولا راستہ بھول گیا ہوں۔ میں نے
پھر اُس کا گھر دریافت کیا۔ جب اُس لڑکے
نے مجھے گھر کا پتہ بتایا تو میں نے اُسے اُس کے
گھر پہنچا دیا۔"

ہال ایک بار پھر تالیوں کی آواز سے گونج
اُٹھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُس کی خوب تعریف
کی۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب دوسرے لڑکے آفتاب
کو بلاتے ہیں۔ وہ آتا ہے اور بڑی ہی رُعب دار
آواز میں بولتا ہے :۔

"میرے پیارے دوستو!

میں ایک بار دوپہر کے وقت کہیں جا رہا
تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ضعیف و نحیف
بُڑھیا چلی آ رہی تھی۔ ضعیفی کے باعث وہ
ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہی تھی۔ اُس کے
سر پہ ایک بھاری گٹھری تھی۔ جس کا بوجھ وہ
اُٹھا نہیں پا رہی تھی۔ میں نے اُس کو سہارا دیا
اور اُس کو اُس کی منزل تک پہنچا دیا مگر خود مجھے
یہ نہیں معلوم کہ میری منزل کہاں ہے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کے مضمون کو
اتنا سراہا کہ سبھی لڑکوں کو یقین ہو گیا کہ
انعام اسے ہی ملے گا۔ اسی طرح سبھی لڑکے
باری باری سے آتے ہیں اور اپنا مضمون
سُناتے ہیں۔

آخر میں احمد کی باری آتی ہے۔ وہی احمد
جو مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ایک کونے میں
کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس میلے میلے
ڈگ بھرتا احمد اسٹیج پر آتا ہے اور اس طرح
بولنا شروع کرتا ہے :۔

"میرے محترم بھائیو اور دوستو!

میں غریبی کے باعث گرمی کی چھٹیوں میں
کہیں نہ جا سکا۔ پھر بھی اس کوشش میں رہا کہ
کوئی ایسا کام کر سکوں جس سے مجھے انعام ملے۔
میرے مضمون کو سراہا جائے۔ آخر میں نے اُس
کام کو کیا۔ مگر اُس کام کو کرنے میں میں نے اپنے
والد کو کھو دیا۔

ہال میں سناٹا چھا گیا۔

بہت سے لڑکوں کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی
ہیں۔ تبھی ہیڈ ماسٹر صاحب کی آواز گونجتی ہے
"میرے بچے! اب آگے کہو۔"

احمد پھر کہنے لگتا ہے ـــــ

"میرے والد ایک غریب آدمی تھے۔ کسی
طرح پیسے جوڑ کر وہ مجھے ایک ماسٹر سے پڑھایا
کرتے تھے۔ میں رات کے وقت اُن کے یہاں
پڑھنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن جب میں پڑھ
کے لوٹ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ کئی گھوڑے
سوار ہمارے گاؤں کی طرف چلے جا رہے ہیں۔
میں نے آہستہ آہستہ چل کر اُن کا پیچھا کیا۔ وہ
لوگ ڈاکو تھے۔ یہ اندازہ اُن سب کی باتوں سے
ہوا۔ وہ سب ایک تاریک اور سنسان جگہ پر
رُک گئے۔ وہاں پر بڑے ہی گھنے درخت تھے
میں دبے پاؤں چل کر اُن کے پاس گیا۔ اور اُن
کی باتوں کو سُنا۔ پھر دبے پاؤں تیز قدم چلتا
ہوا اپنے گاؤں آیا اور اپنے والد کو اس بات کی

باقی ص۳۵ پہ

[illegible] میرے والد [illegible]
بھاگ گئے۔ میں نے اس بات کی خبر بہت سے لوگوں
کو کردی۔ تھوڑی ہی دیر میں سارے گاؤں
کو اس کی خبر ہوگئی کہ ڈاکو آئے ہیں۔ گاؤں
کے لوگ بھی ہاتھ میں ہتھیار لے کر اس جگہ
پہنچ گئے۔ رات اندھیری تھی۔ اس لیے ڈاکو ان
کو دیکھ نہ سکے۔ ان لوگوں نے چاروں طرف
سے ڈاکوؤں پر حملہ کر دیا۔ بہت سے لوگ مارے
گئے جن میں میرے والد بھی شامل تھے۔ اس
واقعے کی خبر شاید پولیس والوں کو ہوچکی تھی
اس لیے تھوڑی دیر بعد بہت سے پولیس والے
بھی بندوق لے کر آگئے اور ڈاکو گرفتار
کر لیے گئے۔

احمد خاموش ہوگیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی
اتنے زوروں کی تالیاں بجنے لگیں کہ کان
پھٹنے لگے۔

"خاموش! خاموش!! خاموش!!!"
ہیڈ ماسٹر صاحب ایک بار پھر بڑی زور سے
چیخے۔ پھر اسٹیج پر آئے اور کہنے لگے۔
"مجھے بے حد خوشی ہے کہ میرے اسکول
میں ایک ایسا ہونہار لڑکا بھی ہے جو گاؤں
والوں کی بھلائی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس لیے
انعام کا مستحق وہی ہے۔"
ہیڈ ماسٹر صاحب نے احمد کو اپنے پاس
بلایا۔ پھر اس کو ایک بڑا ہی خوب صورت انعام
دیا۔ ساتھ ہی ساتھ لوگوں نے بھی اس کی
[illegible]ت پھولوں کی مالائیں پھینکیں۔

●●

[illegible] سے خوش رہو [illegible]

[illegible]

"نہیں بادشاہ کا پہلا فرض ہوتا ہے رعایا
کا سکھ چین۔ اور آپ کے اس عیش و عشرت
نے سب کو پریشان کر دیا ہے۔ اس لیے
ہمارے لیے اب ایک ہی کام ہے۔ آپ کو
ختم کر کے ہم میں سے کوئی بادشاہ بن جائے۔"
"نہیں ایسا مت کرو۔ مجھے مت مارو میں
بادشاہ نہیں ہوں، لکڑہارا ہوں۔" لکڑہارا چیخا۔
"اب آپ بچ نہیں سکتے۔" وزیر اعظم بڑھتا
ہوا بولا۔

"یا خدا مجھے اس مصیبت سے نکال۔ میں
بادشاہ بننا نہیں چاہتا۔" اس نے اپنی آنکھیں
بند کرلیں۔ جب کھولیں تو اپنی جھونپڑی میں تھا۔
یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور اپنی بے وقوفی
پر ہنسنے لگا۔ اور بولا۔
"خوش رہو اس حال میں جس حال میں
رکھے خدا۔"
اس کے بعد اس نے کبھی خدا سے شکایت
نہیں کی۔

---

- یہ دنیا دلدل کی طرح ہے۔ اس دلدل میں رہتے ہوئے بھی انسان کو کنول کے پھول کی طرح صاف ستھرا رہنا چاہیے۔ ([illegible])
- نفرت شیطان کا حصہ ہے۔ معاف کرنا انسان کا وصف اور محبت فرشتوں کا۔ ([illegible])

جناب محمد مُبین (ایولہ)

# خوش رہو اس حال میں
# جس حال میں رکھے خدا

ایک لکڑہارا تھا۔ جو روزانہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور شہر میں لے جاکر فروخت کرتا تھا۔ اسی سے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی اس زندگی سے بیزار ہوگیا تھا۔ دن بھر لکڑیاں کاٹتے رہو اور انہیں فروخت کرو تب کہیں جاکر کھانا ملے۔ اس کے علاوہ اسے اور کیا کام۔ پھر رات کو سونے کے لیے اس کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی۔ نہ بچھانے کے لیے نرم بستر اور نہ اوڑھنے کے لیے گرم رضائی۔ وہ رات بھر سردی میں ٹھٹھرتا۔

اور کھانے کے لیے بھی کوئی اچھی چیز نہیں۔ بس روکھی سوکھی روٹی۔ اگر کسی دن لکڑی نہیں بکی تو اس دن فاقہ۔ وہ روز خدا کے سامنے گڑگڑاتا تھا "یا خدا تو نے کیا زندگی بنائی ہے۔ ہر وقت کام۔ نہ اچھا کھانا اور نہ ریشمی کپڑے پہننے کو۔ نہ مجھے کسی طرح کا آرام۔ کاش تو مجھے بادشاہ بناتا جو رات دن بیٹھا رہتا اچھی اچھی چیزیں کھاتا۔ جس کی خدمت کے لیے ہر طرف خادم رہتے۔ اے خدا تو مجھے بادشاہ بنادے تاکہ میں آرام سے رہ سکوں۔ کیا مجھے لکڑہارا بنایا؟"

وہ روز رات خدا کے سامنے اسی طرح گڑگڑاتا۔

ایک دن اللہ میاں نے اس کے پاس ایک فرشتے کو بھیجا۔ فرشتہ اس کے پاس آیا اور بولا۔

"اے لکڑہارے جا خدا نے تیری مراد پوری کی تو بادشاہ بن گیا۔ اپنی آنکھیں بند کر۔"

لکڑہارے نے اپنی آنکھیں بند کیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران رہ گیا اور اچھل پڑا۔ وہ ایک بہت بڑے محل میں تھا۔ جس کمرے میں وہ تھا۔ اس کی بناوٹ پر ایسا لگتا تھا جیسے بے انتہا پیسہ خرچ کیا گیا ہو پورا فرش سنگ مرمر کا تھا اور ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔

اسی وقت نہایت ہی خوب صورت کپڑے پہنے ایک آدمی داخل ہوا اور اس نے جھک کر سلام کیا۔

"حضور ناشتہ تیار ہے۔"

اچانک اُسے کپڑوں کا خیال آیا۔ اُس نے دیکھا تو اُس کے جسم پر بھی اعلیٰ لباس تھا۔ پھر کھانے کے لیے بڑھا۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چُنے ہوئے تھے جن کے نام اُس نے اب تک بھی نہیں سُنے تھے، نہ دیکھا تھا۔ وہ سب کھانے کھانے لگا۔ جب اُس کا پیٹ بھر گیا تو اُس نے سکون کا سانس لیا۔ کتنی راحت ہے اس زندگی میں! کتنے عمدہ عمدہ کھانے ملتے ہیں۔

پھر وہی غلام آیا اور سر جھکا کر بولا۔ "بادشاہ سلامت کو دربار میں بلایا جا رہا ہے۔"

وہ اس غلام کے ساتھ چل پڑا۔ اور ایک نہایت ہی وسیع کمرے میں پہنچ گیا۔ قریب ہی ہیرے جواہرات سے جگمگاتا ہوا تخت تھا۔ وہ اسی پر بیٹھ گیا۔ دربار نعروں سے گونج اُٹھا۔

"بادشاہ سلامت"

"زندہ باد"

جب خاموشی چھا گئی تو ایک وزیر نے اُٹھ کر کہا "بادشاہ سلامت کے حضور میں چند مقدمے پیش کیے جاتے ہیں۔"

اسی وقت دو قیدی دربار میں حاضر کیے گئے۔ وزیر نے کہا "ان دونوں نے دولت کے لیے اپنے بڑے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ حضور انصاف کریں۔"

لکڑہارا گھبرا گیا۔ اس کا کیا فیصلہ کریں۔

گھبرا کر اُس نے کہہ دیا "ان کو چھوڑ دو۔"

دربار میں بھنبھناہٹ گونج اُٹھی۔ مگر بادشاہ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔

اسی طرح اور بھی بہت سے مقدمے پیش ہوئے۔ لکڑہارے نے ان سب کے اُلٹے سیدھے فیصلے کر دیے۔

درباری ان فیصلوں سے ناخوش تھے مگر وہ بادشاہ کے ڈر سے کچھ بول نہیں رہے تھے۔

آخر بہت دن ہو گئے۔ لکڑہارا عیش و عشرت میں ہی رہا۔ اور وزیروں نے محسوس کیا کہ بادشاہ کی سلطنت کے کاموں سے دلچسپی اُٹھ گئی ہے۔ کئی بڑے بڑے مسائل پیدا ہو گئے تھے جن سے آسانی سے نہیں نپٹا جا سکتا تھا۔ آخر سب درباریوں نے ایک خفیہ میٹنگ کی۔ وہ عوام کی فلاح چاہتے تھے۔ اس میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ بادشاہ کو ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ وزیرِ اعظم کو بادشاہ بنایا جائے۔

فوراً سب نے تلواریں نکالیں اور بادشاہ کو ختم کرنے کے لیے چل پڑے۔ وزیروں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی لکڑہارا بیدار ہو گیا سب وزیر اُس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے وزیرِ اعظم نے کہنا شروع کیا۔

"بادشاہ سلامت آپ نے امورِ سلطنت سے دلچسپی لینا بند کر دی ہے۔ اور عیش و عشرت میں اپنے آپ کو ڈال دیا ہے۔"

"مگر بادشاہوں کا تو یہی کام ہوتا ہے۔"

باقی صفحہ پر

بچوں کی کوشش

# مولا کا بندہ

لوگ اسے مولا بخش کہا کرتے تھے۔ سیدھا سادہ انسان تھا۔ جھوٹ اور فریب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بے چارے کو معلوم نہ تھا کہ روپے میں کتنے پیسے ہوتے ہیں، اور من میں کتنے سیر۔ اسے نہ کھانے کی فکر تھی نہ پہننے کی جو ملا کھا لیا۔ جیسا ملا پہن لیا۔ سب اسے ہر وقت خوش ہی دیکھتے تھے گھر میں بیوی کے علاوہ مکّو نام کی ایک لڑکی تھی۔ ایک بھینس بھی اس کے پاس تھی۔ اس سب کے علاوہ اس کی زبان پر ہر وقت مولا رہتا تھا۔ کچھ بھی ہو جائے وہ سب کو اپنے مولا کے بھروسے پر چھوڑ دیتا تھا۔ سارے دن بھینس کے ساتھ جنگل میں گھومنا اور شام کو دودھ روٹی کھا کر پڑ رہنا، یہی اس کی روزمرّہ کی زندگی تھی۔ مولا بخش کی اپنی بیوی سے کم بنتی تھی۔ اکثر بیویاں سیدھے سادے میاں کو تنگ بھی کیا کرتی ہیں۔

کوئی خدا کہتا ہے تو کوئی بھگوان، اور کوئی کوئی تو انسان کے علاوہ کسی اور طاقت کو مانتا ہی نہیں ہے۔ وہ نہ رام کہتا تھا نہ رحیم، نہ مندر میں جاتا تھا نہ مسجد میں۔ اس نے اپنے محبوب کا نام مولا رکھ چھوڑا تھا۔ وہی اس کا سب کچھ تھا۔ گھر پر ہی وہ اپنے مولا کی عبادت کرتا تھا "مولا، مولا" زیادہ پکارنے کی وجہ سے ہی شاید لوگوں نے اس کا نام مولا بخش رکھ دیا تھا۔

مولا بخش کی بیوی کہتی ہے "مکّو سیانی ہو گئی کچھ اس کی بھی فکر ہے؟"

"مولا سب فکر دور کر دے گا" وہ جواب دیتا۔

"چولہے میں گیا مولا" بیوی چڑھ کر کہتی "میں تو سنتے سنتے تنگ آ گئی ہوں ہر وقت مولا ہی مولا، کچھ کمانا نہیں ہے لڑکی کی شادی کے لیے؟"

"مولا سب ٹھیک کر دے گا" وہ جواب دیتا۔

بیوی بے چاری چپ لگا جاتی۔

ایک دن اس کی بھینس کو چور لے گئے مگر مولا بخش کو کوئی فکر نہ ہوئی۔ لوگوں نے پوچھا "مولا بخش بھینس کا پتہ نہیں لگاؤ گے؟"

"مجھے کیا پڑی ہے۔ میرا مولا خود پتہ لگا دے گا۔" اس کا جواب تھا۔

لوگوں نے کہا "مولا بخش بھوکے مر جاؤ گے مولا کے بھروسے۔"

"مولا نے مجھے دنیا میں بھیجا ہے تو کھانے کو بھی ضرور دے گا۔ میرے مولا کے دربار میں کوئی بھی کمی نہیں ہے۔" کوئی جل کر کہتا "مولا بخش تمہارا دماغ خراب ہے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔"

وہ جواب دیتا "کیا ڈاکٹر میرے مولا سے بھی بڑا ہے۔ میرا علاج میرے مولا کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ڈاکٹر وہی تو ہے۔"

بیوی کہتی جاؤ اُسے بھینس کو ڈھونڈو، نہیں تو ہم سب بھوکے مرجائیں گے۔"

وہ سنجیدہ ہوکر جواب دیتا۔ "تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہو، مولا کی بھینس تھی وہی لے گیا۔ دے جائے گا دو چار دن میں۔"

بیوی آگ بگولہ ہوکر کہتی "میرے تو کرم پھوٹ گئے جو ایسے نکھٹو سے گھر آئی۔ نہ کچھ کرتا ہے نہ دھرتا ہے میرے تو مولا مولا سنتے کان پک گئے۔ مرجائیں تو پتا چلے گا۔"

مگر مولا بخش پر اس کا کوئی بھی اثر نہ ہوا، اس نے بھینس تلاش کرنے کی کوئی بھی کوشش نہ کی۔ مگر جو تھے پانچویں روز بھینس کو مولا بخش کے کھونٹے پر بندھی دیکھ لوگ حیران رہ گئے۔

کسی نے پوچھا۔ "مولا بخش کہاں ملی بھینس، کون لے گیا تھا — ؟"

مولا بخش نے جواب دیا مولا ہی لے گیا ہوگا۔ رات پہنچنے سے واپس کرگیا۔

اس واقعے کے بعد لوگوں کو مولا بخش کی سچی عبادت پر کچھ یقین ہونے لگا۔

ملّو دن پلن سیانی ہوتی گئی، اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال ہوچکی تھی مگر مولا بخش بالکل بے فکر رہتا تھا۔ وہ تو سب کچھ اپنے مولا کے اوپر چھوڑ بیٹھا تھا۔ پورے گاؤں میں ملّو کی عمر کی کوئی لڑکی کنواری نہ تھی۔ گاؤں کے لوگ اکثر ملّو اور اس کے باپ کی چرچہ کرتے تھے۔ کوئی کہتا — "گاؤں پر کوئی آفت آنے والی ہے جو گاؤں میں اتنی بڑی لڑکی کنواری ہے۔ بھگوان ہی بھلا کرے گا اس گاؤں کا۔" آخر دو چار بڑے بوڑھے آدمیوں کے کہنے سننے پر مولا بخش نے پاس کے گاؤں میں ملّو کا رشتہ طے کردیا اور شادی کی تاریخ بھی مقرر کردی۔ بارات آنے میں چار چھ دن باقی تھے مگر مولا بخش کے گھر میں سیر دو سیر اناج کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

گاؤں کے کچھ لوگوں نے چندہ جمع کرکے ملّو کی شادی کے لیے رقم جٹائی مگر مولا بخش کو انھوں نے نہیں بتایا کہ دیکھیں بھلا مولا کے بھروسے پر یہ کیا کرتا ہے۔ بارات آنے سے دو چار دن پہلے لوگ بولے "مولا بخش شادی کے لیے کچھ سامان جٹاؤ گے یا یوں کب تک بیٹھے رہو گے —"

"مولا سب انتظام کردے گا" وہی جانا پہچانا سا جواب تھا۔ لوگوں نے کہا۔ "دیکھ لیا تیرا مولا، اب بھی وقت ہے جا سا ہوکار سے کچھ لے آ"

"میں اپنے مولا کے علاوہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔" اس کا جواب تھا۔

"یہ پاگل ہوگیا ہے" لوگ کہہ کر چلے گئے۔

بارات آنے سے دو دن پہلے دو بیل گاڑیاں مولا بخش کے دروازے پر آکر رکیں۔ گاؤں والے سمجھ نہ پائے کہ یہ کیا جادو ہورہا ہے۔

"کیوں بھائی کس نے بھیجا ہے یہ سامان؟" کسی نے گاڑی وان سے سوال کیا۔

"مولا نے" گاڑی وان نے مختصر سا جواب دیا۔ گاؤں والوں نے سمجھا مولا شاید مولا بخش کا کوئی دوست ہے۔ پوچھا — "کہاں رہتا ہے بھائی مولا"؟

"مولا بخش کے دل میں" گاڑی وان نے جواب دیا۔ "تم سب کے دل میں بھی ہے مگر تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔"

گاڑی وان شادی کا سارا سامان مولا بخش کے گھر میں بھر کر چل دیے۔ لوگوں کو اب بھی شک تھا کہ مولا ضرور اس کا کوئی دولت مند دوست ہے۔ اپنا شک دور

باقی صفحہ ۱۳ پر

جناب وقار خلیل

# یادِ حسّان

"مولوی محمد حسین حسان ندوی کی شخصیت ہر جہاں تاب ایسی منوّر تھی، ادبِ اطفال کی سربلندی کے لیے ان تھک محنت اور مسلسل عمل سے اتنے کام کیے ہیں کہ گننا تا مشکل ہے۔ شہرت اور خود نمائی سے الگ رہ کر خاموش کام کیے جانا کوئی ان سے سیکھے۔ "پیامِ تعلیم" کو انھوں نے اپنے سعادت مند بچوں کی طرح پالا، پوسا اور شجرِ سایہ دار بنا دیا۔ اردو میں بچوں کا ادب آج جس صحت مند جادہ پر گامزن نظر آتا ہے، اس میں میرِ قافلہ حسان صاحب کی سعیِ مشکور کو بہت زیادہ دخل رہا ہے۔

حیدرآباد میں جنوری ۱۹۶۹ء کے چند ہفتے حسان صاحب سے روز روز ملاقاتیں رہیں یہاں کے بچوں کے لیے لکھنے والوں اور پیامِ تعلیم کے قلمکاروں سے وہ ملے، میں نے ۱۲ جنوری کو ایوانِ اردو میں مدعو کیا۔ بہت سے لکھنے پڑھنے والے جمع تھے۔ بچوں کے ادب پر بات چلی۔ حسان ندوی صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر اور مسکرا مسکرا کر بچوں کے ادب کے ارتقاء میں دکن اور جامعہ ملیہ کی خدمات کا ذکر کیا۔ بڑی معلومات رکھتے تھے، حافظہ بھی غضب کا تھا، میں نے احباب سے موصوف کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ہمارے حسان صاحب کا بچوں کے ادب میں وہی مقام ہے، جو سرسید کا قومی تہذیب کی نشاۃِ ثانیہ میں رہا ہے۔ جب میں نے انھیں "بچوں کا سرسید" کہا تو وہ گہری سوچ میں گم سے رہے انکساری سے کہنے لگے "سرسید کی عظیم شخصیت کہا[ں] میں ذرّہ بے مقدار کہاں!" غرض حسان صاحب نے بچوں کے ادب کو پروان چڑھایا۔ ان کا اچانک و[فات پانا] میرے لیے ایسا صدمہ ہے کہ ہر بار موصوف کے بار[ے میں] لکھنے کی سوچتا رہا مگر قلم ساتھ نہ دے پایا۔

ایک نظم جو نثری آہنگ رکھتی ہے، بے ساخت[ہ] آگئی، وہی مرسلِ خدمت ہے۔ ولی صاحب! اب آپ کو حسان صاحب کی قلمی امانت "پیامِ تعلیم" زندہ و تابندہ رکھنا ہے۔ اللہ آپ کی مدد فر[مائے]۔ مرحوم نے اپنے خطوط میں آپ کی مستعدی، لگ[ن] کے بارے میں بار بار ذکر کیا تھا۔

دنیاوی فکروں، مصروفیتوں نے اس [قدر الجھا] رکھا ہے کہ یہ چند سطریں بھی جو لکھی ابھی ا[...] ہیں۔ اتنی دیر میں تحریر کر رہا ہوں۔

"خدا حسان صاحب کو جوارِ رحمت میں جگ[ہ دے]

آمین۔"

---

- جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھنی ہے وہ دو[ست] سے بھی پوشیدہ رکھو۔ (لقمان)
- سب سے بڑی دولت صحت مند جسم ہے۔ [illegible]

# آدھی ملاقات

اڈیٹر صاحب پیام تعلیم ۔ نئی دہلی

السلام علیکم

ہندوستان و پاکستان کی ڈاک کھلتے ہی مجھے دو نمبر پیام تعلیم کے (جون ۔ جولائی) ملے، جس کی مجھے کوئی توقع نہ تھی ـــــ بہت شکر گذار ہوں ۔ مہربانی ۔

حسان صاحب کی تصویر سرورق پر دیکھ کر اور ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر، یہ پرچے ملنے کی خوشی زائل ہو گئی ۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر ۔

حسان مرحوم کا گذشتہ آٹھ سات سال میں مجھے جب کوئی خط (پیام تعلیم کو مضمون روانہ کرنے کی فرمائش کا) ملتا تھا تو ان کی تحریر اور میرے حق میں محبت و عزت کے الفاظ پڑھ کر میرے ذہن میں جو اُن کی شکل و صورت قائم ہوئی تھی، سرورق کی تصویر اس سے بہت مختلف نکلی ۔ میں حسان صاحب کو ایک ہنس مکھ نوجوان جو بڑوں کا بے حد ادب کرنے کا بچپن سے عادی ہو لہ ۔ تنومند، پھرتیلا قسم کا ادیب سمجھے ہوئے تھا ۔ ان کی آخری تصویر سے ایسا محسوس ہوا کہ یہ شکل کبھی دیکھی تھی ۔ یعنی پچیس تیس سال پہلے اپنی جوانی کے دنوں میں ۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کل کی ڈاک سے اگست کا پیام تعلیم ملا میرے آس پاس "پڑھا کو" بچوں کا زور ہے ۔ رسالہ وغیرہ دیکھتے ہی لے جاتے ہیں ۔ اور پھر واپسی کی پرواہ نہیں کرتے پیام تعلیم کے ساتھ بھی یہی ہوا ۔ میں پوری طرح پڑھنے نہیں پایا کہ وہ پارٹی لے اُڑی ۔

نئے اڈیٹر ولی شاہجہانپوری کا نام بھی سنا ہوا ہے ۔ ان کا حلیہ میرے ذہن میں حسبِ ذیل ہے ۔

پستہ قد ۔ موٹا جسم ، ذرا توند باہر، سانولا رنگ ۔ اگر وہ ایسے نہ ہوں ، یعنی واقعی حسین ہوں تو میرے تصور کی خطا معاف کریں اور اگر کچھ صداقت پائیں تو مجھے ولی سمجھنے کی بجائے "اندازے باز" سمجھیں ۔ اندازہ بہر حال اندازہ ہے غلط بھی ہو سکتا ہے ۔ صحیح بھی ۔ یہ آپ کے حکیم ، ڈاکٹر، رمّال، نجومی سب "اندازے باز" ہوتے ہیں ۔ لگ گیا تیر، نہیں تو تکا،

مولوی شفیع صاحب نیر کو میرا بہت بہت سلام پہنچا دیں آپ کے لکھنے والوں میں وہی مجھ سے واقف ہیں ۔

ڈاک کا نرخ اتنا گراں ہے کہ میں "آپ کو زیادہ بار اپنے خط پڑھنے کی تکلیف نہ دے سکوں گا ۔ لہٰذا میری خاموشی کو میری غبت پر محمول فرمائیں ۔ آپ کی یاد آوری کا ایک بار پھر شکریہ ادا کر کے رخصت چاہتا ہوں السلام علیکم ۔ مزاج شریف

سید ابو تمیم

کل پیام تعلیم کا حسین حسان نمبر ملا ۔ مبارک باد قبول فرمایئے ۔ کل کچھ مہمان آ گئے تھے جس کی وجہ سے بہت مصروف تھا ۔ مگر پھر بھی پورا پرچہ پڑھنے کے بعد ہی رکا آجکل اچھے مضامین حاصل کرنا کتنا مشکل کام ہے، اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہے، اس لیے آپ واقعی مبارکباد

ہے مستحق ہیں کہ حسین حسان صاحب جیسے گوشہ نشین کے
بارے میں ۲۷، ۲۸ نظم و نثر کے مضامین اور قطعات و نظم
شائع کر دی ہیں۔ شاہد صاحب کی خدمت میں بھی مبارکباد
پہنچا دیجیے، اس گرانی اور مشکل زمانے میں انھوں نے ایک
خادم ادب کو یاد رکھا۔

آپ نے، ازراہِ کرم، مجھ سے بھی مضمون کے لیے
فرمایا تھا۔ مگر صرف اسی لیے نہ لکھ سکا کہ مرحوم کی ادبی
خدمات کے لیے جس قدر معلومات کی ضرورت تھی، وہ
حاصل نہیں ہو سکی تھی، اس نمبر کو پڑھنے کے بعد بھی وہ معلومات
حاصل نہ ہو سکیں۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس نمبر کو
پڑھنے کے باوجود صحیح تاریخ اور ماہ و سال معلوم نہ ہو سکا
کہ انھوں نے پیام تعلیم کی ادارت کب سنبھالی تھی۔ بہرحال
میں ضرور لکھوں گا۔

عبداللطیف اعظمی

آج دوپہر کی ڈاک سے "پیام تعلیم" کا حسین حسان
نمبر موصول ہوا پڑھنا شروع کیا تو ایک ہی نشست
میں پورا شمارہ پڑھ ڈالا۔ آپ نے جس مخلصانہ جذبہ سے حق
رفاقت ادا کیا ہے اس کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ بزرگوں
اور دوستوں نے جس قسم کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اُن
سے مرحوم کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ دیکھ کر
بالجملہ تسکین ہوتی ہے کہ اخلاص اور محنت کی پذیرائی
کرنے والے اور بچوں کے ادب سے دلچسپی رکھنے والوں
کی ابھی خاصی تعداد موجود ہے۔ ہر مضمون سے
خلوص اور محبت اور مرحوم کی جدائی پر غم و اندوہ ٹپکتا
ہے۔ آپ نے تمام مضامین بڑے سلیقہ سے مرتب فرمائے
ہیں۔ ان سے اچھی خاصی معلومات مہیا ہو جاتی ہے۔
واقفیت سے پیام تعلیم کے پڑھنے والوں کے
دل میں آپ کے لیے دلی شکرگزاری اور احسانمندی کا
جذبہ پیدا ہوگا۔

حسین صاحب مرحوم کی وفات سے بچوں کے ادب
کی اشاعت میں جو رخنہ ہو گیا ہے۔ خدا کرے آپ کی
کوششیں اس کی تلافی کر سکیں اور خدا آپ کی ان کوششوں
کو حسنِ قبول عطا فرمائے۔

محمد شفیع الدین نیّر

یہ جان کر بڑی تکلیف پہنچی کہ ہمارے محترم "حسین حسان"
صاحب اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ فرما گئے
دعا ہے کہ پروردگارِ دو عالم مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جملہ
متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ
موصوف نہ صرف "نونہالوں" کو اس تنگ و تاریک
دنیا "علم و عمل" کی ضیا یا مشعل (پیام تعلیم) کے
ذریعہ کامیابی اور ترقی کی منزلوں کی طرف بڑھا
رہے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ "زبانِ اُردو"
کے لیے بھی لائق صد آفریں خدمتیں انجام دے
رہے تھے۔ چنانچہ اس قابلِ قدر ہستی کی مفارقت
میں جس قدر بھی غم و افسوس کے آنسو بہیں کم ہیں۔

یہ کیا کہا کہ رہے اب نہیں حسین حسان
وہ آج بھی تو ہیں زندہ مرے خیالوں میں
بسی ہوئی ہے مرے دل میں اب بھی یاد ان کی
ہے نام انھیں کا مرے دل کے گرم نالوں میں

شریکِ غم
شفیع تمنّا کلکتوی

# اِدھر اُدھر سے

## رامائن کی ۴ سوویں سالگرہ

تلسی داس کی رام چرت مانس، جسے عام طور پر رامائن کہا جاتا ہے۔ کی ۴ سوویں سالگرہ کے جشن کے سلسلے میں ابھی کچھ دن پہلے ماسکو کے ایوانِ دوستی کے گرینڈ ہال میں ایک جلسہ ہوا۔

جشن منانے کے سلسلے کے اس جلسے میں ماسکو میں ہندوستانی سفیر ڈاکٹر کے ایس۔ شیلوانکر، ہندوستانی سفارت خانے کے کارکنوں، ہندوستانی شعراء، موسیقاروں اور رقاصوں نے شرکت کی۔ سوویت یونین کی طرف سے سوویت ہند سوسائٹی برائے کلچرل تعلقات کے نائب صدر والنٹینا چلیشیف، جواہر لال نہرو انعام پانے والی این۔ آر۔ گوسیوا، رامائن کی سالگرہ کے جشن کی تیاری کمیشن کے انتظامی سکریٹری والی۔ وی۔ سیوتیکوف۔ ایم ایس سی (لسانیات) شاعر و مترجم ایس۔ ایف۔ سیوا تسیف اور جی۔ ایف۔ اشکنازوزے۔ کلچرل تعلقات کی سوویت ہند سوسائٹی کے ممبران اور سوویت عوام کے نمائندوں نے جلسے میں شرکت کی۔

اسی سال رامائن کی سالگرہ کے ساتھ ساتھ روس کے بلند پایہ شاعر اور آزادی کے علمبردار الیکسانڈر پشکن کی ۱۷۵ ویں سالگرہ بھی منائی جا رہی ہے۔ اس لیے دونوں شاعروں کے درمیان قدر مشترک کی طرف دھیان دیا جانا لازمی ہے کیونکہ دونوں کی تخلیقات کا مقصد عوام کی خدمت تھا اور دونوں ہی سوویت یونین اور ہندوستان میں ہر دلعزیز ہیں۔

نومبر ۱۹۷۶ء میں تھیٹر کو بھیجے گئے اپنے ایک پیغام میں شریمتی اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہے کہ رامائن اسٹیج کرنے کی ۱۰ ویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ یہ ماسکو کے فنکاروں و ہدایت کاروں کی صلاحیتوں اور رامائن کی زبردست جادوگری دونوں کو خراجِ تحسین ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا بھر میں رامائن ایک ہر دلعزیز اور مشہور کتاب ہے جس سے بہت سے ایشیائی ممالک کے عوام نے اپنے اخلاقی نظریات وضع کیے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے مزید کہا کہ سوویت نوجوانوں کو اس عظیم تخلیق سے روشناس کرا کر ہند سوویت دوستی کو مضبوط کرنے میں اس تھیٹر نے ایک زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کو اسٹیج کرنے میں جن لوگوں نے حصہ لیا تھا ان سب کے لیے شریمتی گاندھی نے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔

ڈاکٹر کے۔ ایس شیلوانکر نے اپنی تقریر میں علم الہند کے سوویت ماہرین کی کوششوں کو سراہا، جنھوں نے ہندوستانی ادب کو عوام کے سامنے پیش کرنے میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ یہ انہیں کی محنت کا پھل ہے کہ سوویت عوام کو بہت سے ہندوستانی شعراء اور نثر نگاروں کی تخلیقات سے متعارف ہونے کا موقع ملا ہے جس میں تلسی داس کی بیش بہا تخلیق رامائن بھی شامل ہے۔